ماہنامہ
نئے افق
کراچی
DECEMBER 2017
PDF
aanchalpk.com aanchalnovel.com

ماہنامہ
نئے اُفق
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس
NAEY UFAQ
PUBLICATION
پاکستان (فی پرچہ)..........50روپے
پاکستان (سالانہ)..........600روپے
اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242
مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
اقبال بھٹی
مدیر معاون
طاہر احمد قریشی
منتظمین
نورالدین
جلد 41
شمارہ 11
دسمبر 2017
aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تا کہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تا کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی **30** تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تا کہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشااللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تا کہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تا کہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آسکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مدد گار ثابت ہوگا۔ شُکریہ

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط وکتابت کا پتہ: ''آنچل'' پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200' فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 کیے از مطبوعات نئے اُفق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

Health

دنیا کا سب سے مہنگا زہر جس کی قیمت اربوں روپے میں ہے | World's Most Expensive Poison

computerxtech 0 Oct 03, 2017

اس ایک لیٹر زہر کی قیمت تقریباً ایک ارب 10 کروڑ پاکستانی روپوں کے مساوی دنیا کا سب سے مہنگا زہر بچھوؤں کی ایکWorld's Most Expensive Poison(ہے۔ قسم "ل... Readmore

---

Health

بوڑھوں کو جوان بنانے والی سائنس | Old to Young Conversion Science

computerxtech 0 Sep 11, 2017

انسان کے جسم میں خلیوں کی دو سو سے زائد اقسام پائی جاتی ہیں۔ فوٹو : فائلپچھلے سال 29... Readmore

---

Health

صحت کے معاملے میں خواتین کی 10 سنگین غلطیاں | Ten Health Mistakes by the Women

computerxtech 0 Sep 11, 2017

خوبصورت نظر آنے کے لیے خواتین دنیا بھر کے جتن کرتی ہیں لیکن اکثر کو شکایت رہتی ہے کہ انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ فوٹو، فائلکراچی: اچھی صحت اور خ... Readmore

---

Health

ایسپرین دانتوں کو خرابی سے روک کر انہیں ازخود مرمت کے قابل بناتی ہے | Dental Treatment with Aspirin

computerxtech 0 Sep 11, 2017

کوئنزیونیورسٹی کے سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ ایسپرین دانتوں کی حفاظت کرتی ہے۔ فوٹو: فائل لندن: سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ گھروں میں ... Readmore

---
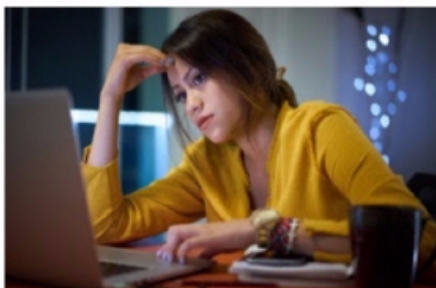
Health News

فکر اور پریشانی سے نجات پانے کے تین آسان طریقے | Three easy ways to eliminate Tension

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ماہرین نفسیات نے پریشان خیالی سے چھٹکارا پانے کے تین اہم طریقے بیان کئے ہیں۔ فوٹو: فائل لندن: ماہر نفسیات کے مطابق پریشان اور فکرمندی کی س... Readmore

---

Health News

ادرک جوڑوں کے درد کے لیے اکسیر دوا | Benefits of Ginger

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ادرک میں کئی اجزا جلن، درد اور سوزش کو کم کرتے ہیں۔ فوٹو: فائلکراچی: ادرک کے جسمانی و طبی فوائد سے ہم سب بخوبی واقف ہیں اور اب ماہرین نے اس کے اس... Readmore

Interesting News

بچت کرنے کے 7 طریقے | Seven Methods of Savings

computerxtech 0 Oct 13, 2017

پیسہ خرچ کرنا جتنا ضروری ہے، پیسے بچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ یہ بچی ہوئی رقم مستقبل میں کسی آڑے وقت میں کام آ سکتی ہے۔ روز بروز بڑھتی مہنگائی ... Readmore

---

Interesting News

دنیا کے خطرناک روڈ | World's Most Dangerous Roads

computerxtech 0 Oct 02, 2017

دنیا بھر کے خطرناک ترین روڈ میں ایسی گزرگاہیں شامل ہیں جو اپنی تعمیر، محل وقوع، اونچائی، طوالت اور موسم کی وجہ سے عام سڑکوں کی نسبت مختلف ہیں دنیا بھر... Readmore

---

Interesting News

عرب امارات کے حکمران کروڑوں ڈالر خرچ کرکے زمین پر مریخ بنائیں گے

computerxtech 0 Oct 01, 2017

امارات کی حکومت نے اگلے 100 سال میں مریخ پر انسانی آبادی بسانے کے منصوبے کا افتتاح کردیا۔ فوٹو: حکومتِ بیٹیڈبلی؛ متحدہ عرب امارات کے حکمران 15 ک... Readmore

---

Interesting News

کیا آپ مریخ پر جانا چاہتے ہیں ؟

computerxtech 0 Oct 01, 2017

مریخ ایک ایسا سیارہ ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ پانی کی موجودگی ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرخ سیارہ انسان کی دلچسپی کا سبب بن چکا ہے فوٹو: فائلانسان چاند پر... Readmore

---

Interesting News

مریخ کے بارے میں 11 حیرت انگیز معلومات

computerxtech 0 Oct 01, 2017

خلائی کھوجیوں کی بڑی تعداد مریخ پر پہنچی گئی ہے اور امید ہے کہ اگر زمین کے علاوہ زندگی اسی سیارے پر ممکن ہے۔ فوٹو، فائلکراچی: زمین کے بعد مریخ عا... Readmore

---

Interesting News

اے ٹی ایم استعمال کرنے والے اسے ضرور پڑھیں اور فراڈ سے بچیں

computerxtech 0 Sep 24, 2017

سائبر لٹیرے اے ٹی ایم میں تبدیلی کرکے بھی آپ کو قیمتی سرمائے سے محروم کرسکتے ہیں۔ (فوٹو: فائل)کراچی: پورے ملک میں نقد رقم نکلوانے کے لیے آٹو ٹیل... Readmore

دستک

مشتاق احمد قریشی

کیا ہم جانتے ہیں حلال کیا ہے......؟

آج کا کالم اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ہمارے بہت سے ساتھی ہر سال بڑی کوشش وخوشامد کر کے سرکاری وفد میں شامل ہو کر سرکاری حج کرتے ہیں اور بڑے فخر سے اس کا اظہار کرتے ہیں جیسے انہوں نے مفت حج نہیں کیا کوئی بڑا معرکہ سر کیا ہو اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اپنے دوستوں کو اس مفت حج کی حقیقت بتا دوں۔ جانے آج کل کیا پالیسی ہے سرکاری خرچ پر حج عمرہ کرنے والوں کے بارے میں اور اپنی بیماریوں کا سرکاری خرچ پر علاج کرانے والوں کے بارے میں، جس زمانے میں جنرل پرویز مشرف برسر اقتدار تھے اس وقت اعجاز الحق وزیر برائے حج و اوقاف تھے اور ان کے ساتھ وزیر مملکت عامر لیاقت صاحب تھے (آج کل دونوں وزارت بلکہ سیاست سے فارغ ہیں) وزارت حج کے سیکرٹری جناب وکیل صاحب تھے ایک بار مجھے اپنے ایک عزیز کے حج کوٹے کی بحالی کے سلسلے میں سیکرٹری حج جناب وکیل صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا، یقیناً وہ ایک بڑے خوش اخلاق اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے انہوں نے متعلقہ کام تو نہیں کیا۔ بڑی صفائی سے معذرت کر لی تھی لیکن مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی یہ اس زمانے کی بات ہے جب آزاد کشمیر میں زلزلے کی تباہ کاری ہو چکی تھی اور امدادی سامان لاہور کے لنڈے بازار میں بیچا جا رہا تھا ابھی چائے کا دور چل ہی رہا تھا کہ وکیل صاحب کے فون پر تاجر منشا صاحب کا فون آیا اور انہوں نے اپنے کچھ افراد کو سرکاری کوٹے پر حج کرانے کی بات کی جس پر سیکرٹری وکیل صاحب نے انہیں بہت واشگاف الفاظ میں یہ کہتے ہوئے منع کر دیا کہ جناب آپ جیسے لوگ بھی اگر زکواۃ کے سرکاری پیسوں سے لوگوں کو حج کرانے کی سفارش کریں گے تو عام لوگوں کا کیا ہوگا ماشاء اللہ آپ کی تو خود اتنی زکواۃ نکلتی ہوگی کہ درجنوں افراد کو حج وعمرہ کرا سکتے ہیں جانے دوسری طرف سے کیا کہا گیا وکیل صاحب نے شکریہ کہہ کر فون رکھ دیا، اس کے بعد میں نے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ بینک جو رقم آپ کے اور ہمارے اکاؤنٹ سے یکم رمضان کو زکواۃ کی مد میں منہا کرتی ہے وہی رقم ہمارے پاس ہوتی ہے جس سے سرکاری خرچ پر علاج معالجہ ہوتا ہے چاہے وہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک حکومت ہمیں الگ سے اس مد کے لیے کوئی فنڈ نہیں دیتی ایسے ہی سرکاری طور پر حج کرنے والوں کا سارا خرچہ اس ہی زکواۃ فنڈ سے خرچ ہوتا ہے اس پر میں نے کہا یہ تو آپ کی ذمہ داری ہے اللہ تعالیٰ کو آپ کیسے حساب دیں گے کیونکہ خرچ تو چاہے کسی کے حکم پر ہو رہا ہو کرا تو آپ رہے ہیں اس پر وہ مسکرائے اور کہنے لگے آپ یہ درست کہہ رہے ہیں ہمیں نوکری بھی تو کرنا ہے اور رہی اللہ کی بات وہ سب کچھ اچھی طرح جانتا ہے یہ کام کم از کم میں تو کبھی بھی خوش دلی سے نہیں کرتا جو حکم آتا ہے اسے میں وزیر صاحب کو بھیج دیتا ہوں یا حکم دینے والے سے کہہ دیتا ہوں کہ لکھ کر بھیجو ہر حکم وزیر صاحب کو بھیجا جاتا ہے وہی اس پر اپنا حکم صادر کرتے ہیں انہیں سب کچھ معلوم ہے۔

جو رقم بینک زکواۃ فنڈ کے نام پر اپنے اپنے کھاتے داروں سے منہا کرتے ہیں اس کا اصل مصرف تو غریب غربا ہیں جن کی بہبود و بھلائی اور فلاح پر خرچ ہونے والی رقم صاحب نصاب لوگوں پر خرچ کی جاتی ہے جو خود زکواۃ نکالنے کے اہل ہوتے ہیں زکواۃ کا درست مصرف نہیں ہو رہا حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ وطن عزیز کے طول و ارض میں پھیلی بے روزگاری، غربت، جہالت اور پسماندگی پر ان اربوں کے فنڈز کو درست استعمال کیا جا سکتا ہے ملک میں پھیلی غربت و بدحالی اگر ختم نہیں تو کم ضرور ہو سکتی ہے لیکن ہمارے حکمران اور نوکر شاہی دونوں ہی مفاد پرستوں پر محیط ہیں ہر کسی کے ذاتی مفادات اس قدر ہیں کہ انہیں حلال حرام کی تمیز ہی نہیں رہی گزشتہ دنوں اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا ہمارے ایک بہت سینئر بیوروکریٹ دوست جو آج کل ریٹائر ہو چکے ہیں انہوں نے از خود ذکر نکالا کہ لوگوں کو شرم نہیں رہی جانے ہمیں کیا ہو گیا ہے حلال و حرام کو بھول گئے بس مال آنا چاہیے چاہے کیسے بھی آئے اور کیسا ہی ہو مال تو آخر مال ہی ہوتا ہے وہ بڑے دکھ سے کہنے لگے کہ ہماری قوم کا مزاج بھی بڑا عجیب ہے ہمیں معلوم ہے کہ رشوت حرام ہے لیکن لینا ضروری ہے ہزاروں خواہشوں کو کیسے پورا کیا جا سکتا ہے حلال کی آمدنی سے تو ضروریات زندگی مشکل سے پوری ہوتی ہیں پھر سرکاری ملازم کو آخر ایک دن ریٹائرڈ بھی ہونا پڑتا ہے اس کے بعد کی زندگی کے لیے بھی تو آخر اس نوکری کے عرصے میں ہی بندوبست کرنا ہوتا ہے سب سے بڑا مسئلہ اس وقت

اپنی رہائش کا سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اگر پہلے کچھ جمع جوکڑی ہوتی ہے تو اپنا مکان بنالیا جاتا ہے ورنہ کرائے کے مکان جن کا کرایہ پنشن سے کیسے ادا کیا جاسکے گا ہاں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ساری زندگی فرشتوں کی طرح گزارتے ہیں اور آخر میں دونوں ہاتھ خالی کھڑے ہوتے ہیں بچوں کے مستقبل کی ہولناکی کی آگ انہیں مزید بوڑھا کردیتی ہے، رہی سیاست دانوں کی بات تو وہ آتے ہی سیاست میں اس لیے ہیں کہ انہیں یہاں نام ونمود اور کاروبار کے لیے سہولیات حاصل کرنا ہوتی ہیں اور میدان سیاست میں خرچ کیا ہوا سرمایہ بمع سود وصول کرنا ہوتا ہے ایمانداری سے تو اس کارخیر سے کچھ حاصل نہیں کیا جاتا جو ذرا مذہبی رجحان رکھتے ہیں چاہے وہ سیاست دان ہوں یا سرکاری ملازم گڑ تو کھاتے ہیں لیکن گلگلوں سے پرہیز کرتے ہیں ہمارے ایک ساتھی شراب کے بڑے رسیا تھے ایک بار ہم سرکاری کام سے یورپ گئے وہاں انہیں مفت کی ملتی تھی وہ خوب پیتے تھے ایک دن رات کے کھانے پر کسی دعوت میں شریک ہوئے میرے ساتھی پوری طرح ٹن تھے میں نے میز پر بیٹھتے ہی اپنے میزبان سے پوچھا کہ یہ ڈشز کس گوشت سے تیار کی گئی ہیں انہوں نے بڑے فخر سے بتایا کہ آج کی دعوت کے لیے خصوصاً سور کے گوشت کا استعمال کیا گیا ہے میں تو فوراً ہی میز سے اٹھ گیا اور کھانا کھانے سے معذرت کرلی لیکن میرے ساتھی بھی اٹھے اور ان کا حال خالی لفظ سور سنتے ہی اتنا خراب ہوا کہ انہوں نے وہیں الٹیاں (قے) کرنا شروع کردیں اور مسلسل لاحول پڑھ رہے تھے میں نے حیرت سے پوچھا بھائی آپ کو کیا ہوا آپ تو شراب بڑے دھڑلے سے پیتے ہو وہ بھی تو حرام ہے تو پھر کیا ہوا سور بھی اتنا ہی حرام ہے جتنی کہ شراب۔ نہیں یار شراب، شراب ہوتی ہے اور سور تو سور ہے بالکل حرام ہے میں نے اس وقت ان سے بحث نہیں کی اور وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگادی کیونکہ کپڑے میرے بھی ان صاحب نے خراب کردیے تھے مگر آج بھی برسوں گزرنے کے بعد بھی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی کہ شراب حرام ہونے کے باوجود جائز کیسے ہوگی اور سور کیوں حرام رہا یہ ایسی ہی بات ہے کہ رشوت کو ہم حلال سمجھ کر محنتانے کے طور پر حلال کرلیتے ہیں اور ایسے ہی کئی اور معاملات میں عوام کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کو جائز سمجھ لیتے ہیں اور بے دردی سے وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جس سے ہمیں فائدہ حاصل ہو رہا ہو چاہے اس کے بدلے کسی کی جان ہی کیوں نہ جارہی ہو ہم بحیثیت مسلمان نہ تو حقوق اللہ کا حق ادا کرتے ہیں اور نہ ہی ہم حقوق العباد پر کوئی توجہ دیتے ہیں بس ہمارے آنکھوں پر چربی چڑھی ہوتی ہے ہمیں کچھ نظر نہیں آتا سوائے اپنے مفادات کے ہمیں رشوت بھی ناجائز نظر نہیں آتی ہے سود بھی بطور منافع تجارت کا منافع نظر آتا ہے اس لیے ایسے لوگوں کے لیے شراب کباب اور لوگوں پر ہر قسم کے ظلم وزیادتی کو وہ جائز سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج تک ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکے وہیں کے وہیں چکرا رہے ہیں چین ہمارے بعد آزاد ہوا آج وہ دنیا بھر کی سپر طاقتوں سے آگے جاچکا ہے اور ہم ابھی تک محتاجگی کا کاسہ لیے دنیا کو تک رہے ہیں جبکہ اللہ نے جو ملک جو زمینیں ہمیں عطا کی ہیں وہ دنیا کی منتخب زمینوں میں سے اعلیٰ ترین زمین ہے اس کا محل وقوع اس کا حدود دار بعہ اس کی معدنیات اس کے نباتات اس کے ریگستان، میدان و دریا کاشت کاری کس چیز کی کمی ہے کمی ہے تو صرف دیانت داری کی کمی ہے ہم اپنے حکمرانوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں حالانکہ قصور تمام تر ہمارا ہے ہم ہی انہیں اپنے کندھوں پر سوار کرکے ایوان اقتدار میں اتارتے ہیں پھر رونا شروع کردیتے ہیں کہ ہائے یہ کیا ہوا ہے ہر بار ہم وہی غلطی دہراتے ہیں ہر بار خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لیتے ہیں اور پھر روتے رہتے ہیں دراصل ہم خود بدعنوان اور کرپٹ ہوچکے ہیں آسان اور تر لقمے کے عادی بن چکے ہیں ہر قسم کی جدوجہد سے بھاگتے ہیں آسانی اور آسائی کے محتاج ہیں بس اب اس کی کسر رہ گئی ہے کہ کوئی آئے اور ہمارے سامنے رکھے کھانے سے لقمہ اٹھا کر ہمارے منہ میں ڈالے ہمیں بین الاقوامی دشمنوں نے اسلام دشمنوں نے نااہل بنادیا ہے کاہل وسست بنادیا ہے ہم آنکھیں ہوتے ہوئے ان سے حقیقت دیکھنا نہیں چاہتے ہم کان ہوتے ہوئے ان سے حقیقت سننا نہیں چاہتے ہاں ابھی زبان چل رہی ہے سو وہ تو سب کی ہی چل رہی ہے سب کی خیر سب کا بھلا جو دے اس کا بھی اور جو نہ دے اس کا بھی بات ہو رہی تھی کیا اور کہاں جاپہنچی دراصل ہم ہوش وحواس ہوتے ہوئے یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ سرکاری مفت حج بظاہر تو بڑا اچھا اقدام ہے لیکن اس کے اثرات جن کی زکواۃ منہا کی گئی کیا اس کا حکومت نے کیا درست استعمال کیا ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ ہم جب اپنی جیب سے خرچ کرکے حج کا فریضہ ادا کرسکتے ہیں تو پھر غریب غربا کو ملنے والی زکواۃ پر ڈاکہ کیوں ڈالیں ایسے ہی کروڑوں کی رقم ہوتے ہوئے ہم سرکاری خرچ پر اپنا علاج کیوں کرائیں یہ سب اس لیے ہے کہ ہم سے جائز ناجائز کی تمیز چھین لی گئی ہے ہمیں حلال وحرام کا فرق بھلا دیا گیا ہے اللہ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے والا اور اپنی عبادات کو درست طریقے سے ادا کرنے والا بنادے ہمارے ایمان کی حفاظت فرمائے آمین۔

اقبال بھٹی

> حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی طرف بلائے اور وہ شخص ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی وجہ سے ایک دوسرے سے لڑے اور وہ شخص ہم میں سے نہیں عصبیت کی بناء پر مرے۔" (ابوداؤد)

عزیزان محترم...... سلامت باشد
سال دو ہزار سترہ کا آخری شمارہ حاضر خدمت ہے۔

2017ء کئی تلخ و شیریں یادوں کے ساتھ رخصت ہوا دعا ہے آنے والا سال ہمارے لیے خوشیاں ساتھ لے کر آئے ویسے بحیثیت قوم کئی مسائل منہ پھاڑے ہمارے سامنے کھڑے ہیں دنیا کی بزعم خود واحد سپر پاور امریکا ہر روز ہمیں دھمکیاں دے رہا ہے ہمارا ایک پڑوسی جو ہمارے وطن عزیز کے ایک بہتر بڑے حصہ یعنی جنت نظیر وادی کشمیر پر ستر سال سے قابض ہے اس نے وہاں کے معصوم عوام پر زندگی تنگ کر رکھی ہے ہر روز حقوق انسانی کی خلاف ورزیاں کر رہا ہے ہم پر جنگ مسلط کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے دوسری طرف ہمارا مسلمان بھائی افغانستان جس کی ہمارے عوام نے روس کے خلاف کئی سال مدد کی۔ لاکھوں افغانوں کو اب بھی اپنے ہاں پناہ دیے ہوئے ہیں آئے دن بھارت کی ایما پر ہمارے وطن میں دہشت گردی کرانے میں مصروف ہے دعا کیجیے نئے عیسوی سال میں اللہ ہمیں ان تمام فتنوں سے نجات دلائے اور ہم پاکستانیوں میں اتحاد اتفاق اور محبت پیدا کرے، آمین۔

اب آیئے اپنے تلخ و شیریں محبت ناموں کی طرف۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم مدیر اور ان کے رفقا سلام مسنون امید ہے سب کے مزاج گرامی بخیر ہوں گے رب ذوالجلال آپ سب کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے، آمین، عمدہ ٹائٹل والا نومبر کا نئے افق پیش نظر ہے، لائق صد احترام جناب مشتاق احمد قریشی صاحب جس طرح مسائل کو ہمارے سامنے لاتے ہیں یہ انہیں کو زیبا ہے اس بار بھی وہ جس موضوع کو ہمارے سامنے لائے ہیں وہ ہمارا ایک قومی المیہ ہے میرے ایک جاننے والے ایک علاقہ کی زکواۃ کمیٹی کے چیئرمین بنا دیے گئے کچھ عرصہ بعد ملے تو میں نے چیئرمین شپ کے بارے میں پوچھا تو بولے چھوڑ دی ہے میں نے کہا کیوں تو کہنے لگے کہ ایسی مدات میں زکواۃ کی رقم مانگی جاتی تھی جسے میرا ضمیر بالکل

گوارا نہیں کرتا تھا لہٰذا چیئرمین شپ پر لات ماردی خداوند کریم ہمارے قوم کو روشن ضمیر بنادے آمین۔ گفتگو کے آغاز میں تحریر کردہ حدیث پاک بہت پیاری ہے اس حدیث پاک سے معلوم ہو گیا کہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر ناجی فرقے میں شامل ہو سکتے ہیں گفتگو میں کرسی صدارت پر میرے پیارے بھائی عمر فاروق ارشد صاحب متمکن ہوئے بھائی میری طرف سے بہت بہت مبارک ہو، آپ کا خط بڑا مدلل اور پر معنی ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ پرنس افضل شاہین صاحب آپ نے مجھ ناچیز کو یاد رکھا ہوا ہے یہ آپ کا خلوص ہے رب العزت اس پر آپ کو اجر عطا فرمائے آمین۔ محترم عبدالجبار رومی نے اپنے خط کے شروع میں بڑا خوب صورت قطعہ تحریر فرمایا ہے جناب عبدالجبار صاحب اقتدار لوگوں کے دلوں میں مظلوم کشمیریوں کے درد کی بجائے اپنے مفاد بھرے ہوئے ہیں وہ دنیا کے خبیث ترین ملک بھارت کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھانے میں مصروف ہیں تبصرہ پسند فرمانے پر آپ کا احسان مند ہوں محترم مجید احمد جائی صاحب کا خط قابل غور ہے میری گفتگو میں شریک ہونے والے سب قارئین سے پرزور اپیل ہے کہ اپنے خطوط میں دوسروں کی عزت نفس کا خیال رکھا کریں ہم نئے افق کے تمام قارئین ایک قبیلہ کی صورت میں ہیں ہمیں اپنے رویے سے کسی کی دل آزاری کا باعث نہیں بننا چاہیے محترمہ صائمہ نور نے اس بار بڑا پیار خط لکھا پیاری بہنا رب کریم آپ کی میرے بارے میں کی گئی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور آپ کو بھی ہمیشہ اپنے حصار رحمت میں رکھے آمین ثم آمین۔ محمد رفاقت صاحب ایک اچھے خط کے ساتھ تشریف لائے ہیں ہمارے خطوط کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ بہت ہی پیارے بھائی ریاض بٹ صاحب کا اپنی کہانی کی طرح تبصرہ بھی خوب ہوتا ہے رب کریم ان کو صحت مند رکھے اور وہ ہمارے ذوق کی تسکین کا سامان فرماتے رہیں اس باران کی کہانی کی کمی بہت محسوس ہوئی لیکن خط کی صورت میں ان سے ملاقات ہوگئی یہی بہت ہے ایم حسن نظامی صاحب آپ کا خط بڑا ہی خوب صورت ہے آخر میں آپ کی ہمشیرہ محترمہ کے انتقال کی روح فرسا خبر پڑھ کر دلی دکھ ہوا رب لم یزل ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ محمد فرقان صاحب مختصر مگر قدرے طویل خط بھی خوب رہا بھائی اپنے من کی پوری بات لکھ دیا کریں محترم جناب طاہر قریشی صاحب حسب سابق ہمارے ایمانوں کو تازگی بخش رہے تھے سب کہانیاں اپنی اپنی جگہ لاجواب ہیں ذوق آگہی میں سب انتخاب خوب ہے خوشبوئے سخن میں شائع ہونے والا کلام ایک سے بڑھ کر ایک ہے میرے بار بار گزارش کرنے کے باوجود قارئین یا تو خوش بوئے سخن توجہ سے پڑھتے نہیں یا اس پر تبصرہ کرنا کسر شان سمجھتے ہیں یہ رویہ بدلنے کی اشد ضرورت ہے۔

محمد رفاقت...... واہ کینٹ۔ محترم جناب اقبال بھٹی صاحب السلام علیکم ماہ نومبر کا رسالہ جیسے ہی ملا پڑھنا شروع کر دیا سب سے پہلے محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کی تحریر ہی دل کو بھا گئی جس میں انہوں نے سرکاری حج پر جانے والوں کو آئینہ دکھایا ہے اور حلال حرام کے متعلق بھی بہت ہی اچھی اور دل میں اتر جانے والی تحریر ہے امید ہے کہ پڑھنے والے اس سے استفادہ اٹھائیں

گے تمام رسالہ دیکھ ڈالا مگر میری تحریر نہیں تھی خیر کوئی بات نہیں کیونکہ بہت کہانیوں کا رش ہوتا ہے آپ کے پاس اور سب کا خیال آپ رکھتے ہیں شاید میرا نمبر نہ ہی آئے آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو اس دفعہ بھی آپ نے رسالے کو بہت ہی جاندار کہانیوں سے سجایا ہے اور یہ ہی معیار رسالے کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ کر رہا ہے سلسلے وار کہانیاں بھی خوب ہیں اور دوسری کہانیاں بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں جس میں ''اندھیرے کے مسافر'' زریں قمر نے ترجمے کا حق ادا کر دیا ہے اسی طرح خالی ہاتھ، یاجوج ماجوج، محبت مجھے امر کر دو، حصار نے بہت متاثر کیا ہم جان اور مرشد بھی اپنی جگہ بہت اچھی جا رہی ہیں سب لکھنے والوں کو بہت بہت مبارک باد قبول ہو اس دفعہ خط بھی بہت اچھے تھے اپنا خط دیکھ کر پتا چلا کہ آپ یاد تو رکھتے ہیں مگر کہانیاں آپ کو یاد نہیں رہتیں، اس امید کے ساتھ کہ اگلی دفعہ میری کہانی یاد رہے گی اس کے لیے ایڈوانس شکریہ بھٹی صاحب قبول کریں اجازت خدا حافظ۔ آپ کا خیر اندیش۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم اس بار یعنی ماہ نومبر کا شمارہ 24 اکتوبر کو نگاہوں کے سامنے آیا سادہ سرورق لیے شمارہ اچھا لگا ویل ڈن اشتہارات کو دیکھتے ہوئے محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک تک پہنچے ہمیشہ کی طرح بڑا اچھا کالم ہے حرام اور حلال کے متعلق بتا رہے ہیں سرکاری خرچے پر علاج معالجہ اور حج تک کرنے والوں کے بارے میں لکھ کر بڑی دلیری کی ہے لیکن بات وہی ہے کہ ہم خود ہی ووٹ دیتے ہیں اور بعد میں واویلا کرتے ہیں بہر حال ایک اور بھی سوچنے والی بات انہوں نے لکھی ہے کہ آزاد کشمیر میں زلزلہ زدگان کے لیے آیا ہوا سامان لاہور کے لنڈے بازار میں بک رہا تھا بڑی شرمناک بات ہے ایسے لوگوں کو اپنی مدت بھولی ہوئی ہوتی ہے گفتگو تک پہنچے تو ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ پرچہ وقت پر پہنچانے کے لیے کچھ خطوط اور کہانیوں کو ڈراپ کر دیا گیا بہر حال آگے بڑھے تو پہلا خط عمر فاروق ارشد (فورٹ عباس) کا نظروں سے گزرا اور بھائی ذرا اپنے غصے کو کنٹرول کیا کریں بک اسٹال والے کو پھینٹی لگانا کوئی مسئلے کا حل نہیں تھا بہر حال شکر ہے کہ آپ کو نئے افق مل گیا اور یہ واردات ہوتے ہوتے رہ گئی شکر ہے آپ کو اب احساس ہو رہا ہے کہ میری تفتیشی کہانیاں نیا موڑ لے رہی ہے بہت شکریہ۔ پرنس افضل شاہین سرورق پر کیا خوب شعر تحریر کیا ہے شکریہ آپ کو میرا شعر زبردست لگا میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ، عبدالجبار رومی انصاری آپ کا قطعہ اور تبصرہ بہت ہی سندر ہے میرا تبصرہ اور شعر کے جواب میں شعر بھی اچھا ہے میری تفتیشی کہانی پراسرار جنگل کو پسند کرنے اور اس پر مدلل تبصرہ کرنے کا شکریہ، صائمہ نور بہن جیتی رہو پراسرار جنگل کی تعریف کا شکریہ، جس بات کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ دیہات اور گاؤں میں عام ہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کو تھانے کچہری تک لے کر جاتے ہیں ایسی باتوں کو موضوع بنانے کی جلد ہی کوشش کروں گا محمد رفاقت بھائی اس بار تو آپ نے کمال ہی کر دیا بڑا اچھا اور خوب صورت تبصرہ ہے حالانکہ یہ تبصرہ ستمبر کے شمارے پر ہے پھر بھی پرانے باسمتی چاولوں کا مزہ دے گیا میری کہانی نفس کے قیدی پسند کرنے کا شکریہ ویل ڈن، بہر حال ہر ماہ آتے رہیے آپ کے بغیر محفل سونی سونی لگتی ہے ایم

حسن نظامی کیسے ہو بھائی میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ میری تحریر کردہ تفتیشی کہانی کو اتنی پذیرائی دینے کا شکریہ، ریاض حسین قمر بھائی کیسے حال چال ہیں یقین کریں آپ کو محفل میں دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے اور آپ کا خط اور اپنے لیے حوصلہ افزائی کے الفاظ پڑھ کر تو آپ کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے آمین، کہانی حسب معمول پسند کرنے کا شکریہ

غموں کی دھوپ سے رکھے تجھے خدا محفوظ

غبار وقت سے میلا تیرا شباب نہ ہو

محمد فرقان بھائی میرا اتنا حوصلہ بڑھانے کا بہت شکریہ، جب تک سانس میں سانس اور ہاتھوں میں لکھنے کی سکت باقی ہے ان شاء اللہ تفتیشی کہانیاں آپ بہن بھائیوں کی نذر کرتا رہوں گا مجید احمد جائی بھائی آپ کا خط بھی ہمیشہ کی طرح خوب صورت لفظوں سے سجا ہوا ہے۔ پراسرار جنگل کہانی پسند کرنے کا شکریہ، پچھلی کہانی قفس کے قیدی کا یہ دوسرا اور آخری حصہ تھا امید ہے اب آپ کی تشفی ہو گئی ہوگی میں نے اپنے کافی ماہ پہلے لکھے ہوئے خط میں تحریر کیا تھا کہ جس میں آپ جیسے دوستوں کے نمبر تھے اس سم والا موبائل چوری ہو گیا تھا اور میں نے حفظ ماتقدم کے طور وہ سم بند کرا دی ہے۔ اب آپ کا کوئی بھی موبائل نمبر میرے پاس نہیں ہے ہو سکے تو میرے نئے نمبر **0313-8807945** پر اپنا نمبر بھیج دیں اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف زریں قمر کی اندھیرے کے مسافر ایک زبردست کہانی ہے زریں قمر کو کہانی اردو کے قالب میں ڈھالنے کا فن خوب آتا ہے ایم زیڈ شیخ کی کہانی یاجوج ماجوج بہت پسند آئی ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی ویل ڈن شیخ صاحب اسی طرح آتے رہیں اور ہمارے لبوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلاتے رہیں، کیونکہ افراتفری کے اس دور میں ایسی کہانیاں غنیمت ہیں فلک شیر ملک صاحب آپ کی تحریر کردہ کہانی خالی ہاتھ ایک اچھی اور سسپنس سے بھرپور کہانی ہے جب زہر کا پتا چل گیا تو تفتیش کچھ آسان ہو گئی ہے بہرحال یہ بھی رقابت کا معاملہ تھا کیتھرین نے سب کچھ ٹرسٹ کے نام لگا کر اپنے آپ کو امر کر لیا، بحیرہ نیلم کی محبت مجھے امر کر دو بھی ایک اچھی کہانی ہے فن پارے سب کے سب تعریف کے قابل ہیں کسی ایک کی زیادہ تعریف کرنا زیادتی ہوگی، خوش بو سخن میں غلام فرید گوہر، بسمل سیماب، پرنس افضل شاہین، ظہور عالم صائم، عبدالجبار رومی، ایم حسن نظامی نمبر لے گئے باقی انتخاب بھی اچھا ہے ذوق آگہی میں ایم حسن نظامی، حسین خواجہ، مہر پرویز احمد دولو اور احسان سحر کا انتخاب خوب تر ہے باقی نے بھی خوب انتخاب بھیجا سلسلے وار ناول ابھی نہیں پڑھ سکا، اب اجازت یار زندہ صحبت باقی۔

فرح احسان...... لاہور۔ جناب اقبال بھٹی صاحب سلام عرض، نیا افق ملا کوئی صاحب اچھل اچھل کر دستگیر شہزاد کی کہانی کسی دوسرے رسالے میں شائع ہونے پر یوں انکشاف کر رہے تھے جیسے انہوں نے کشمیر فتح کر لیا ہو دستگیر شہزاد پاکستان کے چند معدودے فنکاروں میں سے ایک ہیں جو اردو ادب کے مستقبل کے امین ہیں اور جن کے بارے میں نہایت اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا فن مسلسل ارتقا پذیر رہے گا اور وہ اردو ادب کی فنی روایت کو نہ صرف آگے بڑھائیں گے بلکہ ان

روایات میں خوب صورت اضافہ بھی کریں گے خاص طور سے دستگیر شہزاد کے سلسلے میں یہ دعویٰ اس لیے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جدید مرکب پر کامیاب تجربے کیے ہیں ان کے ادب کا یہی وہ رخ ہے جس کی وجہ سے انہوں نے کم عمری میں ادب کی صف اول میں جگہ حاصل کر لی ہے، دستگیر شہزاد فن برائے حیات کے ترجمان ہیں مگر انہوں نے اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ وہ اول و آخر فنکار ہیں۔ میری دلی دعائیں موصوف کے ساتھ ہیں خدا کرے یہ ایسے ہی لکھتا رہے اور ہم پڑھتے رہیں۔

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ بڑی آرزو تھی ملاقات کی پھولوں کی طرح ہمیشہ مسکراتے رہو، جناب مشتاق احمد قریشی صاحب۔ السلام علیکم خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں چند دن ہوئے شہر جانے کا اتفاق ہوا شدید گرمی کا عالم تھا ضروری کاموں سے فارغ ہوا تو بک اسٹال پر پہنچا تو نئے افق سے ملاقات ہوگئی سرورق بڑے کمال کا تھا اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوگئی میں اس کا بہت پرانا قاری ہوں اس کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بہترین ہیں یہ ایک معیاری پرچہ ہے اس مہنگائی کے دور میں ایسا دیدہ زیب میگزین نکالنا آپ ہی کا کام ہے خدا آپ کو نیک مقصد میں کامیاب کرے غزل شائع کرنے کا شکریہ آپ کا خلوص اور نظر عنایت کی بدولت ہی بندہ آپ کو خط تحریر کرتا ہے فیصل آباد میں کبھی کبھار ہی نئے افق کا پرچہ ملتا ہے اس کا کوئی مناسب حل کریں ہر بک اسٹال پر اس کا ہونا ضروری ہے تا کہ قارئین اس سے استفادہ کریں قارئین کی دعاؤں اور آپ کی انتھک محنت سے پرچہ کامیابی سے ہمکنار ہے بے شک آپ ہم سے کافی دور رہتے ہیں مگر خط سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے کافی عرصہ سے آپ کا ہم پر کرم ہے اس کے لیے میں مشکور ہوں آئندہ بھی آپ تعاون کریں گے اقرا دستک گفتگو غزلیں اور دیگر تمام کہانیاں افسانے پہلے سے بہتر ہیں موسم آہستہ آہستہ تبدیل ہوتا جاتا ہے بے روزگاری اور مہنگائی نے انسان کی زندگی دشوار کر دی ہے چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں قریبی پرچے میں جگہ دیں بشرط آپ کا ہمارے ساتھ تعاون ہو کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ کو خط تحریر کروں آج بڑی مشکل سے وقت ہے زندگی میں اور بھی کام ہیں تیری محبت کے سوا خدا آپ کی عمر دراز کرے صحت دے تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے سدا آپ کی زندگی میں رنگ برنگے پھول مہکتے رہیں صبح کا وقت ہے ہر طرف پرسکون ماحول ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور کوئی بات نہیں جو تحریر کی جائے زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی اس کے ساتھ ہی اجازت دیں نیک تمناؤں کے ساتھ۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم! گھاس پر شبنم گرنا شروع ہوگئی ہے سورج غروب ہوتے وقت فضا میں ہلکی سی دھند کی آمد، سرسوں کے پودوں پر پڑنے والی نارنجی شعاعیں مجھے کہیں دور بہت دور لے جاتی ہیں جہاں میرے گاؤں کی پگڈنڈی کے کنارے پر قائم شہتوت کے درختوں کی نرم ٹہنیوں پر میرے بچپن اور لڑکپن کی شوریدہ یادیں بسیرا کیے بیٹھی ہیں ایسی دیوانی رت میں نئے افق کا دیدار ہو جائے تو گویا عاشقوں کو قرار مل جائے سرورق نارمل سا تھا یعنی کہ زیادہ حسین و

نمیل نہیں اور زیادہ قلیل بھی نہیں حسینہ کی ناگن زلفوں میں سرسوں کے دو پھول ٹانک دیے جاتے تو کمال ہوتا مولا خیر کرے قریشی صاحب کا آرٹیکل دل سے پڑھے جانے کی چیز ہے یہ حج کوٹہ وغیرہ میں ہونے والے گھپلے تو بڑے ہی چھوٹے معاملات ہیں یہاں کیا کچھ ہو گیا کتنا کچھ ہو گیا آپ اور مجھ سمیت ہر باشعور پاکستانی جانتا ہے لیکن سسٹم کو بچانے کے چکر میں سبھی کچھ ہوتا دیکھے جارہے ہیں وہ لکھ پتی حاجی صاحب جو زکوٰۃ کے حج کوٹہ پر بیت اللہ کے پھیرے لے کر پھولا نہیں سماتا وہ اگلے دن حویلی کے تھڑے پر چار بندوں کے درمیان بیٹھ کر وطن عزیز میں بڑھتی ہوئی کرپشن، منافقت اور لوٹ مار پر سیر حاصل گفتگو فرما رہا ہوتا ہے جب میں خود منافق ہوں تو پھر اپنے اردگرد بسنے والوں سے یہ امید کیسے رکھ سکتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ شفاف ہوں گے بہرحال گفتگو میں داخل ہوئے تو خود کو کرسی صدارت پر متمکن دیکھ کر اپنی پیٹھ ٹھونکی اور دانشورانہ کروفر کے ساتھ دوست احباب کے تبصروں کا مطالعہ شروع کیا یار ویسے کمال ہے بندہ ایک دفعہ غیر حاضر ہو جائے تو سبھی ہمدم طوطا چشمی کی زندہ مثال بن جاتے ہیں شالا، جتنا بھی میٹھا اور یاران یار بن جاؤ لوگوں نے وہی کرنا ہے جو صاحباں نے مرزا کے ساتھ کیا تھا ریاض قمر صاحب اس دفعہ آپ کا تبصرہ کافی مختصر تھا حضور آپ طویل لکھتے ہوئے اچھے لگتے ہو، ریاض بٹ صاحب نے بھی پنکچر انٹری دی جناب آپ بڑے رائٹر ہیں تبصرے میں جان ڈالا کریں مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آپ کو پورے رسالے میں کبھی کوئی تنقیدی پوائنٹ نظر نہیں آیا آپ کو جب بھی دیکھا ہمیشہ تعریفوں کے پل تعمیر کرتے دیکھا اب آپ فرمائیں گے کہ آپ محبتیں تقسیم کرتے ہیں محبت ضرور تقسیم کیجیے لیکن حقیقت کو سامنے رکھ کر اگر آپ کا دل کہہ رہا ہے کہ فلاں کہانی فضول ہے لیکن آپ لکھ رہے ہیں کہ جی کہانی کمال تھی سرکار ایسی محبت کو چاہ بابل میں پھینکیں باقی آپ نے جس مدلل انداز میں اپنی کہانی پر اعتراضات کے جواب دیے وہ اپنی مثال آپ ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ شمارے کی خاص فارس مغل صاحب کا ناول ہے، ان سے غائبانہ تعارف تھا اور کچھ تحریریں پڑھ رکھی تھیں طویل ناول پڑھنے کا موقع پہلی بار ملا ہے جس کے لیے نئے افق کا شکر گزار ہوں ناول کی ابتدائی اٹھان بتا رہی ہے کہ ایک شاہکار تخلیق پائے گا کرداروں کا باہمی ربط اور واقعات کا تسلسل بہت ہی عمدہ ہے امید ہے کہ آگے چل کر مزید نکھار آئے گا مریم جہانگیر کا ناول حصار مکمل ہو گا اختتام نہایت شاندار تھا مجھے خاص طور پر خوشگوار انجام، یعنی ہیپی اینڈ والے ناولز اچھے لگتے ہیں اس طرح گویا مریم صاحبہ نے ناول کو ہنستا مسکراتا اختتام دے کر ہمارا دل جیت لیا لیکن واللہ چھپکلیوں والی بات سے سخت کوفت ہوئی اس دفعہ کی ساری قسط پر تقریباً چھپکلیوں کی حکمرانی تھی درمیان میں کافی ساری چھپکلیاں اور آخر میں اکلوتی چھپکلی کیا یہ بہت ہی ضروری تھا اتنے رومانٹک اختتام پر جیسے ہی چھپکلی کی آمد ہوئی سارے رومانس کا جنازہ نکل گیا لگتا ہے مریم صاحبہ نے چھپکلی سے اپنی کسی پرانی دشمنی کا بدلہ لیا ہے دیگر کہانیوں میں فلک شیر صاحب مغرب سے خوب صورت انتخاب لے کر آئے خالی ہاتھ، سسپنس اور رومانس سے بھرپور کہانی تھی اس طرح کی کہانیاں ہر بار شامل کیا کریں زریں قمر ہمیشہ کی طرح بہترین ترجمے کے ساتھ تشریف لائیں انگلش لٹریچر کو اردو کے قالب

میں ڈھالنا بلاشبہ ایک مشکل اور محنت آزما کام ہے نئے افق کے لیے واحد ہستی زرین قمر ہی ہیں جو یہ مشکل خدمت سرانجام دے رہی ہیں اللہ انہیں مزید ہمت و طاقت عطا فرمائے، مختصر کہانیاں اس مرتبہ کم تھیں جس کی وجہ سے آپ نے گفتگو میں بتا دی ہے چلیں جی کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے اس بہانے سلسلے وار ناولز کے کچھ صفحات زیادہ پڑھنے کو مل گئے مرشد کے خدوخال مکمل طور پر واضح ہو چکے ہیں اور کہانی پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی ہے ذاتی طور پر مجھے اس ناول میں سب سے زیادہ جو چیز پسند آئی ہے وہ مرشد کا اپنی ماں کے ساتھ پیار ہے خوب صورت جذبوں سے گندھی ایک دلگداز داستان، ویلڈن ساحر صاحب خوش بوئے سخن میں اس مرتبہ خلاف توقع نئے لوگوں نے بڑی کامیاب اور دل کو چھو لینے والی انٹری ماری ہے انڈیا سے بکل سیماب نے کمال کر دیا مجھے لگا گویا اقبالؒ کا کلام پڑھ رہا ہوں جناب آپ کے جذبات اور غیرت ایمانی کو سلام اس کے علاوہ حیدرآباد سے فرح بھٹو صاحبہ نے بھی بہترین شاعری تخلیق کی ہے اگر چہ کچھ کچا پن ضرور ہے لیکن جذبات و احساسات کا اظہار خوب کیا ہے عبدالجبار رومی صاحب منفرد کلام کے ساتھ حاضر ہوئے ان کی نظم کا آخری شعر دل کو چھو گیا یقیناً یہ ایک منفرد طرز کی نظم ہے سینئر شاعر ریاض قمر صاحب کو سب سے پہلے پڑھتا ہوں اس دفعہ غزل اچھی تھی لیکن شاید مجھے متاثر نہیں کر سکی بہرحال اپنی اپنی پسند ہوتی ہے حالانکہ میں ان کا کلام اکثر و بیشتر نئے افق کے پرانے شماروں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر پڑھتا رہتا ہوں ہوسکتا ہے یہ میری کج نظری ہو بہرحال اس دفعہ وہ مجھے متاثر نہیں کر سکے، ایم حسن نظامی بھائی آپ کی محنت قابل داد ہے لیکن یار ایک دفعہ اپنی غزل کو دوبارہ پڑھ کر دیکھیے یقیناً آپ کو خود ہی بہت ساری خامیوں کا اندازہ ہو جائے گا امید ہے کہ آئندہ آپ کے کلام میں بہتری دیکھنے کو ملے گی فریدہ یوسفزئی صاحبہ یقین کیجیے اگر میں نے کبھی کوئی فلم بنائی تو آپ کی نظم کو بطور ٹائٹل سانگ شامل کروں گا ارے پتا نہیں کتنا کچھ یاد کرا دیا آپ نے بہرحال برسات تو خیر نہیں تھی، لیکن پھر بھی میں نے پکوڑے بنوا کر چائے کے ساتھ نوش فرمانے میں کوتاہی نہیں کی اللہ آپ کو جزا دے امید ہے کہ آئندہ سموسے اور چٹنی کے ساتھ نظم لے کر حاضر ہوں گی نئے افق کی تمام ٹیم اور قارئین کو سلام، دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف۔ سلام عقیدت امید ہے آپ اور پوری ٹیم نئے افق کے ساتھ ساتھ رائٹر اور قارئین ساتھی سبھی خیر و عافیت سے ہوں گے نومبر کا میگزین خوب صورت سرورق کے ساتھ ہاتھوں میں ہے اچھا معیاری اور منفرد پرچہ ہے جو روز بروز نکھار اور بامعنی تحریروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو کہ آپ اور نئے افق کے واسطہ سبھی کی یکراں محنتوں اور کوششوں کا مرہون منت ہے یہ واحد ادبی پلیٹ فارم ہے جو سبھی ماہناموں سے پہلے اور اپنے مخصوص وقت پہ ہمارے پاس پہنچتا ہے اس کے اک اک لفظ، فقروں اور محاوروں میں بے حد چاشنی پائی جاتی ہے جو مہینہ بھر ہمیں انتظار کی سلیب پر لٹکائے رکھتے ہیں۔ آپ کی دستک اور لکھاریوں کی محبتوں، الفتوں، بھرے تجزیے اور سبھی ساتھیوں کا ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا ہر ماہ بے پناہ محبتوں کی طرف گامزن رہتا ہے، طاہر قریشی صاحب کے مدلل الفاظ کی روشنی میں صفات کریمی انسان کے سبھی

جذبوں کو معطر اور شاد مان کر دیتے ہیں تو مشتاق احمد قریشی حرام و حلال پر سچی اور کھری گفتگو سبھی کے کانوں کی کھڑکیاں کھولنے کے لیے کافی ثابت ہوتی ہیں۔ گفتگو میں بھٹی صاحب کی الفتوں بھری باتیں اچھی لگیں عمر فاروق ارشد، پرنس جی، علی اصغر انصاری، عبدالجبار رومی، صائمہ نور، محمد رفاقت، ریاض بٹ، ریاض حسین قمر اور محمد آفاق سبھی اپنے اپنے تاثرات اور دکھ سکھ منفرد اور معیاری الفاظ کی روشنی میں شیئر کر رہے تھے۔ جی مجھے یاد فرمانے اور میری نگارشات پسند فرمانے کا بے حد شکریہ، پرچے کی پہلی تحریر زریں قمر صاحبہ کے حصہ میں آئی انہوں نے ڈی میل کے ناول کی تلخیص اپنے تعلیمی تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے منفرد انداز سے کی جو کہ عمدہ موضوع کی عکاس پائی، فلک شیر ملک بھی اپنے منفرد عنوان کی معیاری انداز تحریر سے نبھاتے پائے عشنا کوثر سردار کا ناول بھی اچھوتے موڑ پر پایا نواب صاحب کے کردار پر حیرت ہوئی ایم زیڈ شیخ اور ایک شگفتہ اور ہنستی مسکراتی تحریر لائے جو آخر پر اچھا تاثر چھوڑ گئی۔ ہم جان بھئی فارس مغل تو چھپے رستم نکلے انہوں نے پہلی ہی کڑی میں اپنا گرویدہ بنالیا زمین کے کردار سے دلی ہمدردی ہوئی۔ بحیرہ نیلم محبتوں پر رقم طراز تھیں تو حصار کی آخری کڑی بھی الفتوں کی امین ٹھہری فن پارے کے سبھی لکھاری اور دوسرے سے سبقت میں تھے جسے ذوق آ گہی کے اقتباسات خوب شوئے سخن کی لازوال شاعری اور کتر نیں بے حد اصلاحی پائیں۔ ساحر جمیل سید خراماں خراماں سوئے مزل گامزن پائے اور مرشد بھی نئے سفر پر محو سفر نظر نواز ہوئے۔ ساتھیوں سال رواں کا آخری ماہ آ چکا ہے گزرتے ہوئے اس سال نے کتنے چہروں کے من میں خواہشوں اور سپنوں کے گل کھلائے تو کئی ایک غموں کی عمیق گہرائیوں میں گھر کر بھی کچھ یار بیٹھے کسی پہ مسرتوں کی رم جھم برسی تو کوئی ایک خوشی کو بھی ترس گیا کسی کو عرصے بعد اپنوں کا قرب نصیب ہوا تو کوئی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنوں سے بچھڑ گیا اور یہ سال اپنے دامن میں سبھی کچھ سما کر ہمیں نئے سال کی بانہوں میں دیتے گزر گیا۔ وقت پانی اور تیر منہ سے نکلی بات کبھی پلٹ کر نہیں لوٹا کرتے۔

آؤ نفریں بھلا کر محبتیں بانٹیں
آؤ رنجشیں بھلا کر دوستیاں کرلیں
آؤ پلکوں پہ رکھے موتیوں کو جھٹک کر
پھر سے کوئی خواب بنیں
آؤ گزرے ایام کی تلخیوں کو بھلا کر
اس دسمبر کو الوداع کریں
آؤ نئے سال کی آمد پر پھر سے
اپنے حوصلے آزمائیں
الوداع سال 2017ء الوداع

عبدالجبار رومی انصاری......

سرخ ہونٹوں سے کوئی بات ہے مچلنے والی

ذرا دیکھ نینوں کو میرے میں ہوں کچھ کہنے والی
گھنی زلفیں اور گالوں پہ لالی تو ہے حسن ادا
ذرا دیکھ اس بزم میں ہوں میں مہکنے والی

خوب صورت سرورق کی دوشیزہ کے ہونٹوں پہ کیا بات مچلنے والی ہے یہ تو نئے افق کے اندر جا کے پتا چلے گا کہ یہ کون کون سی داستان لے کے آیا ہے دستک دروازے پر ہو یا کسی کے دل پر یا معاشرے کو جگانے کے لیے دستک چونکا دیتی ہے اور جھنجوڑ ڈالتی ہے، کیا ہم جانتے ہیں حلال کیا ہے جانتے تو سبھی ہیں لیکن وہی بات حرام کو حلال سمجھ کر اپنے مصرف میں لے آؤ چاہے دوسروں کا استحصال ہی ہو جائے خوف خدا جو نہیں ہے لوگ آخرت کو بھول جاتے ہیں جب حلال و حرام بارے پوچھ گچھ ہوگی کہ مال کیسے کمایا اور کیسے خرچ کیا انکل مشتاق احمد قریشی زبردست ادار یہ لکھا ہے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایات دے گفتگو کا آغاز سب سے اچھا ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں امت کو حضور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی طرز پہ زندگی گزارنے کی ترغیب دی گئی ہے اور یہی سب سے بہتر زندگی ہے اور فرقہ بندی سے دور رہنا چاہیے۔ موسم بدل رہا ہے ویسے بھی گرمیوں کا دورانیہ بڑھ رہا ہے اور سردیاں آتی ہیں تو جلدی ختم بھی ہو جاتی ہیں یہ تو حضرت انسان کی وجہ سے زمین کا ماحول ہی ایسے بدل رہا ہے کہ گرمی بتدریج بڑھ رہی ہے خیر عمر فاروق ارشد، پرنس افضل شاہین، محمد رفاقت اور محمد فرقان نے عمدہ خط لکھے مجید احمد جائی نے بھی خوب تبصرہ کیا بھائی میں تو حاضر ہوں بس ایک آدھ دفعہ انتہائی مصروفیت کے باعث حاضر نہیں ہو سکا تھا صائمہ نور نے بھی اچھا لکھا بالکل گروپ بندی اور ذاتی تنقید سے تبصرہ نگاروں کو دور ہی رہنا چاہیے ریاض بٹ نے بھی تسلی بخش خط لکھا اور اپنی کہانی کی وضاحت بھی کر دی بہت اچھا لگا انکل حسن نظامی اور ریاض حسین قمر کے تبصرے بھی بہترین ہے ذوق آگہی سے ایس حبیب خان، نورین ظفر اور بلی شاہد کے مراسلے عمدہ رہے جب کہ خوش بوئے سخن سے بسمل سیماب، مریم ناز اور عامر خان چاند کا کلام اچھا لگا ایم زیڈ شیخ کی شرارتوں بھری تحریر یاجوج ماجوج اچھی رہی آپی اور تابی کی شرارتوں نے دو پریمیوں کو ملا دیا لیکن بابا جی کو ناک کے رستے ساری نسوار سونگھا دی کچھ عجیب لگا کیونکہ نسوار کی پہلی مقدار پر ہی اسے چھینکیں شروع ہو جاتا تھی مگر وہ سوتے رہے حالات کی ہولناکیوں سے گزرتے سمنتھا کو بہت کچھ سہنا پڑا فیملی کا قتل ہوا اسپتال سے نکال دیا گیا خود کی زندگی کو بھی دہشت انگیز خطرات کا سامنا کرنا پڑا حتی کہ مرکس نے بھی سمنتھا کو بچاتے اپنی جان دے دی اور اسے دھاکہ خیز چپ سے آزاد کرایا آخر میں جو کہ دوست بل نے پادری کے کردار سے سمنتھا کے لیے دعا کی اور اسے اس کے محبوب جو سے ملا دیا اندھیرے کے مسافر کو آخر صبح کا اجالا نصیب ہو ہی گیا، جن معاملوں میں آنکھیں کھلی رکھنی چاہیے وہیں بند رکھتے ہیں روزی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا بن ماں کے اس کا خیال نہ رکھا گیا تو وہ عجیب چھپکلی نما مخلوق کے حصار چلی گئی اور ایسے ہی حالات کی ماری روزی نے جان دے دی مجھے آپ سے محبت ہے ماہ روز حیدر کو چھوڑنے کے بعد دوبارہ واپس آئی تو پھر حیدر کے حصار میں آ گئی خوب صورت سبق آموز نصیحتوں سے پر محبتوں سے گندھی لاجواب

کہانی حصار بہت پسند آئی، مرشد کو حجاب میں جو انجانی شے نظر آ رہی ہے وہ خود اس بارے میں بے بس ہے اور لگتا ہے اب چوہدریوں اور مرشد میں گھمسان کا رن پڑنے والا ہے کیونکہ یہاں حجاب کی حفاظت کا مسئلہ آڑے آئے گا اور اب مرشد نے بھی اپنی ماں کے ساتھ اسے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے عمدہ کہانی ایک دم زبردست جا رہی، ویرا کو اس کا انجانا ہمجان ملا جس کا وہ انتظار کرتی رہی تھی مگر وہ اپنی مسکراہٹ دے کر راہی ملک عدم ہوا دوسرے ماجد نے اس کا دل ہی توڑ دیا اور عشق کی پہلی بارش میں تو بے چاری محبت کو بے شمار طعنے سننے کو ملے کہ یہ محبت وحبت کچھ نہیں ہے پھر نہ جانے محبت کہاں سانس لیتی ہے کہاں خوابیدہ رہتی ہے یہ سب جاننے کے لیے ابھی ہمجان بہت باقی ہے لفظوں کے طنز تیروں اور خوب صورت شوخیوں کے ساتھ ہمجان بہت اچھی لگی، ایک سو سولہ چاند کی راتوں میں پاکستان بن گیا اور آپس میں رشتے ناطے جوڑنے کی داغ بیل شروع ہوگئی پتا نہیں کیوں لگ رہا تھا جیسے یہ قسط آگے پیچھے ہوگئی ہو محبت مجھے امر کردو اور پھر زمین کی محبت امر ہوگئی مجموعی طور پر نومبر کا نئے افق محبت کے نام بنتا ہے اس دفعہ زبردست رہا اور نومبر کی 20 تاریخ کو میری سالگرہ ہوتی ہے۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

الخالق

(عدم سے وجود میں لانے والا)

خالق کے معنی ہیں پیدا کرنے والا' بنانے والا' مسلسل اشیاء کو تخلیق کرنے والا' خلق سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے۔ آفرینش' پیدائش' بنانا' پیدا کرنا' اصل میں ''خلق'' کے معنی تقدیر' مستقیم یعنی صحیح انداز ٹھہرانے کے ہیں اور اس کا استعمال کسی چیز کے نمونے اور پیروی کے ایجاد کرنے کے بھی ہوتا ہے۔ ایک شے کو دوسری شے سے بنانے اور ایجاد کرنے کے لئے بھی مستعمل ہے۔ خلق مخصوص صفتِ الٰہی ہے اور اگر کہیں عام لوگوں کے لئے استعمال ہوتی ہے تو صرف دو معنوں میں ہوتی ہے۔ ایک تو اندازہ کرنے کے لئے اور دوسرے جھوٹ گھڑنے کے لئے۔ امام راغب اصفہانی کا قول ہے کہ ''اسی بنا پر بہت لوگ قرآن کے متعلق خلق کا لفظ استعمال کرنے سے رک گئے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حضرت حسن بصریؒ مجاہد' قتادہ' سعید بن المسیب اور ضحاک رحمہم اللہ نے ''خلق اللہ'' کی تفسیر' دین اللہ' سے کی ہے یعنی دین کی جو وضع اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے اسے بدل کر حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دینا۔ بعض کے نزدیک خلق اللہ سے مراد قدرِ الٰہی لیا ہے اور بعض نے احکامِ ملت اور بعض نے تبدیلِ خلقت لیا ہے۔ خلق کا استعمال بمعنی مخلوق بھی ہوتا ہے۔

ترجمہ:۔ اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔ (الزمر۔۶۲)

اللہ تعالیٰ ہی ہر ہر چیز کا خالق ہے' وہی مالک بھی ہے' وہ جس طرح چاہے' تصرف اور تدبیر کرتا ہے' ہر ہر چیز اسی ذاتِ عالی کے ماتحت اور زیرِ تصرف ہے' کسی کو کسی بھی طرح سرتابی یا انکار کی مجال نہیں ہے' وہی خالق و مالک ہر چیز کی حفاظت و نگہبانی کرنے والا ہے اور ہر چیز کی تدبیر کرنے والا ہے' وہ اکیلا بغیر کسی شرکت کے سب کی حفاظت اور تدبیر کرتا ہے۔

ترجمہ:۔ کہہ دیجئے کہ صرف اللہ ہی تمام چیزوں کا خالق ہے' وہ اکیلا ہے' اور زبردست غالب ہے۔ (الرعد۔۱۶)

آیتِ مبارکہ میں تین صفاتِ الٰہی کا ذکر ہے پہلی خالق' دوسری واحد اور تیسری قہار' یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات تخلیق میں بھی واحد و یکتا ہے اور غلبے اور زبردستی زور آوری میں بھی وہی یکتا ہے۔ قہار کے

معنی انتہائی درجے کا غالب حکمران' عقیدہ توحید اور شرک کو بھی آیت میں سمیٹ لیا گیا ہے۔آسمانوں اور زمین کی تمام چیز اللہ تعالیٰ کی ہی خلق ہیں' وہ سب کی سب اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہیں' خواہ کوئی چیز خوشی سے سجدہ کرے (انسان) یا مجبوری سے۔آیات میں اللہ کی قہاریت کا ذکر کر کے سلسلہ توحید کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ایسا حکمران ہے جو غایت درجہ کا غالب اور گرفت والا ہے۔پوری کائنات کا ایک ایک ذرّہ اس کے قبضہ قدرت میں ہے' اس کے سامنے سجدہ ریز ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کرنے میں مصروف ہیں۔ایک انسان ہی ایسا اندھا اور پتھر دل ہے کہ وہ شیطان کے بہکائے میں آ کر اللہ کا خوف محسوس نہیں کرتا اور اپنے ارادے کی قوت کو غلط استعمال کر کے۔اپنی تباہی و بربادی کا خود اہتمام کرتا ہے۔

ترجمہ:۔یہی اللہ ہے تم سب کا پروردگار' ہر چیز کا خالق اس کے سوا کوئی معبود نہیں پھر تم کہاں پھرے جاتے ہو۔(المومن۔۶۲)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے جو تمہاری ہر چیز کا' خود تمہارا خالق ہے اور جو نہایت ہی مہربان پروردگار یعنی پرورش و نگہبانی کرنے والا ہے' ہر ہر طرح سے تمہاری حفاظت و نگہداشت کر رہا ہے اور تمام تر فوائد و منافع اللہ تعالیٰ ہی پہنچا رہا ہے۔تمام کائنات پر اسی کی حکمرانی و اقتدار ہے وہ قادرِ مطلق ہے دنیا کا تمام الٹ پھیر رات و دن کا ہونا تمام مخلوقاتِ ارضی کے لئے نافع ہونا ہی اس بات کی واضح اور صریح دلیل ہے کہ وہی ایک اللہ ان تمام چیزوں کا خالق اور مالک ہے' اسی ذاتِ عالی نے یہ کائنات کا عظیم الشان نظام کمال درجہ حکمت و دانائی کے ساتھ اس طرح بنایا ہے کہ وہ اس کی پیدا کردہ تمام مخلوقات کے لئے نافع ہو' جس طرح اللہ کے اطاعت گزار فرمانبردار اہلِ ایمان ان تمام چیزوں سے نفع و راحت حاصل کرتے ہیں اسی طرح اس کے باغی اور منحرف بھی حاصل کرتے ہیں اور ذرا نہیں سمجھتے کہ جو راحتیں' آسائشیں انہیں میسر ہیں وہ اگر روک لی جائیں تو ان کا کیا حشر ہو' وہ تمام تر نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شب و روز اللہ کی نافرمانی کرتے چلے جاتے ہیں۔اگر ذرا سی بھی عقل سے کام لیں اور سوچ سمجھ لیں تو یہ حقیقت ان کے سامنے روشن ہو جائے گی کہ ان کی تمام تر اطاعت و بندگی' عبادات کا مستحق صرف ایک اکیلے اللہ تعالیٰ کی ہی ذاتِ عالی ہے جس کے پاس مرنے کے بعد حاضر ہونا ہی ہو گا۔

فوائد:۔جو شخص اسم خالق ہمیشہ ورد کرتا رہے' اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے جو اس کے لئے قیامت تک عبادت میں مشغول رہے گا اور پڑھنے والے کا چہرہ نورانی ہو جائے گا اور کوئی شخص سات دن تک متواتر اسم شریف کو سو بار پڑھے گا تو وہ تمام زمینی آفات سے محفوظ رہے گا۔ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبر میں نہ رہنے دے گا بلکہ وہ ریاض قدس میں لے جائے گا۔(اسماء الحسنیٰ' از جلال الدین سیوطیؒ)

●

ہرکارہ موت

زرین قمر

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جسے جنسی تشدد پسندوں نے اس کے خاندان سے الگ کردیا تھا اور وہ یادداشت کھو بیٹھی تھی پھر چودہ سال بعد حالات اسے ایسے موڑ پر لے آئے جہاں اسے پھرانہی حالات کا سامنا تھا اس بار مجرم گلاب کے پھول تحفے میں دیتا تھا جو اس بات کا اعلان ہوتے تھے کہ وہ موت کا ہرکارہ ہیں اسے بھی یہ پھول مل رہے تھے اور وہ بہت خوفزدہ تھی پھر وہ مجرم اس کے سامنے آ کھڑا ہوا مگر اس بار جیت اس کا مقدر تھی۔

زرین قمر کے قلم سے قارئین افق کیلئے بطور خاص

کھڑکی کے پٹ کی روح میں اتر جانے والی پراسرار سی چرچراہٹ اور سیٹیاں بجاتی ہوا سے کھڑکی کے پردے کی پھڑ پھڑاہٹ نے کرن کو چونکا دیا تھا' کمرے میں بالکل اندھیرا تھا' لائٹ پھر چلی گئی تھی یہ تو کراچی کے شب وروز کا عذاب بن گیا تھا ہر چند گھنٹوں بعد لائٹ غائب ہوجاتی تھی اس نے اندھیرے کمرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اسے لگا جیسے کوئی غیر مانوس ہستی کمرے میں گھس آئی ہو' جس کے سائے اسے ہر طرف حرکت کرتے نظر آرہے ہوں پھر اچانک اسے یوں لگا جیسے پڑوس سے آنے والی مدھم روشنی میں کھڑکی کے باہر کسی کا سر نظر آیا ہو پھر جسم آہستہ آہستہ اوپر اٹھا تھا اور پوری کھڑکی سے اس کے آدھے جسم کا سایہ اندر جھانک رہا تھا۔ اس کی سانس رک سی گئی اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک ٹھنڈی تیز لہر دوڑ گئی اس کا دل چاہا کہ وہ زور سے چیخے...... بھاگو بھاگو...... لیکن اس کی چیخ اس کے گلے میں گھٹ کر رہ گئی وہ دعائیں مانگ رہی تھی کہ یہ اس کا وہم ہو خوف کی شدت سے وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرسکتی تھی۔

اچانک ہوا سے ایک بار پھر کھڑکی کا پردہ ہلا اور اس بار وہ سایہ ایک مدھم سی آواز کے ساتھ کمرے میں کود گیا اور اس نے سوچا کہ جب اس نے کھڑکی کھلی دیکھی تھی تو اسے پولیس کو فون کردینا چاہیے تھا لیکن اب دیر ہوچکی تھی اس کی سانسیں تیز ہوگئیں اس نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے تاکہ اپنی چیخوں کو روک سکے' اس کی نظریں سائے کو دیکھ رہی تھیں جو آہستہ آہستہ اس کے بیڈ کے قریب سے گزر رہا تھا' کرن نے اپنے قریب میز پر رکھا دھاتی گلدان اٹھایا ہوا تھا تاکہ موقع ملتے ہی اس سائے کے سر پر دے مارے اچانک لائٹ آگئی اور اس کی آنکھیں چندھیا گئیں آنے والا کمرے کے وسط میں ہی رک گیا تھا۔

''مام؟''

کرن نے گلدان واپس رکھ دیا' اس کے چہرے سے غصہ عیاں ہورہا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اس کا تیرہ سالہ بیٹا کمال رات گئے اس طرح گھر میں داخل ہوا تھا جیسے کوئی چور ہو آج کل شہر میں ایک نفسیاتی مجرم کی کہانیاں عام تھیں جو اندھیری راتوں میں عورتوں کی عزتیں لوٹ کر انہیں مار ڈالتا تھا اور اب تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا تھا' وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ رات کے اندھیرے میں کہیں وہی مجرم تو گھر میں داخل نہیں ہوگیا......؟ کمال اس کے سامنے کھڑا تھا لیکن اس سے نظریں چرا رہا تھا' چند لمحے اسی طرح گزر گئے رات کے اندھیرے میں صرف گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی پھر کرن اپنے بیڈ پر سیدھی ہوکر بیٹھ گئی لیکن وہ کچھ بولی نہیں تھی بس ناگواری سے کمال کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''مام' میں معافی چاہتا ہوں' میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' کمال نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''کیسا نہیں ہوگا؟'' اس نے غصے سے مگر دھیمی آواز میں پوچھا۔

''آپ سے بغیر پوچھے باہر نہیں جاؤں گا۔'' کمال نے معصومانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ا......و......ر؟'' کرن نے ذرا اونچی آواز سے پوچھا اور کمال کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

''وہ......بس...... میں اور میرے کچھ دوست تھے' ہم یونہی ادھر ادھر گھوم رہے تھے کوئی خاص بات نہیں۔'' کمال نے اٹک اٹک کر کہا جیسے اسے خود بھی احساس ہو کہ وہ غلط کررہا تھا۔

''کہاں؟''

''یہیں' آس پاس۔''

''کیا تمہارے ہیڈ ماسٹر احتشام صاحب کو تم پر اعتراض نہیں ہوا؟'' کرن نے ناگواری سے پوچھا۔

''آپ کو کیسے پتہ چلا؟'' کمال ایک قدم پیچھے کھسکا اور حیرت سے پوچھا۔

''انہوں نے فون کیا تھا وہ تمہارے اور دوستوں کے خلاف مقامی تھانے میں رپورٹ لکھوانے جارہے تھے۔''

''اوہ' کیا وہ ایسا کرسکتے ہیں؟''

''ہاں۔''

''ہم نے کوئی چیز نہیں توڑی ہے' میں سچ کہہ رہا ہوں ہم نے صرف کچھ ٹوائلٹ پیپرز ان کے درختوں اور جھاڑیوں پر لٹکا دیئے تھے۔''

''تم اپنے گھر سے اتنی دور احتشام صاحب کے گھر تک کیسے گئے تھے؟''

''ایک کار میں۔''

''گاڑی کون چلا رہا تھا؟''

''جمیل۔''

''کیا اس کے پاس لائسنس ہے؟''

''نہیں۔'' کمال نے شرمندگی سے کہا اور کرن بیڈ سے نیچے اتر کر اس کی طرف پیٹھ کرکے کھڑی ہوگئیں وہ اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسو اس سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''کیا تم لوگوں نے کار چرائی تھی؟''

''جمیل اپنی امی کی کار چپکے سے لے آیا تھا۔'' کمال نے کہا اور کرن نے قریبی دیوار کا سہارا لینے کے لیے اس سے پشت ٹکادی وہ سوچ رہی تھی کمال ابھی صرف تیرہ سال کا ہے کیا وہ غلط راستے پر لگ گیا ہے اسے ابتک دو اسکولوں سے نکالا جاچکا ہے' لڑنے کی وجہ سے اب اگر احتشام صاحب نے بھی اسے گرین فیلڈ اسکول سے نکال دیا تو میں کیا کروں گی؟ اس خیال کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا تھا۔

''یہ سب بہت تکلیف دہ ہے۔'' اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

''کیا؟'' کمال نے پوچھا۔

''میری زندگی...... میری ملازمت...... اور تمہاری پرورش اکیلے کرنا۔''

''ہم اکیلے کیوں ہیں؟''

''کیا......؟'' کرن کمال کے اس بے موقع سوال پر چونکی۔

''میرے والد کیوں نہیں ہیں' یا دادا' یا پھوپھیاں' یا کزنز؟ میری کوئی فیملی کیوں نہیں ہے؟ جیسے دوسرے بچوں کی فیملیز ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم جانتے ہو......'' کرن نے اس کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

''میں وہی جانتا ہوں جو آپ نے مجھے بتایا ہے۔''

''میں...... میں تمہیں کیا بتاؤں...... جبکہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔'' کرن نے کہا۔

''میرے والد کیسے تھے؟''

''وہ بالکل تمہاری طرح تھے۔''

''ہمارے پاس ان کی کوئی تصویر کیوں نہیں ہے؟''

''جب میں نے گھر بدلا تو وہ کھوگئی تھیں۔''

''آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔'' کمال نے غصے اور نفرت سے کہا۔

''کیا؟ تم مجھ سے اس طرح بات نہیں کرسکتے۔''

''جب میں چھوٹا تھا تو آپ مجھے ایسی کہانیاں سناسکتی تھیں جیسے میرے والد کوئی ہیرو تھے؟''

'وہ واقعی ہیرو تھے...... وہ فوجی تھے اور عراق کی جنگ میں لڑنے گئے تھے جہاں وہ شہید ہوگئے۔''

''نہیں یہ جھوٹ ہے' [illegible] یہ بات جانتے ہیں۔'' کمال نے غصے سے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ انٹرنیٹ کیسے استعمال کیا جاتا ہے' میں نے پتا کیا تھا ایئرفورس کے پاس کسی حماد کا ریکارڈ نہیں ہے جو A-10 کا پائلٹ تھا' آپ کے پاس میرا کوئی پیدائشی سرٹیفکیٹ بھی نہیں ہے یا آپ کی شادی کا کوئی ریکارڈ' آپ کون ہیں مام؟ میں کون ہوں؟'' کمال نے دکھ سے کہا اب اس کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملا رہے تھے۔

❖......☆......❖
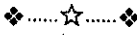
دوسری صبح کرن حماد نے اٹھتے ہی اپنے ماہر نفسیات کو فون ملایا تھا۔

''ڈاکٹر بدر آفس؟'' اس نے پوچھا۔

''یس پلیز۔'' دوسری طرف سے نسوانی آواز سنائی دی۔

''سعدیہ! پلیز کیا اس وقت ڈاکٹر بدر مجھ سے بات کرسکتے ہیں؟''

''میں چیک کرتی ہوں۔''

چند لمحوں میں ڈاکٹر بدر سے رابطہ ہوگیا تھا اور کرن نے بڑی عجلت میں اس سے بات کی۔

''ڈاکٹر بدر میں چاہتی ہوں آپ فوراً ہی میرے لیے

ایک سیشن شیڈول کرلیں۔‘‘
’’کرن‘ یہ بہت نامناسب ہے کہ جب ہم حال ہی میں مل چکے ہیں تو اتنی جلدی دوبارہ سیشن کریں۔‘‘
’’نہیں‘ میرے لیے نہیں بلکہ میں کمال کو لانا چاہتی ہوں‘ وہ کل رات گھر سے غائب ہوگیا پھر اس نے اپنے ہیڈ ماسٹر کے گھر پر جگہ جگہ ٹوائلٹ پیپرز لگادیئے اور ..... گھر آ کر وہ مجھ سے میری اور اپنی فیملی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔‘‘
’’اچھا‘ کیا تم سات بجے تک یہاں آسکتی ہو؟‘‘
’’ہاں‘ میں آجاؤں گی تمہارا شکریہ ڈاکٹر۔‘‘
’’کرن‘ میں تمہیں پہلے بھی بتاچکا ہوں کہ کمال اس وقت تک ٹھیک نہیں ہوسکتا جب تک تم اپنا مسئلہ حل نہیں کرلیتیں۔‘‘ ڈاکٹر بدر نے کہا۔
’’ڈاکٹر میرا باس مجھے پسند نہیں کرتا اور اگر اسے یہ پتہ چل گیا کہ میں کسی ماہر نفسیات کے علاج میں ہوں تو وہ مجھے ملازمت سے نکال دے گا پھر میں کیا کروں گی؟‘‘
’’تم مجھ سے شادی کرسکتی ہو اور میں تمہاری تھراپی گھر پر ہی کردیا کروں گا۔‘‘ ڈاکٹر بدر نے مزاحیہ انداز میں کہا وہ اس سے اکثر ایسے مذاق کرتا رہتا تھا۔
’’خدا کے لیے یہ مذاق بند کرو اور اب مجھے مزید پھول بھی مت بھیجنا۔‘‘
’’اب بہت دیر ہوچکی ہے کرن اب واپسی ممکن نہیں۔‘‘ ڈاکٹر نے ذو معنی انداز میں کہا۔
’’ہم تم سے سات بجے ملیں گے پھر بات ہوگی...... خدا حافظ۔‘‘ کرن نے فون بند کرتے ہوئے کہا پھر اس نے اپنی انگلیاں اپنے بالوں میں پھیری تھیں اور بالوں کو شانوں پر بکھراتے ہوئے اس کی نظریں اپنے بالوں میں موجود سفید لٹ پر پڑی تھیں جو بہت عرصے سے یونہی موجود تھی لیکن اسے یاد نہیں تھا کہ سفید لٹ اس کے سیاہ بالوں میں کب سے موجود تھی اس نے بے پروائی سے کاندھوں کو جنبش دی اور بال درست کرکے سیڑھیاں اترتی نچلی منزل کی طرف گئی جہاں بیرونی دروازے کے قریب ہی فرش پر اسے ایک گلاب کا پھول پڑا نظر آیا جسے وہ کچھ دیر تک دیکھتی رہی اس کے چہرے پر ناگواری تھی اب تک تو اس کے آفس میں اس کی میز پر اسے گلاب کا پھول رکھا ملتا تھا لیکن اب یہ اس کے گھر تک بھی آ گیا تھا‘ اس نے ناگواری سے پھول کو ایک ٹھوکر سے ایک طرف کیا وہ سوچ رہی تھی کہ اگر یہ حرکت ڈاکٹر بدر بھی کررہا ہے تب بھی یہ مناسب نہیں ہے۔

❖......☆......❖

شہر کے بڑے پولیس اسٹیشن میں آفیسر مرد اور عورتیں اپنے یونیفارم میں موجود تھے ان میں کچھ لوگ سادہ لباس میں بھی تھے ان کے درمیان سراغرساں پرویز جہانگیر اور جواد حسین بھی تھے وہ ایک بڑے ہال میں موجود تھے۔
’’سب لوگ دھیان سے میری بات سنیں‘ کیپٹن ولید احمد نے باآواز بلند کہا اور سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔
’’سنسان سڑکوں پر ہونے والے واقعات حد سے زیادہ بڑھ گئے ہیں ان میں اب تک دو لوگ مارے جاچکے ہیں اور گیارہ شدید زخمی ہوئے ہیں یہ سب ڈکیتی‘ شوٹنگ اور دہشت گردی کے واقعات میں ہوا ہے۔‘‘ کیپٹن نے خاموش ہوکر اطراف کا جائزہ لیا سب بغور اسے سن رہے تھے۔
’’پچھلے ایک مہینے میں سڑکوں سے تین عورتوں کو اٹھالیا گیا اور ان پر تشدد کیا گیا بعد میں وہ زخمی حالت میں ملیں‘ آج صبح بھی ایک لڑکی غائب ہونے کی رپورٹ لکھوائی گئی ہے‘ وہ کلب سے واپس گھر جانے کے لیے نکلی تھی لیکن اپنی کار تک بھی نہ پہنچ پائی وہ غائب ہے۔‘‘
’’ہمارے چیف ان حالات کی وجہ سے پریشان ہیں اور ران معاملات کو جلد از جلد نمٹانا چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ علاقے میں سادے کپڑوں اور یونیفارم والے لوگوں کی تعداد بڑھادی جائے‘ اس پر ابھی سے عمل درآمد ہوگا آگے کی تفصیلات آپ کو سراغرساں پرویز جہانگیر بتائیں گے۔‘‘ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد کیپٹن ولید اپنے کمرے میں چلا گیا اور سراغرساں پرویز نے اس کی جگہ سنبھال لی۔
’’سنسان سڑکوں پر ہونے والے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی ایک فرد کا کام ہے لیکن ہمیں اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں بس اتنا جانتے ہیں کہ اس کی کالے رنگ کی وین ہے جس میں کارپٹ

بچھا ہوا ہے ان واقعات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور شدت بھی آ رہی ہے۔'' پرویز جہانگیر نے کہا پھر اس نے مختلف آفیسرز کی ڈیوٹیاں مختلف علاقوں میں لگائی تھیں۔

''سب اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور کسی بھی غیر فطری واقعے پر مجھے اطلاع دیں جواد حسین مجھے اسسٹ کریں گے۔''

اسی صبح دس بجے ایک پولیس آفیسر اپنی ڈیوٹی کے دوران ایک بند گیراج کے پیچھے ایک خالی عمارت کے قریب واقع کوڑا گھر کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اسے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''مدد...... مدد کرو...... کوئی میری مدد کرو۔'' پولیس آفیسر نے چونک کر چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا اچانک آواز پھر سنائی دی۔

''میری مدد کرو۔'' اس نے آواز کی سمت کا اندازہ کر کے ایک طرف دیکھا وہ آواز کچرے کے کنٹینر سے آ رہی تھی پولیس آفیسر نے حیرت سے ادھر دیکھا۔

''تم کہاں ہو؟''

''کچرے کے کنٹینر میں۔''

''اوہ۔'' پولیس آفیسر کے منہ سے نکلا اور اس نے آگے بڑھ کر کنٹینر کا ڈھکن اٹھایا اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی اس کے سامنے ایک نوعمر لڑکی پھٹے ہوئے لباس میں زخمی حالت میں کنٹینر میں پڑی تھی۔

''مجھے یہاں سے نکالو۔'' اس نے روتے ہوئے کہا اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور جسم پر بھی جگہ جگہ نیل پڑے تھے۔

''تم حرکت مت کرؤ میں کسی کو مدد کے لیے بلاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور جیب سے موبائل نکال کر نمبر ڈائل کیے۔

''میں انسپکٹر طارق بول رہا ہوں' فوراً ایک ایمبولینس یہاں بھیج دو۔'' اس نے جگہ کا پتہ بتاتے ہوئے کہا اور فون رکھ کر لڑکی کو نکالنے میں مصروف ہو گیا کچھ ہی دیر میں اس نے لڑکی کو نکال لیا تھا اسی وقت ایمبولینس بھی آ گئی تھی اور وہ جیسے ہی پیچھے مڑا تھا اس کی نظر ٹی وی کیمرے پر پڑی تھی۔

''اوہ حامد تم......؟ تم ایمبولینس کے ساتھ ساتھ یہاں کیسے پہنچ گئے۔'' انسپکٹر طارق نے حیرت سے کہا۔

اور کیمرہ مین حامد اسے دیکھ کر ہنسنے لگا وہ ایک مشہور ٹی وی چینل کا رپورٹر تھا۔

''ہاں میں' تم نے اسے کیسے ڈھونڈا؟'' حامد نے پوچھا۔

''تم یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئے۔'' انسپکٹر طارق نے اپنی بات دہرائی۔

''اس کا جواب ہے کارکردگی اور قسمت جناب۔'' حامد نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لیکن میرا مشورہ ہے کہ جب تک ہم کام کر رہے ہیں تم یہاں سے چلے جاؤ۔'' انسپکٹر طارق نے حامد کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور ایمبولینس کے عملے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''اسے میں نے ابھی کچرے کے کنٹینر سے نکالا ہے۔'' انسپکٹر طارق نے ایمبولینس کے عملے کو بتایا تو ایک کارندے نے ایمبولینس میں سے ایک کمبل نکال کر لڑکی کے جسم کو ڈھانپ دیا اسی وقت سراغرساں پرویز اپنے اسسٹنٹ جواد حسین کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

''ہائے پرویز۔'' حامد نے دور سے ہاتھ ہلا کر سراغرساں کو خوش آمدید کہا ساتھ ساتھ وہ لڑکی کی تصویریں بھی لیتا جا رہا تھا' جسے ایمبولینس میں ڈالا جا رہا تھا' کچھ دیر بعد ایمبولینس وہاں سے چلی گئی تھی۔

''اگر تم کچھ دیر کنٹینر کے قریب ہی کھڑے رہو تو میں تمہاری کچھ تصویریں بنا لوں۔'' حامد نے انسپکٹر طارق سے کہا جو ناگواری سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم پاگل تو نہیں ہو؟ یہاں کتنی گندگی اور لال بیگ ہیں' کیسی بدبو آ رہی ہے ایسا کرو کہ تم یہاں آ جاؤ اور میں تمہاری تصویریں بنا دیتا ہوں۔'' انسپکٹر طارق نے کہا اور سراغرساں اس کی بات پر مسکرانے لگا وہ جانتا تھا کہ رپورٹر حامد اور انسپکٹر طارق کی نوک جھونک یونہی چلتی رہتی تھی۔

''دیکھو انسپکٹر میں تمہیں ایک ہفتے تک مفت کافی پلاؤں گا اگر تم بتا دو کہ اس لڑکی نے تمہیں کیا بتایا ہے؟'' حامد نے اس سے پوچھا دراصل وہ اپنی رپورٹ کے لیے مواد جمع کرنا چاہتا تھا۔

"میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا؟ تم اس ڈاکٹر سے پوچھنا جو اسے یہاں سے لے گیا ہے۔"

"کیا اس لڑکی نے اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں تمہیں کچھ بتایا ہے یا مجرم کا کوئی حلیہ وغیرہ؟" حامد نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم اتنے بے چین کیوں ہو؟" انسپکٹر طارق نے الجھتے ہوئے کہا۔

"اس علاقے میں تین واقعات ہو چکے ہیں۔"

"میری اس سے بات ہوئی ہے۔" انسپکٹر طارق نے کہا۔

"کس بارے میں؟"

"یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا میں اپنی رپورٹ میں لکھوں گا بس۔"

"مت بھولو میں نے کچرا کنٹینرز سے نکالتے ہوئے تمہاری ویڈیو بنالی ہے میں وہ چینل پر چلا دوں گا۔" حامد نے بظاہر دھمکی دی۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ بلیک میل کرنا قانون کے خلاف ہے میں چینل 10 کے خلاف کارروائی کرسکتا ہوں اور تمہاری اس حرکت کی وجہ سے تمہیں جیل بھجوا سکتا ہوں۔" انسپکٹر طارق نے غصے میں کہا۔

"اچھا تم جیت گئے۔" حامد نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری کوئی ویڈیو نہیں چلاؤں گا لیکن تم میرے ایک سوال کا جواب تو دے ہی سکتے ہو تمہارے خیال میں اسے یہاں کس نے ڈالا ہوگا۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں تم سراغرساں پرویز سے یہ بات پوچھ لو وہی اس کیس کی تحقیقات کر رہے ہیں۔" انسپکٹر نے اپنی جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"میں ان سے بھی پوچھ لوں گا لیکن تم کو ہی وہ لڑکی ملی ہے تم اپنی رائے تو بتاؤ تمہارا اندازہ کیا کہتا ہے؟"

"تم اس لڑکی ہی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو اور بھی خبریں ہیں شہر میں ان پر کام کرو۔" انسپکٹر نے کہا اور حامد سراغرساں کی طرف بڑھ گیا جو اب کچرا کنٹینرز کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کیا عورتوں پر تشدد کے واقعات میں سے کوئی کیس حل ہوا؟" اس نے سراغرساں پرویز سے سوال کیا لیکن پرویز نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔

"پرویز تمہارا کیا خیال ہے کیا ہمیں کسی سیریل کلر کا سامنا ہے؟" اس نے دوسرا سوال کر دیا اور ساتھ ہی ویڈیو بنانے کے لیے اپنا کیمرہ آن کر دیا۔

"میں نہیں جانتا۔" پرویز نے خشک لہجے میں کہا۔

"اور اپنا یہ کیمرہ بند کرو۔"

"اب تک جو ثبوت ملے ہیں ان کا کیا ہوا؟" حامد نے ایک اور سوال کر دیا۔ "یہ علاقہ بدنام ہو چکا ہے اب تک کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا مجھے پتہ ہے کچھ دن بعد اس کیس کی فائلیں بند ہو جائیں گی اور سرد خانے میں ڈال دی جائیں گی...... مجھے بتاؤ کیمرے کے سامنے بتاؤ کہ وہ لڑکی کیسے ملی؟"

"نہیں۔" سراغرساں نے سخت لہجے میں کہا۔

"اوہ تم پریشان کیوں کر رہے ہو مجھے معلومات کیوں نہیں دیتے؟" حامد نے غصے سے کہا۔

"تم انسپکٹر طارق سے بات کرو میں لیب کے اسٹاف سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" سراغرساں پرویز نے کہا اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا حامد پھر طارق کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"اوہ تمہیں میری ضرورت نہیں ہے جاؤ اپنے کیمرے کے ساتھ لڑکی سے جا کر خود بات کر لو۔" طارق نے غصے سے کہا۔

"دیکھو میری مجبوری کو سمجھو مجھے اپنے چینل کو رپورٹ کرنی ہے اور میری اسٹوری اس وقت تک ادھوری ہے جب تک تم یہ نہیں بتاتے کہ لڑکی تمہیں کیسے ملی؟"

"اچھا ٹھیک ہے لیکن تم مجھ سے صرف یہ پوچھو گے کہ مجھے وہ کیسے ملی؟ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔" انسپکٹر طارق نے اپنی پتلون اپنی توند پر چڑھاتے ہوئے کہا گویا کیمرے کا سامنا کرنے کی تیاری کر رہا ہو حامد نے بھی موقع غنیمت جان کر چند قدم پیچھے ہٹ کر کیمرہ اس پر فوکس کر دیا تھا اور ریکارڈنگ کا بٹن دبا دیا تھا۔

"چلو شروع ہو جاؤ۔"

"میں یہاں معمول کے گشت پر تھا ہمارے پاس ایک کلب سے غائب ہو جانے والی لڑکی کی رپورٹ تھی

اچانک میں نے لڑکی کے کراہنے اور مدد مانگنے کی آوازسنی ......'' انسپکٹر طارق نے کہنا شروع کیا پھر اس نے لڑکی کے ملنے کی ساری تفصیل بتادی تھی اور حامد ویڈیو بنا تا رہا تھا۔

❖......☆......❖

''ہمارے معاشرے میں جرائم بڑھتے جارہے ہیں لیکن اتوار کی رات کو تو انتہا ہی ہوگئی۔'' کرن حماد بولتے بولتے رکی اور چند لمحے تک کیمرے کو گھورتی رہی' ایک نوجوان لڑکی کو ایک کچرا کنٹینر میں ٹھونس دیا گیا' جیسے وہ بھی کوئی کچرا ہو کیا عورت کی اس معاشرے میں یہی عزت ہے؟ باقی تفصیل دس بجے کی خبروں میں ملاحظہ کیجیے...... میں کرن حماد کیمرہ مین حامد کے ساتھ کراچی سے۔'' کرن نے کہا اور اپنے کان میں لگا ایئرفون نکال دیا پھر اس نے میز کی دراز میں رکھا اپنا پرس نکالا تھا اور اسٹوڈیو سے نکل گئی تھی اس کے چہرے پر پریشانی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا بیٹا کمال اسپتال میں کیوں ہے؟ اسی وقت کوریڈور میں اس کا سامنا فلور ڈائریکٹر مس کشور سے ہوگیا جو لمبی اور صحت مند جسم کی مالک تھی اس کے چہرے سے بھی پریشانی جھلک رہی تھی۔

''اوہ تم نے بہت اچھی پرفارمنس دی ہے۔'' کشور نے کرن کی تعریف کی۔

''ہوں' لیکن تمہارے چہرے پر پریشانی کیوں ہے؟''

''تمہارا باس بہت غصے میں ہے وہ کنٹرول روم میں تھا اور تم پر غصہ کررہا تھا۔''

''یہ کون سی نئی بات ہے......وہ مجھے پسند نہیں کرتا میں جانتی ہوں۔'' کرن نے بددلی سے کہا۔

''لیکن اس نے تمہیں بلوایا ہے وہ بہت غصے میں ہے۔''

''وہ انتظار کرسکتا ہے...... مجھے ایک فیملی مسئلہ درپیش ہے۔'' کرن نے کہا اور آگے بڑھی۔

''سنو تو......شہر میں کوئی اور نیا حادثہ ہوا ہے' باس شجاع الدین تمہیں اپنے آفس میں بلا رہا ہے۔'' کشور نے کہا۔

''میں ابھی اس سے نہیں مل سکتی کشور تم اسے بتادو۔''

''تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہیں پتہ ہے نیوز ڈپارٹمنٹ کا ہر کام کتنا اہم ہوتا ہے تم اس کی بات نہیں سنوگی تو وہ تمہیں ملازمت سے نکال دے گا۔'' کشور نے سمجھایا۔

''اس وقت میرے بیٹے کو میری زیادہ ضرورت ہے اور اس کے سامنے یہ ملازمت میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔'' کرن نے غصے سے کہا۔

''تمہارے بیٹے کو باپ کی ضرورت ہے تمہاری نہیں۔'' کشور بھی غصے سے بولی۔

''اس معاملے میں تم مت بولو کشور۔'' کرن نے کہا اور رفتار بڑھادی۔

''اگر تم اپنی ملازمت برقرار رکھنا چاہتی ہو تو جاؤ باس شجاع سے مل لو تمہیں ابھی اینکر کی ملازمت کرتے ہوئے صرف ایک ماہ ہی ہوا ہے جب تم تجربہ کار ہوجاؤ گی تو تمہاری زیادہ اہمیت ہوگی' اچھا عہدہ ہوگا۔''

''تم شجاع کو بتادو میں اس سے ملوں گی لیکن لیاقت اسپتال سے واپس آنے کے بعد۔''

''اسپتال؟ کیا کمال کا کوئی ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے؟'' کشور نے تشویش سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی اس کے ہیڈ ماسٹر احتشام صاحب نے مجھے میسج کیا ہے کہ میں انہیں لیاقت اسپتال میں ملوں۔''

''وہ اسپتال میں کیوں ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''کیا میں تمہارے ساتھ چلوں؟' کشور کے لہجے میں ہمدردی آ گئی تھی۔

''نہیں' مجھے جانے دو اس سے پہلے کہ شجاع ادھر آ نکلے تم مہربانی کرکے میرے ڈاکٹر بدر کو فون کرکے کہہ دینا کہ اپائنمنٹ کینسل کردے میں اسے پھر فون کروں گی۔''

''ٹھیک ہے' تم اسپتال پہنچ کر مجھے کمال کے بارے میں فون ضرور کردینا۔'' کشور نے کہا۔

''ہاں کردوں گی لیکن تم شجاع کو میری طرف سے بتادینا کہ عورتوں پر تشدد کی اسٹوری کو اتنا اچھالنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔''

''او کے کہہ دوں گی ایک منٹ رکو...... جب تم

پروگرام کررہی تھیں تو تمہارے لیے یہ آیا تھا۔'' کشور نے ایک گلاب کا پھول اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پیلا گلاب؟'' یہ کس نے بھیجا ہے؟'' کرن نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی اس کی ڈنڈی کے ساتھ ایک پرچہ بھی لگا ہے۔'' کشور نے کہا۔ کرن نے اس کے ہاتھ سے گلاب لے لیا اور اس میں لگا کارڈ نکال کر اپنے پرس میں رکھ دیا اور ٹی وی اسٹیشن سے باہر نکل گئی۔

ٹی وی اسٹیشن سے باہر آتے ہی اسے سردی کا احساس ہوا تھا بارش بھی ابھی رکی تھی اور ہوائیں سرد تھیں اس نے اپنا کوٹ اچھی طرح بند کیا اور اپنی کار میں آ بیٹھی پھر اسے اسپتال پہنچنے میں آدھا گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا تھا لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ ایک بلو کلر کی وین برابر اس کے پیچھے سفر کررہی تھی جیسے اس کا تعاقب کررہی ہو اسپتال پہنچی تو اس کی ملاقات سب سے پہلے ہیڈ ماسٹر احتشام سے ہوئی تھی جو اپنے چھوٹے قد اور بھاری بدن کے ساتھ وہاں موجود تھے' اس وقت انہوں نے کالا سوٹ پہنا ہوا تھا کرن کو دیکھتے ہی انہوں نے اپنی آنکھوں پر ٹکا چشمہ درست کیا تھا۔

''مسٹر احتشام' کمال کہاں ہے؟'' کرن نے عجلت میں پوچھا۔

''مسز حماد' میں نے آپ کو ایک گھنٹے پہلے میسج کیا تھا۔'' ہیڈ ماسٹر نے ناگواری سے کہا۔

''میں 'آن ایئر' تھی جیسے ہی فارغ ہوئی ہوں آ گئی ہوں۔''

''مجھے بھی بہت سے ضروری کام نمٹانے ہوتے ہیں مسز حماد میرے پاس فالتو وقت نہیں کہ یہاں آپ کا انتظار کرتا رہوں۔''

''کمال ٹھیک تو ہے؟'' کرن نے ہیڈ ماسٹر کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

''ہاں' مسز حماد' یہ گرین فیلڈ اسکول کے قانونی مشیر مسٹر سلیم احمد ہیں' آپ ہمارے ساتھ آئیں تاکہ ہم بیٹھ کر بات کرسکیں۔'' ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' کرن نے کہا لیکن ہیڈ ماسٹر نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور چلتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوگیا کرن اور سلیم احمد نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

''مسٹر احتشام آپ نے کہا کہ کمال ٹھیک ہے تو پھر آپ نے مجھے اسپتال میں کیوں بلایا؟'' کرن نے پوچھا۔

''آپ کو اطلاع دینے کے لیے کہ کمال اب ہمارے اسکول کا طالب علم نہیں ہے یہ رہا اس کا ٹرمینیشن لیٹر۔'' ہیڈ ماسٹر نے ایک پیپر کرن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیوں؟''

''گرین فیلڈ اسکول ایک معیاری اسکول ہے۔'' اس بار جواب قانونی مشیر سلیم احمد نے دیا تھا۔ ''اور وہاں شہر کی بہترین فیملیز کے بچے پڑھتے ہیں اور قانونی مشیر ہونے کے ناتے یہ میری ذمے داری ہے کہ میں گرین فیلڈ کا دفاع کروں' آپ اور آپ کا بیٹا اسکول کے معیار پر پورے نہیں اترتے چنانچہ ہم آپ کو اسکول کیمپس میں داخلے کی اجازت نہیں دے سکتے۔''

''کیا یہ کل رات ہونے والے واقعے کی وجہ سے کیا گیا ہے؟'' کرن نے پوچھا۔

''ایک وجہ وہ بھی ہے لیکن آج تو اس نے حد کردی۔'' ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

''کیا مطلب؟ اس نے کیا کیا ہے؟''

''یہ بات آپ کو پولیس اور مسٹر فرقان کا وکیل ہی بتائے گا۔'' ہیڈ ماسٹر نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا لیکن کرن اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''میرا بیٹا کہاں ہے؟''

''اتنا چراغ پا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کا بیٹا ویٹنگ روم میں ہے مجھے جانے دیں۔'' ہیڈ ماسٹر نے کہا اور اسے اپنے سامنے سے ہٹایا۔

''مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' کرن نے ضدی لہجے میں کہا۔

''اس نے لڑائی کی ہے' تمہیں پولیس کی رپورٹ میں سب مل جائے گا۔''

''پولیس......؟' مسٹر احتشام آپ اسکول میں ڈسپلن

کے لیے ذمہ دار ہیں آپ نے ایسا کیوں ہونے دیا۔''

''میرے علم میں آنے تک تمہارے بیٹے نے ایک اسٹوڈنٹ کو زخمی کر دیا تھا۔''

''اسٹوڈنٹ کتنا زخمی ہوگیا ہے؟ کیا اس پر کوئی کارروائی کرنے سے پہلے بات نہیں ہوسکتی تھی؟'' کرن نے پوچھا اس کی آواز تیز ہوگئی تھی قریب سے گزرتے ہوئے کچھ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

''اوہ کیا یہ کرن حماد نہیں ہے؟ وہی چینل 10 نیوز والی اینکر۔'' ایک شخص نے دوسرے سے پوچھا۔

''ہاں، وہ دیکھو اس کے بالوں میں ایک سفید لٹ موجود ہے جو اس کی خاص نشانی بن گئی ہے۔'' دوسرے نے جواب دیا کرن سنبھل کر کھڑی ہوگئی تھی اور اس نے اپنی آواز بھی دھیمی کر لی تھی۔

''تمہارے بیٹے نے مسٹر فرقان احمد کے بیٹے اصغر کی ناک توڑ دی ہے اور ایک دانت بھی، تمہیں پتہ ہے مسٹر فرقان احمد ہمارے گرین فیلڈ اسکول میں فنڈ دیتے ہیں، ہم ان سے تعلقات خراب نہیں کر سکتے۔'' ہیڈ ماسٹر نے کہا اور اپنے وکیل کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔

کرن جب ویٹنگ روم میں گئی تو کمال ایک پولیس آفیسر اور اصغر کے والدین کے ساتھ وہاں موجود تھا کرن کمال سے بات کرنے کے بجائے اصغر کے والدین کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''مسٹر اور مسز فرقان، میں کمال کی والدہ ہوں آپ کا بیٹا کیسا ہے؟''

''وہ زخمی تو ہوا ہے لیکن اسے بھی سبق مل گیا ہے۔'' اصغر کے والد فرقان احمد نے کہا۔

''تم اس بات کو اتنے معمولی انداز میں مت لو۔'' مسز فرقان نے اپنے شوہر پر برستے ہوئے کہا وہ بہت غصے میں تھیں۔

''تمہارے بیٹے کمال نے میرے بیٹے کو مارا اور اس کا سر فٹ پاتھ سے ٹکرایا وہ اس کی پشت پر سوار ہوگیا تھا۔'' مسز فرقان نے غصے سے کہا۔ ''اگر ہیڈ ماسٹر نہ روکتے تو میرا بیٹا تو مر ہی جاتا۔''

''ایسا نہیں ہے..... ضرور کچھ آپ کے بیٹے نے بھی کیا ہوگا؟'' کرن نے کہا اور اسی وقت وہاں موجود پولیس آفیسر نے مداخلت کی۔

''دیکھیں آپ دونوں کچھ خیال کریں یہ اسپتال ہے۔''

''سارہ چلو.....'' مسٹر فرقان نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر کہا اور کرن کی طرف مڑا۔

''مجھے افسوس ہے مسز حماد کہ ہماری ملاقات ایسے حالات میں ہوئی میں اپنی بیوی کی طرف سے معذرت چاہتا ہوں۔''

''تمہیں معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں کمال کے خلاف قانونی کارروائی کروں گی..... بہت جلد میرے وکیل کا نوٹس تمہیں ملے گا۔'' مسز فرقان نے دھمکی آمیز انداز میں کرن سے کہا جس کے بعد مسٹر فرقان انہیں ویٹنگ روم سے باہر لے گئے۔

'میری بات سنیں مام۔'' کمال نے کہا۔

''تم خاموش رہو، تم سے میں گھر جا کر بات کروں گی۔'' کرن نے کہا اور پولیس آفیسر کی طرف مڑی۔

''کمال کے ہیڈ ماسٹر نے اسے اسکول سے نکال دیا ہے اور مسز فرقان کمال کو گرفتار کروانے کی بات کر رہی ہیں میں کیا کروں مجھے نہیں معلوم کہ اصل معاملہ کیا ہے؟''

''بچے ہیں اتنا سنگین واقعہ بھی نہیں ہوا مسز فرقان زیادہ ہی غصہ کر رہی ہیں۔'' پولیس آفیسر بولا۔

''کیا میں کمال کو لے جاؤں؟'' کرن نے آفیسر سے پوچھا۔

''ہاں آپ لے جا سکتی ہیں اس کا داخلہ کسی اور اسکول میں کروا دیں۔''

''دیکھتی ہوں کیا کرنا ہے۔'' کرن نے کہا پھر وہ کمال کا ہاتھ پکڑے اپنی کار میں آ بیٹھی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ کشور ٹھیک ہی کہتی ہے کمال کو باپ کی نگہداشت کی ضرورت ہے۔

''مام پلیز آپ مت روئیں..... میں شرمندہ ہوں۔'' کمال نے افسردگی سے کہا۔

''نہیں، قصور میرا ہے، میں نے تمہاری بات سنے بغیر ہی تمہیں قصوروار مان لیا۔'' کرن نے کہا اور کمال نے اس

کی کار میں رکھا ہوا پیلا گلاب اٹھا لیا۔
''اس مرجھائے ہوئے پھول کا آپ کیا کریں گی؟'' اس نے پوچھا۔
''یہ پی ٹی وی اسٹیشن پر کسی نے میرے لیے بھیجا تھا۔'' کرن نے کہا اور پھول کے قریب رکھا کارڈ اٹھایا جس پر لکھا تھا۔ ''مجھے معاف کر دو۔'' اس پر کسی کے دستخط نہیں تھے۔
''لگتا ہے میرا کوئی پراسرار دوست ہے۔'' کرن نے کہا اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔
''کمال بتاؤ تم نے لڑائی کیوں کی تھی؟''
''کیا یہ پھول موٹے ڈاکٹر بدر نے بھیجا ہے؟'' کمال نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔
''میں نے تمہیں منع کیا ہے نا کہ ڈاکٹر بدر کو اس نام سے مت پکارا کرو۔''
''بتائیں کیا اس نے بھیجا ہے؟''
''میں نہیں جانتی یہ کون بھیجتا ہے' جب میں پروگرام کر رہی تھی تب یہ آیا تھا۔''
''یہ یقیناً اس موٹے نے ہی بھیجا ہوگا۔'' کمال نے غصے سے کہا اور پھول کو توڑ مروڑ کر پھینک دیا۔
''اب تمہیں سکون مل گیا؟'' کرن نے پوچھا۔ ''اب میرے سوال کا جواب دو تم نے لڑائی کیوں کی تھی؟ تم جانتے ہو' تمہیں اسکول جانا ہوگا۔''
''مجھے اسکول اچھا نہیں لگتا۔''
''دیکھو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ گھر میں رہوں لیکن اگر میں کام نہیں کروں گی تو گھر کیسے چلے گا ہمارے اخراجات کیسے پورے ہوں گے' ہماری مجبوری ہے مجھے ملازمت کرنا ہے اور تمہیں اسکول جانا ہے۔'' کرن نے سمجھاتے ہوئے کہا۔
''لیکن جو آپ آفس جائیں تو میں گھر پر بھی رہ سکتا ہوں۔''
''نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔''
''کیا ہیڈ ماسٹر واقعی مجھے اسکول سے نکال دیں گے؟''
''ہاں! اور یہ تمہارا تیسرا اسکول ہوگا جہاں سے تمہیں نکالا جا رہا ہے' میں جاننا چاہتی ہوں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔'' کرن نے کہا اور اسی وقت اس کی نظریں عقبی آئینے میں اس نیلی وین پر پڑیں جو ٹی وی اسٹیشن سے روانگی کے وقت بھی اس کا پیچھا کر رہی تھی۔
''یہ وین پھر میرے پیچھے کیوں ہے؟'' کرن نے زیر لب کہا اور پھر کمال کی طرف متوجہ ہوگئی۔
'میری بات کا جواب دو کمال۔''
''کیا یہ ضروری ہے؟''
'ہاں بہت ضروری ہے۔'' کرن نے کہا لیکن کمال نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔
گھر پہنچنے کے بعد دونوں گھر میں داخل ہوئے تھے لیکن کرن کافی دیر تک ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے پردے کی اوٹ سے جھانک کر باہر سڑک پر دیکھتی رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا کسی پولیس کی پیٹرولنگ کار نے بھی اس وین کو کرن کا تعاقب کرتے نہیں دیکھا؟
''آپ باہر کیا دیکھ رہی ہیں؟'' کمال نے پوچھا۔
''میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ میں نے کار کی لائٹیں بند کر دی ہیں یا نہیں۔'' کرن نے جھوٹ بولا۔ وہ کمال کو بتانا چاہتی تھی کہ کوئی کار صبح سے اس کے تعاقب میں ہے اچانک دوسرے کمرے میں رکھے کارڈلیس فون کی گھنٹی بجی۔
''کمال ذرا فون اٹھا کر لاؤ۔'' کرن نے کہا اور کمال فون اٹھا لایا۔
''مام! طوفان کا فون ہے۔'' کمال نے کہا۔
''بری بات کمال' میں نے تمہیں منع کیا ہے کہ تم انہیں ایسے مت پکارا کرو' وہ بڑی ہیں اور بڑوں کا ادب کرتے ہیں۔'' کرن نے کہا اور فون کمال کے ہاتھ سے لے لیا۔
''کیا کمال ٹھیک ہے؟'' دوسری طرف سے کشور کی آواز سنائی دی۔
''نہیں' اس نے پھر اسکول میں لڑائی کی تھی اور ہیڈ ماسٹر نے اسکول کے سرمایہ دار کو دکھانے کے لیے ایک شو منعقد کیا تھا اسپتال میں۔'' کرن کے لہجے میں طنز تھا۔
''اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ؟''
''نہیں ٹھیک ہے میں کل آ کر بات کروں گی۔''

کرن نے کہا اور فون بند کر دیا پھر اس نے کمال سے بات کی تھی اور اسے سمجھا دیا تھا کہ اسکول جانا اس کے لیے ناگزیر ہے وہ کسی حالت میں اس کی تعلیم نہیں روک سکتی۔

''میں تمہیں کسی دوسرے اچھے اسکول میں داخلہ دلوادوں گی۔''

''اور اگر انہوں نے بھی مجھے قبول نہ کیا؟''

''تم کیا چاہتے ہو کھل کر بتاؤ۔'' کرن نے تنگ آ کر پوچھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ دوسروں کی طرح ہماری بھی ایک فیملی ہو۔''

''کیا یہی وجہ ہے کہ تم لڑتے ہو؟''

''مجھے نیند آ رہی ہے کل بات کریں گے کمال نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

''وعدہ۔'' کرن نے پوچھا وہ بھی اس وقت بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

''ہاں وعدہ۔''

❖......☆......❖
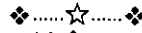
دوسری صبح کرن نیوز کے آفس پہنچی تو بڑی جلدی میں تھی وہ فوراً اپنے نیوز ڈائریکٹر شجاع الدین سے ملنا چاہتی تھی تا کہ ایک روز پہلے ہونے والی غلط فہمی کو دور کیا جا سکے یہ ملازمت اس کی ضرورت تھی۔

''ارے ارے اتنی جلدی میں کدھر جا رہی ہوں۔'' دوست کشور نے اسے راستے میں روک لیا۔

''آج تو اس خوبصورت جینز اور کوٹ میں غضب ڈھا رہی ہو ایک تو تم خوبصورت ہو اور پھر تمہارے یہ انداز...... ہائے کاش میں لڑکا ہوتی تو تمہیں لے اڑتی۔'' کشور اس وقت مذاق کے موڈ میں تھی۔

''راستہ چھوڑو کشور مجھے ابھی شجاع سے ملنا ہے۔'' کرن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھہرو میں ذرا تمہارا معائنہ کرلوں...... سب ٹھیک ٹھاک ہے کوئی کمی تو نہیں ذرا گھوم کر دکھاؤ...... اچھی لگو گی تو باس کا موڈ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کشور یہ باتیں پھر کر لینا...... کل میں پروگرام چھوڑ کر چلی گئی تھی شجاع کا غصہ عروج پر ہوگا آج بھی دیر میں پہنچی تو معافی نہیں ملے گی۔'' کرن نے وضاحت کی۔

''ڈرو مت' پروفیشنل بنو خوبصورت تو تم ہو ہی اسے اپنی مجبوری مت بتانا بلکہ کہنا کہ تم نے وقت کی ضرورت کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ لوگوں کو اس خبر کے لیے انتظار کروایا جائے اس طرح ان کا تجسس بڑھے گا اور پھر جب خبر نشر ہوگی تو زیادہ تعداد اسے دیکھے گی اس سے ریٹنگ بڑھے گی اور ہاں شجاع باس ہے اس کی کسی بات سے اختلاف مت کرنا۔''

''ٹھیک ہے اب جانے دو۔'' کرن نے کہا اور اسی وقت ایک ہینڈسم نوجوان وہاں آ کھڑا ہوا۔

''ایکسکیوزمی خواتین' کیا کوئی مجھے بتائے گا کہ شجاع الدین مجھے کہاں مل سکتے ہیں؟''

''بتانے کے بجائے میں آپ کو وہاں لے چلتی ہوں۔'' کشور نے کہا۔''میرا نام کشور ہے اور یہ کرن ہے تمہارا نام کیا ہے؟'' کشور خوش مزاجی سے بات کر رہی تھی۔

''میں سراغرساں پرویز جہانگیر ہوں اور میرا تعلق مقامی پولیس ڈپارٹمنٹ سے ہے۔'' اس نے اپنا بیج دکھاتے ہوئے کہا۔

''تم بات کرو میں باس سے ملنے جاتی ہوں۔'' کرن نے کشور سے کہا اور شجاع الدین کے آفس کی طرف مڑ گئی۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے اندر جھانکا تھا ایک چالیس سالہ صحت مند شخص میز کے پیچھے رکھی کرسی پر بیٹھا تھا اور فون پر کسی سے بات کر رہا تھا اس کے قریب رکھی کرسی پر ملک کے مشہور اخبارات پڑے تھے ایک دیوار میں لگی الماریوں میں بہت سی کتابیں' ایوارڈز' ٹرافیز رکھی تھیں اور نیوز روم سے متصل دیوار جو شیشے کی تھی اس سے دوسری طرف سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا اور درمیان میں لگا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا' کرن اندر جانے سے جھجک رہی تھی وہ جانتی تھی کہ اس کے اور شجاع کے درمیان ہونے والی گفتگو نیوز روم میں موجود لوگ بخوبی سن سکیں گے اور انہیں دیکھ بھی سکیں گے۔

'میں نہیں جانتا تم کر سکتے ہو یا نہیں مجھے آج ہی اس

کا انٹرویو چاہیے۔'' شجاع نے فون پر چیخ کر کہا۔ وہ کام کے سلسلے میں کسی سے رعایت نہیں کرتا تھا اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور اپنا سر کھجانے لگا۔

''ان خاتون رپورٹرز سے تو اللہ بچائے۔'' وہ بڑبڑایا اور اسی وقت کرن نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اندر داخل ہوئی وہ چند قدم آگے آ کر رک گئی تھی۔

''تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو؟'' شجاع نے غصے سے پوچھا۔

''جی۔''

''میں نے تمہیں چوبیس گھنٹے پہلے بلایا تھا۔''

''میرے ساتھ کچھ فیملی پرابلم تھا۔''

''اس کے لیے انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا؟''

''میرا بیٹا لیاقت اسپتال میں تھا'' اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

''کیا وہ زخمی تھا؟''

''نہیں۔''

''تو پھر انتظار کیا جا سکتا تھا۔''

''میں جانتی ہوں۔''

''ہم ایک نیوز آپریشن چلا رہے ہیں اور کچھ چینلز ہم سے اس مقابلے میں صرف دو پوائنٹ پیچھے ہیں اور تم سنجیدہ نہیں ہو کیا واقعی تم صحافی بننا چاہتی ہو؟ اگر ہاں تو پھر کام بھی صحافی کی طرح کرو۔''

''میں جانتی ہوں آپ مصروف ہیں' اگر آپ کے پاس وقت نہیں ہے تو میں پھر آ جاؤں گی۔'' کرن نے کہا تو شجاع کے چہرے پر نرمی کے آثار نظر آنے لگے۔

''تم نے لڑکیوں پر تشدد والی اسٹوری کیوں کور نہیں کی؟'' شجاع نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

''میرے خیال میں ایسا کرنا ٹھیک نہیں تھا۔'' کرن نے کہا۔

''کیا مطلب؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''بچے بھی ٹی وی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔''

''لیکن خبریں تو نشر کرنا ہی ہوتی ہیں بھلا خبروں سے اس کا کیا تعلق؟''

''بچے حساس ہوتے ہیں وہ ایسی خبروں سے اثر لے سکتے ہیں...... وہ معاشرے کی غلط تصویر ذہن میں بٹھا سکتے ہیں۔''

''میری بلا سے' کیا تمہاری جرنلزم کی کلاس میں تمہیں یہی پڑھایا گیا تھا؟ لوگوں کا حق ہے کہ انہیں سچائی بتائی جائے۔'' شجاع نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے صرف جنسی تشدد کی خبروں پر اعتراض ہے۔'' کرن نے کہا اسے اپنی جرات پر خود بھی حیرت ہو رہی تھی۔ اور شجاع بھی اسے غیر یقینی انداز سے دیکھ رہا تھا۔

''مجھے سکھایا گیا ہے کہ لوگوں تک سچی خبریں پہنچائی جائیں لیکن ہمیں جنسی تشدد کا شکار ہونے والی لڑکیوں اور ان کے خاندانوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے' کہ ایسی خبروں سے ان پر کیا گزرے گی۔'' کرن نے کہا۔ ''اور بچے......''

''بس کرو کرن...... ہماری پہلی ترجیح ہمارے اسٹاک ہولڈرز ہیں جتنا زیادہ ہمارا چینل دیکھا جائے گا اتنی ہی ریٹنگ بڑھے گی اتنے ہی اشتہار ملیں گے اور ڈالرز میں کمائی ہوگی' ہمارا فرض ہے کہ خبریں ڈھونڈیں اور انہیں من و عن پیش کر دیں اس سے قطع نظر کہ کون دیکھ رہا ہے یہ ایک کاروبار ہے۔''

''کاروبار؟'' کرن نے حیرت سے کہا۔

''ہاں' میں نیوز ڈائریکٹر ہوں اور اگر میں کہہ رہا ہوں کہ یہ کاروبار ہے تو ہے' تم کچھ نہیں ہو سوائے ان خبروں کو پیش کرنے والی کے' تم میرے چینل کے لیے کام کرتی ہو میں چاہوں تو تمہیں نکال باہر کر سکتا ہوں۔''

''چینل سے میرا کانٹریکٹ پرائم ٹائم نیوز اینکر کا ہے۔'' کرن نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کیا؟ کیا کہا۔'' شجاع غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ ''وہ کانٹریکٹ تمہاری ملازمت بچا سکتا ہے لیکن تم اس ڈیپارٹمنٹ کے لیے کام کرو گی اور تمہیں اسائنمنٹ میں دوں گا تمہاری خبروں کی نشریات صرف تیس منٹ کی ہیں باقی وقت میں تم ایک سڑکوں پر پھرنے والی رپورٹر ہو گی تم ایسا کرنے پر مجبور ہو گی تمہیں پتہ چلنا چاہیے کہ ایک صحافی کے لیے صرف خوبصورت ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اور بھی

بہت مشقت کرنا پڑتی ہے تمہیں ہر پیش آنے والے واقعے کی رپورٹنگ کرنا ہوگی' چاہے وہ کیسا ہی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ ہو کسی چھوٹی سی تقریب میں فیتہ کاٹنے سے لے کر شہر کی سیاسی تقریب کی کورنگ تک۔'' شجاع کا غصہ عروج پر تھا۔

''شکریہ شجاع صاحب۔'' کرن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شکریہ؟ یہ کیا بکواس ہے میں تمہیں ڈانٹ رہا ہوں اور تم......''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں' شام کی خبروں میں کسی تجربہ کار اینکر کو ہونا چاہیے' میں اس کام میں دلچسپی رکھتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ آپ میری رہنمائی اور اصلاح کریں میں وعدہ کرتی ہوں کہ وقت کے ساتھ ساتھ مجھے تجربہ حاصل ہوگا اور آپ کو ایک تجربہ کار اینکر ملے گی۔ میری صحافت کی ڈگری مجھے اس ملازمت کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ آپ کا اطمینان اور رضامندی ضروری ہے اور میں رپورٹنگ کا کام دینے پر بھی آپ کی مشکور ہوں مجھے واقعی ایسی پریکٹس کی ضرورت ہے۔'' کرن نے عقلمندی سے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی' شجاع الدین اس کے رویے پر حیرت زدہ اور خوش نظر آ رہا تھا۔

''لیکن میں اگلے پیر سے پہلے کام شروع نہیں کر سکتی۔'' کرن نے جلدی سے کہا۔

''کیوں؟ اس کی وجہ؟''

''میرا بیٹا کمال اسکول میں لڑنے کی وجہ سے اسکول سے نکال دیا گیا ہے وہ گھر پر اکیلا ہے میں اس کا داخلہ کسی دوسرے اچھے اسکول میں کروانا چاہتی ہوں تاکہ یکسوئی سے کام کر سکوں۔'' کرن نے کہا اور شجاع نے انٹر کام کا بٹن دبا کر ہانک لگائی۔

''حامد میرے آفس میں آؤ۔'' شجاع کی بات ختم ہوئی تو کرن نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا حامد اپنے کیمرے کے ساتھ نیوز روم سے شجاع کے آفس میں داخل ہو رہا تھا اندر آتے ہوئے اس نے کرن کو بھی سلام کیا اور اس کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ وہ شجاع کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''حامد: اب سے کرن تمہارے ساتھ تمہاری گاڑی میں رپورٹنگ پر جایا کرے گی۔'' شجاع نے کہا۔

''شجاع یہ مت کرو تمام پولیس والے مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں' ہم میں بے تکلفی ہے وہ مجھ سے اور میں ان سے تعاون کرتا ہوں' ہمارے ساتھ ایک عورت ہمارے کام میں خلل کے سوا اور کچھ نہیں ہوگی ہمیں اپنی ہر بات سوچ سمجھ کر کرنا ہوگی' ہم بے تکلفی سے گفتگو نہیں کر سکیں گے۔''

''تو اس کو سکھاؤ کہ ایک رپورٹر کیسے بنا جاتا ہے۔'' شجاع نے کہا۔

''مجھ پر رحم کرو میرے کام کو مشکل مت بناؤ تمہیں پتہ ہے کوئی حادثہ ہو تو پولیس کی وجہ سے مجھے فوراً اطلاع مل جاتی ہے اور میں واقعے کی تصویریں اور ویڈیو بنا کر وہاں سے چلا آتا ہوں' اس سے پہلے کہ دوسرے چینل کے رپورٹر وہاں پہنچیں وہ کام کو مشکل بنا دیتے ہیں۔''

''لیکن میرے خیال میں کرن کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیا یہ اب بھی شام کی خبریں پیش کرے گی؟'' حامد نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''تو یہ نہیں ہو سکتا نیوز کا کوئی شیڈول نہیں ہوتا کوئی بھی ہنگامی خبر کبھی بھی آ سکتی ہے۔''

''یہ پیر سے تمہارے ساتھ کام شروع کر رہی ہے بس۔'' شجاع کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے۔''

''کیا میں گھر جا سکتی ہوں' مجھے کمال کی فکر ہے۔'' کرن نے شجاع سے کہا۔

''کیا وہ بیمار ہے؟'' شجاع نے پوچھا۔

''نہیں' میں نے بتایا نا میں اس کا داخلہ کسی دوسرے اسکول میں کروانا چاہتی ہوں۔''

''حامد' کیا تم پاک سٹی اسکول میں کسی کو جانتے ہو؟'' شجاع نے حامد سے پوچھا۔

''ہاں چند لوگوں کو جانتا ہوں۔''

''کرن اور اس کے بیٹے کو ساتھ لے جاؤ اور اس کا داخلہ کروا دو...... اور آج رات کی خبر ضرور نشر ہونا چاہیے کرن وہی کچرا کنٹینر والی ہم اب بھی اسے ٹیلی

کاسٹ کرسکتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے۔" کرن نے کہا اور پھر وہ حامد کے ساتھ شجاع کے آفس سے نکل گئی تھی اس کے بعد اس نے کچرا کنٹینر کی خبر کے لیے جائے حادثہ پر جا کر خبر کی ویڈیو بنوائی تھی اور پھر حامد کے ساتھ کمال کے اسکول پہنچی تھی جہاں سے اسے کمال کے کاغذات لینا تھے جو نئے اسکول میں جمع کروانا تھے۔
"اگر تم مناسب سمجھو تو میں تمہارے ساتھ اسکول کے اندر چلوں؟" حامد نے پوچھا۔
"نہیں' میں خود یہ معاملہ طے کروں گی۔" کرن نے کہا "تم میرا یہیں انتظار کرو۔" وہ گاڑی سے اتر کر اسکول میں داخل ہوئی تھی جہاں رجسٹرار آفس میں اس کی ملاقات خاتون رجسٹرار سے ہوئی تھی۔ جس نے ایک گرمجوش مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا تھا۔
"کیا میں آپ کی کچھ مدد کرسکتی ہوں؟"
"ہاں میرے بچے کا ٹرانسفر دوسرے اسکول میں ہوگیا ہے میں اس کے ریکارڈ کے کاغذات لینے آئی ہوں۔"
"کیا آپ اس علاقے سے شفٹ کررہی ہیں؟"
"نہیں۔"
"دراصل ہم اپنے طالب علموں کو کھونا نہیں چاہتے ......" رجسٹرار خاتون نے کہا۔ "آپ اپنے بچے کو کیوں لے جانا چاہتی ہیں؟"
"میں نے اس کے لیے یہی بہتر سمجھا۔" کرن نے کہا اور خاتون رجسٹرار نے الماری کی دراز سے کمال کی ریکارڈ فائل نکال لی۔
"لیکن مجھے حیرت ہے اس فائل کے ساتھ نوٹ لگا ہے کہ اسے ہیڈ ماسٹر کی اجازت کے بغیر کسی کو نہیں دیا جاسکتا۔" رجسٹرار خاتون نے کہا۔
"یہ درست کہہ رہی ہے۔" اسی وقت ہیڈ ماسٹر احتشام کمرے میں داخل ہوئے۔
"لیکن یہ میرے بیٹے کا ریکارڈ ہے مجھے دوسرے اسکول میں جمع کرانا ہے۔"
"یہاں انچارج میں ہوں جب مناسب سمجھوں گا خود ریکارڈ بھیج دوں گا تم یہاں سے جاسکتی ہو ورنہ میں پولیس کو فون کروں گا۔"
"مسٹر احتشام ذرا مسکرایئے۔" کرن کے جواب دینے سے پہلے حامد اپنے کیمرے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔
"تم کون ہو؟" احتشام تیزی سے اس کی طرف مڑا۔
"کیمرہ بند کرو...... تمہیں یہاں تصویریں بنانے کی اجازت نہیں ہے تم ان تصویروں کو میرے خلاف استعمال نہیں کرسکتے۔"
"ہم کرسکتے ہیں یہ بھی ایک خبر ہے۔" حامد نے کہا اور کرن رجسٹرار خاتون کی میز سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔
"حامد ویڈیو بناؤ...... اس ویڈیو میں لوگ دیکھیں گے کہ ایک غیر ذمہ دار ہیڈ ماسٹر کس طرح ایک معصوم تیرہ سالہ بچے کی زندگی سے کھیل رہا ہے' ہاں اگر تم اسپتال میں اور یہاں جو میری بے عزتی کی اس کے لیے معافی مانگ لو تو میں حامد سے درخواست کروں گی کہ وہ یہ ویڈیو ضائع کردے۔" کرن نے کہا۔
"تم یہی کہنا چاہتی ہو نا کرن کہ کمال کو اسکول سے نکال کر ہیڈ ماسٹر نے غلطی کی ہے اور اب اسے اس کی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔" حامد نے کہا۔
"ہاں ...... تم سوری کرلو۔" کرن نے ہیڈ ماسٹر سے کہا۔
'میں ایسا نہیں کرسکتا ورنہ مسز فرقان بہت برہم ہوں گی۔"
'مسز فرقان کی خوشنودی زیادہ اہم ہے یا گرین فیلڈ اسکول کے بورڈ کو اور سارے شہر کو یہ دکھانا کہ تم کتنے ظالم اور خوشامد پسند ہو۔" کرن نے غصے سے کہا۔
"ٹھیک ہے میں تمہیں ریکارڈ دے دوں گا پہلے تم مجھے یہ ویڈیو دو۔" احتشام نے زچ ہوکر کہا۔
"حامد' مجھے ٹیپ دو۔" کرن نے حامد سے کہا اور اس نے ٹیپ کرن کو دے دی۔
"انہیں کمال کا ریکارڈ دے دو۔" ہیڈ ماسٹر نے رجسٹرار خاتون سے کہا اتنی دیر میں حامد دوبارہ ویڈیو کیمرہ آن کرچکا تھا۔
"اب معافی مانگنے کا وقت ہے تم معافی مانگو تو تمہیں وہ ویڈیو ملے گی جس میں تم نے کرن کے ساتھ بدتمیزی کی

ہے۔'' حامد نے کہا۔

''ٹھیک ہے مس کرن میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کا دل دکھایا اور آپ کے بیٹے کو بے وجہ اسکول سے نکالا۔'' احتشام نے کہا اس کے چہرے سے غصہ نمایاں تھا کرن کمال کا ریکارڈ لے کر واپس گاڑی میں آ بیٹھی تھی۔

''تم نے کمال کر دیا حامد ورنہ ہیڈ ماسٹر اتنی آسانی سے ریکارڈ دینے والا نہیں تھا۔''

''ہاں، جب تمہیں دیر لگی تو میں تمہارے پیچھے آ گیا اور میں نے وہاں جو منظر دیکھا فوراً اس کو شوٹ کرنے لگا۔'' حامد نے جواب دیا پھر وہ دونوں پاک سٹی اسکول گئے تھے اور وہاں کمال کے کاغذات جمع کروا دیئے تھے۔

❖......☆......❖

وہ جب سے ڈاکٹر بدر کے کلینک آئی مسلسل رو رہی تھی وہ اس کے خاص کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جہاں وہ اکثر اس کی تھراپی کرتا تھا اس کا بیٹا کمال برابر کے کمرے میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا جہاں ڈاکٹر بدر نے اسے بٹھایا تھا تاکہ وہ اسے دیکھنے سے پہلے اس کی ماں کی تھراپی بھی کر دے جو وہ کافی عرصے سے کر رہا تھا اور کمال کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اتنے عرصے ڈاکٹر بدر سے علاج کروانے کے باوجود اس کی ماں ٹھیک کیوں نہیں ہوتی، ڈاکٹر سے ملنے کے بعد اس کی نفسیاتی کیفیت زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔

''میں جاننا چاہتا ہوں کرن کہ تم کیوں چاہتی ہو کہ کمال کو مزید تھراپی کی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر بدر نے کرن سے پوچھا جو اس کے سامنے صوفے پر بیٹھی رومال سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔

''اسے گرین فیلڈ اسکول سے نکال دیا گیا ہے لڑنے کی وجہ سے۔''

''اس کی وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ اسے دوسرے لڑکے تنگ کرتے ہوں جس کے جواب میں وہ لڑتا ہو اس عمر میں اکثر لڑکے ایسا کرتے ہیں، تم چاہو تو میں اسے مارشل آرٹ سکھا سکتا ہوں تاکہ وہ ایسے لڑکوں سے اپنی حفاظت کر سکے۔''

''نہیں، میں نہیں چاہتی وہ پہلے بھی بہت لڑتا ہے مارشل آرٹ سیکھنے کے بعد تو......''

''ایسا نہیں ہے مارشل آرٹ کی ایک قسم کریومیگا (krav Maga) ہے جو ذہن کو سکون میں رکھنا سکھاتی ہے اور بتاتی ہے کہ لڑنے سے کیسے خود کو باز رکھا جائے۔''

''میں چاہتی ہوں کہ لڑنا بند کر دے جبکہ مارشل آرٹ اسے جسم کے خاص حصوں پر کاری ضرب لگانا بھی سکھاتا ہے میں نہیں چاہتی کہ وہ کسی ساتھی کو خطرناک حد تک نقصان پہنچا بیٹھے وہ تو یہاں آنا بھی نہیں چاہتا تھا میں اسے زبردستی لائی ہوں۔'' کرن نے کہا اور ڈاکٹر بدر نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

''میں...... اپنی تھراپی کے لیے نہیں آئی ہوں......''

کرن نے جلدی سے کہا کافی عرصے سے ڈاکٹر بدر کے ساتھ تنہائی میں خود کو بے آرام سمجھتی تھی اسے ڈاکٹر کی قربت ناگوار گزرتی تھی کیونکہ وہ تھراپی کے بہانے اس سے بہت نزدیک آنے کی کوشش کرتا تھا۔

''تمہیں سکون کی ضرورت ہے ......تھراپی کی کمال سے زیادہ تمہیں ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر بدر نے کہا۔ ''اتنی دیر تک رک کر ہم دونوں کا انتظار کرنے کے لیے میں تمہاری مشکور ہوں۔''

''تمہیں دیکھ کر اور تم سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے تم جانتی ہو۔'' ڈاکٹر نے اپنائیت سے کہا اور اسے آرام دہ لیدر کے صوفے پر منتقل ہونے کا اشارہ کیا۔

''مجھے بتاؤ کمال سے تمہیں اور کیا شکایت ہے۔'' ڈاکٹر نے اس کے سامنے کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اسکول سے بھاگ نکلا اور اپنے ہیڈ ماسٹر کے گھر کے لان میں جگہ جگہ ٹوائلٹ پیپر لگا دیئے۔''

''وہ تیرہ سال کا ہے اور اس عمر میں لڑکے ایسی شرارتیں کرتے ہی ہیں۔''

''وہ پہلے بھی ایسی حرکتیں کرتا رہا ہے اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ وہ ایسا نہیں کرے گا ایسا پہلی بار ہوا ہے اس نے پہلے بھی مجھ سے کیا ہوا وعدہ نہیں توڑا۔''

''اور تم اپنی طرف سے کیوں پریشان ہو؟''

''میں اپنی ملازمت کے لیے شاید قابلیت نہیں رکھتی

میرا باس مجھے ملازمت سے نکالنے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہے اور اگر اسے پتہ چل گیا کہ میں ذہنی طور پر بھی بیمار ہوں اور ایک ماہر نفسیات سے علاج کروا رہی ہوں تو اسے مجھے نکالنے کی بہت اچھی وجہ مل جائے گی اور میں ایک تیرہ سالہ نالائق بچے کی ماں ہوں جسے اسکول سے تین بار نکالا جا چکا ہے۔'' کرن اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلی گئی تھی اور باہر سڑک پر جاتی ٹریفک کو دیکھ رہی تھی لیکن دراصل وہ ڈاکٹر بدر سے اپنے آنسو چھپا رہی تھی۔

''اور؟'' ڈاکٹر بدر نے اس کے قریب آ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ چونک کر پیچھے مڑی۔

''ڈاکٹر' تم میرے بہت اچھے دوست ہو' میں جانتی ہوں تم مجھے پسند کرتے ہو مجھ سے ملنا چاہتے ہو' لیکن میں مجبور ہوں تم عرصے سے میرا علاج کر رہے ہو تم سے میرا کوئی راز پوشیدہ نہیں لیکن اب میں تم سے ملنا نہیں چاہتی کمال بھی تم سے میرے ملنے کو پسند نہیں کرتا اس سے میری پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوگا۔''

''تم اب بھی مجھے صحیح بات نہیں بتا رہی ہو کہ کمال سے تمہیں کیا شکایت ہے؟''

''وہ سمجھتا ہے کہ میں جھوٹی ہوں۔''

''کیا ایسا ہے؟''

''وہ اپنے والد کے بارے میں جاننا چاہتا ہے اور میں اسے نہیں بتا سکتی مجھے کچھ یاد ہی نہیں ہے۔''

''اس نے تمہاری کسی بات پر تمہیں جھوٹا سمجھا؟''

''اس نے مجھ سے پوچھا وہ کون ہے......؟ اس کا باپ کون تھا؟ ہمارا کوئی خاندان کیوں نہیں ہے؟ ہمارے پاس اپنی فیملی اور اس کے باپ کی تصویریں کیوں نہیں ہیں؟'' کرن بات کرتے کرتے بڑے سے صوفے میں دھنس کر بیٹھ گئی اس کے آنسو پھر بہہ رہے تھے۔''میں نہیں جانتی اس کی ان باتوں کا کیا جواب دوں مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔''

''کرن میں نے تم سے کئی بار کہا ہے کہ تم اپنی پچھلی یادداشت ریکور کرنے کے لیے تھراپی کرالو لیکن تم سنتی ہی نہیں ہو۔ میں تم پر زور نہیں دوں گا لیکن میری درخواست ہے کہ تم اس بارے میں سوچو۔''

''لیکن میں کمال کو کیا بتاؤں؟''

''سچائی بتاؤ جو تمہیں پتا ہے تمہیں آخری بات جو یاد ہے کہ جب تم ہوش میں آئیں تو تم ایک اسپتال میں تھیں اور تم نے کمال کو جنم دیا تھا اس سے پہلے کی کوئی بات تمہیں یاد ہی نہیں سوائے اس کے کہ تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور پھر اسپتال میں آنکھ کھلی تھی جہاں تم سے ملنے بھی کوئی نہیں آیا اور تم نے اکیلے ہی نئی زندگی کا آغاز کیا۔'' ڈاکٹر نے کہا اور اس کے قریب سے ہٹ گیا کرن کی آنکھیں بند تھیں پھر اسے ڈاکٹر کے دور ہوتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تھی اور کمرے میں ہلکی ہلکی موسیقی گونجنے لگی تھی ڈاکٹر نے اسے ایک کمبل اوڑھا دیا تھا۔

''میں کمال کے ساتھ ہوں اس کی تھراپی کر رہا ہوں تم جب تک آرام کرو۔'' ڈاکٹر نے کہا اور کرن نیند کی وادی میں چلی گئی۔

واپسی پر ڈاکٹر بدر اپنی گاڑی میں کرن اور کمال کو چھوڑنے اس کے گھر تک آیا تھا دور ہی رپورٹر حامد کی گاڑی کھڑی تھی جو نظروں سے اوجھل تھی حامد نے ایک حساس مائیک کرن کے گھر کی کھڑکی میں لگایا ہوا تھا جہاں سے اسے کرن اور دوسروں کے باتیں کرنے کی آوازیں اپنی گاڑی میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''مام' جلدی آئیں میں بہت تھک گیا ہوں۔'' کمال نے ڈاکٹر کی گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر بدر ہمیں گھر تک چھوڑنے کا شکریہ۔'' کرن نے کہا۔'میں تو نیند میں تھی پتہ نہیں کیسے گھر آگئی تم اب یہاں اترنے کی زحمت مت کرو میں کمال سے بھی کچھ بات کرنا چاہتی ہوں تمہارا شکریہ کہ تم نے کمال سے بات کی اور ہمارے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔'' کرن نے کہا۔

''تم لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی جب اپنی کار لینے آؤ تو مجھے ضرور بتانا ہم ساتھ لنچ کریں گے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''نہیں میرا دوست حامد میری مدد کر دے گا۔''

''میرے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے۔''

''میرے خیال میں ہے' تم مجھ سے ایک دوست سے زیادہ کی توقع رکھتے ہو اور مجھے اس وقت صرف ایک

دوست کی ضرورت ہے میں تمہاری امیدوں پر پوری نہیں اتر سکتی شب بخیر۔'' کرن نے کہا اور کمال کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوگئی۔ ڈاکٹر بدر کی گاڑی جانے کے بعد حامد بھی وہاں سے رخصت ہوگیا تھا۔

دوسری صبح جب کرن سو کر اٹھی تو اسے بہت حیرت ہوئی کیونکہ اس کے کچن کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اسے اچھی طرح یاد تھا کہ رات کو سونے سے پہلے اس نے تمام کھڑکی دروازے خود بند کیے تھے' اس نے کمال سے بھی اس بارے میں پوچھا کہ شاید اس نے کسی وقت کھڑکی کھولی ہو لیکن وہ بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا' اس روز کرن نے کمال کے ساتھ باہر ہی لنچ کرنے کا فیصلہ کیا اور اسکول سے اسے جلد ہی اپنے ساتھ لے کر ایک قریبی ریسٹورنٹ میں پہنچ گئی جہاں اس کی ملاقات سراغرساں پرویز سے ہوئی وہ بھی اپنے بیٹے رحمان کے ساتھ وہاں لنچ کرنے آیا ہوا تھا۔ وہ کرن کو پہچان گیا اور اسے اپنے ساتھ لنچ کرنے کی دعوت دی۔ وہ کمال سے مل کر بہت خوش ہوا تھا اور کمال جلد ہی رحمان سے بے تکلف ہوگیا تھا کیونکہ وہ اس کا ہم عمر تھا۔

''مام' کیا میں اور رحمان وہ گیم کھیلنے جائیں۔'' کمال نے ریسٹورنٹ میں لگی گیم کی مشینوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' رحمان بھی اپنے والد سے اجازت لے رہا تھا پھر وہ دونوں گیم کھیلنے چلے گئے اور سراغرساں پرویز اور کرن اپنی میز پر تنہا رہ گئے۔

''اپنی بیوی کے انتقال کے بعد پہلا موقع ہے کہ میں کسی خاتون کے ساتھ اکیلا ہوں۔'' سراغرساں پرویز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں بھول ہی گیا ہوں کہ خواتین سے کیسے بات کی جاتی ہے۔''

''میں بھی۔'' کرن نے اداسی سے کہا۔

''کیا مطلب؟ آپ کے شوہر؟''

''ان کا بھی انتقال ہوگیا ہے۔'' کرن نے کہا۔

''اوہ مجھے افسوس ہوا۔'' پرویز نے کہا۔

''پرویز' تم مجھے اپنی ملازمت کے بارے میں بتاؤ۔''

''کیا بتاؤں؟ سراغرساں ہوں...... سراغرسانی کرتا ہوں۔'' پرویز نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ تو میں جانتی ہوں...... میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ شہر میں خواتین پر جنسی تشدد کی جو وارداتیں ہو رہی ہیں ان کے بارے میں تمہاری کیا معلومات ہیں؟'' کرن نے وضاحت کی۔

''ہاں ضرور اگر تم چاہتی ہو لیکن اس بارے میں ابھی زیادہ معلومات جمع نہیں ہوئی ہیں وہ جو بھی کوئی ہے کوئی طاقت ور شخص ہے اپنے شکار کو پیچھے سے دبوچتا ہے اس نے چہرے پر ماسک لگایا ہوتا ہے اس کے پاس ایک وین ہے جس میں کارپٹ بچھا ہے ہم ابھی تک اسے نہیں ڈھونڈ سکے ہیں اس کے علاوہ ہمیں کچھ معلومات نہیں ہیں جائے حادثہ پر وہ صرف زخمی یا مردہ شکار کو چھوڑ جاتا ہے اور ایک سفید گلاب وہاں سے ضرور ملتا ہے۔''

''گلاب؟'' کرن نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں جب بھی کوئی زخمی یا مردہ شخص ملتا ہے تو گلاب اس کے سینے پر رکھا ہوتا ہے یا ہاتھ میں ہوتا ہے۔''

''کیا گلاب سے کوئی کچھ اشارہ دینا چاہتا ہے؟'' کرن نے پوچھا۔

''ہم نے پھول فروخت کرنے والوں سے معلوم کیا ہے ایک سفید گلاب کسی کی معصومیت اور پاکبازی کو ظاہر کرتا ہے۔''

''اور ایک پیلا گلاب کیا ظاہر کرتا ہے؟''

''لیکن میرا خیال ہے کہ کسی بھی شکار لڑکی کے پاس سے ہمیں پیلا گلاب نہیں ملا ہے۔'' پرویز نے کہا۔

''کوئی مجھے ٹی وی اسٹیشن پر روزانہ ایک پیلا گلاب بھیجتا ہے جس میں ایک کارڈ لگا ہوتا ہے اور اس پر لکھا ہوتا ہے' مجھے معاف کردو' اس ہفتے ایک گلاب میری کار میں بھی ملا اور ایک گلاب میرے گھر کے دروازے پر بھی ملا۔'' کرن نے کہا تو پرویز نے اپنی جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکالا۔

''کیا گلاب تازہ تھا؟'' پرویز نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''ایک تازہ گلاب کا مطلب ہے' میں اب بھی تم سے محبت کرتا ہوں' اور ایک پیلا گلاب جو تازہ نہ ہو حسد کی نشاندہی کرتا ہے یا محبت ختم ہونے کی نشاندہی کرتا ہے اور یہ تم سے ایک درخواست ہی ہوسکتی ہے کہ تم بھیجنے والے کا خیال کرو۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کیا میں خطرے میں ہوں؟'' کرن نے پوچھا۔

''یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہوا ہے؟''

''اکثر ایک نیلے رنگ کی بڑی وین میرے گھر تک میرا پیچھا کرتی ہے اور آج صبح میرے کچن کی کھڑکی بھی مجھے کھلی ملی تمہارا کیا خیال ہے کہیں کوئی گھر میں داخل ہونے کی کوشش تو نہیں کر رہا تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ تم کسی بھی نئی تبدیلی پر سخت نظر رکھو جو معمول سے ہٹ کر ہو۔ احتیاط برتو۔'' پرویز نے کہا اور ایک کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ میرا کارڈ ہے اگر تمہیں اب گلاب ملے تو مجھے کال کرنا اسے یا اس کے اطراف کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔''

جس وقت پرویز کرن کو اپنا بزنس کارڈ دے رہا تھا ریسٹورینٹ کی دوسری بالکونی سے ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس شخص ادھر ہی دیکھ رہا تھا اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے اس نے زور سے بالکونی کی ریلنگ پر ہاتھ مارا۔

''وہ میری ہے اور سراغرساں پرویز اس کی موجودگی کے لیے تم ایک ایک سانس کی قیمت ادا کرو گے۔'' وہ تیزی سے مڑا اور اپنے پیچھے کھڑی لڑکی کو دھکا دے کر زینے سے نیچے اترنے لگا پھر وہ ریستوران سے باہر چلا گیا تھا قریب ہی ایک بوڑھا پھول بیچ رہا تھا وہ وہاں رک گیا۔

''جی جناب؟'' بوڑھے نے پوچھا اس شخص کی نظر مرجھائے ہوئے پھولوں پر تھیں جو ایک بکس میں پڑے تھے۔

''کیا یہ برائے فروخت ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''اوہ نہیں...... یہ تو باسی اور مرجھائے ہوئے ہیں...... میں نے کچرے میں ڈال دیئے ہیں۔''

''مجھے یہ چاہیے۔'' اس نے ایک سفید مرجھایا ہوا گلاب اٹھایا۔ ''یہ کتنے کا ہے؟''

پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر دس روپے بوڑھے کو پکڑائے تھے اور آگے بڑھ گیا تھا۔

''وہ میرے دل کی ملکہ ہے...... کوئی اور اسے پسند نہیں کر سکتا......'' وہ بڑبڑاتا ہوا قریب کھڑی نیلی وین میں بیٹھ گیا تھا۔

شام کو کرن کمال کے ساتھ گھر واپس آئی تو اس نے کچھ شاپنگ بھی کی تھی اور وہ تھک گئی تھی وہ آرام کی غرض سے اپنے بیڈروم میں گئی تو حیران رہ گئی اس نے بیڈروم کا دروازہ واپس بند کر دیا تھا اور دیوار سے لگ گئی تھی۔

''اوہ خدایا نہیں۔'' اس کے لہجے میں خوف تھا اس نے کمال کو کئی بار پکارا لیکن کمال نے اس کی آواز نہیں سنی کیونکہ اس نے تیز آواز میں میوزک چلایا ہوا تھا آخر وہ کمال کے کمرے کے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

''کمال میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ اتنی تیز آواز میں میوزک مت سنا کرو۔'' اس نے کمال کو ڈانٹا اور وہ حیران رہ گیا کیونکہ کچھ دیر پہلے تو اس کا موڈ ٹھیک تھا اور اب وہ اچانک غصے میں آ گئی تھی۔ ''اسے بند کرو۔'' کرن نے کہا تو کمال نے ٹی وی بند کر دیا۔

''اپنا بیگ لو ہم ابھی باہر جا رہے ہیں۔'' کرن نے کہا۔

''کیوں؟''

''گھر میں کوئی داخل ہوا ہے ممکن ہے وہ اب بھی کہیں چھپا ہوا ہو۔'' کرن نے سرگوشی میں کہا اور کمال کے ساتھ سیڑھیوں سے اترتی نیچے آ گئی پھر وہ سیدھی اپنی کار میں آ بیٹھی تھی اور کار کے دروازے لاک کر لیے تھے اس کے بعد اس نے اپنے سیل فون سے سراغرساں پرویز کو فون کیا تھا جس کا نمبر اس نے ریستوران ہی میں سیو کر لیا تھا۔

''ہیلو پرویز میں کرن بول رہی ہوں کیا تم ابھی میرے گھر آ سکتے ہو؟ یہ بہت ضروری ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''میں ابھی گھر آئی ہوں اور یہاں ایسی چیز ہے جو میں تمہیں دکھانا چاہتی ہوں۔''

''تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں...... لیکن کوئی ہمارے گھر میں داخل ہوا ہے۔''

''تم گھر سے باہر نکل جاؤ فوراً۔'' پرویز نے ہدایت کی۔

''میں اپنی کار میں ہوں گھر کے باہر۔''

''میں اس وقت پولیس اسٹیشن میں ہوں تم وہیں آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' کرن نے کہا اور کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔

''مام' آپ کو کیسے پتا چلا کہ کوئی ہمارے گھر میں داخل ہوا ہے؟'' کمال نے پوچھا۔

''میرے بیڈ پر ایک مرجھایا ہوا سفید گلاب پڑا تھا۔''

''تو؟''

''میں نے وہ وہاں نہیں رکھا تھا میرے خیال میں یہ میرے لیے ایک پیغام ہے۔''

''کیسا پیغام؟''

''یہ میں نہیں جانتی یہ سراغرساں پرویز ہی بتاسکتا ہے۔''

''وہ کیسے بتاسکتا ہے؟''

''وہ جانتا ہے پھولوں کے بارے میں' جب لوگ کسی کو پھول بھیجتے ہیں تو ان کی قسمیں ان کے بھیجے جانے کی وجہ بتاتی ہیں۔''

''یہ تو بکواس ہے۔''

''کمال......'' کرن نے تنبیہی انداز میں کہا۔

جب وہ پولیس اسٹیشن پہنچی تو سراغرساں پرویز اپنے اسسٹنٹ جواد حسین کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ اس نے پرویز کو مرجھائے ہوئے سفید گلاب کے بارے میں بتایا جو اس کے بیڈ پر پڑا تھا۔

''تم نے کسی چیز کو چھوا تو نہیں؟''

''نہیں......ہم فوراً ہی گھر سے نکل گئے۔''

''اچھا تم یہیں میرے آفس میں رکو مجھے اپنے گھر کی چابیاں دو اپنا پتہ بھی دو۔'' پرویز نے کہا پھر اس نے جواد حسین سے اس کا تعارف بھی کروایا تھا اور وہاں سے روانہ ہوگئے تھے۔

کرن کے گھر کی تلاشی لینے پر کوئی نہیں ملا تھا لیکن ایک دروازے کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا پھر پڑوس سے پوچھنے پر پرویز کو پتہ چلا تھا کہ ایک نیلے رنگ کی وین اکثر وہاں آتی ہے اور کرن کے دروازے کے سامنے رکتی ہے لیکن اس میں سے کوئی اترتا نہیں کبھی کبھی وہ وین آہستہ روی سے چلتی وہاں سے گزر جاتی ہے سراغرساں پرویز نے کرن کو کچھ دن کے لیے کسی اور جگہ رہنے کا مشورہ دیا تھا اور اس کے بیٹے کمال کو اپنے گھر لے گیا تھا جہاں وہ اس کے بیٹے رحمان کے ساتھ خوش رہ سکتا تھا' ان دونوں میں خاصی دوستی ہوگئی تھی وہ ہم عمر بھی تھے اور ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے کرن کے گھر کو سکیورٹی کے حساب سے سیٹ کروادیا گیا تھا تمام لاک نئے لگوائے گئے تھے اور گھر میں جگہ جگہ سکیورٹی کیمرے اور الارم نصب کیے گئے تھے اس تمام کام میں پندرہ دن لگے تھے اور ان پندرہ دنوں میں جنسی تشدد کی دو وارداتیں ہوچکی تھیں جن میں دو لڑکیوں کو ماردیا گیا تھا جس کی خبر چینل-10 سے کرن نے ہی نشر کی تھی۔

اپنے گھر میں شفٹ ہونے کے بعد کرن زیادہ مصروف ہوگئی تھی اور ڈاکٹر بدر کے پاس تھراپی کے لیے نہیں جاسکی تھی ویسے بھی اس کا ارادہ اب تھراپی کرانے کا نہیں تھا وہ کمال کے لیے پریشان تھی اسے راہ راست پر لانا چاہتی تھی اچانک ایک روز ڈاکٹر بدر کا فون آیا وہ اپنے آفس میں بیٹھی تھی۔

''ہیلو' کرن میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''یہ بہت ضروری ہے کرن میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں' یہ ہم دونوں کے لیے ضروری ہے کیا تم میرے ساتھ آج لنچ کرسکتی ہو؟''

''میں مصروف ہوں اور میرے روزانہ کے کام پہلے سے پلان ہوتے ہیں' حامد تھوڑی دیر میں آتا ہی ہوگا اس کے بعد مجھے رپورٹنگ پر جانا ہے۔''

''بس کچھ دیر کے لیے آجاؤ میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔'' ڈاکٹر بدر نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' کرن نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہامی بھرلی۔

جب وہ ریستوران میں پہنچی تو ڈاکٹر بدر وہاں موجود تھا اس نے گرمجوشی سے کرن کا استقبال کیا۔

''میں آگئی ہوں لیکن مجھے جلدی واپس جانا ہے۔'' کرن نے بیٹھتے ہوئے کہا اس نے میز پر رکھا ہوا نیپکن اپنے زانو پر پھیلایا تھا اور مینو دیکھنے لگی تھی۔

''میں نے کھانے کا آرڈر دے دیا ہے۔'' ڈاکٹر بدر

نے جلدی سے کہا۔
''اوہ' اچھا کیا مجھے بہت کام کرنا ہے۔''
''ابھی تمہارا شو ہونے میں کافی وقت ہے تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے؟''
''حامد میرا انتظار کررہا ہے میں نے تمہیں بتایا بھی تھا۔'' کرن نے اسے یاد دلایا۔
''آج ہاف ڈے کرلو۔''
''کیا؟ میری ملازمت نئی ہے میں ایسا نہیں کرسکتی۔''
''یہ ایک مہنگا ریسٹوران ہے میں نے تمہارے لیے بکنگ کرائی ہے تم میرے ساتھ ایسا نہیں کرسکتیں۔'' اس نے خاصے اونچے لہجے میں کہا کہ اردگرد کے لوگ ان کی طرف متوجہ ہوگئے کرن اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی تو ڈاکٹر بدر نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے بٹھادیا۔
''دیکھو کرن' میں کچھ وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں ہم یہاں سے اپنا لنچ پیک کرواکر چلتے ہیں میری بوٹ تیار ہے ہم کھلے سمندر میں سیر کے لیے جائیں گے وہیں باتیں ہوں گی۔''
''میں تمہاری بات سے متفق نہیں ہوں' میں نے بتایا' میں آفس سے غیر حاضر نہیں ہوسکتی' لنچ کرکے واپس چلی جاؤں گی۔''
''حامد تمہاری جگہ سنبھال لے گا میں تمہیں خبروں کے وقت تک واپس پہنچادوں گا۔''
''ڈاکٹر بدر' میں نے پہلے کبھی تمہیں ایسے موڈ میں نہیں دیکھا' کیا بات ہے؟'' کرن نے پوچھا۔
''تم جانتی ہو میں تمہارا اور کمال کا بہت خیال رکھتا ہوں وہ میرے لیے بالکل میرے بیٹے کی طرح ہے اور تم......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیسے بات کروں ......؟ میں دوبارہ شروع کرتا ہوں۔''
''خدا کے لیے ڈاکٹر......بس کرو۔''
''کرن؟''
''تم اب تک میرے بہت اچھے دوست رہے ہو۔''
''ہاں' وہ تو میں ہوں اور میں کوشش کررہا ہوں کہ تمہاری یادداشت بھی واپس لاسکوں۔''
''میری زندگی میں کوئی اور شامل ہوگیا ہے۔'' کرن نے کہا اور ڈاکٹر بدر اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔
''تم کسی اور سے ملتی ہو اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں؟'' ڈاکٹر بدر کی آواز میں غصے کی جھلک نمایاں تھی۔
''نہیں میں ابھی اس سے ملی نہیں ہوں لیکن ملنا چاہتی ہوں۔''
''تمہارے ماہر نفسیات کے طور پر میرا مشورہ ہے کہ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو تم ذہنی مریض ہو۔'' ڈاکٹر بدر نے غصے سے کہا اور کھڑا ہوگیا پھر وہ تیز تیز چلتا ہوا ریسٹوران سے نکل گیا تھا اور کرن اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئی تھی پھر وہ بھی واپس آفس چلی گئی تھی جہاں اس نے حامد کو ڈاکٹر بدر کے بارے میں بتایا تھا تو وہ ہنس پڑا۔
''میں اسے جانتا ہوں ایک زمانے میں' میں بھی اس کے پاس جاتا تھا' پھر میں نے جانا چھوڑ دیا۔''
''کیوں؟''
''مجھے شک تھا کہ وہ مجھے ہپناٹائز کرکے اپنے اشاروں پر چلاتا ہے۔''
''مجھے بھی یونہی لگا' جیسے وہ مجھے کٹھ پتلی کی طرح استعمال کررہا ہے میں نے بھی جانا چھوڑ دیا۔''
''اس کے پاس گاڑی کون سی ہے؟''
''بلو کلر کی بڑی وین۔'' کرن نے جواب دیا۔
''میں نے کئی بار تمہارے گھر کے سامنے سے اسے دیکھا ہے۔'' حامد نے کہا۔
''کیا وہ میری جاسوسی کررہا ہے؟''
''یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن اگر ایسا ہے تو کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔''
''حیرت ہے' میں جب سے اسے جانتی ہوں آج تک اس نے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ہمیشہ وہ میری ضرورت پر میرے کام آیا ہے لیکن کمال اسے پسند نہیں کرتا۔''
''بعض اوقات بچوں کی چھٹی حس بڑوں سے زیادہ تیزی سے کام کرتی ہے بھلا ہم ڈاکٹر بدر کے بارے میں کتنا جانتے ہیں سوائے اس کے کہ ہم نے اس سے علاج کروایا اس کی فیسیں دیں لیکن کوئی فائدہ ہمیں نہیں ہوا۔''
''تم نے کل رات اسے میرے گھر کے باہر دیکھا تھا؟''

''مجھے شک ہے یقین نہیں۔''

''کمال اسے پسند نہیں کرتا۔'' کرن نے کہا پھر وہ اس کے ساتھ ریورننگ کے لیے چلی گئی تھی واپسی پر حامد نے اسے اس کے گھر پر ڈراپ کیا تھا۔

اسی رات ایک نیلے کلر کی وین آہستہ آہستہ چلتی کرن کے گھر کے سامنے آرکی تھی کچھ فاصلے پر ہمسایوں کے گھر سے ہلکی ہلکی روشنی نظر آرہی تھی لیکن وین کے ڈرائیور کی توجہ کرن کے گھر کی طرف تھی جو سڑک کے دوسری جانب واقع تھا۔

''تم سمجھتی ہو کہ خوبصورت ہو تو سب سے برتر ہو؟ کل جب خبریں نشر ہوں گی تو تم بھی ایک خبر بن چکی ہو گی پھر کیا کرو گی؟'' ڈرائیور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور وین سے اتر کر سڑک پار کر کے کرن کے گھر کے لان میں داخل ہو گیا وہ جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا تمام کھڑکیوں کو چیک کر رہا تھا جو اندر سے لاک تھیں پھر گھر کے پچھلی طرف اسے ایک کھڑکی کھلی مل گئی اس نے ایک ماسک نکال کر منہ پر چڑھایا اور کھڑکی کھول دی وہ کھڑکی کچن میں کھلتی تھی وہ کرن کو کام کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا وہ جلدی سے نیچے جھک گیا اور سوچ رہا تھا کہ جب وہ اسے پکڑے گا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا' میں اس کے دروازے پر اپنا پیغام چھوڑ جاؤں گا۔

تھوڑے ہی فاصلے پر حامد بھی اپنی وین میں موجود تھا' آج کرن سے بات کرنے کے بعد اسے محسوس ہوا تھا کہ کرن خطرے میں ہے چنانچہ اس کے گھر میں سیکیورٹی نظام ہونے کے باوجود اس نے خود کرن کو بتائے بغیر اس کے گھر کا پہرہ دینے کا فیصلہ کیا تھا کچھ دیر بعد کمال کے کمرے کی لائٹ بند ہو گئی تھی' اور گھر اندھیرے میں ڈوب گیا تھا حامد نے کچھ دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی وین ہی میں لیٹنے کی کوشش کی اسی لمحے کسی نے دروازہ کھول کر اسے بالوں سے گھسیٹ کر باہر نکال لیا تھا وہ جو کوئی بھی تھا بہت طاقتور تھا اس نے حامد کو سنبھلنے کی مہلت نہیں دی تھی۔

''میرے بال چھوڑو۔''

''تم کیا سمجھتے ہو میں تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب ہونے دوں گا؟ وہ میری ہے۔'' بولنے والے نے ایک مکا پوری طاقت سے اس کی کنپٹی پر مارا تھا اور اس کی آنکھوں میں ستارے ناچ گئے تھے' وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

کرن کے لان میں چھپا سایہ پھر آہستہ آہستہ کچن کی کھڑکی کی طرف بڑھا تھا اور اچانک ایک جھاڑی میں الجھ گیا تھا جس میں بے انتہا کانٹے تھے وہ ابھی خود کو ان کانٹوں سے آزاد ہی کرا رہا تھا کہ اسے اپنے عقب سے ایک کرخت آواز آئی۔

''رک جاؤ' ورنہ میں تم پر اپنا کتا چھوڑ دوں گا۔'' یہ کرن کے پڑوسی بلال کی آواز تھی سائے نے مڑ کر دیکھا بلال اس سے مخاطب نہیں تھا بلکہ وہ سڑک پر پڑے حامد کے پاس کھڑے دو سایوں سے مخاطب تھا جو اس پر جھکے ہوئے تھے' اس کے کتے نے ایک سائے کو زمین پر گرا دیا تھا اور دوسرا سایہ بھاگ نکلا تھا' کتا سائے کو گرا کر اس کے سینے پر کھڑا ہو گیا تھا اور بلال نے جیب سے موبائل نکال کر پولیس کو فون ملایا تھا اور صورت حال بتا کر پتہ سمجھا دیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں پولیس وہاں پہنچ گئی تھی اور زخمی حامد اور ایک مجرم کو پکڑ کر لے گئی تھی جس کو بلال کے کتے نے گرایا ہوا تھا' کرن کے لان میں موجود سایہ ایک دیوار کی آڑ میں اس وقت تک چھپا رہا جب تک سب وہاں سے چلے نہیں گئے تھے سب کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر کچن کی کھڑکی کے قریب گیا تھا اور کھڑکی کھول کر اندر کچن میں اتر گیا تھا۔

''مام' ادھر آئیں اوپر میرے کمرے میں' دیکھیں کیا ہو رہا ہے پولیس نے کسی کو گرفتار کیا ہے۔'' اچانک کمال کی آواز سنائی دی اور اندر آنے والا تیزی سے الماری کی اوٹ میں چھپ گیا اوپر منزل میں کوئی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

''کمال بہت رات ہو گئی ہے صبح تمہیں اسکول جانا ہے اب سو جاؤ۔''

''میں سو گیا تھا ایمبولینس کی آواز سے اٹھا ہوں' میرا خیال ہے کسی کو چوٹ لگی ہے۔''

''بہت زیادہ دھند ہے کچھ دکھائی نہیں دے رہا اور ایمبولینس بھی چلی گئی ہے چلو اب سو جاؤ۔'' کرن کی آواز آئی۔

’’کیا آپ جاننا نہیں چاہتیں آپ مسٹر بلال سے تو پوچھ سکتی ہیں۔‘‘ کمال نے کہا۔
’’نہیں‘ میں بہت تھک گئی ہوں اور ہم دونوں کو اب سو جانا چاہیے‘ میں اپنے لیے چائے بناؤں گی کیا تم کچھ لو گے؟‘‘
’’نہیں۔‘‘
’’تو پھر لائٹ آف کرو اور سو جاؤ۔‘‘ کرن نے کہا اور اندر چھپے سائے نے اپنی جیب سے ایک سرنج نکالی پھر جیسے ہی کرن باورچی خانے میں آئی تھی اس نے پیچھے سے اسے دبوچ لیا تھا اور سرنج اس کی گردن میں پیوست کردی تھی اور وہ بے ہوش ہوگئی تھی اور اس کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔ سائے نے اسے سنبھالے سنبھالے کچن کا پیچھے کا دروازہ کھولا تھا اور باہر نکل کر دھند میں غائب ہوگیا تھا۔

❖......☆......❖

دوسری صبح حامد کی آنکھ کافی دیر سے کھلی تھی‘ وہ اسکول جانے کے لیے لیٹ ہوگیا تھا‘ آنکھ کھلتے ہی وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اور کرن کو آواز دی۔
’’مام...... مام......‘ آپ کہاں ہیں...... جلدی کریں ہم اسکول کے لیے لیٹ ہوگئے ہیں۔‘‘ اس نے زور سے ہانک لگائی اور باتھ روم میں گھس گیا اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے تھے اور تیزی سے اپنے کمرے سے باہر آیا تھا۔
’’مام...... اٹھیں جلدی کریں...... دیر ہورہی ہے۔‘‘ اس نے کرن کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ دروازہ کھول کر اندر گیا لیکن کرن وہاں موجود نہیں تھی پھر اس نے سارے گھر میں اسے تلاش کیا لیکن جب وہ نہ ملی تو اس نے حامد کو فون کیا کہ شاید وہ ایمرجنسی میں حامد کے ساتھ کسی رپورٹنگ پر چلی گئی ہو لیکن اسے حامد کے فون پر بھی جواب نہیں ملا تب اس نے چینل 10 میں نیوز ایڈیٹر کشور کو فون کیا کہ شاید اسے کچھ پتہ ہو لیکن اسے پتہ چلا کہ کرن ٹی وی اسٹیشن بھی نہیں پہنچی ہے تب اس نے سراغرساں پرویز کو فون کیا جو اس وقت حامد کے ساتھ اسپتال میں موجود تھا اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کی تفصیلات معلوم کررہا تھا اس کے دو اسسٹنٹ بھی اس کے ساتھ تھے۔
’’حامد تم وہاں کیا کررہے تھے آخر کسی نے تمہیں تشدد کا نشانہ کیوں بنایا؟‘‘ سراغرساں پرویز نے کہا۔
’’میں نہیں جانتا کہ کسی نے ایسا کیوں کیا؟‘‘
’’کیا تم انہیں پہچان سکتے ہو؟‘‘
’’نہیں‘ میں نے انہیں نہیں دیکھا‘ اندھیرا بہت تھا پھر بھی تھے وہ شاید دو تھے یا اس سے زیادہ۔‘‘
’’تم وہاں کیا کررہے تھے؟‘‘ پرویز نے پوچھا۔
’’کرن نے مجھے کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں جن سے مجھے شک تھا کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے اور موقع پاکر اسے نقصان پہنچانا چاہتا ہے چنانچہ کچھ دن سے میں اس کے گھر کے باہر حفاظت کے نقطہ نظر سے ٹھہر جاتا تھا۔‘‘
’’تم نے کسی کو اس بارے میں بتایا؟‘‘
’’نہیں۔‘‘
’’کیوں نہیں؟‘‘
’’یہ میرا شک بھی ہوسکتا تھا اگر مجھے یقین ہوجاتا کہ میرا خیال درست ہے تو میں ضرور کسی کو بتاتا۔‘‘
’’تم نے غلطی کی تمہیں کسی نہ کسی کو اعتماد میں لینا چاہیے تھا اس طرح تم تو پر بھی شک کیا جاسکتا ہے۔‘‘
’’کیا......؟ تم کیا کہہ رہے ہو...... میں اس کا ساتھی ہوں...... وہ ہر جگہ رپورٹنگ پر میرے ساتھ جاتی ہے اور تم...... مجھ پر شک کررہے ہو؟‘‘ حامد نے حیرت سے کہا اسی وقت حامد کے فون کی بیل بجی تھی اور پرویز نے اس کی کال ریسیو کی تھی۔
’’حامد...... حامد کیا تم اپنی وین میں ہو؟...... حامد جواب دو۔‘‘
’’ہیلو!‘‘ پرویز نے کہا۔ ’’حامد؟‘‘
’’نہیں۔‘‘ میں نیوز ڈپارٹمنٹ کا ڈائریکٹر شجاع الدین بول رہا ہوں...... حامد کا باس...... تم کون ہو؟‘‘
’’حامد اس وقت تم سے بات نہیں کرسکتا۔‘‘
’’تم کون ہو؟ میں کس سے بات کررہا ہوں؟‘‘
’’سراغرساں پرویز۔‘‘
’’حامد کہاں ہے؟‘‘
’’وہ لیاقت اسپتال میں ہے۔‘‘ پرویز نے کہا اور فون بند کردیا پھر وہ حامد کی طرف مڑا تھا جسے نرس بے ہوشی

کا انجکشن لگا چکی تھی۔
''حامد تم بات کر سکتے ہو؟'' پرویز نے پوچھا کیونکہ حامد کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں۔
''ہاں۔''
''تمہیں یقین ہے کہ تم نہیں جانتے کس نے تم پر حملہ کیا تھا؟ کیا فون پر میرے باس تھے؟'' اس نے پوچھا۔
''تم کتنے دن سے کرن کے گھر کے باہر پہرہ دے رہے تھے؟'' پرویز نے پوچھا لیکن حامد کی آنکھیں بند ہو گئیں۔
''حامد...... حامد...... ہمارے ساتھ رہو یہ بتاؤ تم نے وہاں کسی کو دیکھا؟''
''دو...... سائے...... تھے...... ایک نیلی وین ......''
حامد نے کہا اور بے ہوش ہو گیا اسی وقت سراغرساں پرویز کے فون کی گھنٹی پھر بجی۔
''ہیلو۔''
''مام...... چلی گئی ہیں۔'' دوسری طرف سے کمال بول رہا تھا۔
''کمال......''
''جی انکل پرویز۔''
''میں اس وقت مصروف ہوں' تمہیں ابھی فون کرتا ہوں۔'' پرویز نے کہا۔
''مام یہاں نہیں ہیں۔'' کمال نے کہا۔ پرویز نے اس کی آواز میں خوف کی کپکپاہٹ محسوس کی تھی۔
''کیا وہ کہاں ہے؟''
''پتہ نہیں...... وہ گھر پر بھی نہیں ہیں اور ٹی وی اسٹیشن پر بھی نہیں...... میں نے میڈم کشور کو فون کیا تھا لیکن انہوں نے بتایا کہ وہ وہاں نہیں پہنچیں۔''
''کمال پریشان مت ہو...... مجھے یقین ہے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہو گی مجھے تفصیل سے بتاؤ جب انہوں نے تمہیں صبح اسکول جانے کے لیے اٹھایا اس کے بعد کیا ہوا؟''
''انہوں نے مجھے نہیں اٹھایا...... میری آنکھ آٹھ بجے کے قریب کھلی جب میں نے گھر میں دیکھا تو وہ نہیں تھیں میں نے انہیں فون کیا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ ان کا پرس اور سیل فون گھر پر ہی ہے۔'' کمال رک رک کر بول رہا تھا اس کے لہجے سے گھبراہٹ نمایاں تھی۔
''میڈم کشور نے کہا ہے کہ وہ آ رہی ہیں میں ان کا انتظار کروں وہ مجھے اسکول لے جائیں گی۔''
''تم کہاں ہو؟''
''میں گھر پر ہوں۔''
''ٹھیک ہے وہیں رہو...... میں آ رہا ہوں...... تم کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا اور کسی کو گھر میں مت آنے دینا۔'' پرویز نے اسے ہدایت کی۔
''ایک نیوز ٹیم آ رہی ہے کیا میں انہیں آنے دوں۔'' کمال نے پوچھا۔
''یہ کیسے ممکن ہے؟''
''میڈم کشور نے بتایا ہے کہ انہوں نے اپنے باس کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ مام کھو گئی ہیں اور ان کے باس کچھ لوگوں کو بھیج رہے ہیں جو میرا انٹرویو لیں گے۔''
''کمال' میری بات غور سے سنو...... ان رپورٹرز کو کسی صورت اندر مت آنے دینا۔'' پرویز نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اپنی بات دہرائی۔
''اور ہاں...... مس کشور کو بھی گھر میں مت آنے دینا ان سے کہنا کہ پولیس نے ہدایت کی ہے کہ کسی کو گھر میں نہ آنے دیا جائے' انہیں کہنا کہ وہ انتظار کریں ہم آ رہے ہیں۔'' پرویز نے بات مکمل کر کے فون بند کر دیا۔
کوئی نہیں جانتا تھا کہ شجاع نے نیوز ٹیم کو کرن کے گھر جانے کا آرڈر دینے سے پہلے اس کے پاس ایک کال آئی تھی وہ اپنے آفس میں بیٹھا تھا اور کسی نے اسے اطلاع دی تھی کہ کرن کو اغوا کر لیا گیا ہے اس وقت تک اس بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا شجاع اس خبر کے ملنے پر خوش ہوا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ کرن کا مسئلہ خود بخود حل ہو گیا اب ایک خبریں پڑھنے والی خود خبر بن گئی تھی اور شاید اسے کرن کے مسئلے سے نجات ملنے والی تھی حقیقت تک پہنچنے کے لیے اس نے نیوز ٹیم کو کرن کے گھر بھیج کر کمال کا انٹرویو کرنے کی ہدایت کی تھی۔)
کمال سے بات کرنے کے بعد پرویز کچھ دیر تک اپنی اگلی منصوبہ بندی کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور پھر اس نے کمال کو فون کیا تھا۔
''کمال...... تم پریشان تو نہیں ہو رہے ہو؟ اگر تم کچھ

پوچھنا چاہو تو مجھ سے پوچھ سکتے ہو۔'' اس نے کمال کی پریشانی دور کرنے کے خیال سے کہا۔
''کیا میری مام ٹھیک ہیں؟''
''مجھے یقین ہے وہ ٹھیک ہوں گی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کسی اسٹور پر گئی ہوں گی کچھ خریدنے اور ان کی کار خراب ہوگئی ہوگی۔''
''ان کی کار تو یہاں' گھر پر موجود ہے۔''
''اور ان کا پرس بھی۔'' کمال نے چند لمحوں بعد کہا۔
''وہ پرس کے بغیر شاپنگ پر کیسے جاسکتی ہیں؟''
''اچھا سوال ہے' میں آتا ہوں اور صورت حال دیکھ کر تم سے بات کرتا ہوں تم گھر پر ہی رہنا' کسی سے بات مت کرنا کسی کو اندر مت آنے دینا میں راستے میں ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر ہدایت کی۔
''تم..... کہاں..... جارہے ہو؟'' حامد نے بیڈ پر سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پھر بیڈ پر ڈھیر ہوگیا بے ہوشی کی دوا اپنا اثر دکھا رہی تھی۔
''جلدی کرو ایک نرس کو یہاں بلاؤ'' پرویز نے اپنے اسسٹنٹ جواد سے کہا جو دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا اور پھر حامد کی طرف مڑا۔
''ہمارے آنے تک تم یہاں رہو گے..... تم خود کو گرفتار نہ سمجھو..... کیا میں تمہیں بیڈ کے ساتھ باندھ کر ہتھکڑی لگادوں؟''
''نہیں..... میں یہاں ہی رہوں گا۔'' حامد نے کہا۔
''تم نے میرے مریض کے ساتھ کیا کیا ہے؟'' ایک نرس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے تیزی سے کہا۔
''اس پر نظر رکھو..... یہ میرا قیدی ہے اور ایک اغوا کا چشم دید گواہ بھی۔'' پرویز نے نرس سے کہا۔ پھر وہ اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ وہاں سے نکل گیا تھا۔
''کیا معاملہ ہے؟'' جواد نے پوچھا۔
''کرن غائب ہے..... میں چاہتا ہوں تم شہر کے واحد ریستوران کے مالک کا پتہ لگاؤ وہ کون ہے کیونکہ کرن نے بتایا تھا کہ وہاں لنچ کرنے کے بعد اسے ایک گلاب موصول ہوا تھا اور وہاں آنے والے لوگوں کی فہرست بھی چیک کرو مجھے تفصیل چاہیے۔''

❖.....☆.....❖

سراغرساں اپنے دوساتھیوں جواد حسین اور ارشد خان کے ساتھ جیسے ہی لیاقت اسپتال سے نکلا ایک نارنجی کپڑوں میں ملبوس لڑکی ہاتھ میں مائیک پکڑے اس کی طرف بڑھی اس کے ساتھ ایک کیمرہ مین بھی تھا۔
''میں سارہ ہوں..... چینل 10 نیوز سے۔'' اس نے کہا لیکن پرویز اور اس کے دونوں اسسٹنٹ آگے اپنی کار کی طرف بڑھتے رہے انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔
''آفیسرز' لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا حامد' کرن کو اغوا ہونے سے بچاتے ہوئے زخمی ہوا ہے؟'' رپورٹر سارہ نے مائیک ان کے چہروں کے آگے کردیا۔ ''کیا کرن.....؟'' سارہ کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پرویز اپنی گاڑی میں بیٹھا تھا اور اس نے دروازہ بند کرلیا تھا اس کے دونوں ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔
''خدایا! بھلا اس سوال کا کوئی کیا جواب دے سکتا ہے؟ اگر ہم ہاں کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ کرن اغوا ہوگئی ہے اور نہیں کہتے ہیں تب بھی کرن اغوا ہوگئی ہے۔'' پرویز بڑبڑایا سارہ نے اس کے سائڈ کی کھڑکی کا شیشہ تھپتھپایا اس کا کیمرہ مین اس منظر کی بھی ویڈیو بنا رہا تھا۔
''آفیسرز.....' اس نے پھر کہا۔
''بھلا ان کو کیسے پتہ کہ کرن کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ انہیں کس نے بتایا ہے؟'' ارشد نے پرویز سے کہا۔
''کسی نہ کسی نے تو یہ خبر لیک کی ہے..... بھلا یہ رپورٹرز کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لوگ جاننا چاہتے ہیں۔'' بھلا لوگوں کو کیا پتہ؟ ابھی یہ خبر یا افواہ کہیں سے نشر ہی نہیں ہوئی ہے؟'' پرویز نے کہا اور گاڑی آگے بڑھادی۔
''لوگوں کو کسی کی اتنی پروا نہیں وہ دوسروں کے معاملوں سے اتنی دلچسپی نہیں رکھتے۔'' جواد نے کہا۔
''جواد' جب تم پولیس اسٹیشن فون کرو تو وہاں سے کچھ سکیورٹی کے لوگوں کو ان کے یونیفارم میں کرن کے گھر پہنچنے کے لیے کہنا اور انہیں ہدایت کرو کہ وہ علاقے کو فیتے سے نشان زد کردیں اور اس کے گھر کے پیچھے کی سڑک اور لان کو بلاک کردیں اس کے ساتھ ساتھ وہاں کھڑی ہوئی حامد کی کالی وین کو بھی بلاک کریں جس پر پیلے رنگ سے چینل 10- کا مونوگرام بنا ہے تاکہ کوئی اس کے قریب نہ جاسکے۔'' پرویز نے ہدایت کی اور جواد

Medora
Perfumed Talc
خوشبو جو دل کو بھائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے
Medora
Perfumed Talc
Season
Pleasure
Cherish
Joy
Passion
Greetings
Dignity
Salute
خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس
MEDORA OF LONDON
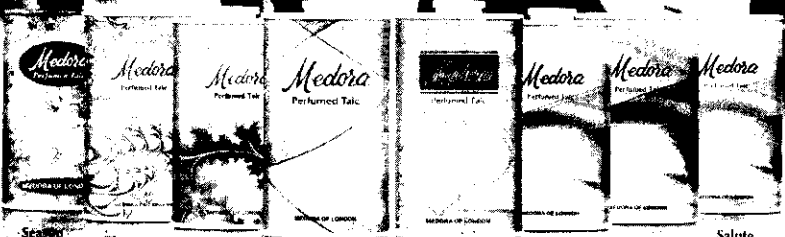
نے فوراً اس کی ہدایات پر عمل کیا تھا۔
"ارشد تم گھر کے باہر کے ایریا کی ذمہ داری سنبھالو گے اور جواد تم گھر کے اندر کی تحقیقات کرو گے اور میں میڈیا اور کمال سے بات کروں گا۔" پرویز نے کہا۔
"ٹھیک ہے۔" دونوں اسسٹنٹ نے ایک ساتھ کہا۔
"میرا خیال ہے کرن اگر اغوا ہوئی ہے تو اس اغوا کا تعلق کسی نہ کسی جنسی تشدد کے کیس سے ملتا ہے میں تمہیں تفصیل بتاتا ہوں۔" پرویز نے دنوں اسسٹنٹس کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
"آج کل شہر میں جنسی تشدد کے واقعات بہت ہو رہے ہیں مجرم اپنے ہر شکار کو شکار کرنے کے بعد وہاں ایک گلاب چھوڑ جاتا ہے اور کرن کو بھی کوئی نامعلوم شخص گلاب کا پھول بھیجتا تھا کوئی اس کے گھر میں گھسا اور اس کے بیڈ پر گلاب رکھ گیا اب وہ غائب ہے...... اور اب حامد...... وہ کرن کا پارٹنر ہے وہ سارا دن اس کے ساتھ کام کرتا ہے اور کئی دنوں سے راتیں اس کے گھر کے باہر پہرہ دیتے ہوئے گزار رہا تھا۔ آخر کیوں؟ شاید وہ کچھ جانتا ہو؟ اس کے علاوہ کرن کو اپنے آفس میں جو گلاب ملا تھا اس کی ڈنڈی پر ہمیں حامد کی انگلیوں کے نشان ملے ہیں اور اس کے ساتھ ایک نوٹ بھی تھا جس پر لکھا تھا کہ "مجھے معاف کردو" اس کے علاوہ حامد بھی وین چلاتا ہے اور مجرم کی بھی وین ہے دونوں کا کلر خاصا ملتا جلتا ہے ایک گہری نیلی اور دوسری سیاہی مائل نیلی۔"
"لیکن حامد تو اسپتال میں ہے۔" ارشد نے کہا۔
"ہاں لیکن اسے کرن کے گھر کے باہر کسی نے تشدد کا نشانہ بنایا۔" پرویز نے کہا۔
"تم سمجھتے ہو کہ حامد مجرم ہوسکتا ہے؟" جواد نے پوچھا۔
"وہ اس ٹائپ کا لگتا تو نہیں اور اس پر ہونے والے تشدد سے بھی کچھ ثابت نہیں ہوتا لیکن کرن کا کہنا تھا کہ کوئی اس پر نظر رکھے ہوئے ہے اور ایک وین اکثر اس کا پیچھا کرتی ہے ممکن ہے اس نے حماد کو بھی یہ بتایا ہو اور وہ اس کی نگرانی کر رہا ہو...... لیکن ایک اور بھی بات ہے کہ اسے ہم سے پہلے کیسے کرائم اور اس کے وقوعہ کا پتہ چل جاتا ہے وہ ہم سے پہلے وہاں موجود ہوتا ہے ممکن ہے یہ اتفاق ہو لیکن اتفاق بار بار نہیں ہوتا۔" پرویز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"ممکن نے وہ نفسیاتی مریض ہو۔" جواد نے کہا۔
"اس کے علاوہ کرن کا باس شجاع الدین...... وہ عورتوں سے نفرت کرتا ہے۔" پرویز نے جواد کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنی بات جاری رکھی۔
"خاص طور پر کرن سے تو اسے اللہ واسطے کا بیر ہے اسے کرن کے اغوا سے بڑی خوشی ملی ہوگی اور وہ کہہ سکتا ہے کہ جنسی تشدد کے مجرم نے یہ اغوا کیا ہے۔"
"اس کا مطلب ہے کہ خبر کو اس نے ہی پھیلایا ہے؟" جواد نے کہا۔
"ممکن ہے۔" پرویز نے جواب دیا۔
"لیکن انہیں اس کے بیٹے کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا بغیر تصدیق کے اسے پریشان کردیا۔" پرویز نے ناگواری سے کہا۔
"ممکن نے عوام کے لیے ایک سنسنی خیز خبر بنانے کے لیے شجاع نے کوئی چال چلی ہو؟" جواد نے کہا۔
"لیکن کرن اس کا حصہ نہیں بن سکتی کم سے کم اپنے بچے کو ہراساں کرنے میں اس کا ہاتھ نہیں ہوسکتا۔" پرویز نے کہا۔ "لیکن ایک بات اور بھی ہوسکتی ہے اس کے تعلقات گرین فیلڈ اسکول کے ہیڈ ماسٹر احتشام سے بھی اچھے نہیں تھے کمال کو اس نے اسکول سے نکال دیا تھا کرن کی بے عزتی کی تھی وہ بھی مشکوک ہے۔" پرویز نے کہا لیکن یہ باتیں ہمارے درمیان راز رہیں گی۔" اس نے کہا۔
"ٹھیک ہے۔"
"میں نے یہ باتیں صرف اس لیے کی ہیں کہ تمہیں میرے ساتھ انویسٹی گیشن کرنے میں آسانی ہو۔"
"کیا تمہارا خیال ہے کہ اسے پھول ملنا اور حامد پر تشدد ہونا اس کے ماضی کی کسی کہانی کا حصہ ہوسکتے ہیں؟" ارشد نے پوچھا۔
"میں نہیں جانتا کیونکہ میں یہ جانتا ہوں کہ کرن کی یادداشت صرف پچھلے چودہ سال پر مشتمل ہے اس سے پہلے کا اسے کوئی بات یاد نہیں۔" پرویز نے جواب دیا۔
"ممکن ہے اس کی یادداشت کا کچھ تعلق اس کے بیٹے

سے بھی ہو کیونکہ اس کی عمر بھی اتنی ہی ہے تقریباً۔'' جواد نے کہا۔

''ہاں' لیکن یقین سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔'' پرویز نے کہا۔

جب سراغرساں پرویز اور اس کے اسسٹنٹ کرن کے گھر پہنچے تو چینل -10 نیوز کی گاڑی وہاں موجود تھی گھر اور علاقے کو فیتہ لگا کر ٹیپ کر دیا گیا تھا جیسے ہی پرویز اپنے ساتھیوں کے ساتھ گاڑی سے اترا ایک شخص ہاتھ میں مائیک لیے اس کی طرف لپکا۔

''میں جاوید ہوں چینل -10 نیوز سے کیا کرن اغوا ہوگئی ہے؟'' رپورٹر نے مائیک پرویز کی طرف بڑھایا۔

''ہم ابھی یہاں پہنچے ہیں اور آپ سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔'' پرویز کی جگہ اس کے اسسٹنٹ جواد نے جواب دیا۔

''کرن کے گھر کو ٹیپ سے کیوں احاطہ کیا گیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی ہم آئے ہیں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' جواد نے پھر کہا اب وہ پرویز اور دوسرے ساتھی کے ساتھ کرن کے لان میں داخل ہو چکا تھا۔

''کرن کی کار یہاں کیوں پارک ہے؟'' رپورٹر جاوید نے پھر سوال کیا وہ سائے کی طرح ان کے پیچھے لگا تھا۔

''نو کمنٹس۔'' پرویز نے کہا اور آگے بڑھا۔

''حامد لیاقت اسپتال میں کیوں داخل ہے؟''

''ہم جیسے ہی تحقیقات کے بعد کوئی رپورٹ بنائیں گے تمہیں بتادیں گے اور مجھے یقین ہے پولیس ہیڈ کوارٹر ضرور کوئی رپورٹ ایشو کرے گا۔'' پرویز نے کہا اور پھر رپورٹر کی طرف مڑا جو پیلا ٹیپ کراس کر کے اس کے پیچھے لان میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اور میں تمہیں گرفتار کرلوں گا اگر تم نے اس ٹیپ کو پار کر کے ادھر آنے کی کوشش کی۔'' پرویز کی تنبیہ پر رپورٹر وہیں رک گیا تھا۔

''پرویز صاحب۔'' اسے اپنے پیچھے ایک خاتون کی آواز سنائی دی تو وہ مڑا' کشور اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''تم میرے ساتھ آؤ کشور۔'' پرویز نے کہا اور کشور کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔

''جب کمال نے تم سے بات کی تو اس کے محسوسات کیا تھے؟'' پرویز نے کشور سے پوچھا۔

''وہ بہت فکر مند تھا اور میں بھی۔''

''مجھے تمہاری مدد چاہیے جب میں یہاں تحقیقات مکمل کرلوں تو تم کمال کو اپنے ساتھ لے جانا اسے یہاں اکیلا بھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔'' پرویز نے کہا۔

''ہاں......ضرور......'' کشور نے جواب دیا۔

''میں تم سے بھی کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔'' پرویز نے گھر میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اسی وقت کمال بھی کمرے میں داخل ہوا۔

''کمال تم تھوڑی دیر اپنے کمرے میں رہو میں تمہاری کشور آنٹی سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔'' پرویز نے کہا تو کمال اثبات میں سر ہلا کر وہاں سے چلا گیا۔

''کیا پچھلے چند دن میں کرن نے تم سے کوئی بات کی.....ایسی بات جس سے کچھ اندازہ ہو سکے؟''

''نہیں' بلکہ وہ ہمیشہ سے زیادہ پراعتماد تھی یہاں تک کہ اس نے باس کو بھی ڈانٹ دیا تھا۔''

''شجاع الدین کو...... نیوز ڈائریکٹر کو؟'' پرویز نے حیرت سے کہا۔

''ہاں۔''

''لیکن کیوں؟''

''کل حامد اور کرن ایک رپورٹ بنانے گئے تھے ایک ایسے علاقے میں جہاں جنسی تشدد کے مجرم کی موجودگی کا شک کیا جا رہا تھا لیکن وہ کوئی رپورٹ نہیں لائے جس پر باس بہت غصے میں تھا حالانکہ وہ دونوں بہت مشکل سے وہاں سے جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے لیکن باس کو اس کی پروا نہیں تھی اسے رپورٹ کی فکر تھی۔

''اس نے کیا کہا تھا؟''

''وہ چیخ رہا تھا کہ وہ اسے ملازمت سے نکال دے گا۔''

''اور حامد؟ وہ کرن کے ساتھ ہی تھا نا؟''

''ہاں' وہ اس کے ساتھ ہی تھا لیکن اداس تھا۔''

''کیا تم اس کی وجہ بتا سکتی ہو؟''

''وہ ذرا ذاتی سی وجہ ہے۔''

''میں جاننا چاہتا ہوں کیونکہ حامد اس وقت زخمی حالت میں اسپتال میں ہے اور کرن غائب ہے۔'' پرویز نے کہا اور اسی وقت پھر کمال کمرے میں داخل ہوا۔

''تھوڑی دیر اور انتظار کرو کمال میں ابھی بات کر رہا ہوں۔'' پرویز نے کہا اور کمال وہیں فرش پر بیٹھ گیا اس کے چہرے سے مایوسی جھلک رہی تھی اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔ پرویز اور کشور لپک کر اس کے قریب گئے۔

'پریشان مت ہو کمال...... ہم تمہاری ماں کو ڈھونڈھ لیں گے...... کیا تم میری مدد کرو گے؟'' پرویز نے کہا۔

''جی انکل ضرور' کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ آنٹی کشور سے کیا بات کر رہے ہیں؟'' کمال نے کہا تو پرویز نے کشور کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور کشور نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیوں نہیں؟ ہوسکتا ہے ہم جو کچھ جاننا چاہتے ہیں تم اس بارے میں کچھ جانتے ہو۔'' پرویز نے کہا جس پر کمال بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کشور اور پرویز اپنی جگہوں پر واپس آ گئے۔

''سب سے پہلی بات جو میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کمال وہ یہ ہے کہ تم جو کچھ بھی سنو گے اور بولو گے وہ ایک راز ہوگا جو تم کسی کو نہیں بتاؤ گے کسی رپورٹر کو بھی نہیں' سمجھ گئے؟'' پرویز نے کہا۔

''جی' کیا میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟''

''ہاں...... ہم اسی لیے یہاں موجود ہیں۔''

'حامد انکل اسپتال میں کیوں ہیں؟''

''کیا حامد کو کوئی نقصان پہنچا ہے؟'' کشور نے جلدی سے پوچھا۔ وہ کس اسپتال میں ہے اور اس کا کرن کے معاملے سے تو کوئی تعلق نہیں؟''

''میں اسی لیے پریشان ہوں کہ حامد کی وین ابھی بھی یہاں موجود ہے وہ کئی دنوں سے یہاں پہرہ دے رہا تھا' جب سے کرن نے اسے بتایا تھا کہ کوئی اس پر نظر رکھے ہوئے ہے اور کل رات اس پر تشدد ہوا کسی نے اسے وین سے کھینچ کر باہر نکالا اور بہت مارا۔''

''وہ ٹھیک تو ہو جائے گا نا؟''

''وہ بے ہوش ہے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے ہیں' تا کہ اس سے کچھ سوالات کر سکیں۔''

''کمال تم بتاؤ حامد انکل اور تمہاری ماما ایک دوسرے سے کیسے ملتے تھے؟'' پرویز نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ رپورٹنگ کے علاوہ بھی وہ ان کے ساتھ کبھی باہر گئیں؟''

''نہیں...... وہ کبھی ان کے ساتھ بغیر کام کے باہر نہیں گئیں بلکہ وہ ان کا بہت خیال کرتے تھے۔''

''کیا وہ کسی بات پر ایک دوسرے سے ناراض تھے؟''

''نہیں؟'' کمال نے کہا جس پر پرویز نے کشور کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''وہ تم سے ملنا چاہتی تھی اور حامد کو اعتراض تھا۔'' کشور نے دبے لہجے میں کہا۔

''کیا! مجھ سے؟''

''ہاں' وہ تمہیں پسند کرتی ہے لیکن اظہار کی ہمت نہیں رکھتی اس نے مجھے بتایا تھا۔''

''ٹھیک ہے اب تم جا سکتی ہو اگر کوئی تم سے پوچھے تو کہنا کہ میں نے تم سے تمہاری اور کرن کی آخری ملاقات کے بارے میں پوچھا ہے اور بس۔'' پرویز نے کہا اور کمال کی طرف مڑا۔

''آؤ پارٹنر تھوڑی سراغرسانی کرتے ہیں۔'' پرویز نے کمال کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

''کیا میری ماما خیریت سے ہوں گی؟'' کمال نے پوچھا۔

''ہاں' میں سمجھتا ہوں وہ شاپنگ کے لیے گئی ہوگی۔''

''وہ واپس آ جائیں گی؟''

''ہاں مجھے یقین ہے' تم مجھے ہر وہ بات بتاؤ جو تم نے یہاں دیکھی جب وہ یہاں تھی۔'' پرویز نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' کمال نے کہا اور اسی وقت پرویز کے اسسٹنٹ ارشد اور جواد وہاں آ گئے۔

''ہاں بولو۔'' پرویز نے کمال کو ٹوکا۔

''میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا جب ایک سائرن سے میری آنکھ کھلی میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو ایک ایمبولینس کھڑی تھی میں نے ماما کو آواز دے کر اوپر بلایا۔''

کمال نے کہا۔
''اچھا تم مجھے اوپر اپنے کمرے میں لے چلو باقی باتیں وہیں ہوں گی۔'' پرویز نے کہا اور اسے لے کر اوپر چلا گیا۔
''آج صبح جب تمہاری آنکھ کھلی تو تمہارے کمرے کا دروازہ کھلا تھا یا بند تھا؟''
''بند تھا...... مام نے مجھ سے پوچھا تھا کہ وہ اپنے لیے چائے بنانے جا رہی ہیں کیا میں پیوؤں گا تو میں نے انکار کر دیا تھا اور وہ دروازہ بند کر کے کچن میں چلی گئی تھیں۔''
''صبح دروازہ کس نے کھولا؟''
''میں نے' جب میری کئی آوازیں دینے پر بھی وہ نہیں آئیں تو میں خود دروازہ کھول کر باہر نکلا تاکہ دیکھوں وہ اپنے کمرے میں کیا کر رہی ہیں۔''
''وہ کمرے میں تھیں؟''
''نہیں' پھر میں نیچے گیا لیکن وہ کہیں بھی نہیں تھیں۔'' کمال نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
''چلو کچن میں چلتے ہیں شاید وہاں سے کچھ معلوم ہو سکے۔'' پرویز نے کہا اور کمال کے ساتھ پھر نیچے آ گیا۔ ''کمال' کیا جب تم کچن میں آئے تھے تو تمہیں کوئی غیر معمولی چیز نظر آئی تھی؟'' پرویز نے پوچھا۔
''ہاں' مائیکرو ویو کی سیٹی بجتی ہے جب اسے کھولو...... میں نے کھولا تھا اندر ایک کپ رکھا ہے۔'' کمال نے کہا۔
اور پرویز نے جیب سے دستانے نکال کر مائیکرو ویو کھولا سیٹی بجی اس نے کپ میں پانی چیک کیا وہ ٹھنڈا تھا اس نے جیب سے نوٹ بک نکال کر اس میں کچھ لکھا پھر وہ کمال کی طرف مڑا۔
''کمال تمہاری مام چائے کیسی بناتی ہیں؟''
''جیسے سب بناتے ہیں وہ گرم پانی میں ٹی بیگ ڈال کر چائے بناتی ہیں۔''
''اور ٹی بیگ کہاں رکھتی ہیں؟''
''اس الماری میں۔'' کمال نے کچن کے پچھلے دروازے کی طرف بنی الماری کی طرف اشارہ کیا اور اس کا دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
''ٹھہرو' اسے مت چھونا۔'' پرویز نے کہا اور پھر دستانے والے ہاتھ سے الماری کھولی اس نے الماری کا جائزہ لیا لیکن الماری کے اندر کچھ خاص چیز نہیں ملی تھی پھر اس کی نظر نیچے زمین پر پڑی جہاں ایک خالی سرنج پڑی ہوئی تھی۔
''کیا تمہاری مام شوگر کی مریض ہیں اور انسولین لیتی ہیں؟'' پرویز نے کمال سے پوچھا۔
''نہیں۔'' کمال نے کہا اور پرویز نے دستانے والے ہاتھ سے سرنج اٹھا کر ایک لفافے میں رکھی۔
''سرنج تو ڈاکٹر استعمال کرتے ہیں میری مام ڈاکٹر بدر کے پاس جاتی ہیں وہ غلیظ ڈاکٹر...... میں اسے پسند نہیں کرتا۔'' کمال نے غصے سے کہا۔
''دیکھو کمال صرف ایک سرنج کے ملنے کی وجہ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ڈاکٹر بدر مجرم ہے' سرنج تو بہت سے لوگ استعمال کرتے ہیں۔'' پرویز نے اسے سمجھایا۔

❖......☆......❖

اگلے روز سراغرساں پرویز کمال کے ساتھ اسپتال پہنچا تھا وہ حامد سے بھی کچھ مزید سوالات کرنا چاہتا تھا جب وہ اسپتال پہنچا تو حامد کمرے میں تنہا تھا۔
''اب کیسی طبیعت ہے؟'' اس نے حامد سے پوچھا۔
''بہتر ہے کرن کا کچھ پتہ چلا؟'' حامد نے پوچھا۔
''تمہیں کرن کے بارے میں کیا پتہ ہے؟''
''میں نے تمہیں فون پر باتیں کرتے ہوئے سنا تھا پھر تمہارے جانے کے بعد بھی یہاں جو آفیسر تھا وہ کسی سے کہہ رہا تھا کہ کرن اغوا ہو گئی ہے کچھ پتہ چلا؟ وہ کہاں ہے؟'' حامد نے پوچھا۔
''وہ ڈاکٹر بدر کے پاس ہے۔'' کمال نے جلدی سے کہا تو حامد نے سوالیہ نظروں سے پرویز کی طرف دیکھا۔
''تم بار بار یہ کیوں کہہ رہے ہو کمال؟'' پرویز نے اسے پھر ٹوکا۔
''وہ اکثر میری مام سے الجھتا رہتا تھا۔''
''اس کے علاج کے دوران؟'' پرویز نے پوچھا۔
''ہاں' مجھے پتہ نہیں جب میں آخری بار اسکول سے نکالا گیا تو وہ مجھے کیوں اس سے ملوانے لے گئی تھیں۔ انہوں نے اس سے ملنا چھوڑ دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ وہ مزید سیشن نہیں کریں گی۔'' کمال نے کہا۔

''ان کی لڑائی کے بارے میں کچھ بتاؤ؟'' حامد نے کہا۔

''مجھے پچھلا واقعہ یاد ہے جب ڈاکٹر بدر میری مام کو چھوڑنے گھر آیا تھا وہ اکثر جب اس کے پاس سے واپس آتی تھیں تو مجھے لگتا تھا کہ وہ کافی دیر تک روتی رہتی ہیں۔''

''آخری بار کی کیا بات تمہیں یاد ہے؟'' پرویز نے پوچھا۔

''میں نے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنی تھیں تو میں اپنے کمرے سے باہر آیا تھا وہ دونوں بیرونی دروازے کے قریب کھڑے تھے اور ڈاکٹر بدر میری مام سے شادی کے لیے کہہ رہا تھا لیکن مام نے انکار کرتے ہوئے اسے گھر سے چلے جانے کے لیے کہا تھا جس پر ڈاکٹر بہت چیخا تھا اور کہا تھا کہ تم مجھے واپس بھیجنے والی کون ہوتی ہو میں جب چاہوں گا جاؤں گا...... میں نے تمہیں بنایا ہے...... میرے بغیر تم کچھ نہیں ہو' تمہارا نہ کوئی ماضی ہے اور نہ مستقبل۔''

''تمہیں یقین ہے اس نے یہی کہا تھا؟'' پرویز نے پوچھا۔

''ہاں' مام رو رہی تھیں اور اس سے خاموش ہونے کے لیے کہہ رہی تھیں اس نے مام کو کاندھوں سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلا تھا تو میں زور سے چیخا تھا اور دوڑتا ہوا سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا تھا۔''

''پھر اس نے کیا کیا؟''

''ایسا لگا جیسے وہ مجھے مارنا چاہتا ہے لیکن پھر وہ مام پر چیخا...... تم میری ہو...... میں نے تمہیں بنایا ہے۔'' اس نے چیخ کر کہا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔''

''تمہاری مام نے پھر کیا کیا؟''

''وہ بہت دیر تک روتی رہی تھیں پھر ہم لوگ سو گئے تھے جب صبح میں اٹھا تب بھی وہ میرے کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھی رو رہی تھیں۔''

''کیا وہ آخری موقع تھا جب وہ ڈاکٹر بدر سے ملی تھیں؟'' حامد نے پوچھا۔

''ہاں' انہوں نے اپنا علاج ختم کر دیا تھا اور وہ اس سے ملنے نہیں جاتی تھیں وہ ہر روز انہیں فون کرتا تھا اور روز ایک گلاب بھیجتا تھا لیکن وہ اس سے پھر نہیں ملیں صرف آخری بار مجھے لے کر اس کے پاس گئی تھیں۔''

''وہ تمہیں کسی اور ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں لے گئیں؟'' پرویز نے پوچھا۔

''شاید وہ کسی اور کو نہ جانتی ہوں۔'' کمال نے کہا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ وہ اپنا کیا علاج کروا رہی تھیں؟'' حامد نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کیا تمہیں پتہ ہے کہ انہوں نے علاج کیوں بند کیا؟'' پرویز نے کہا۔

''شاید وہ اس سے خوفزدہ تھیں۔'' کمال نے جواب دیا اور حامد سوچ میں پڑ گیا کہ اگر کرن ڈاکٹر سے خوفزدہ تھی تو اس نے کسی کو کیوں نہیں بتایا اور کمال کو اس کے پاس کیوں لے گئی اور اس کے ساتھ لنچ کرنے کیوں گئی۔''

''انکل پرویز کیا آپ ڈاکٹر بدر سے میری مام واپس لا سکتے ہیں؟'' کمال نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے ایک بار اس سے ملنا ہی پڑے گا۔'' سراغرساں پرویز نے کہا۔

اگلے روز سراغرساں ڈاکٹر بدر سے ملا تھا وہ اس بلڈنگ کے انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اور جب اس کی گہری نیلی سیاہی مائل وین آ کر رکی اور ڈاکٹر باہر نکلا تو وہ اس کی طرف بڑھا۔

''ڈاکٹر بدر؟''

''جی' کیا بات ہے؟ آپ جانے پہچانے لگ رہے ہیں لیکن آپ کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''میں سراغرساں پرویز ہوں۔ مقامی پولیس اسٹیشن سے میرا تعلق ہے۔''

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''مجھے آپ سے کچھ سوالوں کے جوابات چاہئے۔''

''میرے پاس وقت نہیں ہے اور میں اگلے ہفتے بھی مصروف ہوں۔''

''مجھے صرف چند منٹ چاہئیں کچھ سوالوں کے لیے۔'' پرویز نے کہا لیکن ڈاکٹر اس کی بات سننے کے لیے رکا نہیں تھا اور لفٹ کی طرف بڑھ گیا تھا پرویز نے بھی اس کی تقلید کی۔

''میرے مریض میرے منتظر ہیں اور مجھے فرصت نہیں ہے۔'' ڈاکٹر بدر نے پھر کہا۔

''تم کرن حماد کو جانتے ہو؟''

''بے وقوفی کے سوالوں سے میرا وقت ضائع مت کرو جبکہ تمہیں پتہ ہے میں اسے جانتا ہوں۔''

''ڈاکٹر، کرن غائب ہوگئی ہے شاید اسے کسی نے اغوا کرلیا ہے۔'' پرویز نے کہا لیکن ڈاکٹر بدر نے کوئی جواب نہیں دیا وہ لفٹ سے نکل کر اپنے آفس میں داخل ہوا تھا اور دروازہ بند کرلیا تھا۔

''اگر تم کرن کو جانتے ہو تو اس کے بیٹے کمال کو بھی جانتے ہوگے اس کا کہنا ہے کہ تم اس کی ماں کو دھمکیاں دیتے تھے۔'' پرویز نے اس کے پیچھے اس کے آفس میں داخل ہوتے ہوئے کہا اندر بیٹھے مریض ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

''کل رات تم کہاں تھے؟'' پرویز نے چیخ کر پوچھا اور ڈاکٹر بدر نے اپنے خاص کمرے کا دروازہ کھولا پھر اس نے مڑ کر اپنی ریسپشنسٹ کی طرف دیکھا تھا اور ایک مسکراہٹ اور دھیمے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔

''پلیز پولیس کمشنر سے میری بات کراؤ۔'' اس نے کہا اور دروازہ بند کرلیا۔

❖......☆......❖
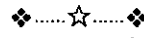
کچھ ہی دیر بعد سراغرساں پرویز اپنے باس کیپٹن ولید احمد کے سامنے کھڑا تھا وہ کافی دیر سے وہاں کھڑا تھا اور کیپٹن ولید کسی کام میں مصروف تھا۔

''کیپٹن اگر آپ مصروف ہیں تو میں پھر آجاؤں گا۔'' پرویز نے کہا۔

''اس بات کی وضاحت کرو کہ تم آج ڈاکٹر بدر کے دفتر میں کیا کررہے تھے اور اس کے مریضوں کے سامنے تم نے اس کی بے عزتی کیوں کی؟''

''ایک گواہ نے شک ظاہر کیا تھا کہ وہی کرن کو اغوا کرنے والا ہوسکتا ہے۔'' پرویز نے جواب دیا۔

''ایک تیرہ سالہ بچہ جو صدمے سے بے حال ہے وہ تمہارا گواہ ہے؟ تم ایسی غلطی کیسے کرسکتے ہو پرویز۔''

''ہمیں کچھ شواہد ملے ہیں۔''

''شواہد؟ کیسے؟ کب؟ کہاں؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر بدر کو تم نے تنگ کیوں کیا؟ کیا تمہارے شواہد اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں؟''

''میرا شک ہے کہ وہی اصل مجرم ہے۔'' پرویز نے کہا۔

''سراغرساں پرویز، مجھے تم جیسے تجربہ کار آفیسر سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی تمہیں اندازہ ہے کہ یہ ڈاکٹر بدر کتنا اثر و رسوخ رکھتا ہے تمہاری اس حرکت کی وجہ سے میں حکام بالا کو وضاحتیں دیتا پھروں گا؟''

''مجھے اپنا کام کرنے دیں میں ثبوت بھی فراہم کردوں گا کرن نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس سے مطمئن نہیں تھی وہ بھی علاج کروا رہی تھی پھر اس نے علاج بند کردیا ہمیں بہرحال اسے چیک تو کرنا چاہیے جبکہ کرن غائب ہے۔''

''لیکن اس شک پر نہ تو اسے گرفتار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی عدالت میں پیش کیا جاسکتا ہے چنانچہ میں تمہیں اس کیس کی تحقیقات کی اجازت تو دیتا ہوں لیکن بغیر ثبوت کے اب تم ڈاکٹر بدر کے آفس نہیں جاؤ گے۔''

''یس سر۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد ثبوت ڈھونڈو اور اصل مجرم کو سامنے لاؤ' وہ جو بھی کوئی ہے۔ خواہ مخواہ ڈاکٹر بدر کو تنگ کرنے سے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا سوائے پریشانی کے تم نہیں جانتے کہ وہ کیا کچھ کرسکتا ہے۔'' کیپٹن ولید نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔'' پرویز نے کہا اور کیپٹن ولید کے دفتر سے نکلنے کے بعد حامد کو فون کیا۔

''حامد' کمال ٹھیک ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہے' اس نے مجھے ایک اور بات بتائی ہے۔''

''کیا؟''

''اس کا کہنا ہے کہ ایک بار ڈاکٹر بدر نے اسے بتایا تھا کہ وہ بچپن میں یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک فارم ہے ''دلکشا فارم'' کے نام سے' یہی نام کمال نے بتایا تھا' شہر سے نکل کر سپر ہائی وے پر سیدھے ہاتھ پر پڑتا ہے' اس کے ساتھ ہی ایک نہر بھی موجود ہے کچھ جنگلات پر مشتمل حصہ ہے لیکن آج کل ویران پڑا ہے۔''

''حامد ہم تیرہ سال کے بچے کے کہنے پر صرف شہادت پر کام کررہے ہیں اور اب یہ ویران فارم جہاں ظاہر ہے کوئی نہیں رہتا ہوگا۔'' پرویز نے کہا۔

''لیکن کسی نہ کسی کو تو اس کیس کو انجام تک پہنچانا ہے۔'' حامد نے کہا۔

''ہوں..... ایسا کرو حامد صبح میں کمال اور اپنے بیٹے کو اسکول چھوڑنے کے بعد تم سے ملتا ہوں پھر طے کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' حامد نے کہا اور فون بند کردیا۔

❖.....☆.....❖
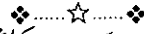
اس کی آنکھ اندھیرے کمرے میں کھلی تھی اسے پیاس لگی تھی ہونٹ خشک تھے اور گلے میں کانٹے چبھ رہے تھے اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا' اس نے ٹانگیں پھیلائیں تو فرش کی ٹھنڈک کا احساس ہوا تب اس نے سوچا کہ میں فرش پر کیوں لیٹی ہوں' پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم پر پورے کپڑے بھی نہیں تھے اس نے اپنے پاؤں اپنی قمیص میں سکیڑ لیے اسے محسوس ہورہا تھا جیسے وہاں اس کے علاوہ بھی کوئی موجود ہو۔

''کمال..... کمال..... میری مدد کرو۔'' اس نے پھر کہا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس نے سوچا ایسے لمحات میں اس پر پہلے بھی آچکے ہیں اسے سوتے سوتے اکثر سانس گھٹنے کا احساس ہوتا تھا لیکن کروٹیں بدلنے پر کیفیت ٹھیک ہوجاتی تھی پر آج ایسا نہیں ہورہا تھا کچھ دیر بعد اسے قدموں کی آواز سنائی دی اس نے پھر کمال کو آوازیں دیں لیکن شاید کوئی سننے والا نہیں تھا پھر وہ ہلکی سی روشنی کی مدد سے دروازے کا اندازہ کرکے اس طرف کھسک گئی اور دروازے کا ہینڈل ڈھونڈنے لگی لیکن وہاں کوئی ہینڈل نہیں تھا۔

''اوہ خدایا..... یہ سب کیا ہے؟'' وہ چیخی باہر پھر کوئی آہٹ سنائی دی۔

''کون ہے.....؟ وہاں کون ہے؟''

''تم کیا چاہتے ہو؟ کون ہو؟''

''مجھے باہر نکالو..... پلیز میری مدد کرو۔'' وہ برابر چیخ رہی تھی۔

''کمال..... کمال تم کہاں ہو..... کیا میری آواز سن رہے ہو؟'' اس نے کہا اور پھر اس کی آواز اور سسکیاں مدھم ہوتی چلی گئیں وہ ایک بار پھر بے ہوش ہوگئی تھی۔

کچھ دیر بعد پھر اسے ہوش آیا تھا تو وہ اپنی پوری طاقت جمع کرکے کھڑی ہوئی تھی اور اندھیرے میں ہاتھوں سے ٹٹولتی لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھی تھی۔

''کمال.....! کمال!'' اس نے پھر اپنے بیٹے کو پکارا تھا لیکن جواب میں اسے تالیوں کی آواز سنائی دی تھی جو اس کی پشت کی طرف سے آرہی تھی' وہ تیزی سے مڑی تھی کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہاں ہلکی ہلکی روشنی میں ایک شخص کھڑا نظر آرہا تھا جس نے کالے رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا اس کے چہرے پر نقاب تھی اور اس کے ایک ہاتھ میں لمبی ڈنڈی والا گلاب تھا وہ آہستہ آہستہ کرن کی طرف بڑھا اور کرن پیچھے ہٹنے لگی۔

''تمہاری' بہت اچھی تصویریں آئی ہیں۔'' آنے والے نے کہا۔ ''میڈیا پر چلیں گی تو دھوم مچ جائے گی۔ مشہور اینکر اور رپورٹر برہنہ حالت میں..... ویسے تم خاصی خوصورت ہو۔''

''بکواس بند کرو..... تم کون ہو؟'' کرن نے غصے سے کہا وہ نیچے بیٹھ گئی تھی اور آنے والے نے ہاتھ میں پکڑا گلاب اس کی طرف اچھال دیا تھا پھر اس نے دروازے کی چوکھٹ کے اوپر لگا ہوا بٹن دبایا تھا اور کمرہ روشن ہوگیا تھا۔

''میرا بیٹا کمال کہاں ہے؟'' کرن نے پوچھا تو آنے والا ہنس پڑا اس کے باریک ماسک سے اس کے سفید سفید دانت جھانک رہے تھے۔

''اچھا سوال ہے لیکن اس سے زیادہ اچھا سوال یہ ہے کہ جب تک تم میری مہمان ہو تمہیں کس طرح رہنا ہے میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہاری نفسیاتی کیفیت ٹھیک ہوگئی ہے یا تم ابھی تک مریض ہو اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ ایک زخمی شیرنی اپنے بچے کو حاصل کرنے کے لیے کیا کرسکتی ہے دونوں صورتوں میں شہرت میرے قدم چومے گی۔'' اس نے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھایا جس میں مگرمچھ کی کھال سے بنے اسٹریپ کی گھڑی بندھی تھی اور کرن

کو اچھی طرح یاد تھا کہ ڈاکٹر بدر ہی وہ گھڑی پہنتا تھا۔
"دیکھو تم جو کہو گے میں کروں گی لیکن تم کمال کو چھوڑ دو پلیز۔" کرن نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

❖......☆......❖

حامد اپنی وین میں سپر ہائی وے پر جارہا تھا کافی دیر سفر کرنے کے بعد اس نے اپنی وین سیدھے ہاتھ پر موڑ کر ایک کچے راستے پر ڈال دی تھی جو اس کے اندازے کے مطابق دلکش فارم کی طرف جاتا تھا' راستے میں بہت خودرو جھاڑیاں تھیں جو آگے چل کر جنگل میں تبدیل ہوگئی تھیں اس سے اور آگے دور ایک نہر بہہ رہی تھی اس نے جھاڑیوں میں چھپا کر وین روکی تھی اور انجن اسٹارٹ ہی چھوڑ کر نیچے اتر گیا تھا پھر وہ ایک پگڈنڈی پر آگے بڑھنے لگا تھا جس پر کسی ہیوی گاڑی کے ٹائروں کے نشانات موجود تھے کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جھاڑیوں سے پار اس کی نظر لکڑیوں سے بنے ایک بڑے سے کیبن پر پڑی تھی پھر وہ واپس اپنی وین تک آیا تھا اور وہاں سے اس نے سراغرساں پرویز کو فون کیا تھا۔
"پرویز مجھے مدد کی ضرورت ہے۔" اس نے کہا اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات ناچ رہے تھے وہ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے کہ کرن اس کیبن میں موجود ہو اسے مدد کی ضرورت ہو وہ خاصا پریشان ہو رہا تھا' اتنا عرصہ کرن کے ساتھ کام کرتے ہوئے وہ اس سے خاصا قریب ہوگیا تھا اس کا خیال کرنے لگا تھا اس کی اور کمال کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھنے لگا تھا۔
"تم کہاں ہو؟" اچانک پرویز کی آواز سے وہ چونکا تھا۔
"میرا خیال ہے میں نے ڈاکٹر بدر کا ٹھکانہ ڈھونڈ لیا ہے یہ سپر ہائی وے سے ایک میل اندر کی طرف واقع ہے۔"
"میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم انتظار کرو۔"
"میری بات سنو پرویز یہ ضروری ہے یہ بتاؤ کہ جنسی تشدد کے مریض یا مجرم کی وین کی پہچان کیا ہے؟" اس نے پرویز سے پوچھا۔
"وہ نیوی کلر یا بلیک کلر کی بتائی جاتی ہے اس میں کھڑکیاں نہیں ہیں ایک شخص نے ہی اسے دیکھا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ وہ گہرے رنگ کی ہے اندر شاید کارپٹ بچھا ہے اور......"
"وہ یہاں ہے ایسی ہی ایک وین یہاں موجود ہے۔" حامد نے کہا۔
"کیا تم روڈ پر موجود ہو؟" پرویز نے پوچھا۔
"نہیں' میں روڈ سے دائیں ہاتھ پر مڑنے والی ایک پگڈنڈی پر بنے وین کے ٹائروں کے نشانات کے تعاقب میں یہاں تک پہنچا ہوں جہاں میں نے اپنی وین کھڑی کی ہے وہاں ایک جنگل ہے۔"
"تم وہیں ٹھہرو' میں کمال اور رحمان کو اسکول سے لے کر آتا ہوں۔" پرویز نے کہا۔ "میں انہیں کشور کے پاس چھوڑ کر آؤں گا تم موقع سے دور رہنا کوشش کرنا کہ تم کسی کی نظر میں نہ آؤ...... میں وہاں پہنچ کر وین کو چیک کروں گا اور اگر وہ واقعی مطلوبہ وین ہوگی تو پولیس کو فون کروں گا۔" پرویز نے کہا اور حامد نے فون بند کردیا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔
"سوری پرویز میں یہ بات نہیں مان سکتا' ممکن ہے اسے میری ضرورت ہو......" حامد منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور وین کا دروازہ بند کرکے واپس اسی راستے پر چل دیا جہاں آگے اسے کیبن اور وین نظر آئے تھے۔

❖......☆......❖

ویران فارم ہاؤس کے کیبن میں کرن وقت کی قید سے آزاد ایک کرسی پر نیم برہنہ حالت میں بیٹھی تھی' کمرے میں روشنی ہونے کے بعد اس نے دیکھا تھا کہ وہاں کچھ سامان بھی موجود تھا کمرے میں ناگوار سی بو بسی ہوئی تھی' فرش پر ایک میٹریس پڑی تھی ایک کونے میں بڑی سی میز تھی دیوار میں اوپر کی طرف کیمرے نصب تھے جن سے کرن کے خیال میں اس کی تصاویر یا ویڈیوز یقیناً بنائی گئی تھیں وہ جاننا چاہتی تھی کہ اسے یہاں لاکر کیسے قیدی بنایا گیا' کمرے میں ایک ہی دروازہ تھا جو لاک تھا چنانچہ فرار کا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔
"اب وقت آگیا ہے کہ میں تجربہ شروع کروں۔" اچانک آواز پر وہ چونکی تھی۔
"کیا؟" اس نے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا جس نے وائٹ کلر کا لیب کوٹ پہنا ہوا تھا۔

''بس کرو ڈاکٹر بدر میں نے تمہیں پہچان لیا ہے اپنے چہرے سے ماسک اتارو اور مجھے یہاں سے جانے دو۔'' کرن نے ہمت جمع کر کے کہا۔
''چالاک خاتون..... تم نے مجھے کیسے پہچانا؟''
''تمہاری گھڑی' تمہارا بولنے کا انداز' تمہارے الفاظ..... بس اب مجھے میرے کپڑے واپس کرو اور جانے دو۔''
''ابھی نہیں مائی ڈیئر' اس طرح میرا تجربہ تو ناکام ہو جائے گا۔''
''تم کیا بکواس کر رہے ہو کیسا تجربہ؟''
''تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم کتنی اسمارٹ ہو چنانچہ میں تمہیں ایک اشارہ دیتا ہوں نفسیاتی مریض میں post-traumatic stressPTSD کا تجربہ۔''
''اس سے میرا کیا تعلق ہے؟''
''تمہارا تعلق ہے۔''
''یہ ناممکن ہے۔''
''یہ ممکن ہے' عورتوں اور بچوں میں یہ ممکن ہے کہ جب انہیں زندگی کے خطرناک حالات کا سامنا ہوتا ہے تو وہ اس پر فتح پا لیتے ہیں لیکن تمہارا معاملہ اس سے مختلف ہے' تمہارا دماغ تمہارا ساتھ نہیں دیتا تم نے اپنے گرد ایک تصوراتی دنیا بسا رکھی ہے جس نے ایک نئی حقیقت کو جنم دیا ہے گاؤں کی رہنے والی ایک لڑکی جو شہر میں آ کر ایک مشہور ٹی وی رپورٹر بن گئی ہے' اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' ڈاکٹر بدر نے کہا اس نے ماسک اتار دیا تھا اور اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی کرن اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی اسے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا تھا کہ ڈاکٹر بدر کی مسکراہٹ کتنی خوفناک تھی اسے جھرجھری آ گئی اور وہ سوچنے لگی کہ اس نے ڈاکٹر بدر کو پہچاننے میں کتنی غلطی کی تھی۔
''تم جانتے ہو میں کون ہوں؟'' کرن نے پوچھا۔
'ہاں میں ہی تو جانتا ہوں تم کون ہو۔'' ڈاکٹر بدر نے ہنستے ہوئے کہا۔
''تو تم مجھ سے کھیل رہے تھے؟ مجھے بے وقوف بنا رہے تھے؟''
'یقیناً..... بھلا میں اپنے نئے تجربات کس پر کرتا؟''
''کیسے تجربات؟''
''یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔''
''تم ذہنی مریض ہو۔'' کرن نے چیخ کر کہا اور ڈاکٹر نے اس کے گال پر زور سے طمانچہ مارا پھر ڈاکٹر نے اس کے بال پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا تھا اور کرن نے زور سے اس کے پیٹ میں لات ماری تھی وہ دہرا ہو گیا تھا اور کرن اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے پھر اس پر چھلانگ لگائی تھی اور میز پر رکھا ہوا لیمپ اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا تھا وہ کرسی پر گرا تھا اور کرسی سمیت فرش پر ڈھیر ہو گیا تھا اتنی دیر کرن کے لیے کافی تھی وہ دروازہ کھول کر کمرے سے نکل کر بھاگی تھی۔

❖......☆......❖
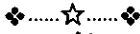
حامد کیبن کے قریب پہنچ کر اندر سے آنے والی آوازوں کو سن رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے دو افراد لڑ رہے ہوں کسی جنریٹر کے چلنے کی آواز بھی آ رہی تھی پھر اچانک اسے ایک عورت کے چیخنے کی آواز سنائی دی اور وہ پہچان گیا کہ وہ کرن ہی کی آواز تھی۔
''کرن..... میں حامد ہوں..... میں آ رہا ہوں۔'' وہ آواز کی سمت کا اندازہ کر کے بھاگا پھر وہ جیسے ہی کیبن میں داخل ہوا تھا ایک کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوئی نیم برہنہ کرن اس سے ٹکرائی تھی اور حامد نے اسے تھام لیا تھا۔
''اوہ خدایا کرن؟'' حامد کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا لیکن کرن اسے چھوڑ کر باہر کی طرف بھاگی تھی پھر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا ڈاکٹر بدر نے حامد کو پکڑ لیا تھا۔
''نہیں..... خدا کے واسطے اسے چھوڑ دو۔'' کرن چیخی تھی۔
''تم کہیں نہیں جا سکتیں..... تم میری ہو۔'' ڈاکٹر بدر بھی چیخا تھا لیکن کرن بھاگتی ہوئی جنگل میں چلی گئی تھی۔
''میں نے تمہیں بتایا ہے..... ابھی میرا تجربہ باقی ہے..... تم کہیں نہیں جا سکتیں.....'' اس نے کہا اور حامد کو گھسیٹتا ہوا اندر کمرے میں لے گیا پھر اس نے حامد کو بے تحاشہ مارنا شروع کر دیا تھا۔

کرن کچھ دور تک بنا سوچے سمجھے بھاگتی رہی تھی پھر اچانک ایک جگہ رک گئی تھی اسے حامد کا خیال آیا تھا جو نہ جانے کیسے اسے بچانے پہنچ گیا تھا اور وہ اسے اکیلا ڈاکٹر بدر کے ساتھ چھوڑ آئی تھی اس خیال کے آتے ہی وہ دوبارہ پلٹی تھی اس نے سوچا تھا کہ شاید وہ حامد کی کوئی مدد کر سکے جب وہ واپس کیبن تک پہنچی تھی تو وہاں خاموشی تھی اور اس کمرے کا دروازہ نیم وا تھا جس سے وہ نکل کر بھاگی تھی یوں لگ رہا تھا کہ کیبن میں کوئی موجود نہ ہو۔

''حامد..... حامد.....'' اس نے کئی بار حامد کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہ ملنے پر بہت احتیاط سے قدم اٹھاتی کمرے میں داخل ہوئی دروازہ کھول کر وہ دو قدم آگے ہی گئی تھی کہ کوئی سخت چیز اس کے سر پر ٹکرائی تھی اور وہ اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی تھی۔

جب اسے ہوش آیا تھا تو کمرے میں موجود تیز روشنیوں سے اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے سر کے پیچھے اس حصے کی طرف بڑھ گیا تھا جہاں شدید درد ہو رہا تھا اس کی انگلیاں بھیگ گئی تھیں اور اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کرن..... کیا تم ٹھیک ہو؟'' کسی نے پوچھا تو کرن نے آواز کی سمت گردن گھمائی اور وہ حیران رہ گئی۔

''اوہ خدایا..... اس نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟'' اس نے حامد کو دیکھ کر کہا وہ فرش پر زخمی حالت میں پڑا تھا اس کے جسم سے جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا' کرن اس کی طرف بڑھی لیکن دو قدم بڑھانے کے بعد گر گئی اس کا دایاں پاؤں زنجیر میں بندھا ہوا تھا۔

''اوہ حامد.....'' وہ کراہی۔ ''میں تم تک نہیں پہنچ سکتی ..... میں زنجیر میں بندھی ہوں جو دیوار کے ساتھ لگے ایک لوہے کے کنڈے میں لگی ہے کیا تم میرے قریب کھسک کر آسکتے ہو تاکہ میں تمہاری مدد کر سکوں۔'' اس نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں ..... تم غور سے میری بات سنو.....'' حامد نے کہا اور اسے زور سے کھانسی آئی پھر اس کے منہ سے خون نکلا تھا۔

''باتیں مت کرو..... تمہیں کھانسی آرہی ہے..... اوہ خدایا..... اس نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''سنو ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' حامد نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔'' حامد نے کہا اور پھر کھانسی کے ساتھ خون آیا۔

''حامد پلیز..... مت بولو۔''

''کرن..... یہ بہت ضروری ہے ..... میں تمہیں بچانے کی کوشش کررہا تھا۔'' حامد نے کہا۔

''ڈاکٹر بدر کہاں ہے؟'' کرن نے پوچھا۔

''وہ کہہ رہا تھا کہ وہ میری وین نہر میں ڈبونے جارہا ہے وہ بیس فٹ گہری ہے۔''

''اچھا' خاموش ہو جاؤ..... تمہارا بہت خون بہہ گیا ہے..... شاید کوئی ہماری مدد کو آجائے۔''

''نہیں' وہ ہمیں نہیں ڈھونڈ سکیں گے..... یہ جگہ غیر آباد ہے اور میری وین بھی اس نے پانی میں ڈبودی ہوگی..... کوئی نشانی نہیں ہے۔''

''سنو ہمت کرو..... تم یہاں سے نکل جاؤ..... اپنی جان بچاؤ۔''

''لیکن میں تو زنجیر سے بندھی ہوں کیا کروں؟'' کرن نے کہا۔

''حامد تم بہت بڑے بے وقوف ہو۔'' اچانک ڈاکٹر بدر کی آواز آئی وہ کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ ''تم کرن کی محبت میں گرفتار ہو تب ہی اسے بچانے یہاں آگئے بھلا اور کوئی کیسے یہ ہمت کرسکتا تھا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہیں اچھی سزا مل گئی ہے۔''

'بدر..... تم ایک ڈاکٹر ہو..... اس پر رحم کرو اس کی حالت اچھی نہیں ہے پلیز اسے اسپتال لے چلو۔'' کرن نے درخواست کی اور ڈاکٹر بدر ہنس پڑا۔

''تم بھی کتنی احمق ہو اسے میں نے ہی اس حال کو پہنچایا ہے اس لیے نہیں کہ پھر اس کو اسپتال لے جا کر اس کا علاج کرواؤں۔''

''دیکھو تم جو کہو گے میں کروں گی تم اسے چھوڑ دو۔'' کرن نے کہا لیکن جواب میں ڈاکٹر بدر نے حامد کے سینے پر ٹھوکریں مارنا شروع کردیں وہ درد سے چیخ رہا تھا۔

''اسے سبق ملنا چاہیے اس نے یہاں آنے کی جرات کیسے کی؟'' وہ غصے سے بولا' کرن اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن زنجیر کی وجہ سے

وہ آگے نہ بڑھ سکی بس طاقت لگاتی رہی جس پر ڈاکٹر نے تالیاں بجائیں۔
''واہ واہ کیا منظر ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اب میرا تجربہ مکمل ہوگا۔''
''کیسا تجربہ؟''
''جو تمہارے شوہر کی موت سے شروع ہوا تھا جب تم کومے میں چلی گئی تھیں تب کمال پیدا ہونے والا تھا' میں نے ہی تمہیں حاصل کرنے کے لیے تمہارے شوہر تمیز الدین کو مارا تھا وہ میرے راستے کا پتھر تھا' لیکن جب تم ہوش میں آئیں تو یادداشت کھو چکی تھیں ایسی حالت میں ہی کمال پیدا ہوا' میں نے تمہارے سارے اخراجات اٹھائے...... تمہیں پھر سے زندہ رہنا سکھایا...... یوں سمجھ لو تمہیں نئی زندگی دی...... تمہیں ٹی وی چینل میں ملازمت دلائی...... تمہیں گھر دلایا...... اور اب...... اب یہ تمہارے نئے عاشق میرے راستے کی دیوار بننا چاہتے ہیں...... میں اسے ماردوں گا...... تاکہ تم پھر ایک بار اسی کیفیت سے گزرو...... ہاہاہاہا کتنا مزہ آئے گا آج ایک محبت کی قربانی ہوگی۔''
''تم پاگل ہوگئے ہو۔'' کرن نے غصے سے کہا۔
''تم جب غصے کی کیفیت سے باہر آؤ گی تو تمہیں اندازہ ہوگا جب میرے تجربات پر میرا تحقیقی کام چھپے گا تو دنیا میں میری شہرت ہوجائے گی اور تم...... تم گمنام ہوجاؤ گی ایک باسی پھول کی طرح...... ایک مسلے ہوئے گلاب کی طرح جسے صرف میرے باغ میں کھلنا چاہیے تھا لیکن تم نے خود یہ انجام اپنے لیے منتخب کیا ہے۔'' اس نے پھر ٹھوکروں سے حامد کو مارتے ہوئے کہا۔
''رک جاؤ...... ڈاکٹر...... خدا کے لیے...... ایسا مت کرو......'' کرن چیخی اور ڈاکٹر نے زور سے اسے تھپڑ مارا وہ پیچھے کی طرف گر گئی۔ وہ اس کے خاصا قریب آ گیا تھا کرن نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قریب پڑی کرسی اٹھائی اور لگاتار اس کے سر اور گھٹنوں پر مارتی چلی گئی وہ کراہ رہا تھا پھر وہ گر گیا تھا لیکن گرتے گرتے اس نے کرن کا سر پکڑ کر دیوار سے دے مارا تھا وہ چکرا کر رہ گئی تھی اور پھر اس کے غصے اور سر کی چوٹ نے مل کر اس کے ذہن میں پچھلی یادوں کا سیلاب برپا کر دیا تھا' وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی تھی۔
''اوہ' ڈاکٹر مجھے یاد آ گیا...... میں ملائیکہ تمیز الدین ہوں...... میں ملائکہ ہوں۔''
''اسے باندھ دو......'' حامد نے کہا۔
''اوہ...... اس نے مجھے ٹھیک کر دیا ہے...... میں جانتی ہوں میں ملائیکہ ہوں۔''
''باندھ دو...... اسے باندھ دو۔'' حامد نے پھر کہا' اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔
''کیسے......؟ یہاں تو صرف یہ زنجیر ہے۔'' اس نے کہا۔
''دیکھو...... ڈاکٹر بدر بے ہوش ہے اور تمہارے قریب ہی پڑا ہے اس کی جیبیں تلاش کرو اس میں زنجیر کے تالے کی چابی ہوگی۔'' حامد نے کہا اور کرن نے اس کی تقلید کی ڈاکٹر کے کوٹ کی جیب میں چابی مل گئی تھی اور کرن نے اپنے پیر میں بندھی زنجیر کھول لی تھی اسی وقت کمرے میں باہر قدموں کی آواز سنائی دی تھی اور سراغرساں پرویز چند پولیس افسران کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تھا اس کے ہاتھ میں پستول تھی۔
''جو جہاں ہے وہیں ٹھہر جائے۔'' اس نے کڑک دار آواز میں کہا پولیس افسران نے کمرے میں پوزیشن سنبھال لی تھی اور پرویز کرن کی طرف بڑھا تھا۔
''اوہ...... تم زخمی ہو؟'' اس نے کا۔
''مجھے چھوڑو...... اسے دیکھو...... حامد کو...... اس نے بہت مارا ہے...... اسے جلدی اسپتال پہنچاؤ۔'' کرن نے کہا اور پرویز نے پولیس افسران کو حامد کی طرف اشارہ کیا دو پولیس افسران ڈاکٹر بدر کو ہتھکڑی لگا کر باہر لے گئے تھے اور پرویز کرن کے قریب آ گیا تھا۔
''اوہ پرویز' میں سمجھی کہ شاید اب تم سے کبھی نہیں مل سکوں گی۔''
''جب تک میں زندہ ہوں ایسا نہیں ہوسکتا...... کرن...... تم میری ہو۔'' پرویز نے کہا۔
''میں کرن نہیں' ملائیکہ ہوں...... میری یادداشت واپس آ گئی ہے۔'' اس نے کہا اور پرویز اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

❖......☆......❖

دو ہفتے بعد کرن اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی کمال اس کے قریب صوفے پر موجود تھا' اور سراغرساں پرویز کرن کیساتھ بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

''کرن...... میں بہت خوش ہوں......'' پرویز نے کہنا شروع کیا۔

''کرن نہیں...... ملائیکہ تمیز الدین...... میری ماں کا نام ملائیکہ ہے آپ پھر بھول گئے۔'' کمال نے ہنستے ہوئے کہا' کمال بہت خوش تھا اسے ایک پہچان مل گئی تھی کرن کی یادداشت آنے کے بعد اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ تمیز الدین کا بیٹا تھا جسے ڈاکٹر بدر نے چودہ سال پہلے مار دیا تھا' ڈاکٹر بدر گرفتار ہو چکا تھا' حامد اسپتال میں داخل تھا اس کی حالت آہستہ آہستہ بہتر ہو رہی تھی اور سراغرساں پرویز اپنے بیٹے رحمان سمیت' کمال اور ملائیکہ کا بن بلایا مہمان بن گیا تھا۔

''تم جانتی ہو...... بغیر ایک خاتون کے گھر کھانے کو دوڑتا ہے۔'' پرویز نے کہا۔

''ہوں......'' ملائیکہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کل لنچ پر چلتے ہیں۔'' پرویز نے پیش کش کی۔

''کیا خیال ہے کمال۔'' ملائیکہ نے کمال کی طرف دیکھا جو پرویز کو بہت پسند کرتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' کمال نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

❖......☆......❖
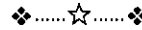
اگلے روز خبرنامہ ختم کرتے ہوئے وہ بہت خوش تھی۔

''ناظرین' آج جنسی تشدد کی آخری تفصیلی رپورٹ میں نے پیش کردی ہے امید ہے کہ آپ کو یہ پروگرام پسند آیا ہوگا' اب چینل-10 نیوز کی رپورٹر ملائیکہ تمیز الدین کو اجازت دیں' شب بخیر۔''

''بہت اچھا پروگرام رہا ملائیکہ۔'' کشور نے آگے بڑھ کر مبارک باد دی اور ملائیکہ مسکرا دی۔

''مبارک ہو ملائیکہ پروگرام بہت زبردست گیا ہے۔'' اس کے باس شجاع نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''شکریہ باس۔''

''مجھے احساس ہے میں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا...... میں معافی چاہتا ہوں۔'' شجاع نے کہا۔

''اب آپ خوش ہیں؟''

''خوش...... بہت خوش...... ہم نے سارے نیوز چینلو کو پیچھے چھوڑ دیا ہے ہماری ریٹنگ سب سے زیادہ رہی ہے' تمہیں بہت سے چینلو بک کرنا چاہتے ہیں' ہمیں تمہارے لیے ایک پرسنل سیکرٹری رکھنا پڑے گی' جو تمہارے معاملات سنبھالے...... سب ہی تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن میں نے سب سے کہہ دیا ہے کہ تم ہم سے کنٹریکٹ کر چکی ہو...... میں تمہارے ساتھ ڈنر کرنا چاہتا ہوں تاکہ ہم اس کنٹریکٹ کی مدت بڑھانے پر بات کرسکیں۔''

''سوری میں آج فارغ نہیں ہوں۔'' ملائیکہ نے مسکرا کر کہا۔

''پھر اگلے ہفتے؟''

''دراصل میں کل اپنے بچوں کے ساتھ اپنے گاؤں جارہی ہوں۔''

''بچوں......؟ میرا خیال ہے تمہارا ایک ہی بیٹا ہے کمال۔''

''ہاں' لیکن ایک بیٹا رحمان بھی ہے...... رحمان پرویز...... سراغرساں پرویز کا بیٹا...... ہم سب گاؤں جارہے ہیں ممکن ہے وہاں مجھے میرے بچپن کی بہت سی یادیں مل جائیں۔'' ملائیکہ نے کہا۔

''اوہ مبارک ہو ملائیکہ...... میں پرویز کے لیے مبارکباد دے رہی ہوں جسے تم نے اپنے اچھے دوستوں میں شامل کرلیا ہے۔'' کشور نے کہا۔

''شکریہ...... کشور...... پرویز میرا اچھا دوست ہی نہیں بلکہ اب میری زندگی میں میرا جیون ساتھی ہوگا...... میرے کمال اور رحمان کا محافظ...... سرپرست اور ان کے سر کا سایہ۔'' ملائیکہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

❖

بازگشت

ریاض بٹ

کچھ جرائم ایسے ہوتے ہیں جس کی سزا قانون کی کتابوں میں نہیں ہوتی قانون جرم کا شکار ہونے والوں سے ہمدردی تو کرتا ہے لیکن مجرم کوسزا نہیں دے سکتا۔

ریٹائرڈ انسپکٹر خالد کی ڈائری کا ایک ورق

اس جہان فانی میں ہر قسم کے لوگ بستے ہیں۔ نیک‘بد‘ اچھے اور برے‘ نیکی اور بدی کا یہ سفر ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ آج تفتیشی کہانی کا آغاز کرنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ جرائم کی دنیا میں اچھے اور برے دونوں قسم کے مرد وزن سے مجھے پالا پڑتا رہا تھا...... اور میں نے من وعن دونوں قسم کے کرداروں سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی جو کچھ میں نے دیکھا‘ جرائم کی تفتیش کے سلسلے میں‘ وہی پیش کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں‘ نہ سارے مردوں کو مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے اور نہ ساری عورتوں کو...... اور نہ کسی جنس کی تذلیل مقصود ہوتی ہے‘ کہانی میں...... بہرحال یہ تفتیشی کہانی ان دنوں کی ہے جب سیلاب نے ہر طرف تباہی مچادی تھی۔ ہمارے تھانے کی حدود میں جو علاقے تھے وہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ ویسے یہ آج سے تقریباً تیس سال پہلے کی بات ہے‘ پانی ہمارے تھانے کی بنیادوں تک آ گیا تھا...... اب تو پانی اتر گیا تھا لیکن اس کے اثرات باقی تھے۔

گاؤں میں محبت آباد اور صابر آباد کے دو دو جوان سیلاب کی نذر ہوگئے تھے۔ یہ پانی بھی عجیب چیز ہے۔ نہ ہو تو زندگی گزارنا ناممکن کی حد تک مشکل ہوتا ہے اور زیادہ آجائے‘ یعنی سیلاب آجائے تو انسان اس کی تباہی سے بچ نہیں سکتا۔

اب یہاں بیان کرنے والی بات یہ ہے کہ ایک صبح ایک بوڑھی سی عورت گاؤں صابر آباد سے میرے پاس تھانے میں آئی۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہوگی۔ میں نے اسے عزت سے بٹھایا اور آنے کی وجہ پوچھی۔

''تھانیدار صاحب‘ میری بات کوئی نہیں سنتا ہے اور نہ سچ مانتا ہے‘ سب یہی کہتے ہیں کہ میرا دماغ خراب ہوگیا ہے‘ کیا میں واقعی پاگل لگتی ہوں۔'' آخر میں‘ اس نے مجھ سے ہی سوال کردیا۔

''نہیں‘ اماں جی۔'' میں نے مختصر جواب دیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا وہ سر جھکائے کسی سوچ میں غرق تھی۔

آخر اس کے لب ہلے۔

''تھانیدار بیٹا...... تم بھی میرے بیٹے کی طرح ہو...... میں لوگوں سے کہتی ہوں کہ میرے بیٹے اصغر علی کو سیلاب میں جان بوجھ کر دھکا دیا گیا ہے‘ لیکن سب کہتے ہیں یہ بڑھیا پاگل ہے۔''

''کیا مطلب‘ اماں جی؟'' میں واقعی حیران ہوا۔

''میں کوئی ثبوت پیش نہیں کرسکتی...... بس میرا دل کہتا ہے کہ میرا بیٹا کسی کی دشمنی کی بھینٹ چڑھا ہے۔ کوئی موقع کی تلاش میں تھا اور......'' وہ خاموش ہوگئی۔

لیکن اس موقع پر میں خاموش نہیں رہ سکتا تھا‘ مجھے تجسس ہوا کہ آخر یہ اماں جی کس لیے یہ سب کہہ رہی ہے؟

''چلیں اس بات کو ایک طرف رکھیں‘ کہ آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن کوئی وجہ تو ہوگی یہ بات کہنے کی۔''

''بیٹا تم تھانیدار ہو...... خود ہی کوئی سراغ لگاؤ نہ......''

''لیکن...... اماں جی...... آپ کوئی شک اور وجہ

بتائیں گی تو قانون ان کی انگلی پکڑ کر آگے بڑھ سکے گا......!" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرنا ہی بہتر سمجھا۔

"میری بیٹی اور دوسرا بیٹا اکبر علی بھی مجھے پاگل سمجھتے ہیں......اس لیے میرے ساتھ آنے پر راضی نہیں تھے...... میں بوڑھی ہڈیوں سے اکیلی ہی آ گئی ہوں......" وہ میری بات کی تہہ تک پہنچے بغیر بولی۔

میں چکرا کر رہ گیا۔ کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا کہ ہوسکتا ہے یہ اماں جی جوان بیٹے کے مرنے کے صدمے کی وجہ سے ایسی باتیں کر رہی ہوں' بظاہر یہی قرین قیاس تھا۔

میں نے اسے یہ تسلی دے کر رخصت کر دیا کہ میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں......؟ اس نے مجھے اپنا نام وزیر بیگم بتایا تھا۔ میں نے کیا کرنا تھا؟ اس بات کا کوئی سر پیر ہی نہیں تھا......کوئی بنیاد ہی نہیں تھی...... جس طرح بنیاد کے بغیر کوئی عمارت تعمیر کرنا ایک بڑی حماقت ہوتی ہے اسی طرح بغیر وجہ اور ثبوت کے تفتیش کرنا وقت کے ضیاع کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

لیکن......!

اماں جی......میرے ذہن میں ایک گرہ سی ضرور ڈال گئی تھی۔

تھانے کے دوسرے کاموں میں الجھ کر میں یہ سب کچھ بھول گیا۔ یہ کوئی ایک ہفتے بعد کی بات ہے کہ وزیر بیگم ایک بار پھر میرے سامنے موجود تھی۔ مگر اس بار وہ اکیلی نہیں تھی' بلکہ اس کے ساتھ اس کے محلے کے دو معزز مرد بھی تھے۔ جن کی عمریں بالترتیب چالیس اور پینتالیس سال کے درمیان تھیں......اماں جی بہت پریشان تھیں۔ میں نے انہیں اپنے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے

کہا۔
ان میں چالیس سالہ بندے کا نام عمر دین جبکہ دوسرے کا فضل دین تھا۔ گفتگو کا آغاز عمر دین نے کیا۔
''تھانیدار صاحب' ان کا بیٹا اکبر علی گم ہوگیا ہے۔''
''گم ہوگیا ہے......!'' میں نے زیر لب دہرایا...... ایک نظر وزیر بیگم کی طرف دیکھا پھر بولا۔
''یہ کب کی بات ہے؟''
''اکبر علی رات سے غائب ہے۔''
'اماں جی......وہ کیا کہہ کر گھر سے گیا تھا...... کہ کہاں جارہا ہے؟''
''تھانیدار پتر' تم نے پہلے بھی میری بات پر کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا...... ''اب بھی شاید تم میری بات کا اعتبار نہ کرو...... اس لیے میں ان دو معزز بندوں کو ساتھ لے آئی ہوں۔''
''اماں جی......دراصل میں بہت مصروف تھا...... آج میں آپ کے گھر آنے والا تھا......!'' میں نے مصلحت آمیز جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ ''اب میں ساری اگلی پچھلی کسر پوری کردوں گا...... آپ بلاجھجک ساری بات بتادیں۔''
میں نے دیکھا...... کہ دونوں معزز اشخاص نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں' آپ نے جو جھوٹ بولا ہے اسی کی اس وقت ضرورت تھی۔
وہ اس کے پڑوسی تھے......اور ہر بات سے باخبر لگتے تھے اور میرا قیاس یہ بھی تھا کہ وزیر بیگم انہیں یہ بات بتا کر لائی ہوگی کہ وہ پہلے بھی اصغر علی کے سلسلے میں تھانے میں جا چکی ہے۔
میرے کان وزیر بیگم کی طرف لگے ہوئے تھے۔
چند لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے ...... پھر وزیر بیگم کے لب ہلے۔
''وہ اچھا بھلا...... اپنے کمرے میں سویا تھا' صبح میں جب اس کو جگانے گئی تو کمرہ خالی تھا' یہاں پہنچ کر وہ چپ ہوگئی اور سر جھکالیا' میں نے اب واقعی اس کے گھر جاکر تفتیش کرنی تھی' لیکن اس سے پہلے آئے ہوئے دونوں معزز اشخاص سے چند سوال کرنے تھے۔
میں نے سپاہی منظور کو بلا کر اسے حکم دیا۔
''منظور احمد اماں جی کو لے جاؤ...... اور انہیں اپنی بیرک میں بٹھاؤ۔'' ان کے جانے کے بعد میں عمر دین اور فضل دین کی طرف متوجہ ہوگیا۔
''ہاں تو جناب...... میرے خیال میں آپ اپنی پڑوسن کے سارے حالات سے واقف ہوں گے۔''
''بالکل جناب......انہوں نے یہ بات آج ہی ہمیں بتائی ہے کہ یہ اصغر علی کے سلسلے میں آپ کے پاس آچکی ہیں۔''
دونوں نے گویا میرے خیال کی تصدیق کردی۔ میں نے چند لمحے ان کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیا' پھر سوال کیا۔
''آپ کا کیا خیال ہے؟ اصغر علی واقعی سیلاب کی نذر ہوا تھا یا......؟''
''دیکھیں جناب' آپ خود سمجھدار ہیں...... اصغر علی گاؤں کے ساتھ بہتے نالے میں تیزی سے بہتا آرہا تھا...... گاؤں کے دو جوانوں نے اسے دیکھ لیا...... اور شور مچادیا...... پھر چار پانچ بندوں نے اسے بڑی مشکل سے نکالا تھا' وہ بے جان تھا۔ یہی لگتا تھا کہ سیلابی ریلے نے اسے نالے میں پھینکا تھا......اور پھر یہ بات مان بھی لی گئی لیکن وزیر بیگم نے اپنے بیٹے کی لاش دیکھ کر کہا تھا کہ اسے جان بوجھ کر نالے میں پھینکا گیا ہے لیکن اس کے پاس کوئی وجہ یا ثبوت نہیں تھا۔ ویسے سیلاب نے زیادہ نقصان فصلوں کا کیا تھا...... اور کچھ ڈور ڈنگر بھی لاپتہ ہوئے تھے۔'' پہلے تو کچھ سنی سنائی باتیں مجھ تک پہنچی تھیں اب حقیقت یہ دو معزز اشخاص بیان کررہے تھے۔
''اچھا......آپ یہ بتائیں کہ مجھ تک یہ اطلاع پہنچی تھی کہ گاؤں صابر آباد میں دو جوان سیلاب کی نذر ہوئے تھے......دوسرا جوان کون تھا......''
''تھانیدار صاحب ہمارے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں ......عمر دین نے فضل دین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
اس نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔
''خیر اس بات کو چھوڑیں' اب ایک سوال کا جواب دیں۔ کیا اس خاندان کے ساتھ کسی کی دشمنی بھی ہے؟''
''تھانیدار صاحب! اب چونکہ اکبر علی بھی گم ہے اس

لیے......'' فضل دین کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
''ہاں ہاں' فضل دین صاحب بلاخوف ہر بات بتادیں کسی معاملے میں آپ کا نام نہیں آئے گا......قانون کی چھتری آپ کو ہر قسم کا تحفظ فراہم کرے گی......!'' میں نے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے کہا۔
''سیانے کہتے ہیں......نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں......لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ باتیں صرف آپ تک رہیں گی......!'' فضل دین نے چند لمحے عمر دین کی طرف دیکھا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔
''دراصل اصغر علی اور اکبر علی کی بہن نمو کا مسئلہ ہے ہمارے خیال میں۔''
''کیسا مسئلہ......؟'' میرے کان کھڑے ہوگئے اور تمام تھانیدارانہ حسیں بیدار ہوگئیں۔
''گاؤں کے نمبردار نے اپنے بیٹے کے لیے نمو کا رشتہ مانگا تھا' لیکن اصغر علی اور اکبر علی نے انکار کردیا تھا۔''
''اور وزیر بیگم نے کیا کہا تھا؟''
''اس نے فیصلہ بیٹوں پر چھوڑ دیا تھا۔''
''آپ سیانے بیانے بندے ہیں...... جب رشتے سے انکار کیا جاتا ہے تو اس کی کوئی وجہ بھی ہوتی ہے......کیا نمبر دار کے بیٹے میں کوئی عیب تھا' یا بھائی' بہن کی شادی کہیں اور کرنا چاہتے تھے؟''
''دراصل نمبر دار شرافت علی کا بیٹا رفاقت علی شہر کے کسی دفتر میں کام کرتا ہے......اور سنا یہ گیا ہے کہ وہ وہاں خراب عورتوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے اور ایک بات میں اپنی طرف سے کروں گا' اگر آپ اجازت دیں......!''
''بالکل......فضل دین صاحب' جب آپ نے اس چوٹی کو سر کرہی لیا ہے' میرا مطلب ہے جو معلومات مجھ تک پہنچائی ہیں تو دل کی بات بھی کہہ دیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
جب کسی کی اولاد نمبردار کے بیٹے کی طرح بگڑ جاتی ہے تو اسے یہی راستہ نظر آتا ہے کہ اس کے پاؤں میں شادی کی زنجیر ڈال دے۔ ہوسکتا ہے نمبردار صاحب نے اسی لیے نمو کا رشتہ مانگا ہو۔''
''آپ کی بات بالکل صحیح اور قابل غور ہے۔'' میں نے کہا۔

اس کے بعد میں نے ان کے تعاون کا شکریہ ادا کر کے رخصت کر دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وزیر بیگم کو بھی لے جائیں۔ میں جلد ہی وزیر بیگم کے گھر آؤں گا۔ لیکن ......!

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے' دوپہر کو میرے پاس اطلاع آئی کہ صابر آباد کے آخر میں واقع کھیتوں میں اکبر علی کی لاش پڑی ہے۔ اطلاع دینے عمر دین اور سرفراز آئے تھے...... سرفراز کا تعلق بھی صابر آباد سے تھا۔

میں نے چند باتیں ان سے پوچھیں...... اور ضروری تیاری کے بعد ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اور دو سپاہیوں کو لے کر جائے واردات کی طرف روانہ ہو گیا۔

دونوں اشخاص تانگے پر آئے تھے۔

لیکن ہم نے سرکاری جیپ اور لاش والی گاڑی استعمال کی...... ابھی ہم صابر آباد کے ان کھیتوں سے دور ہی تھے کہ ہمیں کسی عورت کے بینوں کی آواز آئی۔

قریب جا کر پتہ چلا کہ وہ وزیر بیگم ہی ہے' گاؤں کی چند عورتیں اسے سنبھال رہی تھیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ یہ کھیت قدرے ویران جگہ پر تھے' آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی...... یہ بنجر کھیت تھے...... اس کی وجہ سیم تھور تھی...... کافی گھنے درخت بھی تھے...... درختوں پر چند گدھ بیٹھے ہوئے تھے...... مجھے بتایا گیا تھا کہ اس طرف زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ میں نے لاش کا معائنہ کیا...... میں پہلی بار اکبر علی کو دیکھ رہا تھا۔ کافی خوبصورت جوان رہا ہوگا' اب تو اس کا رنگ بالکل خراب ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے نیلا نیلا جھاگ نکلا تھا' جو اب تھوڑی پر جم سا گیا تھا۔ یہ نشانی کسی سانپ کے ڈسنے کی تھی...... یا کسی سریع الاثر زہر کی اور یہ زہر سانپ کا بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے بڑی باریک بینی سے لاش کا معائنہ کیا...... مجھے کہیں بھی سانپ کے دانتوں کا نشان نظر نہیں آیا اور اس کے جسم پر کسی قسم کے تشدد کے نشان بھی نظر نہیں آئے ...... میں نے اس کی جیبیں دیکھیں وہاں ایک "کنگھی" چند روپے ایک سگریٹ کی ڈبی اور ماچس کے علاوہ کچھ نہیں تھا...... بٹوہ بھی نہیں تھا...... سگریٹ غالباً گولڈ لیف کے تھے۔

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کرنے کے بعد لاش سپاہی منظور کی نگرانی میں پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔

وزیر بیگم کو عورتیں غالباً اس کے گھر لے گئی تھیں۔

یہاں سے وزیر بیگم کا گھر تقریباً چار فرلانگ کے فاصلے پر تھا...... یہ اس وقت کا آدھا میل سمجھ لیں۔

سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ اس ویران جگہ پر اکبر کیوں آیا تھا؟ مجھے کھوجی کا انتظار تھا...... کھوجی کا نام حشمت علی تھا...... وہ چند لمحوں بعد ہی آ گیا...... اس نے مجھے سلام کیا...... اور اپنے کام میں جت گیا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان کو کھوجی کے پاس رہنے دیا...... اور خود سرکاری جیپ میں بیٹھ کر وزیر بیگم کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا...... سپاہی عظمت بھی میرے ساتھ تھا۔

وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وزیر بیگم کی طبیعت زیادہ بگڑنے کی وجہ سے اسے عمر دین اور اس کی بیوی شہر کے اسپتال میں لے گئے تھے۔ جائے وقوع پر نمبردار شرافت علی کی غیر حاضری مجھے کھٹک رہی تھی...... ایسے معاملات میں تو نمبردار آگے آگے ہوتے تھے۔ دال میں کچھ کالا تھا۔

اب ہمارا وزیر بیگم کے گھر میں کوئی کام نہیں تھا...... ان حالات میں نمو سے بھی تفتیش نہیں ہو سکتی تھی۔

نمبردار کا گھر قریب ہی تھا...... میں نے سوچا لگے ہاتھوں اسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ہم نے گاڑیاں وہیں کھڑی رہنے دیں اور میں اور سپاہی پیدل ہی اس کے گھر پہنچ گئے۔

سپاہی نے دروازے پر دستک دی' دروازے کے باہر ہلکے نیلے رنگ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔

دستک کے جواب میں اندر سے ایک بھاری بھرکم نسوانی آواز آئی۔

"کون ہے...... بھئی؟"

"سپاہی نے کہا۔ خاتون نمبردار صاحب کو باہر بھیجیں' ہم تھانے سے آئے ہیں۔"

"نمبردار صاحب تو کل کے شہر گئے ہوئے ہیں...... آئیں گے تو تھانے میں بھیج دوں گی۔"

اس سے پہلے کہ سپاہی کچھ کہتا...... میں آگے بڑھا'

اور کھنکھار کر گلہ صاف کرنے کے بعد بولا۔
''آپ کا بیٹا رفاقت علی کدھر ہے؟''
''وہ تو شہر میں ہی رہتا ہے۔ صرف ہفتے کی شام کو آتا ہے اور سوموار کو صبح چلا جاتا ہے۔''
''ٹھیک ہے بی بی جونہی شرافت علی آئے اسے تھانے بھیج دینا۔'' اس کے بعد ہم نے تھانے میں آ کر دم لیا تھا۔
یہاں اے ایس آئی میرے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا...... مجھے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔
میرے بیٹھنے کے بعد وہ بیٹھا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا' وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔
''سر...... مجھے تو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اصغر علی بھی قدرتی موت نہیں مرا۔''
''کیا تمہارے پاس کوئی تھیوری ہے؟'' میں نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔
''تھیوری تو کوئی نہیں ہے سر' اس نے چند لمحے اپنا سر کھجایا پھر بولا۔ ''ویسے ہی ایک اندازہ اور شک ہے۔''
''اچھا...... لیکن اب شک کیسے رفع ہوسکتا ہے...... اصغر علی تو منوں مٹی تلے ابدی نیند سویا ہوا ہے میں نے اس کے خیالات جاننے کے لیے کہا۔
''یہ مسئلہ تو ہے' سر'' اے ایس آئی آفاق کچھ دیر خاموش رہا پھر گویا ہوا۔ ''آپ نے جو حالات بتائے ہیں اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر بیگم تو چاہتی ہے کہ ہم اصغر علی کی موت کی بھی تفتیش کریں۔''
''بالکل یہی بات ہے' آفاق...... بلکہ وہ تو شاکی ہے کہ میں نے پہلے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی...... لیکن تم خود سوچو...... اس وقت حالات ایسے نہیں تھے' اب بھی شک والی بات ہی ہے۔''
''بہر حال سر...... ابھی تو ہم کچھ نہیں کر سکتے...... جب تک وزیر بیگم ٹھیک نہ ہوجائے...... اسے اوپر درخواست دے کر بیٹے کی لاش قبر سے نکلوانے کے آرڈر حاصل کرنے پڑیں گے...... پھر لاش کا پوسٹ مارٹم کروانے کے بعد ہی حقیقت تک رسائی حاصل ہوسکے گی۔'' اے ایس آئی آفاق نے پوری تفصیل بیان کردی۔
''تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو...... اس دوران تم یہ پتہ کرو کہ نمبردار شرافت علی شہر کیوں آیا ہے؟''
''شہر آیا ہے۔'' اس نے زیر لب دہرایا پھر بولا۔
''اس کا بیٹا شہر میں کسی وکیل کا منشی ہے...... ہوسکتا ہے وہ اسے ملنے آیا ہو...... اس نے اپنی معلومات کا ذخیرہ میرے کانوں میں انڈیل دیا۔
''ویری گڈ...... جن معلومات کی مجھے ضرورت تھی وہ تو پہلے ہی تمہارے پاس موجود ہیں۔'' میں نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''بس سر ہمیں آنکھیں اور کان کھلے رکھنے پڑتے ہیں ورنہ......!''
''ویسے رفاقت علی کیسا لڑکا ہے؟''
''آوارہ...... اور عورتوں کا رسیا......'' آفاق نے کہا۔
''ٹھیک ہے آفاق' تم یہ پتہ کرو کہ شرافت علی شہر کیوں آیا ہے؟ کیا بیٹے کے پاس آیا ہے یا......؟''
وہ ''یس سر'' کہہ کر چلا گیا اور میں سوچوں کے گھوڑے دوڑانے لگا۔
یہاں یہ بات بتانا مناسب ہوگا کہ جن بنجر کھیتوں سے اکبر علی کی لاش ملی تھی وہ نمبردار شرافت علی کی ملکیت تھے۔
اگلے دن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی...... ساتھ لاش بھی تھی۔ وزیر بیگم کی حالت اب بہتر تھی' وہ خود دو بندوں کے ساتھ لاش لینے آئی تھی...... یہ ایسا وقت نہیں تھا کہ میں اس سے سوال وجواب شروع کردیتا۔ ضروری کاغذی کارروائی کے بعد میں نے لاش ان کے سپرد کردی اور خود پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کھول کر بیٹھ گیا۔
پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اکبر علی کی موت رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی...... اس کے معدے میں زہریلے حلوے کی کچھ مقدار موجود تھی' زہر سانپ کا تھا۔
میں سوچنے لگا...... کہ زہریلا حلوہ اسے کس نے کھلایا تھا...... اور وہ اس ویران جگہ پر کیوں گیا تھا......؟ لاش بھی اتفاقاً دریافت ہوئی تھی۔ اس طرف کوئی کم ہی جاتا تھا...... لاش گاؤں صابر آباد کے ایک بندے غلام محمد نے دیکھی تھی' اس کی بکری گم ہوگئی تھی' وہ اسے ڈھونڈتا ہوا اس طرف نکل گیا تھا' لاش دیکھ کر وہ حواس باختہ

ہوگیا تھا اور اس نے گاؤں کی طرف دوڑ لگادی تھی......
اس کے ذہن سے یہ بات حرف غلط کی طرح مٹ گئی تھی کہ وہ تو اپنی بکری ڈھونڈنے گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں واضح طور پر یہ لکھا تھا کہ حلوہ مرنے سے کچھ ہی دیر پہلے کھایا گیا تھا۔ عجیب پراسرار معاملہ تھا؟ اسی شام اکبر علی کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

اگلی صبح ابھی میں تھانے میں پہنچا ہی تھا کہ اے ایس آئی آفاق بھی میرے کمرے میں آ گیا۔ وہ ایک سنسنی خیز اطلاع لے کر آیا تھا۔

''سر یہاں تو معاملہ ہی اور بنا ہوا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شرافت علی کا بیٹا رفاقت علی آج کل جیل میں ہے۔'' اس نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

میں اچھل پڑا...... اور اے ایس آئی آفاق کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس نے کوئی پھلجڑی چھوڑی ہو۔

پھر اس نے جو تفصیل بتائی وہ میں اپنے الفاظ میں آپ تک پہنچا دیتا ہوں۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ نمبردار کا بیٹا یہاں شہر میں کسی وکیل کے پاس منشی تھا اور خراب عورتوں کے چکر میں پڑا ہوا تھا' تین دن پہلے اسے ایک بدنام گلی سے گرفتار کیا گیا تھا' مخبر کے ذریعے متعلقہ تھانے کو اطلاع ملی تھی کہ فلاں گلی میں عصمت فروشی کا دھندا ہوتا ہے...... جس وقت چھاپہ مارا گیا تھا رفاقت علی وہاں بڑی بی کے ساتھ بھاؤ تاؤ کر رہا تھا...... مختصراً یہ کہ اس تھانے کے ایس ایچ او نے فوری پرچہ کاٹ کر چھ عورتوں اور دو مردوں کو جیل بھجوا دیا تھا...... میں زیادہ تفصیل نہیں بتاؤں گا کیونکہ ایک تو اس واقعہ کا موجودہ کیس سے صرف اتنا ہی تعلق تھا کہ ہمارا مشتبہ جیل چلا گیا تھا...... دوسرے ان میں کچھ ایسی باتیں بھی تھیں جو احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں...... یہ بات بھی غور طلب تھی کہ سانپ کا زہر قاتل نے کہاں سے حاصل کیا تھا...... وہ کوئی عام زہر بھی استعمال کر سکتا تھا؟

کھوجی نے اپنا کام کر دیا تھا...... ابھی میں وہ باتیں 'یعنی کھروں کے متعلق نہیں بتاؤں گا۔ میں نے مخبروں کو بھی متحرک کر دیا تھا۔

وزیر بیگم کے گھر ابھی مہمانوں اور محلے داروں کی آمد و رفت جاری تھی اس نے تو ابھی کافی دن جاری رہنا تھا...... ہماری مخبر نوراں (جس کا ذکر پچھلی دو تین کہانیوں میں آ چکا ہے) کا وزیر بیگم کے گھر آنا جانا تھا...... میں نے اس کو اپنے ذریعے سے پیغام بھیجا کہ وزیر بیگم کو کہو کسی طرح وقت نکال کر تھانے میں آ جائے۔

دو دن بعد وہ میرے پاس آئی...... وہ تو برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ اس کے دو جوان جہان بیٹے وہاں چلے گئے تھے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ میں نے پہلے تو اس سے اظہار ہمدردی کیا...... پھر کہا۔

''اماں جی' بندہ عاجز و مجبور ہے...... ان معاملات میں...... ویسے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت جلد میں اکبر کے قاتلوں کو قانون کے کٹہرے میں کھڑا کر دوں گا۔''

لیکن...... تھانیدار صاحب اصغر علی کا معاملہ؟''

''میں نے اسی لیے آپ کو بلایا ہے...... میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ مجبوری تھی...... ورنہ میں ابھی آپ کو نہ زحمت دیتا...... اور......!'' میں نے چند لمحے توقف کیا پھر کہا۔

''ابھی آپ کے گھر آنے کا کوئی موقع نہیں تھا پھر میں نے وقت ضائع کیے بغیر اسے اصغر علی کی لاش قبر سے نکلوانے کا طریقہ سمجھا دیا...... اور محرر کو بلا کر ایک درخواست اس کی طرف سے لکھوا کر اس کے اوپر اس کا انگوٹھا لگوا لیا......! اس وقت کافی سوال میرے ذہن میں کھلبلی مچائے ہوئے تھے لیکن...... میں نے سردست اس کو رخصت کرنا ہی مناسب سمجھا۔

درخواست میں نے اس کے حوالے کر دی تھی اور یہ بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اسے درخواست کہاں دینی ہے۔ خیر یہ تو قانونی معاملات ہوتے ہیں جن کو اگر تفصیلاً بیان کرنا شروع کر دیں تو...... اس شام مجھے دیر تک تھانے میں رہنا تھا کیونکہ ذرا اندھیرا پھیلنے پر نوراں نے آنا تھا۔

وہ حسب وعدہ آ گئی اور میں نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر اپنے سامنے پڑی کرسی پر بٹھا لیا۔

''ہاں نوراں کیا خبریں ہیں؟''

''تھانیدار صاحب...... خبریں کافی گرم ہیں۔'' وہ معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''تم سے ٹھنڈی خبروں کی توقع رکھنا ایسے ہی ہے جیسے سورج سے ٹھنڈک مانگنا......'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کی حوصلہ افزائی ہے مہربانی ہے' نمو کے متعلق خبر یہ ہے کہ نمو اور نمبردار کے بیٹے رفاقت علی کی آپس میں بڑی گوڑھی (گہری) محبت ہے۔ وہ ملتے ملاتے بھی ہیں......اور مجھے یہ بات پتہ چلی ہے کہ نمو کے کہنے پر ہی رشتہ مانگا گیا تھا۔''

''اوہ......عجیب بات ہے......کیا نمو اس بات سے بے خبر ہے کہ رفاقت علی کس قماش کا بندہ ہے؟''

''تھانے دار صاحب آپ کی رفاقت علی سے ملاقات ہوچکی ہے۔'' اچانک کسی خیال کے تحت نوراں نے پوچھا۔

''نہیں......ابھی تک نہیں ہوئی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اسی لیے آپ حیران ہورہے ہیں۔ ایک تو رفاقت علی ایک خوبرو جوان ہے' دوسرے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے جنس مخالف کو شیشہ میں اتارنا اسے خوب آتا ہے۔''

''میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں......لیکن کیا وہ اتنی جرات والا ہے کہ کسی کو قتل کردے۔''

''بالکل ہے' وہ تو لڑائی خود مول لیتا ہے۔''

''کیا تمہیں پتہ ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟'' میں نے نوراں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہونا کہاں ہے' شہر میں ہوگا......' کل ہفتہ ہے کل شام کو آئے گا۔''

فی الحال میں نے اسے حالات سے باخبر کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے رخصت کردیا......اور اسے کہا کہ وہ نمو کو ٹٹولنے کی کوشش کرے۔

اس وقت کافی رات ہوگئی تھی......میں آرام کرنے اپنے گھر چلا گیا۔

کھوجی حشمت علی نے کھروں کے متعلق جو باتیں کی تھیں وہ بھی میرے ذہن میں تھیں......اور اب نوران جو باتیں بتا گئی تھی ان سے کچھ اشارے ملے تو تھے لیکن اس کیس کی کافی کڑیاں ابھی گم تھیں۔

اگلے دن مجھے بتایا گیا کہ نمبردار صاحب آئے ہیں' میں نے اسے فوری بلالیا۔

اس نے روایتی نمبرداروں کی طرح مجھے فرشی سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔

'مجھے ہنسی اور غصہ ایک ساتھ آیا......میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرتے ہوئے اسے خشک لہجے میں بیٹھنے کے لیے کہا۔

وہ بیٹھ گیا......چہرے سے کچھ پریشان لگتا تھا۔

''شرافت علی' کیا بات ہے کچھ پریشان لگتے ہو......؟ میں نے اس کے دل کا حال جاننے کے لیے اس بار ذرا نرم لہجے میں سوال کیا۔

میں از خود اسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ مجھ تک کیا معلومات پہنچ چکی ہیں۔

''پہلے آپ یہ بتائیں کہ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں ؟''

''ناراض......کس لیے بھئی......تم نے کونسا جرم کیا ہے؟'' میں نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے جرم کیا کرنا ہے جناب......میں تو قانون کے ساتھ تعاون کرنے والا بندہ ہوں......یہ میری ڈیوٹی بھی ہے' اور فرض بھی بنتا ہے۔ میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ آپ میرے گھر آئے لیکن میں آپ کو نہیں ملا۔''

''ہاں......میں نے چند لمحوں کے لیے سوچنے کی اداکاری کی پھر بولا۔

''تمہارے گھر تو ہم گئے تھے لیکن پتہ یہ چلا کہ تم شہر میں آئے ہوئے ہو۔''

''اب کیا بتاؤں تھانیدار صاحب میں نے تو حالات کو سلجھانا چاہا تھا' لیکن اصغر علی اور اکبر علی کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے حالات بگڑ گئے۔ اس وقت میرا بیٹا جیل میں ہے۔ میں اس کی ضمانت کروانے کے سلسلے میں شہر میں آیا ہوا ہوں۔ کل گاؤں گیا......تو پتہ چلا کہ آپ میرے غریب خانے گئے تھے۔''

پھر اس نے وہی باتیں بتائیں جو اے ایس آئی بتا گیا تھا۔

اب لوہا گرم تھا......اس لیے میں نے سوالات کے ہتھوڑے سے اس پر ضرب لگا کر اپنے مطلب کے سانچے

میں ڈھالنے کا فیصلہ کر لیا۔
میں نے نمبردار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا......
''دیکھو' شرافت علی انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے' میری معلومات کے مطابق تمہارا بیٹا بہت بگڑ چکا ہے......اسے ابھی کچھ دن حوالات میں رہنے دو' تاکہ وہ پچھتاوے کی آگ میں جل کر آئندہ کے لیے توبہ کر لے......''
''تھانیدار صاحب میں نے دنیا دیکھی ہے...... مجھے تو یہ محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ میرے بیٹے پر یہ شک کر رہے ہیں کہ اس نے اکبر علی کو زہریلا حلوہ کھلایا ہے۔'' وہ باخبر لگتا تھا۔
''لیکن تمہارا بیٹا تو اس رات جیل میں تھا۔''
''یہی بات تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔''
''مجھے پتہ ہے شرافت علی تم بہت ذہین اور معاملہ شناس ہو' لیکن میرے ساتھ چکر کر کے تم ایسے چکروں میں آ جاؤ گے جو تمہیں گھن چکر بنا دیں گے......تم نے میرے سوال کو گھما دیا ہے......!'' میں نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''اس نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جس میں حیرانگی اور شرمندگی دونوں موجود تھیں۔
''جناب...... میں آپ کو چکر دینے کی بالکل کوشش نہیں کر رہا...... بلکہ کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں نوک زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا......لیکن اب بتانا ہی مناسب ہے......
پھر جو باتیں اس نے میرے گوش گزار کیں وہ میں اپنے الفاظ میں آپ کو سنا دیتا ہوں...... ورنہ بات بہت لمبی ہو جائے گی۔
جیسا کہ آپ کے علم میں یہ بات آ چکی ہے کہ نمو اور رفاقت علی کے درمیان گوڑھی (گہری) محبت تھی ...... اور یہ بات پہلی بار میرے علم میں آئی کہ یہ چکر عرصہ دو سال سے چل رہا تھا......نمو اور اس کے گھر والوں کو کچھ عرصہ پہلے ہی پتہ چلا تھا لیکن شرافت علی بہت کائیاں شخص تھا...... وہ اڑتی چڑیا کے پر گننے کی خداداد صلاحیت سے مالا مال تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے ہی اسے شک ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی ٹوہ میں رہنے لگا' پھر دو ماہ کی تگ و دو کے بعد ایک شام اس نے ایک متروکہ ڈیرے میں ان کو ملتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ نمو کا سر رفاقت علی کی گود میں تھا...... اور وہ اس کے بالوں میں ہاتھ سے کنگھی کر رہا تھا...... دونوں شرافت علی کو اپنے سامنے دیکھ کر حواس باختہ ہو گئے......ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں اور سر جھک گئے ......شرافت علی نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔
''دیکھو...... نادانو' اس طرح ایک جوان لڑکی اور ایک جوان لڑکے کا ایسی ویران جگہ ملنا ٹھیک نہیں ...... آگ اور پانی ایک ساتھ ہوں تو شیطان اس آگ کو مزید بھڑکا کر پانی کو ابلنے پر مجبور کر دیتا ہے تم دونوں مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ اس طرح نہیں ملو گے۔''
نمو نے شرافت علی کے نرم لہجے سے شہہ پا کر اپنے لب کھولے۔
''چاچا جی ہماری سچی محبت ہے۔ رفاقت نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ سارے برے کام چھوڑ دے گا۔''
''ٹھیک ہے ......نمو تم میری بیٹیوں کی جگہ ہو' میں یہ نہیں کہوں گا کہ تم نے میرے بیٹے کو خراب کیا ہے......بس آج کے بعد تم میری نصیحت کو اپنے پلے باندھ لو کہ آئندہ تم نے اس طرح ملنا نہیں ہے' ویسے تم میرے گھر آ سکتی ہو۔''
''چاچا جی ہم پہلے بھی مہینے میں دو تین دفعہ ہی اس طرح ملتے تھے اب آئندہ اور احتیاط کریں گے۔''
اس کے بعد شرافت علی نے نمو کو اپنے گھر جانے کا کہا تھا اور رفاقت علی کو لے کر گھر کی طرف چل پڑا تھا۔
کچھ دن شرافت علی نے خاموشی اختیار کیے رکھی ...... پھر اپنی بیوی کو ساری صورت حال سمجھا کر اسے کہا کہ وہ جا کر رشتہ مانگے۔
اس کی بیوی ناصرہ بیگم بھی شرافت علی کی طرح ایک جہاندیدہ خاتون تھیں...... اس نے یہ بات ظاہر کیے بغیر کہ نمو اور رفاقت علی کے درمیان کھچڑی پک رہی ہے ...... رشتے کے لیے بات چلائی...... یہ آج سے تقریباً سوا سال پہلے کی بات تھی۔
نمو کی ماں وزیر بیگم نے چند لمحے سوچا پھر کہا۔ ہم بیٹی والے ہیں ......ہمیں سوچنے کا موقع دیں...... پھر ہم نے بیٹوں کے ساتھ بھی مشورہ کرنا ہے' ناصرہ نے کہا......آپ کو سوچنے کے لیے کتنا وقت چاہیے؟''

''آپ دو ماہ بعد آئیں۔''
''اتنا وقت......؟'' ناصرہ بیگم نے حیرانگی سے کہا۔
''اگر آپ انتظار نہیں کر سکتے تو......''
لیکن ناصرہ بیگم نے وزیر بیگم کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے...... میں دو ماہ بعد آ جاؤں گی...... آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ دو ماہ بعد جب ناصرہ بیگم گئی تو انہوں نے ایک شرط رکھ دی کہ وہ اگر اپنی بیٹی کا رشتہ ہمارے بیٹے اصغر کو دے دیں تو ہم اپنی بیٹی کا رشتہ ان کے بیٹے رفاقت علی کو دے دیں گے۔ یہ شرط سن کر ناصرہ بیگم نے کہا...... میں سوچ کر جواب دوں گی۔ گھر آ کر اس نے ساری صورت حال اپنے خاوند کو بتا دی۔
'دیکھو...... ناصرہ میں وٹے سٹے کی شادی کے سخت خلاف ہوں' یہ بعد میں بہت سے مسائل اور خرابیاں پیدا کرتی ہیں۔'' شرافت علی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
''دیکھیں...... میں بھی اس کے سخت خلاف ہوں' پھر اس کی ایک اور وجہ بھی ہے؟''
''وہ سب میرے علم میں ہے ناصرہ...... فی الحال تم خاموشی سے بیٹھ جاؤ' جلتی آگ میں کودنے کا کوئی فائدہ نہیں...... ذرا آگ ٹھنڈی ہونے دو...... پھر دیکھیں گے اور ہاں......!'' چند لمحے شرافت علی نے اپنی بیوی کے چہرے کی طرف دیکھا...... پھر بولا۔
''ابھی بیٹی نرگس اور بیٹے رفاقت علی سے کسی قسم کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں...... اگر رفاقت علی پوچھے بھی تو کہہ دینا وہ لوگ ابھی سوچ رہے ہیں۔''
'لیکن...... دکھ کی بات یہ تھی کہ ابھی تک دونوں طرف کی سوچ جاری تھی......!
شرافت علی کی وہ وجہ بھی معقول اور دور اندیشی کے زمرے میں نظر آتی تھی جس کی بنا پر وہ اپنی بیٹی نرگس اس گھر میں نہیں دینا چاہتا تھا...... یہ وجہ ابھی بتانے کا وقت نہیں آیا' آپ آگے کی کہانی سنیے۔
ان باتوں سے میرے وہ شکوک کافی حد تک دور ہو گئے تھے جو رفاقت علی پر تھے۔ جاتے جاتے نمبردار شرافت علی...... دو باتیں ایسی کر گیا تھا جو سنانے کے قابل ہیں۔
ایک بات اس نے یہ کہی تھی کہ میں نے تو حالات کو کسی غلط رخ پر جانے سے بچانے کے لیے اپنی بیوی کو نمو کا رشتہ مانگنے کے لیے بھیجا تھا...... دوسری بات یہ کہی تھی کہ ہٹ دھرمی کی وجہ سے وزیر بیگم کو یہ دن دیکھنا پڑے ہیں۔
اب مجھے اس وقت کا انتظار تھا جب اصغر علی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے جاتی...... اور اس کی رپورٹ میرے سامنے آتی...... یہ چار دن بعد ممکن ہوا...... جب پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میرے سامنے آئی تو میرے بہت سے اندیشوں اور اندازوں کی تصدیق ہو گئی۔
پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ پہلے اصغر علی کا گلہ گھونٹا گیا تھا پھر اسے پانی میں پھینکا گیا تھا۔
لاش کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی...... اس لیے جلد ہی اسے دوبارہ دفنا دیا گیا تھا...... ویسے یہاں یہ بات بیان کر دیتا ہوں کہ وزیر بیگم نے آرڈر حاصل کر لیے تھے۔ ایسے حالات سے مجھے اپنی سروس میں بہت دفعہ پالا پڑا تھا۔
اس شام میں اور کانسٹیبل منور سفید کپڑوں میں وزیر بیگم کے گھر پہنچ گئے۔
وہ تو ایک طرح مر ہی گئی تھی...... میں نے کانسٹیبل منور کو صحن میں ہی رکنے کا حکم دیا...... اور خود اس کی بیٹھک میں پہنچ گیا۔
اس کا بہنوئی فاروق علی مجھے لے کر گیا تھا...... مجھے بٹھا کر اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا تھانیدار صاحب میں ابھی بہن وزیر بیگم کو لے کر آتا ہوں۔ وزیر بیگم اس کے سہارے بیٹھک میں آئی تھی۔
''تھانیدار صاحب میرا اندیشہ صحیح نکلا نہ......'' اس نے بیٹھتے ہی کہا۔
''اماں جی...... آپ کو یاد ہے کہ آپ جب پہلی بار میرے پاس آئی تھیں تو میں نے آپ سے کیا کہا تھا...... اگر اس وقت آپ سارے حالات بتا دیتیں تو میں اسی وقت یہ تفتیش شروع کر دیتا جواب کرنے لگا ہوں اور اس طرح شاید آپ کا اکبر علی بھی زندہ ہوتا۔''
اس نے سر جھکا لیا...... یہ اس بات کا اعتراف تھا کہ اس وقت واقعی اس سے غلطی ہو گئی تھی...... میں نے

شرافت علی اور مخبر نوراں سے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں وہ اس کے سامنے رکھ دیں اور وہ وجہ بھی جس کی بنا پر شرافت علی اپنی بیٹی نرگس کا رشتہ دینے سے گریزاں تھا...... یہ وجہ وٹے سٹے کے علاوہ تھی۔

''تھانیدار صاحب...... آپ تک جو باتیں پہنچی ہیں بالکل صحیح ہیں' میں ہی غلطی پر تھی۔''

یہاں دو باتوں کی وضاحت کردوں کہ اس وقت بیٹھک میں وزیر بیگم اور میں اکیلے تھے...... مخبر نوراں نے اصغر علی کے متعلق بھی کچھ باتیں بتائی تھیں...... وہ بھی میں نے وزیر بیگم کے سامنے رکھ دی تھیں ان کی بھی اس نے تصدیق کردی تھی۔

میں نے پچھتاوے کی آگ میں جلتی وزیر بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اماں جی ...... جو کچھ ہو چکا ہے وہ اس لیے واپس نہیں آسکتا کہ گیا وقت اور منہ سے نکلی بات کبھی واپس نہیں آتی...... لیکن......!'' میں نے چند لمحے توقف کیا...... پھر بولا۔

''مجھے اصغر اور اکبر کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے' اس لیے میں جو باتیں آپ سے پوچھوں ان کا صحیح صحیح جواب دیں۔''

اب تو کچھ بھی باقی نہیں بچا تھانیدار صاحب...... میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر کی جنت کو دوزخ بنالیا ہے...... اس کے آنسو نکل آئے۔

میں بھی اسے ایسی ہی جذباتی حالت میں لانا چاہتا تھا تاکہ وہ مجھ سے کچھ بھی نہ چھپائے۔

پھر اس نے مجھ سے کچھ بھی نہ چھپایا...... اور سب کچھ کہہ دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی نمو کا رشتہ نمبردار کے بیٹے کو دے دے گی۔

خیر یہ اس کا ذاتی مسئلہ تھا...... میرا مسئلہ یہ تھا کہ مجھے اصغر علی اور اکبر علی کے قاتلوں کو پکڑنا تھا...... اور اس سلسلے میں مجھے کافی اشارے اور سراغ مل گئے تھے...... اس طرف پہلے میرا خیال اس وقت گیا تھا جب نوراں نے مجھے اصغر علی کے متعلق بتایا تھا' لیکن اس وقت کچھ باتیں ابھی صاف اور واضح نہیں تھیں...... اب کافی حد تک باتیں واضح ہوگئی تھیں۔

صرف ایک الجھن باقی تھی...... اس کا ذکر آگے آئے گا...... دراصل قاتل نے جو بات اپنے دفاع کے لیے استعمال کی تھی...... وہی میری راہنمائی کا باعث بنی تھی۔

میں نے تھانے میں واپس آکر ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان کو اپنے کمرے میں بلالیا۔

''جی سر...... حکم......'' وہ آکر اٹین شن کھڑا ہوگیا۔

''ذرا...... اپنے کان ادھر لاؤ۔''

حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے میرے حکم کی تعمیل کی تھی۔

جاتے جاتے اسے میں نے یہ بھی کہا کہ وہ سپاہی شہباز کو بھی اپنے ساتھ لے جائے۔

تقریباً دو گھنٹے بعد اس نے آکر بتایا کہ بندہ نہیں ملا...... میرا شک اس صورت حال سے مزید کچھ پختہ ہوگیا...... سیانے اسی لیے کہتے ہیں کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

اسی رات میں نے مخبر نوراں کو ایک بار پھر بلالیا اور پہلا سوال یہ کیا۔

''نوراں ...... آج کل تمہارے ذہن کو کچھ زنگ سا لگ رہا ہے۔''

''کیا مطلب تھانیدار صاحب!'' اس کی حیرانگی دیدنی تھی۔ یہی لگتا تھا کہ اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا ہے۔

یہ بات میں نے اسے طیش دلانے کے لیے کی تھی تاکہ وہ ہاتھ دھو کر اس کام کے پیچھے پڑ جائے۔ جو میں اس سے لینا چاہتا تھا۔

''میرے خیال میں تنویر کی ماں نے تیرے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔''

''یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟'' نوراں بولی دراصل کچھ ہی دن پہلے اس نے مجھے بتایا تھا کہ تنویر کی ماں کہتی ہے ابھی تنویر واپس نہیں آیا' بس یہ میرا خیال ہے' اور شک ہے...... ابھی میں نے اس سے بات چھپالی تھی۔

''تھانیدار صاحب...... میں آپ کے خیال اور شک کو غلط کہنے کی جرأت تو نہیں کرسکتی لیکن میں آپ کے ہی کئی بار کہے ہوئے الفاظ کو دہرانے کی اجازت ضرور

چاہوں گی۔"

"اجازت ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ ہی اکثر کہتے ہیں کہ جب کوئی جھوٹ بولتا ہے تو وہ یا تو کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہ رہا ہوتا ہے یا پھر اپنی کسی غلطی یا جرم پر پردہ ڈالنا مقصود ہوتا ہے۔" اب میں نے اسے اصل بات بتانا مناسب سمجھا۔

"بالکل یہی بات ہے' نوراں' مجھے شک ہے کہ تنویر نے ہی دونوں (اکبر' اور اصغر) کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔"

"اوہ......لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ تنویر تو میری معلومات کے مطابق ابھی تک باہر ملک سے واپس نہیں آیا۔"

"یہی تو سارا چکر ہے' ائرپورٹ پر بھی ہمارا ایک مخبر ہے' پہلے تو میرا شک رفاقت علی پر تھا کہ کہیں اس نے نمو سے شادی کرنے کے لیے اپنے راستے کی دیواریں نہ گرادی ہوں لیکن میری تفتیش نے یہ بات غلط ثابت کردی تھی اس لیے میرا دھیان تنویر کی طرف گیا......اور میں نے سپاہی عظمت کو بھیج کر مخبر سے رابطہ کیا......تنویر کی ایک تصویر بھی میں نے کسی طریقے سے حاصل کرلی تھی۔ مخبر نے یہ بتا کر میری آنکھیں کھول دیں کہ تنویر اصغر علی کے ساتھ پیش آنے والے واقعے سے دو دن پہلے کینیڈا سے آ گیا تھا' اس نے خود اس حلیے کے آدمی کو دیکھا تھا......دراصل مخبر کی ڈیوٹی ائرپورٹ پر اس جگہ ہے جہاں باہر سے آنے والا اور باہر جانے والا کوئی ذی روح اس کی نظروں سے بچ نہیں سکتا۔" میری اتنی لمبی چوڑی بات ختم ہوئی تو نوراں بولی۔

"تھانیدار صاحب اس سے تو یہ بات کافی حد تک واضح ہوگئی ہے کہ تنویر آپ کا مشتبہ نمبر 1 ہے لیکن ایک بات ہے۔"

"کونسی بات نوراں؟"

"اب آپ یہ تو نہیں چاہیں گے کہ میں کسی طرح تنویر کی ماں سے پوچھوں کہ اس نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟"

"تم کافی سمجھدار ہو' اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی طرح تنویر کا سراغ لگانے میں ہماری مدد کرو......جونہی وہ ہمارے ہتھے چڑھا......میں خود ہی اس سے سب

کچھ اگلوا لوں گا۔"

"ٹھیک ہے...... تھانیدار صاحب...... میں انشاء اللہ جلد ہی آپ کو خوشخبری سناؤں گی۔"

اس کے بعد میں نے اسے رخصت کر دیا تھا۔

ہمارے دوسرے مخبر بھی ادھر ادھر سن گن لے رہے تھے۔

دو دن کہیں سے بھی کوئی حوصلہ افزا رپورٹ نہیں ملی...... مجھے ایک اور خطرہ بھی تھا...... میں نے اس کا بھی بندوبست کیا ہوا تھا۔ تنویر چپ چاپ واپس بھی جا سکتا تھا...... اس لیے میں نے ائرپورٹ والے مخبر کو ہائی الرٹ کر دیا تھا۔

تیسرے دن مجھے نوراں کی طرف سے ایک رقعہ ملا...... جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

"تھانیدار صاحب...... تنویر کو ڈھونڈنے کے سلسلے میں میرا خاوند بھی میری مدد کر رہا ہے...... ایک بات میں نے اپنے طریقے سے معلوم کر لی ہے' کہ تنویر نے اپنی آمد کیوں خفیہ رکھی ہے؟ اس نے اپنی ماں کو یہ بتایا تھا کہ جب وہ کینیڈا گیا تھا تو ایک بندے سے کچھ رقم ادھار لے کر گیا تھا...... ابھی اس کے پاس چونکہ رقم نہیں ہے اس لیے یہ سارا انتظام یعنی اپنے آپ کو کینیڈا میں ہی ظاہر کرنا' صرف اس شخص کے لیے ہے...... اب اپنی ماں کو وہ یہ بتا کر گیا ہے کہ اپنے ایک دوست کے پاس کچھ دن رہے گا...... دوست کا نام ابھی معلوم نہیں ہو سکا' میں نے زیادہ کریدا نہیں کہ کہیں تنویر کی ماں کو شک نہ ہو جائے۔ میری کوشش جاری ہے۔ آپ کی خیر اندیش۔!

رقعہ پڑھ کر میں نے اسے نذر آتش کر دیا...... اور ذہن کے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے...... اچانک اے ایس آئی نے السلام علیکم کہہ کر مجھے خیالات کی دنیا سے واپس آنے پر مجبور کر دیا۔

"اوہ...... آؤ آفاق...... وعلیکم السلام...... کہاں کہاں کی خاک چھان کر واپس آ رہے ہو؟"

"سر...... یہ تنویر کہیں ایسا غائب ہوا ہے کہ مل ہی نہیں رہا......"

"مل جائے گا...... بھئی...... ذرا حوصلہ رکھو۔"

پھر میں نے نوراں کی طرف سے آئے ہوئے رقعے کی عبارت سے اسے آگاہ کر دیا تھا۔

چند لمحے وہ کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

'سر...... پہلے تو ہمارا دھیان تنویر کی طرف گیا ہی نہیں تھا' اب اس کے دوستوں کے متعلق بھی چھان بین کرنی پڑے گی۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی میرے ذہن میں آ رہی ہے...... اے ایس آئی نے چند لمحے توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا...... یہ بات جھوٹ بھی ہو سکتی ہے جو تنویر نے اپنی واپسی کو خفیہ رکھنے کے لیے اپنے گھر والوں سے کی تھی۔"

"میں بھی تمہاری آمد سے چند لمحے پہلے اسی نتیجے پر پہنچا تھا اور میں نے ایک بات اور بھی سوچی ہے...... میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

اے ایس آئی متجسس نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

'یہ تنویر نرا گاؤدی نہیں لگتا ہے' بلکہ عقلمند لگتا ہے' اس طرح وہ یہی جواز بنا کر چپ چاپ واپس کینیڈا جا بھی سکتا ہے...... پھر ہم یہاں ہاتھوں سے اڑے طوطوں کو ڈھونڈتے ہی رہیں گے۔"

"اوہ...... سر...... آپ بہت دور کی بلکہ قریب کی کوڑی لائے ہیں۔ لگتا یہی ہے کہ تنویر کو کینیڈا میں ہی سب حالات کا علم ہو چکا تھا۔ وہ پوری پلاننگ کے تحت آیا تھا...... ویسے مجھے امید ہے کہ آپ نے حفظ ماتقدم کے طور پر ائرپورٹ والے مخبر کو ہائی الرٹ کر دیا ہوگا۔"

"بالکل...... آفاق...... یہ تو ضروری تھا۔"

اس کے بعد وہ چلا گیا تھا اور......! میں میز پر بکھرے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

کاغذات نمٹاتے نمٹاتے شام اپنی حشر سامانیوں سمیت دھرتی پر اتر آئی تھی۔ خنکی بڑھ گئی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے آفس بوائے کو بلا کر اپنے کمرے کی مغربی کھڑکی بند کروا دی۔

پھر...... میں آدھے گھنٹے بعد آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا۔ وہ رات میں نے کچھ جاگتے اور کچھ سوتے گزاری...... میں نے عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے رب باری تعالیٰ سے یہ دعا مانگی...... کہ وہ مجھے اس امتحان میں سرخرو کرے۔

یہ شاید پہلی بار ہوا تھا کہ ہمارا مشتبہ یا ملزم اتنے دنوں ہماری آنکھوں سے اوجھل رہا تھا...... ویسے میں ائرپورٹ کے متعلقہ تھانے دار کو بھی سارے حالات سے آگاہ کر دیا تھا اور اس نے ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کروادی تھی۔

اگلے دن میں ابھی اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ سپاہی شہباز نے آ کر اطلاع دی۔

''سر...... ایک برقع پوش خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہے۔''

''وہ بھیج دو بھئی۔''

چند لمحوں بعد ایک دراز قامت برقع پوش خاتون میرے سامنے تھی۔ اس نے جب میرے کہنے پر نقاب الٹا تو گویا دن کو چاند نکل آیا...... وہ ایسی ہی چندے مہتاب تھی، عمر بائیس سال لگتی تھی، میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں...... بی بی، تمہیں کونسی ضرورت تھانے تک لے آئی ہے۔''

''تھانے دار صاحب آپ مجھے بچالیں...... میں نے کوئی جرم نہیں کیا؟''

''بی بی...... یہ کیا بات ہوئی......؟ کھل کر اور صحیح صحیح بات بتاؤ۔''

''میں اکبر سے محبت کرتی تھی...... اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''پھر......؟''

تنویر میرا چچازاد ہے، وہ کافی عرصے سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ میرے ساتھ شادی کرلو...... لیکن میں تو اکبر کے علاوہ کسی اور کو زندگی کا ساتھی بنانے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی...... میں نے اسے صاف جواب دے دیا تھا، پھر وہ باہر چلا گیا...... میں نے سکھ کا سانس لیا، کچھ عرصہ پہلے وہ ایک دن مجھے ملا، میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی...... کیونکہ چاچی نے اس کے آنے کا تذکرہ نہیں کیا تھا...... میں نے اس سے پہلا سوال یہی کیا، اس نے بتایا کہ وہ تو کافی دنوں سے آیا ہوا ہے لیکن چونکہ اس نے ایک بندے کے پیسے دینے ہیں اس لیے اپنی آمد کو خفیہ رکھا ہوا ہے، تم بھی کسی سے ذکر نہ کرنا، میں نے اس سے وعدہ کرلیا اس

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کردیا ہے۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆ کہانیوں پر آپ کے تبصروں پر مشتمل خطوط (گفتگو) ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔

☆ خصوصی توجہ: ای میل سے کہانیاں ارسال کرنے والے مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کے اختتام پر اپنا اردو میں مکمل ایڈرس اور موبائل فون نمبر ضرور تحریر کریں۔

☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

7، فرید چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

میں میرا کیا نقصان تھا؟ لیکن اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا...... میں آج تک بڑی مشکل میں زندگی گزارتی آئی ہوں' اب آپ بے شک میرے ساتھ جو مرضی سلوک کریں' لیکن تنویر کو ضرور گرفتار کر کے سزا دلوائیں' کیونکہ اس نے کہا تھا کہ وہ میرے راستے سے ہٹ جائے گا...... میں صرف اس کا دیا ہوا حلوہ اکبر کو کھلا دوں۔''

''اوہ تو یہ بات ہے...... میں نے ایک طویل سانس لی...... لیکن کیا تم جانتی ہو کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟''

''تھانیدار صاحب' میں آپ کو ایک اشارہ دے دیتی ہوں' لیکن میری آپ سے ایک گزارش ہے کہ میرا نام نہ آئے...... میں آپ کو کیسے بتاؤں؟ کہ میں کتنا بڑا رسک لے کر تھانے میں آئی ہوں...... اگر میرے بھائیوں کو پتہ چل گیا تو وہ میری تکہ بوٹی کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔''

''تم بالکل بے فکر ہو کر مجھے اشارہ دے کر جس طرح خاموشی سے آئی ہو اسی طرح چلی جانا...... اور کسی سے کچھ ذکر نہ کرنا...... یہ تو تمہیں پتہ لگ ہی گیا ہوگا کہ اکبر کی موت زہریلا حلوہ کھانے سے واقع ہوئی تھی۔ اور زہر بھی سانپ کا تھا۔

''یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی...... اسی لیے تو میں پریشان تھی...... لیکن خدا گواہ ہے کہ مجھے اس بات کا بالکل علم نہیں تھا' کہ حلوہ زہریلا ہے۔ میں تو اس بات پر خوش تھی کہ چلو اسی بہانے تنویر سے جان چھوٹ جائے گی' رہی بات تنویر کی تو اس کا ایک دوست حکیم ہے' عمران وہ وہاں ہو سکتا ہے؟''

''دیکھو...... میں تمہیں پھر کہہ رہا ہوں کہ ان باتوں کا کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

قارئین وہ جرم میں شریک تھی بے شک نادانستہ شریک تھی' میں اسے تھانے میں روک سکتا تھا لیکن میں نے اسے جانے دیا...... ہوسکتا ہے کچھ قارئین مجھے اپنے فرائض سے غفلت کا مرتکب ٹھہرائیں لیکن نہ جانے کیوں مجھے وہ مظلوم لگی تھی...... اسی وقت میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کا نام کیس میں نہیں آنے دوں گا...... جیل جا کر اس نے بہت خراب ہونا تھا...... اس کے بھولپن سے فائدہ اٹھایا گیا تھا۔

ویسے وہ مجھے عمران حکیم کا پتہ دے گئی تھی۔

تقریباً چار گھنٹے بعد عمران حکیم اور تنویر میرے سامنے تھے...... دونوں کے چہرے یوں سفید ہو گئے تھے جیسے ان کے چہروں سے سارا خون غائب ہو گیا ہو۔

دونوں نے ہمیں زیادہ پریشان نہیں کیا...... میں نے اپنی استادی سے تنویر سے یہ بات منوالی کہ وہ مجسٹریٹ کے سامنے یہ بیان ریکارڈ کروائے کہ زہریلا حلوہ اس نے خود اکبر کو کھلایا تھا۔ ویسے یہ بات منوانے کے لیے میں نے اس کے ساتھ ہاتھ کیا تھا' اسے یہ چکمہ دیا تھا کہ میں ایسا پرچہ کاٹوں گا جس سے اسے کم سزا ہوگی...... وہ کوئی عادی مجرم تو تھا نہیں جو قانونی حربے اور قانونی دفعات سے واقف ہوتا...... یہ تو اس کے تابوت میں آخری کیل تھی...... اس سے میں اسے زیادہ سے زیادہ سزا دلوانا چاہتا تھا...... اور مہتاب کو بچانا چاہتا تھا...... جی ہاں جو لڑکی میرے پاس آئی تھی اس نے اپنا نام مہتاب بتایا تھا...... تنویر نے قانون کو ہاتھ میں لیا تھا یہ سب تو ہو گیا تھا اور میرا کام ختم ہو گیا تھا۔

اب پردے اٹھا دیتا ہوں...... سب سے پہلے کھوجی حشمت علی کی سن لیجیے...... اس نے کہا تھا کہ مقتول اکبر علی کے کھرے اس کے گھر کے پچھلی طرف جو دروازہ ہے اس طرف سے آئے تھے...... اور جائے واردات تک گئے تھے' یعنی جہاں اکبر کی لاش ملی تھی لیکن واپسی کے کھرے نہیں تھے...... تقریباً ایک فرلانگ مغرب کی طرف سے کسی لڑکی کے کھرے آئے تھے اور اسی طرف واپس گئے تھے' اس کے آگے ذرا پختہ سڑک تھی' وہاں کھرے غائب ہو گئے تھے' یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ایک لڑکی جائے واردات تک آئی تھی...... بے شک اس کی رہائش کے متعلق کلیئر نہیں ہوا تھا...... لیکن اب تو ہر بات کلیئر ہو گئی تھی...... وہ مہتاب ہی تھی۔ اب یہ بتا دیتا ہوں کہ تنویر کی ایک بہن نگہت اکبر کے بڑے بھائی اصغر کے ساتھ بیاہی گئی تھی لیکن اصغر کی ماں وزیر بیگم نے اسے ایک دن بھی چین نہ لینے دیا...... کئی دفعہ جھوٹی باتیں اس کے ساتھ منسوب کر کے اپنے بیٹے کو بتائیں اور اس نے نگہت پر کئی بار ہاتھ اٹھایا...... وہ ناز و انداز میں پلی بڑھی تھی...... جب تک باپ زندہ رہا...... اس کے ناز نخرے اٹھاتا رہا...... یہ

کہہ کر کہ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں' پتہ نہیں اگلے گھران کیساتھ کیا سلوک ہو؟ باپ کے مرنے کے بعد ماں نے اور اس سے زیادہ بھائی نے اس کا خیال رکھا...... اس کی ہر خواہش پوری کی...... تنویر اکثر کہتا تھا کہ میں اپنی نگہت کو کہیں نہ جانے دوں گا' اگر کوئی گھر داماد مل گیا تو اسے بیاہوں گا...... یہ تو جذباتی باتیں ہوتی ہیں جس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی تھی کہ تنویر کو اپنی بہن بہت عزیز تھی...... وہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھنے کی سکت نہیں رکھتا تھا...... لیکن آخر کار اسے بہن کو رخصت کرنا پڑا' دنیا کے دستور کے مطابق کیونکہ بادشاہ بھی اپنے اتنے وسائل رعب ودبدبے کے باوجود بیٹی کو گھر میں نہیں بٹھا سکتا...... اپنی بہن کو رخصت کرنے کے بعد وہ کینیڈا چلا گیا...... ادھر آخر وزیر بیگم نے اپنے بیٹے اصغر سے نگہت کو طلاق دلوا کر چھوڑی...... وہ روتی دھوتی اپنی ماں کے پاس چلی گئی...... میں نے اپنے تھانیدارانہ تجربے سے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ وزیر بیگم ایک نفسیاتی کیس تھا...... وہ اپنی بہو کو اپنے پاؤں کی جوتی کے نیچے رکھنا چاہتی تھی۔

اس کو ہوش اب آیا تھا۔ جب چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں...... جب نگہت طلاق کا داغ ماتھے پر لے کر اپنی ماں کے پاس گئی تو ان دنوں تنویر کینیڈا میں تھا...... اس نے سارے حالات خط میں لکھ کر اسے بھیج دیے...... اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا...... اصل میں وہ کینیڈا کی جس فرم میں ملازم تھا' ان دنوں' اس کی طرف سے جاپان گیا ہوا تھا' خط کمپنی والوں نے سنبھال کر رکھ لیا...... اور جب وہ واپس آیا تو اسے خط دیا گیا۔ خط پڑھ کر تنویر کا دماغ گھوم گیا...... اس نے چھٹی کی درخواست دے دی...... اسے صرف ایک ماہ کی چھٹی ملی...... وہ پوری پلاننگ کر کے آیا تھا...... اس کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں' اصغر اسے کھیتوں میں مل گیا اصغر اس کے مقابلے میں دھان پان سا تھا...... اچانک گاؤں میں سیلاب کا ریلا آ گیا...... تنویر نے اصغر کو پکڑ کر اس کا گلا گھونٹ دیا' اور اسے ریلے میں پھینک دیا...... وہ سیدھا نالے میں گرا' تنویر بڑی مشکل سے بچتا بچاتا گھر پہنچ گیا...... اس نے اپنے آپ کو گاؤں والوں سے پوشیدہ رکھا تھا' اور ابھی اکبر کو بھی ٹھکانے لگانا تھا' بقول اس کے وہ وزیر بیگم کو دونوں بیٹوں سے محروم کر دینا چاہتا تھا' کیونکہ نگہت نے بتایا تھا' کہ ظلم کرنے میں وہ بھی اپنے بھائی اور ماں کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ اب وہ اکبر کو مارنے کے لیے منصوبہ بندی کرنے لگا...... اسے یہ پتہ تھا کہ اس کی تایازاد مہتاب اکبر سے محبت کرتی ہے' اسے اس بات کا دکھ بھی تھا اور غصہ بھی...... اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا فیصلہ کیا' زہر اپنے حکیم دوست عمران سے لیا...... عمران اس کا لنگوٹیا یار تھا' اس کے گرے ہوئے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کو تیار رہتا تھا۔ دراصل تنویر انتقام میں اندھا ہو کر سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کھو چکا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ہر کام اس کے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوگا...... اصغر کا گلا گھونٹ کر اسے سیلاب کی نذر کرتے ہوئے اس نے یہی سوچا تھا کہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ اصغر سیلاب کی وجہ سے اس انجام کو پہنچا ہے' اور اکبر کے لیے سانپ کا زہر استعمال کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ یہ سمجھ لیا جائے...... اکبر کو سانپ نے ڈس لیا ہے...... اس نے آخر میں حقیقتاً چپ چاپ واپس آنے کا پروگرام بنالیا تھا۔

لیکن انسان یہ بات بھول جاتا ہے کہ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے......اور خون اپنی گواہی خود دیتا ہے۔

قارئین......! اب میں آخر میں تنویر کی آخری باتیں سنا دیتا ہوں' آج اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تنویر میرے سامنے بیٹھا ہوا یہ سب کہہ رہا ہو (ویسے یہ باتیں میری ڈائری میں درج ہیں)

تھانیدار صاحب! جس بہن کو میں نے محبت کی چھتری کے نیچے پروان چڑھایا' اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا...... اس کے ساتھ ظلم کی انتہا کر دی گئی...... اس کو بے قصور مارا پیٹا گیا...... اور آخر میں اس کے ماتھے پر طلاق کا کلنک لگا کر گھر سے نکال دیا گیا۔ آپ کے قانون میں کوئی ایسی دفعہ ہے جس کے تحت ایسے لوگوں کو سزا دی جاسکے...... پھر میں کیا کرتا؟ اس کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گیا تھا...... لیکن میں نے قانون کے تقاضے پورے کیے تھے' ویسے تنویر کی کہی ہوئی باتوں کی بازگشت آج بھی میرے بوڑھے کانوں میں گونجتی ہے۔

●

ایک سو سولہ چاند کی راتیں

عشنا کوثر سردار

قسط نمبر 16

یہ ناول 1947ء کے تقسیم ہندوستان کے پس منظر میں ہے، اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے ہیں جنہوں نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈو پاک کی تقسیم جب ہونے جا رہی تھی اس دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو ملے۔ اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔ جب تاریخ رقم ہو رہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزرے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر...... وہ خوف...... تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔

نواب سیف الدین پٹوڈی کچھ دیر خاموش رہے تھے پھر جیسے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے بولے تھے۔

''میاں جگ ہنسائی کا سوچ کر بیٹی کی زندگی کسی مشکل میں نہیں ڈال سکتے، دنیا کی فکر کریں گے تو رشتے خطرے میں پڑ جائیں گے۔'' نواب صاحب کا لہجہ متانت بھرا تھا مرزا سراج الدولہ کو یکدم اندیشوں نے گھیرا تھا۔

''ایسی باتیں کیوں کررہے ہیں نواب صاحب ہم مل کر بیٹھے ہیں اور اس بابت بات چیت کرتے ہیں برسوں کے مراسم ہیں ایسی کیا بے اعتباری دل میں گھر کررہی ہے، اب میں آپ کی طرف آتا ہوں چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر مت لیں نواب صاحب۔'' مرزا صاحب بولے تھے ان کا انداز مصلحت پسند تھا اور نواب صاحب نے نرم لہجے میں کہا تھا۔

''ٹھیک ہے آپ تشریف لایئے ہم بات کرلیتے ہیں۔'' وہ متانت سے بولے تھے۔

❁......◉......❁

فتح النساء سر جھکائے بیٹھی تھی جب بوا چلتی ہوئی پاس آئی تھیں فتح النساء خاموش تھیں چہرے پر زندگی کی کوئی رمق نہ تھی۔

''فتح النساء آپ کب تک خود کو اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا دیں گی جو جرم آپ نے کیا ہی نہیں اس کے لیے خود کو سزائیں کیوں دینا۔'' بوا نے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا تھا مگر فتح النساء کچھ نہیں بولی تھی۔

''مجھے لگتا ہے یہ گہری سازش کے تحت ہوا ہے ضرور مرزا حیدر سراج الدولہ کی کوئی چال ہے اور جلال کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں جلال کا قصور نہیں ان کو جو دکھایا گیا ہے انہوں نے وہی دیکھا ہے مگر جلد جب وہ معاملے کی سچائی جان لیں گے تو خود لوٹ کر آپ کے پاس آئیں گے۔'' بوا نے سمجھانا چاہا تھا مگر وہ آہستگی سے سر نفی میں ہلاتی ہوئی ان کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

''بوا جو مر جاتے ہیں ان سے کوئی رسما ملنے بھی چلا آئے تو فرق نہیں پڑتا ہم ایسے ہی مرنے والوں میں شامل ہو چکے ہیں جن کے لیے اب ایسے محسوسات کوئی معنی نہیں رکھتے، تمام خواب مر چکے ہیں اور ان کی قبریں ہمارے اندر بن چکی ہیں اور ہمیں اب اس معاملے سے سروکار نہیں رہا کہ کون لوٹتا ہے اور کون نہیں چھوٹے نواب آئیں تو آپ ان سے بلا تامل کہہ دیجیے گا کہ اب یہاں کوئی نہیں ہے ہمیں امید نہیں اگر وہ کبھی لوٹنا چاہیں گے مگر اگر ان کو کوئی پچھتاوا کبھی روکے اور ان کے قدم اس جانب آن رکیں تو برملا کہہ دیجیے گا کہ اب یہاں کوئی نہیں رہتا، فتح النساء مر چکی ہے۔'' وہ بہت مغموم تھی۔

''بیٹی دل میں آبدیدہ نہ ہو خاطر جمع رکھو اللہ سب بہتر کرے گا آپ کی پژمردگی ہمارا کلیجہ کاٹ رہی ہے مگر ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتے آپ کا ملول ہونا ہم سے دیکھا نہیں جاتا ہم کیا کریں آپ سے زیادہ ہم رنجیدہ ہیں مگر اس سے کیا ہوگا؟ ہم چھوٹے نواب کو سمجھانے کے قابل نہیں ان کا نمک کھایا ہے ان کے ملازم ہیں اور ملازم کی حیثیت کیا ہوتی ہے؟'' بوا کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں فتح النساء نے اٹھ کر ان کی آنکھیں پونچھی تھیں اور سر نفی میں ہلا کر ان کو مزید کچھ کہنے سے روکا تھا اور پھر آہستگی سے ملتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھیں بوا افسردہ سی ان کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔

❁......◉......❁

''ہمیں افسوس ہے جو ہوا مگر ہم جلال کے اقدام پر اس قدر شرمندہ ہیں کہ ہم فتح النساء سے آنکھیں نہیں ملا پا رہے ہم کیا کریں، ہمیں کچھ سمجھ نہیں آتا جلال ہمارے بہترین دوست ہیں مگر کہیں ان کو ہمارا کچھ کہنا ان کی زندگی میں مداخلت نہ لگے۔'' وہ اماں کے سامنے بیٹھتے ہوئے پر ملال انداز میں بولے تھے بیگم نواب نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا دادی جان نے بھی کہا تھا۔

''معاملے کی چھان بین ہونا از حد ضروری تھا مگر جس طور نواب صاحب اور ان کے سپوت خاموشی اختیار کیے بیٹھے ہیں ہم بھی اس پر حیران ہیں ہمیں سمجھ نہیں آتا فتح النساء کی خاموشی کو سب نے ان کی خطا کیوں مانا، عورت اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف جب آواز نہیں اٹھاتی تو وہ حیرت سے ششدر بھی ہوسکتی ہے ہر کوئی فتح النساء کو خطاوار کیونکر سمجھ رہا ہے جب کہ ان کی پرورش تو یہیں اس محل میں ہوئی ہے اور فتح النساء کی سرپرستی نواب سیف الدین پٹوڈی نے کی ہے وہ اس گھر کی بیٹی تھیں تو بیٹی کو اس طور گھر سے نکال دینا کیا ثابت کرتا ہے کیا عین کی کسی غلطی

پر ہم اسے اس طرح تنہا چھوڑ دیں گے۔'' دادی جان نے کہا تھا اور اماں نے ان کو فوراً دیکھا تھا۔

''اماں کہاں آپ عین النور کا موازنہ فتح النساء سے کرنے لگیں عین اس گھر کی بیٹی ہے اسے اس گھر کی عزت کا خیال ہے جبکہ فتح النساء'' انہوں نے بات دانستہ ادھوری چھوڑ دی تھی تبھی دادی جان بولی تھیں۔

''کبھی کبھی جو آنکھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں وہ سچ نہیں ہوتا ہم حقائق جانے بنا کسی پر الزام تراشی نہیں کر سکتے بہو بیگم فتح النساء ہمیں غلط دکھائی نہیں دیتی۔'' ساس الجھی تھیں اور پرسکون انداز میں اپنا موقف بیان کر دیا تھا تب نواب بیگم نے کچھ کہنا مناسب نہیں جانا تھا اور خاموشی اختیار کر گئی تھیں۔

''ہم دادی جان کی بات سے اتفاق کرتے ہیں ایسا سچ جو ضروری بھی نہیں اور جبکہ ہم حیدر سراج الدولہ کے بارے میں کئی باتیں سن چکے ہیں۔'' تیمور بولا تھا اور اماں جان اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''آنکھوں دیکھی مکھی کوئی نہیں نگلتا تیمور میاں فتح النساء کی سچائی کیا ہے اور کیا نہیں ہم میں سے کوئی نہیں جانتا سو ایسے میں ان کی حمایت کرنا مناسب نہیں حیدر میاں بھی اس گھر کے داماد بننے جا رہے ہیں اگر فتح النساء اس گھر کی بہو ہیں تو۔'' وہ کہہ کر چلتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں، دادی جان تیمور کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

''اس گھر میں کوئی فتح النساء پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں بچاری لڑکی عزت پر داغ تو لگا اس کا اعتبار بھی گیا کوئی اس گھر میں اس کا نام سننا نہیں چاہتا اور جلال کیا حقائق کا پتا لگائیں گے وہ تو فتح النساء کا نام بھی سننے کو تیار نہیں ایسے میں حقائق کیسے سامنے آ سکتے ہیں کسی سچائی کا سامنے آنا عبث ہے تیمور میاں آپ بھی اس کہانی کو ختم ہی کیجیے سیف جو اس گھر کا سربراہ ہے اگر وہی کان اور آنکھیں بند کر سکتا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' دادی اماں نے کہا تھا اور تیمور ان کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

❀ .... ❁ .... ❀

''محترم قصہ یوں ہے کہ غلطیاں تو ہوتی ہیں کسی سے اور کیوں ہوتی ہیں اس سب کو جانے دیجیے جوانی میں خطائیں ہو جاتی ہیں ہم نہیں جانتے کہ غلطی کس کی تھی مگر ہم اس بات پر بحث بھی کرنا نہیں چاہتے، ہم چاہتے ہیں کہ اس معاملے کو درگزر کر کے ہم اس رشتے کو آگے بڑھائیں اللہ جانتا ہے ہماری نیت صاف ہے اور ہم دل میں کوئی بغض نہیں رکھتے، ہم صدق دل سے عین بیٹی کو اپنے گھر کی بہو بنانا چاہتے ہیں کیا اچھا ہوگا، ہم سب بھول کر اس رشتے کو آگے بڑھنے دیں۔'' مرزا سراج الدولہ بولے تھے اور نواب صاحب نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا مرزا سراج الدولہ ان کی سمت منتظر نظروں سے دیکھنے لگے تھے تبھی وہ نرمی سے بولے تھے۔

''مرزا صاحب بات یہ ہے کہ نواب خاندان کی خاصی جگ ہنسائی ہوئی ہے وہ واقعہ یا بات ایسی معمولی نوعیت کی نہیں ہے کہ ہم فراموش کر دیں یا درگزر کر دیں اگر اب ہم اس رشتے کو آگے بڑھانے کی بات کریں گے تو دنیا ہم پر ہنسے گی ہم ایک بات جانتے ہیں غلطی فتح النساء کی نہیں ہے فتح النساء ہماری بیٹی جیسی ہیں اور اس گھر کی عزت ہیں اور نواب خاندان نے عزتوں پر سمجھوتہ کرنا نہیں سیکھا اس معاملے پر کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔'' نواب صاحب قطعی انداز میں بولے تھے اور سراج الدولہ صاحب ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے پھر نرمی سے بولے تھے۔

''نواب صاحب ہم معذرت چاہتے ہیں جو بھی ہوا ہم اس کی معافی مانگتے ہیں، آپ کہیں تو ہم تحریری بیان دینے کو تیار ہیں آپ کہیں تو حیدر میاں کو لا کر آپ کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں ہم آپ اپنا غصہ نکال لیں اور چاہیں تو جان سے مار دیں اور چاہیں تو بخش دیں اس سے زیادہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' مرزا سراج الدولہ نے کہا تھا اور نواب صاحب نے انہیں خاموشی سے دیکھا تھا۔

''برسوں کے مراسم میں نواب صاحب ہم بگاڑنا نہیں چاہتے تبھی آپ سے بات کرنے آئے ہیں ہم معاملات کو سلجھانا چاہتے ہیں اگر مان لیں کہ حیدر میاں سے ایسی غلطی ہوئی بھی ہے تو اب کیا ہو سکتا ہے۔'' بات گھر کی تھی گھر میں رہی محل کے اندر اس حصے میں کوئی غیر نہیں تھا کسی کو تو وجہ بھی معلوم نہیں بیشتر لوگ تو اس شادی کے ٹلنے کے اسباب اب تک نہیں جانتے اور ہم بات کو کہاں سے کہاں لے گئے ہیں ایسا کچھ تو ہوا بھی نہیں تھا حیدر میاں نے صرف غلطی سے ان کا آنچل تھاما تھا اور انہوں نے شور مچا دیا تھا حیدر

میاں کا کہنا ہے کہ ان کو لگا وہاں عین ہیں۔ جبکہ وہاں فتح النساء موجود تھیں اتنی سی بات تھی یہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں فتح النساء نواب خاندان کی بہو ہیں اور ہم ان کی عزت کرتے ہیں حیدر بھی فتح النساء کا اتنا ہی احترام کرتا ہے اس نے برملا کہا کہ اسے خبر نہیں تھی کہ وہاں بھابی جان تھیں وہ کمرے میں یہ سمجھ کر گیا تھا کہ وہاں عین ہوں گی مگر عین کی جگہ فتح النساء کا چہرہ دکھائی دیا تو وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا مگر اتنی دیر میں فتح النساء شور مچا چکی تھیں بات کو ہوا دینے پر آئیں تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے نواب صاحب مگر ختم کرنا چاہیں تو لمحہ بھی نہیں لگتا ہمارے مراسم برسوں پرانے ہیں مگر متواتر جس طرح کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے ہمیں تو یہ کسی کی سازش لگتی ہے کوئی ہے جو ایسے حالات پیدا کر رہا ہے کہ ہم اس رشتے کو آگے نہ بڑھا سکیں۔'' مرزا صاحب بولے تھے اور نواب صاحب انہیں خاموشی سے دیکھنے لگے تھے۔

''نواب صاحب کیا سوچ رہے ہیں چلیں ایسا کریں اس بات کا فیصلہ ہم بچوں پر چھوڑ دیتے ہیں آپ حیدر میاں کو عین بیٹی سے بات کرنے دیں ہم تو پرانے وقتوں کے لوگ ہیں ہماری سوچ مختلف ہے مگر وہ بچے آنے والا کل ہیں سوان کو ہم سے زیادہ سمجھ بوجھ ہے ایسا میرا ماننا ہے۔'' مرزا صاحب مصلحت پسندی کے پیش نظر دھیما اور نرم لہجہ اختیار کیے ہوئے تھے ایسا معلوم پڑتا تھا کہ وہ دل جیتنے آئے تھے اور ان کا فیصلہ مثبت کرا کر ہی جانا چاہتے تھے۔''

''ویسے آپ بچوں کو پاکستان تو بجھوا ہی رہے ہیں اور خود بھی تشریف لے جا رہے ہیں یہاں حیدر میاں بھی پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ تو کیا خیال ہے عین کے ساتھ حیدر میاں کو روانہ کر دیتے ہیں اگر ان بچوں کی مرضی ہوئی تو وہ اس رشتے کو زندگی بھر کے سفر میں بدل لیں گے ورنہ ہم اس کو وقت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیں گے ویسے کب روانہ ہو رہے ہیں آپ پاکستان کے لیے؟'' مرزا صاحب نے پوچھا تھا۔

''ابھی طے نہیں کیا مرزا صاحب مگر ہم عین کو تنہا روانہ نہیں کر سکتے عین ہمارے ساتھ پاکستان جائیں گی۔'' نواب صاحب نے کہا تھا۔

''بہرطور آپ کو پاکستان جانا تو ہے نا نواب صاحب کہ پاکستان ہی آپ کا خواب تھا ہم آپ کی سلامتی کے لیے دعا گو رہیں گے اور آپ کو ملنے پاکستان آتے رہیں گے۔'' مرزا صاحب نے کہا تھا۔

''محبت ہے آپ کی مرزا صاحب ہم تو کہتے ہیں آپ بھی پاکستان چلیے کانگریس کی خدمت بہت کر لی آپ نے اب کچھ خدمت مسلم لیگ کی بھی کر لیں۔'' نواب صاحب نے کہا تھا اور وہ مسکرا دیے تھے۔

''ہم وفاداریوں کو لباس کی طرح بدلنے والوں میں سے نہیں ہیں نواب صاحب کبھی تو آپ سے کہا کہ دوستی نبھانے والے ہیں تو آنے والے نہیں ہم آپ کی دوستی کا دم بھرتے رہیں گے چاہے پاکستان رہیں یا انڈیا جگہیں اہم نہیں رشتے داری اور دوستی اہم ہے۔'' مرزا صاحب نواب صاحب کو گویا آئینے میں اتار رہے تھے۔ نواب صاحب ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

❀......۞......❀

''عین آپ نے بھی فتح النساء سے بات نہیں کی آپ کو بھی لگتا ہے کہ قصور فتح النساء کا ہے۔'' تیمور نے پوچھا تھا تو وہ چہرہ جھکا گئی تھیں۔

''یہ معاملہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے تیمور ہم اس پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔'' عین لاتعلقی سے بولی تھیں اور تیمور نے انہیں کسی قدر افسوس سے دیکھا تھا۔

''فتح النساء آپ کی سہیلی ہیں آپ کو ان سے بے حد لگاؤ رہا ہے اس محل میں آپ واحد تھیں جو فتح النساء کے اس درجہ قریب رہیں کیا آپ تب بھی ان کے مزاج کو سمجھ نہیں پائیں۔'' تیمور نے گویا الزام دیتی نظروں سے دیکھا تھا مگر عین خاموش رہی تھیں۔

''عین اعتبار دل سے آتا ہے کیا آپ فتح پر اعتبار نہیں کرتیں اور حیدر کا یقین کرتی ہیں۔'' تیمور نے پوچھا تھا تبھی وہ بولی تھیں۔

''ہم کسی کا یقین نہیں کر رہے ہم نے حیدر کی پشت پناہی نہیں کی ان کو بے قصور نہیں کہا نہ ہم نے فتح پر کوئی الزام لگایا۔ حیدر نے اگرچہ اپنی صفائی دینے کی بھی کوشش کی ہے اور ہم سے بات کرنے کے لیے بھی کوشش کرتے رہے مگر ہم نے ان کی نہیں سنی ہمیں نہیں پتا معاملہ کیا ہے مگر ایسا لگتا ہے کوئی ان معاملات کو ہوا دے کر بہت بڑھا دینا چاہتا ہے پہلے ابا جان کے خلاف سازشوں کا جال اور اب

ہماری شادی کے موقع پر ایسے واقعہ کا ہونا کسی نے ایسے ہی کسی لمحے کا انتخاب کیوں کیا؟ جلال بھائی خوش تھے فتح النساء خوش تھیں حیدر میاں خوش تھے اور...''
عین نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور تبھی تیمور نے پوچھا تھا۔
''آپ خوش تھیں عین۔'' مگر عین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔
''ہم نے کچھ پوچھا عین کیا آپ خوش تھیں۔'' مگر عین خاموشی سے سر جھکائے تھی تبھی وہ مدہم لہجے میں گویا ہوا تھا۔
''ہم دلوں پر بند باندھ سکتے ہیں مگر روح کے اندر جو شکست و ریخت کا عمل ہوتا ہے ہم اس کی آواز کو دبا نہیں سکتے اس خسارے اور انہدام پر ہم دانستہ آنکھیں تو بند کر لیتے ہیں مگر دل جیسے کوئی غیر مزروعہ اور ناکاشتہ بنجر زمین بنتا جاتا ہے جس پر محبت کا بیج بونا ممنوع ہو جاتا ہے۔'' تیمور کے مدہم لہجے میں جیسے کئی طوفان تھے عین اس کی سمت دیکھتی ہوئی نگاہ پھیر گئی تھی۔
''محبت کا ذکر بے وجہ ہے تیمور محبت پر بات نہیں کی جاسکتی۔'' وہ دانستہ جیسے پہلو بچا رہی تھی تیمور نے مزید کوئی بات نہیں کی تھی اور اٹھ کھڑا ہوا تھا تبھی عین نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
''تیمور محبت آسمانوں سے اتری ہے وحی بن کر ہماری غلطی ہی ہے کہ ہم اسے زمینوں پر تلاش کرتے ہیں ہم اچھے دوست ہیں اور میں آپ کو بہت خوش دیکھنا چاہتی ہوں آپ خوش بخت کا ہاتھ تھام لیجیے۔'' وہ بولی تھی اور تیمور کے پلٹنے سے قبل پلٹ کر تیزی سے چلتی ہوئی وہاں سے نکل گئی تھی تیمور نے پلٹ کر دیکھا تھا اور اس سمت دیکھتا رہ گیا تھا۔

❁......۞......❁

''تیمور آپ اپنے ساتھ ایسی ناانصافی کیوں کر رہے ہو بیٹا، زندگی کی خوشیوں کے دروازے خود پر بند کرنا وہ بھی ایسی خاموش محبت کے لیے جس سے دوسرا فریق واقف تک نہیں؟ عین کو تو خبر نہیں کہ آپ ان سے ایسی جنونی محبت کرتے ہیں اور وہ ایسے کسی احساس سے آگاہ ہی نہیں اور آپ اپنی زندگی ایسی محبت کے لیے روک دینا چاہتے ہیں فرض کریں آپ ایسے ہی تنہا رہ جاتے ہیں اور ہم نہیں

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ کہانیوں پر آپ کے تبصروں پر مشتمل خطوط (گفتگو) ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔
☆ خصوصی توجہ: ای میل سے کہانیاں ارسال کرنے والے مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کے اختتام پر اپنا اردو میں مکمل ایڈرس اور موبائل فون نمبر ضرور تحریر کریں۔
☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

7، فرید چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

رہتے تو کون خیال رکھے گا آپ کا؟'' بیگم حکمت پریشانی سے گویا ہوئی تھیں اور تیمور ان کو خاموشی سے دیکھنے لگا تھا پھر مدہم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''ممی محبت اظہار کی محتاج نہیں ہوتی نا محبت کو چیخ کر بتانا پڑتا ہے محبت دو انسانوں کے درمیان ایک بولتی چپ ہے جو اپنا احساس خود اپنی زبان میں کراتی ہے محبت کو تو لفظوں کی ضرورت نہیں نا محبت کسی اظہار کی پابند ہے اگر ہم نہ بھی کہیں تب بھی محبت دوسرے فریق کو بتا دے گی اور صاف لفظوں میں جتا دے گی کہ وہ احساس ان دونوں کے درمیان موجود ہے اور اس کا نام محبت ہے۔'' تیمور وثوق سے بولا تھا۔

''لیکن بیٹا کیا فائدہ ایسی محبت کا جس کا کوئی انجام نہیں، عین آپ کی زندگی کا حصہ نہیں بن سکتی، عین کی اپنی زندگی ہے اور وہ اس زندگی کی پابند ہے وہ چاہے بھی تو ایسی ان دیکھی زنجیروں کو توڑ نہیں پائیں گی وہ روایتوں کے ساتھ بندھی ہیں ان کا حوالہ نواب خاندان کی عزت سے جڑا ہے اور وہ اپنے والد محترم کے سر کو جھکنے نہیں دیں گی وہ خود کو بہترین بیٹی ثابت کر رہی ہیں اس سے بڑھ کر ان کے لیے کچھ نہیں ہیں اگر وہ اس حقیقت کو جان بھی لیتی ہیں تو کیا فرق پڑے گا۔'' حکمت صاحب بتا رہے ہیں ان کی شادی کی بات دوبارہ چل رہی ہے مرزا سراج الدولہ قدم پیچھے موڑنے والے نہیں ہیں اور نواب صاحب کا مزاج تو سب جانتے ہیں وہ آرام سے معاف کر سکتے ہیں سو وہ رشتہ ٹوٹ کر بھی ٹوٹا نہیں اور اپنا وجود باقی رکھتا ہے۔'' بیگم حکمت پریشانی سے گویا ہوئی تھیں۔

''ممی محبت کے لیے ضروری نہیں کہ اسے جواباً پذیرائی ملے محبت کو اس سے سروکار نہیں ہوتا محبت میں یہ احساس خوش کن ہوتا ہے کہ آپ کسی سے کس طور محبت کرتے ہیں اور اس کے لیے کیا کرنا چاہتے ہیں دنیا کی تمام خوشیاں آپ اس انسان کو سونپ دینا چاہتے ہیں جس سے آپ کو محبت ہوتی ہے، محبت نہیں دیکھتی کہ محبت کا متبادل کیا ہے یا اس کے جواب میں کوئی کیا لوٹا رہا ہے محبت اندھی ہوتی ہے سو دیکھتی نہیں۔'' تیمور مدہم لہجے میں بولا تھا اور بیگم حکمت اسے دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

''محبت واقعی اندھی ہوتی ہے بیٹا اس کا احساس بہر طور ہو رہا ہے ہمیں۔'' بیگم حکمت جتاتے ہوئے بولی تھیں مگر تیمور اٹھتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

❀ ...... ◈ ...... ❀

جلال خاموش بیٹھا تھا جب نواب صاحب چلتے ہوئے آئے تھے اور اس کے قریب بیٹھ گئے تھے جلال نے خاموشی سے والد محترم کی طرف دیکھا تھا۔

''ہم آپ کو نصیحت یا تلقین کرنا ضروری خیال نہیں کرتے جلال کیونکہ آپ عقل و فہم رکھتے ہیں اور اپنے معاملات بہت عمدگی سے خود طے کر سکتے ہیں سو ہم نے اتنے بڑے واقعے کے ہونے کے باوجود آپ کی نجی زندگی میں نہ تو مداخلت کی نہ کوئی دباؤ ڈالا'' نواب صاحب نے نرمی سے مدعا چھیڑا تھا جلال نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا۔

''بیٹا زندگی میں بہت سی پیچیدگیاں آتی ہیں مگر اس کا مطلب زندگی کو روک دینا یا اپنے وجود کو کاٹ کر پھینک دینا نہیں ہوتا جو حصہ تکلیف دے کبھی کبھی ہم باوجود کوشش کے اس حصے کو کاٹ کر الگ نہیں کر سکتے مگر ہم اس حصے کی تکلیف کو پورے طور پر محسوس کرتے ہیں اور اس تکلیف کا مکمل احساس کر پاتے ہیں کہ ہمارے جسم کا وہ حصہ کسی احساس سے دوچار ہے اور کس درد سے گزر رہا ہے جب ہم اس بات کا ادراک کر لیتے ہیں تو ہم جسم کے اس حصے کی تکلیف کا احساس کرتے ہیں اور اس تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس تکلیف کے باعث پورے جسم کو تکلیف نہ ہو۔'' نواب صاحب نے متانت سے تمہید باندھی تھی اور جلال ان کی بات سمجھتے ہوئے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

''ابا جان ہم آپ کی بات سمجھ رہے ہیں مگر۔''

''برخوردار رشتوں میں اگر مگر نہیں ہوتا رشتے ایسے لفظوں سے آشنائی نہیں رکھتے سو رشتوں کے تسلسل سے بہاؤ کے لیے ضروری ہے کہ ایسے تمام الفاظ کو متروک قرار دے دیا جائے ہم رشتوں کے احساس کو زندہ رکھنے کے لیے بہت سے ایسے احساسات کی قربانی دیتے ہیں اور ایسے بہت سے اصولوں کو کالعدم قرار دیتے ہیں جن سے رشتوں کی سالمیت کو خطرہ ہو یا جن کے باعث رشتوں کا تقدس پامال ہو رہا ہے آپ کو فتح النساء اور اپنے رشتے کی

بابت از سر نو غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے چھوٹے نواب تاکہ رشتوں کی باقیات کو بچایا جاسکے آپ فہم و فراست رکھتے ہیں اور آپ کو سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہمارے خیال میں آپ بہت سی باتوں کے معنی اپنے طور پر جانتے ہیں مگر پھر بھی ہم آپ کو از سر نو نظر ثانی کی تلقین کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔'' نواب صاحب کا انداز مصلحت لیے ہوئے تھا اور جلال خاموشی سے دیکھتے ہوئے سر جھکا گیا تھا۔

❀......۞......❀

بس کہ ہوں غالب، اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

خوشنما نے جلال کو دیکھ کر جیسے آہ بھری تھی وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھے جب خوشنما نے ان کو سنبھالا تھا۔

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ کے تمثال دار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

''آپ وفا ڈھونڈنے جن گلیوں میں آئے ہیں چھوٹے نواب وہاں وفا کے معنی بھی کوئی نہیں جانتا، ہم آپ کو مشورہ دیں گے کہ فتح النساء کی طرف واپس لوٹ جائیے ان کے پاس آپ کے درد دل کا مرہم بھی ہے اور غم کا مداوا بھی وہ آپ کی شریک حیات ہیں ہم تو بدنام زمانہ ہیں جام پر جام دیے جائیں گے اور آپ مدہوش سے مدہوش ہوتے جائیں گے، مگر ہوش کی دنیا اس سے کہیں زیادہ بھلی ہے آپ کو جاتا ہوا نہیں دیکھ سکتے، مگر......!'' خوشنما نے جلال کو سنبھالا تھا اور مدہم آواز میں کہا تھا جلال اجنبی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

''ہم نے اس بے وفا سے عشق کیا جو اس کے قابل بھی نہیں تھیں ہمیں افسوس ہے ہم نے دل کو روکا نہیں اور محبت کو ہوا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ہم نے جذبوں کی آبیاری کی اور محبت کو بڑھنے دیا اور جب آتش دہک اٹھا تو پتا چلا مکان جل گیا ہے ہم نے آتش کو بھڑکنے دیا روکا نہیں ہم قصوروار ہیں خوشنما ہم اس سزا کے لائق ہیں ہمیں یہ سزا ملنا روا ہے کیونکہ اس کم بخت دل نے اس بے وفا کا اعتبار کیا ہے جیسے وفا کے معنی سے کوئی سروکار نہیں۔'' جلال نے لڑکھڑاتے ہوئے خوشنما کے شانے پر سر رکھا تھا خوشنما نے جلال کے لبوں کو اپنے گیسوؤں پر ہلتا ہوا محسوس کیا تھا وہ ہوش و خرد سے بے گانہ تھے۔

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیران ہونا
عشرت پارہ دل زخم تمنا کھانا
لذت ریش جگر، غرق نمکداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے وفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جلال کے لب آہستگی سے ہلے تھے اور وہ ہوش سے بے گانہ ہوگئے تھے خوشنما نے ان کا چہرہ دیکھا تھا اور ان کو تخت پر آہستگی سے لٹا دیا تھا۔

❀......۞......❀

حکمت صاحب نے بیگم کی طرف تھا اور نرمی سے بولے تھے۔

''تقسیم کے عمل کے ساتھ ہی ہجرت کا آغاز ہوگیا ہے سو آپ بھی رخت سفر باندھ لیجیے نواب صاحب سے اس متعلق بات چیت ہوئی تھی فرما رہے تھے کہ بس چند ہی دنوں میں پاکستان کی طرف روانہ ہونا ہے۔'' حکمت صاحب کے کہنے پر بیگم حکمت نے انہیں حیرت سے دیکھا تھا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ کیا ان کا نامساعد حالات میں ہجرت ہوگی آپ واقعات نہیں سن رہے ہر سمت دنگا فساد کا عمل شروع ہوگیا ہے اگر یہ کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت بھی ہو رہا ہے تو بھیانک ترین ہے، ہم ایسے حالات میں رسک کیسے اور کیونکر لے سکتے ہیں۔'' بیگم حکمت کس قدر متفکر دکھائی دی تھیں تبھی حکمت صاحب نرمی سے بولے تھے۔

''بیگم ہم نے جو جدو جہد آزادی کی ہے اور جو انتھک محنت کی ہے تو اب ہم قدم نہیں روک سکتے ہم ایسا کریں گے تو بزدل کہلائیں گے بہت جگ ہنسائی ہوگی ہم مسلم لیگ کا حصہ ہیں اور لوگ طعنہ کسیں گے کہ مسلم لیگ والے ہی ڈر کر بیٹھ گئے کچھ بھی ہو مگر اب رخت سفر باندھنا ہوگا چاہے ہم میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ بچے ان فسادات سے ڈر کر ہم قدم نہیں روک سکتے ہمیں ہر صورت آگے

بڑھنا ہوگا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" وہ حتمی انداز میں بولے تھے تو بیگم حکمت دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

❋......۞......❋

"یا اللہ یہ فسادات تو بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔" دادی جان نے فکر سے کہا تھا اور نواب صاحب مسکرا دیے تھے۔

"اماں جان ہمت نہیں ہار سکتے ہیں اس سفر میں چاہے جان چلی جائے مگر قدم روکنا منع ہے ہمارا نوزائیدہ پاکستان ہمارا منتظر ہے وہ ریاست جس کے لیے ہم نے انتھک محنت کی اور کئی برسوں تک محض خواب دیکھتے رہے اس ریاست کا قیام عمل میں آ گیا ہے سو اب ہمارا یہاں رکنا ممکن نہیں ہم سب جلد یہاں سے کوچ کر جائیں گے ہم انتظامات دیکھ رہے ہیں۔

کوئی مناسب دن دیکھ کر ہم سفر کا آغاز کر دیں گے۔" نواب صاحب نے گویا فیصلہ کر لیا تھا۔

"نواب صاحب اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں یہ فسادات بڑھتے جا رہے ہیں خوف ہے کہ اس کا کوئی اختتام نہیں۔" ایسے حالات میں سفر محفوظ نہیں ہوگا۔" بیگم کے خدشہ ظاہر کرنے پر نواب صاحب نے انہیں خاموشی سے دیکھا تھا۔

❋......۞......❋

"ہم پاکستان جانا چاہتے ہیں بوا یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" فتح النساء نے کہا تھا اور بوا ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں پھر نرمی سے بولی تھیں۔

"بیٹا زوجہ کی زندگی اس کے خاوند اور اس کی اطاعت سے جڑی ہوتی ہے جو بھی ہے وہ آپ کے خاوند ہیں اور آپ ان کی مرضی کے بنا ایسا کوئی فیصلہ نہیں لے سکتیں، آپ کو چھوٹے نواب سے اس متعلق بات کرنا ہوگی۔" بوا نے مشورہ دیا تھا۔

"نہیں ہم ان سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتے ہم ان کے لیے مر چکے ہیں انہوں نے اتنے دن میں ہم سے رجوع نہیں کیا سو ان کے احکامات کی پیروی کرنا ہم پر واجب نہیں یوں بھی رشتے تو زندہ لوگوں پر واجب ہوتے ہیں اور ہم مر چکے ہیں فقط سانسیں لینے کا نام زندگی نہیں ہے۔" فتح النساء دھیمے لہجے میں گویا ہوئی تھیں تبھی دھیان سامنے اٹھا تھا جہاں عین کھڑی دکھائی دی تھیں فتح النساء انہیں سامنے دیکھ کر چونک گئی تھیں۔

"ہم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں فتح النساء۔" وہ نرمی سے بولی تھیں۔

بوا اٹھ کر دانستہ وہاں سے ہٹ گئی تھیں، عین چلتی ہوئی ان کے پاس آ ئی تھیں اور مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

"ہم سچ جاننا چاہتے ہیں فتح النساء برائے کرم ہمیں سچ جاننے دیجیے ہمارے لیے یہ بہت ضروری ہے۔" عین النور نے درخواست کی تھی مگر فتح النساء نے انہیں خاموشی سے دیکھا تھا جبھی عین الجھن سے گویا ہوئی تھیں۔

"فتح یہاں ایک نہیں کئی زندگیوں کا سوال ہے آپ چپ کیوں ہیں؟" کیونکہ ہم بولنے کے پابند نہیں ہم آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتے عین برائے کرم آپ یہاں سے چلی جائیے۔" فتح النساء نے کہا تھا مگر عین وہاں سے ہٹی نہیں تھیں۔

"ہم جانتے ہیں آپ خفا ہیں آپ کا غصہ واجب ہے اور ہم اسی لیے آپ کے پاس آئی ہیں یہ بات سچ ہے کہ ہم حیدر میاں کی محبت میں اندھے رہے ہیں۔ مگر اب ہم چیزوں کو غیر جانبداری سے دیکھنا چاہتے ہیں۔" عین نے کہا تھا فتح النساء نے سر ہلایا تھا۔

"ہم آپ کے اس اقدام کو سراہتے ہیں نواب زادی عین النور مگر ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے، معذرت چاہتے ہیں مگر ہم مزید بات نہیں کر سکیں گے۔" وہ اٹھی تھیں اور چلتے ہوئے وہاں سے نکلتی چلی گئی تھیں عین حیرت سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔

❋......۞......❋

"نواب صاحب کیا سوچا آپ نے کیا آپ ہمیں قابل معافی نہیں سمجھتے۔" مرزا سراج الدولہ نے کہا تھا نواب صاحب نے انہیں خاموشی سے دیکھا تھا نواب صاحب کی خاصیت تھی کہ وہ ایک خاص رکھ رکھاؤ رکھتے تھے وہ جلد معاف کر دینے کے عادی تھے اور جیسے مرزا صاحب ان کی اس عادات کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

"جانے دیجیے نواب صاحب آپ کا پاکستان معرض وجود میں آ گیا کم از کم اس خوشی میں دل صاف کر لیں آپ نے کون سا یہاں رہنا ہے آپ پاکستان چلے جائیں گے تو پھر قسمت سے ملنا ہوگا ہم نہیں چاہتے آپ دل میں کدورت لے کر یہاں سے جائیں جو ہوا ہم آپ سے

معافی طلب کرتے ہیں۔'' انہوں نے اپنی ٹوپی اتار کر نواب صاحب کے قدموں میں رکھ دی تھی۔

''لیجیے ہم نے اپنی عزت آپ کے قدموں میں ڈال دی اب تو آپ کوئی فیصلہ کرڈالیے۔'' ان کے اس اقدام پر نواب صاحب دنگ رہ گئے تھے خاموشی سے کچھ لمحوں تک ان کو دیکھتے رہے تھے پھر ان کی کیپ جھک کر اٹھائی تھی اور ان کی سمت بڑھادی تھی۔

''مرزا صاحب ہمارے دل میں کوئی کدورت نہیں ہم نے آپ کو معاف کیا۔'' نواب صاحب نے نرمی سے کہا تھا مرزا صاحب مسکرائے تھے۔

''عین نوازش ہے نواب صاحب مگر ہم اپنی معافی کے ساتھ آپ کے ہونہار داماد مرزا حیدر سراج الدولہ کی معافی بھی طلب کرنے آئے ہیں برائے کرم بچے کی غلطی معاف فرمادیں آپ عظیم شخصیت ہیں آپ کا مرتبہ مزید بلند ہوگا۔'' مرزا نے کہا تھا نواب صاحب نے سوچتے ہوئے آہستگی سے سر ہلایا تھا۔

''جایئے معاف کیا آپ کو مگر اس نرمی کو ہماری بزدلی مت سمجھیے گا۔'' نواب صاحب نے کہا تھا مرزا مسکرا دیے تھے۔

''ہم آپ کی اچھائی کے معترف ہیں محترم ہم جانتے تھے آپ کا دل بہت صاف ہے تشکرات۔'' وہ نرمی سے بولے تھے اور نواب صاحب نے سر ہلا دیا تھا۔

❀......◈......❀

''تیمور بے وفائی سے بڑا دکھ کوئی نہیں یار، ہم نے فتح النساء کو اپنا سب کچھ مان لیا ہمیں عشق تھا ان سے اگرچہ ہم اس کا اظہار ان سے نہیں کرسکے مگر ہمیں لگا وہ اس سے واقف ہوں گی اور اگر نہیں تو جلد ہم ان کو اس بارے میں آگاہ کردیں گے مگر ایسا ممکن نہیں ہوسکا اس سے قبل کہ ہم ان کو کچھ کہتے وہ کسی اور کی طرف مائل ہوچکی تھیں ہم نے دنیا چھوڑ کر ان کو چنا تھا جیسے بھی چنا جس باعث بھی چنا مگر ہمیں ان سے محبت ضرور تھی مگر فتح النساء نے اس محبت کی قدر نہیں کی۔'' جلال تیمور کے سامنے اپنا دل ہلکا کررہا تھا اور تیمور خاموش کھڑا تھا۔

''ہم ان کے لیے ہر ناممکن کو ممکن بنانے کو تیار بیٹھے تھے مگر وہ اس محبت کے قابل نہیں رہیں۔'' جلال نے کہا تھا

تیمور نے ان کو پرملال سا دیکھا تھا ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں جو اس بات کی غماز تھیں کہ وہ محبت میں سچے تھے۔
''محبت میں اعتبار اور کسی کو عزت دینا ضروری ہوتا ہے جلال اس کے بنا محبت کا وجود بے معنی رہتا ہے شاید آپ نے محبت تو کی مگر اپنی محبت کو وہ ایک خاص اعتبار نہیں سونپا۔'' تیمور نے سمجھایا تھا۔
''ہم نے اپنی آنکھوں سے انہیں حیدر میاں کے ساتھ دیکھا تھا۔'' جلال نے جھٹلایا تھا۔
''کبھی کبھی جو دکھائی دیتا ہے وہ دراصل ہوتا نہیں جو آپ نے دیکھا اس کی حقیقت کچھ اور بھی تو ہوسکتی ہے سانحہ یہ نہیں کہ فتح النساء نے آپ سے بے وفائی کی سانحہ یہ ہے کہ آپ نے ان کا اعتبار نہیں کیا اور ضروری نہیں کہ قصوروار وہی ہوں قصوروار آپ کے حیدر میاں بھی ہوسکتے ہیں ویسے بقول حیدر میاں کہ وہ سرسری سا واقعہ تھا جس کو ہوا دی گئی انہوں نے معافی طلب کی تو ان کو قصوروار جانے بنا معاف بھی کردیا کیا فتح النساء کی عزت ایسی ارزاں تھی؟'' تیمور نے غیر جانبداری سے کہا تھا جلال سرنفی میں ہلانے لگے تھے۔
''معاملہ کچھ بھی ہو، ہم فتح النساء کو قصوروار سمجھتے ہیں وہ اپنی صفائی بھی دے سکتی تھیں واقعہ چاہے سرسری نوعیت کا تھا یا سنگین نوعیت کا یہ محض کوئی غلط فہمی تھی یا آنکھوں کا دھوکا تھا جو بھی تھا اس میں کہنے سننے کی گنجائش بہر حال تھی مگر فتح النساء نے کچھ نہیں کہا۔'' جلال نے کہا تھا۔
''اور آپ نے ان کے بنا کچھ کہے ان پر فرد جرم عائد کردی، جلال کیا یہ شہر اندھا بہرا ہے، کیا حیدر میاں کی سچائی آپ نہیں جانتے یا ہم نہیں جانتے؟ ان کا مزاج تو ایسا ہی ہے سب جانتے ہیں، نواب خاندان ان کی غلطیوں پر ہمیشہ پردہ ڈالتا آیا ہے یا دوسرے معنوں میں ان کی غلطیاں نظر انداز کرتا آیا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی یہاں تک ہوئی کہ انہوں نے ایسا مکروہ فعل کرنے کی ٹھانی بقول ان کے انہوں نے عین جان کر محض آنچل تھاما اگر یہ واقعہ ایسی ہی معمولی نوعیت کا تھا تو آپ کس بات پر فتح النساء پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ بے وفا ہیں؟'' تیمور نے کان کھینچتے ہوئے انہیں آڑے ہاتھوں لیا تھا جلال ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے یقیناً ان کے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

❁……۞……❁

''ہم شکر گزار ہیں کہ آپ نے معاملہ فہمی سے کام کیا اور ہمارے سپوت اور اپنے داماد کو معاف کردیا چلیے اتنے دنوں میں کوئی اچھی پیش رفت تو ہوئی پاکستان کا معرض وجود میں آنا گویا اچھا شگون ثابت ہوا ایک طرف آپ کا وطن آزاد ہوا اور دوسری طرف ہمارے سپوت کے اوپر سے ایک الزام خارج ہوا۔'' مرزا صاحب مسکرائے تھے نواب صاحب نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا۔
''اب سب معاملات طے پا ہی گئے ہیں تو نیک کام میں دیر کیسی؟'' آپ لوگ تو پاکستان روانہ ہو ہی رہے ہیں، میں بھی حیدر میاں کو آپ کے ہمراہ روانہ کردیتا ہوں، اب ہوگا یہ کہ ان نامساعد حالات میں شادی ہونے سے رہی سو پاکستان روانہ ہوکر وہاں دھوم دھام سے شادی کا فریضہ انجام دیا جاسکتا ہے آپ جب حکم دیں گے ہم پاکستان حاضر ہوجائیں گے۔'' مرزا سراج الدولہ نے کہا تھا نواب صاحب نے پرخیال انداز میں سوچتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔
''مشورہ مناسب ہے مرزا صاحب مگر فی الحال یہاں کچھ ضروری کام ہے، اثاثوں کو لے کر ہمارے کچھ خدشات ہیں ہم ان معاملات کو سلجھالیں پھر ان شاء اللہ ہم پاکستان روانہ ہوجائیں گے۔'' نواب صاحب نے کہا تھا۔
''تو آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ بچوں کو پہلے روانہ کردیں عین بٹی اور حیدر میاں کو پہلے روانہ کردیتے ہیں اور آپ معاملات سمیٹ کر بعد میں روانہ ہوجائیں۔'' مرزا صاحب نے مشورہ دیا تھا نواب صاحب نے سر ہلایا تھا۔
''ہم سوچ کر آپ کو آگاہ کرتے ہیں۔'' انہوں نے سہولت سے کہا تھا اور مرزا صاحب مسکرادیے تھے۔
''حیدر میاں پر اعتبار نہیں آپ کو تو جلال کو ساتھ روانہ کردیں۔''
''نہیں ایسی بات نہیں دراصل ان کا فی الحال یہاں رکنا ضروری ہے۔ ہمارے اکلوتے وارث ہیں وہ یہاں ان کی ضرورت پڑے گی ہم جلال کو ہمراہ نہیں بھیج سکتے۔'' نواب صاحب نے پس و پیش سے کام لیا تھا۔
''تو ٹھیک ہے جس کو آپ اعتبار کے قابل سمجھتے ہوں

اسے ہمراہ روانہ کردیجیے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔“ مرزا صاحب مسکرائے تھے اور نواب صاحب کچھ سوچنے لگے تھے مرزا صاحب کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ انہوں نے نواب صاحب کو راضی کرلیا تھا۔

❀......◉......❀

”ہوش کیجیے چھوٹے نواب آپ یہاں نشے میں بے ہوش پڑے ہیں وہاں آپ کے اہل وعیال فکر کررہے ہوں گے اٹھیے برائے کرم گھر تشریف لے جائیے ہمیں آپ کی اور آپ کے اہل خانہ کی فکر ہے فسادات بڑھ رہے ہیں بلوائی مسلمانوں کے خون کے جیسے پیاسے ہورہے ہیں سو آپ کا ایسے عالم میں ہوش وحواس میں رہنا بہت ضروری ہے۔“ خوشنما نے چھوٹے نواب کو شانے سے تھام کر ہلایا تھا وہ کسی قدر فکر مند دکھائی دی تھی مگر چھوٹے نواب ہوش میں تھے انہوں نے آنکھیں کھول کر خوش نما کو دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر ایسا ممکن نہ ہوا تھا اور ان کی آنکھیں دوبارہ بند ہوگئی تھیں تبھی ان کی مدہم آواز ابھری تھی۔

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا
دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

”چھوٹے نواب آپ کا اپنے اہلخانہ کے ساتھ موجود ہونا بہت ضروری ہے آپ سن رہے ہیں آیئے ہم آپ کو آپ کے گھر چھوڑ آتے ہیں۔“ خوشنما نے کہا تھا اور اس کی کلائی کو تھاما تھا مگر وہ اتنے بھاری وجود کو ایک انچ بھی سرکا نہ پائی تھی اور تھک کر ان کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”چھوٹے نواب کیا پاگل پن ہے یہ خود کو سنبھالیے آپ مسلسل بے سدھ اور بے ہوش پڑے رہیں گے تو آپ کے خاندان کا کیا ہوگا؟“ خوشنما نے ہمدردی کے تحت کہا تھا وہ مخلصی سے ان کو ہدایت دے رہی تھی مگر جلال بے سدھ پڑے تھے ان کے لب آہستگی سے ہلے تھے اور ان کا درد آشکار ہوا تھا۔

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
بے نوائی تر صدائے نغمہ شہرت اسد
بوریا یک نیستاں عالم بلند آوازہ تھا

”وہاں اب کوئی نہیں حاکم خاتون ایک دل تھا سو جل بجھا راکھ میں کیسے ڈھونڈنے جاؤں؟“ ان کی مدہم آواز زخمی تھی خوشنما کی سمجھ میں نہ آیا تھا ان کو کیسے قائل کرے۔

”آپ کو جو محبت کبھی ہم سے تھی اس کا واسطہ برائے کرم گھر لوٹ جائیے۔“ وہ ملتجی لہجے میں بولی تھیں وہ اسی کیفیت میں مسکرائے تھے۔

”محبت کی حقیقت کیا ہے حاکم خاتون جلتا ہوا الاؤ ہے بس اور دل کو خاکستر کرجاتا ہے یہاں دل ہی نہیں رہا اور آپ کیسے واسطے دے رہی ہیں۔“ وہ غمزدہ سا گویا تھا اور وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی تھیں۔

❀......◉......❀

عین کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا وہ سمجھ نہیں پارہی تھیں اماں کی زبانی ان کو معلوم ہوا تھا کہ ان کو حیدر میاں کے ہمراہ پاکستان روانہ ہونا ہے تو وہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی تھیں۔

”فکر مند نہ ہوں ہم بھی پاکستان کے لیے جلد روانہ ہوں گے پاکستان پہنچ کر آپ کی شادی ان شاء اللہ دھوم دھام سے ہوگی۔“ اماں نے کہا تھا اور وہ ان کا شفقت سے بھرا ہاتھ سر پر دھرا دیکھ ان کو دیکھنے لگی تھی۔

پھر وہ اسٹیشن روانہ ہوئی تھی حیدر میاں وہاں موجود تھے انہوں نے آگے بڑھ کر عین کا ہاتھ تھاما تھا اور پھر جانے کیا ہوا تھا کہ یکدم بھیڑ کے باعث ان کا ہاتھ حیدر کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا ایسا حیدر نے قصداً کیا تھا یا ایسا محض اتفاق ہوا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھیں مگر حیدر میاں ٹرین میں سوار ہوگئے تھے اور ٹرین اپنی منزل کی طرف چل پڑی تھی وہ گھر لوٹ آئی تھیں، تب نواب صاحب نے تیمور کو بلا کر ہدایت کی تھی۔

”آپ عین کو بحفاظت پاکستان چھوڑ کر آیئے اتنا جان لیجیے ہم آپ پر آپ کے والد محترم پر بے انتہا اعتبار کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ اس اعتبار کو لے کر کبھی ہمیں شرمندہ نہیں کریں گے۔ ہم یہ ذمہ داری جلال کو

سوچتے مگر ان کی کچھ خبر نہیں ہے ہمیں ان کی فکر ہو رہی ہے ہم کچھ اہم امور نبٹا کر جلد آپ کو پاکستان میں ملیں گے آپ کے والد محترم اور آپ کے اہلخانہ بھی ہمارے ہمراہ پاکستان کی زمین پر قدم رکھیں گے ان شاء اللہ ایسا جلد ہوگا۔" نواب صاحب نے کہا تھا اور تیمور نے سر ہلا دیا تھا۔

"جیسا آپ کا حکم چچا جان سر تسلیم خم ہے۔" تیمور احتراماً بولا تھا نواب صاحب نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ہم آپ پر جلال کی مانند ہی اعتبار کرتے ہیں آپ جلال کے دوست اور اس گھر کے اہم فرد ہیں سو ہماری دعائیں اور یقین آپ کے ہمراہ ہے آپ آج ہی عین کو لے کر پاکستان روانہ ہوں گے۔" نواب صاحب نے کہا تھا اور اس نے سر ہلا دیا تھا۔

"جیسا آپ کا حکم چچا جان میں حاضر ہو جاؤں گا۔" وہ کہہ کر پلٹا تھا اور وہاں سے نکل گیا تھا عین نے چھت پر کھڑے اسے جاتے دیکھا تھا۔ عین چلتی ہوئی والد کے سامنے آن رکی تھیں۔

"ابا جان ایسی کیا جلدی ہے اب جب حیدر میاں پاکستان روانہ ہو ہی گئے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ ہم بھی ان کے لیے پاکستان روانہ ہوں ہم آپ کے ہمراہ پاکستان روانہ ہوں گے چاہے آپ کو اس میں وقت لگے۔" یہ اس نے ابا جان کے سامنے جانے سے گویا انکار کر دیا تھا نواب صاحب نے شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ رکھا تھا تو جانے کیوں آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے تھے۔

"ابا جان جانے کیوں ڈر لگ رہا ہے، ہمارا دل مطمئن نہیں ہے آپ کو چھوڑ کر جانے کو دل نہیں چاہ رہا ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے دیکھیے آپ نے ہمیں روانہ کیا مگر ہم واپس لوٹ آئے اس کا کوئی مقصد ضرور ہوگا۔ اللہ چاہتے ہیں ہم آپ کے ساتھ قیام کریں۔" وہ اشکوں سمیت بولی تھیں اور ابا جان کے گلے لگ کر رونے لگی تھیں۔

نواب صاحب نے بیٹی کا سر تھپکا تھا۔

"آپ فرمانبردار اولاد ہیں عین بیٹا آپ نے ہماری مرضی کو ہمیشہ اپنی مرضی جانا ہے ہمیں آپ پر فخر ہے اللہ آپ جیسی نیک اور صالح اولاد ہر کسی کو دے اللہ پاک آپ کا نصیب اچھا کرے اور دنیا و آخرت سنوارے سلامت رہیے میری بچی اللہ پاک آپ کو وقت کے گرم تھپیڑوں سے محفوظ رکھے آپ کے ہمراہ ہماری دعائیں ہیں ہم جلد آپ کو پاکستان میں ملیں گے فکر مند نہ ہوں ہم اپنی دعائیں آپ کے ہمراہ بھیج رہے ہیں۔" ابا جان نے کہا تھا اور وہ پر درد کیفیت سے ان کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

بد قسمتی سے اس دن بلوائیوں نے محل پر حملہ کیا تھا اور تب عین کو سمجھ آیا تھا کہ اس کا دل اس درجہ بھاری کیوں تھا اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کو مرتے دیکھا تھا آزادی کی قیمت تھی کہ اسے اپنے ماں باپ دادی جان کی قربانی دینا پڑی تھی اور جلال اس کا کچھ پتا نہ تھا تیمور اس لمحے آیا تھا اور اسے لے کر محل سے نکل آیا تھا وہ سکتے کی سی کیفیت میں پاکستان کے لیے روانہ ہوئی تھی دل درد سے بھرا تھا وہ سکتے کی سی کیفیت میں پاکستان کے لیے روانہ ہوئی تھی دل درد سے بھرا تھا اور آنکھیں نمی سے اس نے جیسے اپنا سبھی کچھ گنوا دیا تھا اپنے اہلخانہ کو ایسی موت مرتے دیکھنا کتنا بڑا کرب تھا یہ صرف نواب زادی عین النور جانتی تھیں اسی دن وہ پاکستان کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ پورا خاندان بکھر گیا تھا اور آنکھوں کے خواب بھی۔

وہ غم سے نڈھال سی پاکستان کی سمت روانہ ہوئی تھیں تیمور ان کے ہمراہ تھے ان کے محافظ بن کر مگر اسے یقین نہیں تھا کہ اگر وہ صحیح سلامت پاکستان پہنچ پائیں گے عین نے جو موت کا کھیل دیکھا تھا ان کی روح جیسے درد سے نڈھال تھی مگر وہ اپنے ماں جائے کے لیے دعاگو تھیں کہ وہ ساتھ خیریت سے ہوں۔

❀......۞......❀

ٹرین پاکستان کی حدود میں داخل ہوئی تھی تو ٹرین میں شور سا اٹھا تھا کئی سر سجدے میں گر گئے تھے کئی پاکستان زندہ باد اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر اللہ کا شکر ادا کرنے لگے تھے۔

عین نے نمی سے بھری آنکھوں سے کھڑکی سے باہر جھانکا تھا۔

"بس یہ تھا اور اس کے لیے کیا کیا نا بیت گیا اتنا سا سفر تھا مگر جیسے قیامت کے زمانے جی آیا ہم کیا کیا نہ گنوا آئے۔" یہ سفر آسان کیوں نہ تھا تیمور، اگر یہ تقسیم باضابطہ

ہوئی تھی تو اس سفر کو اتنا مشکل کیوں کر دیا گیا۔زمین کے دو ٹکڑوں کا بٹوارہ کرنا ہی تھا تو یہ فسادات کیوں مسلط کیے گئے اتنے معصوموں کا خون ناحق کیوں بہایا گیا؟'' ان کی آنکھوں سے اشک رواں تھے یقیناً ان کا دل درد سے نڈھال تھا تیمور نے ماسوائے ان کا ہاتھ تھام کر خاموشی سے دلاسہ دینے کے کچھ نہیں کہا تھا۔

❁……◉……❁

''چاچا جان چاہے آپ کوئی بھی عمل اختیار کریں مگر ہم یہ مقدمہ واپس نہیں لیں گے ہم اپنے ابا جان اور اہل خانہ کے قتل کا بدلہ آپ سے لے کر رہیں گے آپ نے جو کیا ہے اس کی سزا آپ کو ضرور ملے گی۔'' جلال نے جرأت مندانہ انداز سے کہا تھا مگر مرزا سراج الدولہ مسکرا دیے تھے۔

''آپ کی کم فہمی ہے میاں، ایسا نہیں ہوگا آپ کے بچکانہ اقدام پر ہمیں ہنسی آتی ہے کس دنیا میں رہتے ہیں آپ جب جانتے ہیں فسادات میں کئی خاندان مارے گئے ان میں سے ایک خاندان آپ کا بھی تھا بلوائیوں نے جو کیا آپ اس کا ملبہ ہمارے سر نہیں ڈال سکتے۔'' مرزا سراج الدولہ نے کہا تھا اور جلال نے ان کو پرسکون انداز میں دیکھا تھا۔

''چاچا جان اگر یہ معاملہ ایسا ہی سہل ہے تو آپ اس درجہ خوفزدہ کیوں ہیں اگر یہ حملہ بلوائیوں کا تھا تو آپ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے کیوں ہیں بلوائیوں نے حملہ کیا یہ سچ ہے مگر ایسے اثر ورسوخ والے انسان کے گھر میں گھسنا اور حملہ کرنا آسان نہ تھا آپ اس کے موجب بنے یہ جال آپ ہی کا بنا ہوا تھا۔ حملہ آور بلوائی ہی تھے مگر دماغ آپ کا کارفرما تھا آپ ہر طرح سے اس معاملے کو معمول کے فسادات کا حصہ دکھانا چاہتے تھے مگر ایسا ممکن نہیں ہوسکا۔'' ان کا پرسکون لہجہ بتا رہا تھا کہ ان کے پاس اس کے ثبوت ہیں اور یہی بات سراج الدولہ کو پریشان کن لگی تھی۔

''آپ کا دماغ سٹھیا گیا ہے میاں اہلخانہ کے غم نے پاگل کر دیا ہے آپ کو تبھی آپ اول فول بکے جا رہے ہیں ہم اس معاملے میں ملوث نہیں ہیں اور نہ ہمارا اس سے کوئی تعلق ہے یہ معمول کے فسادات کا واقعہ تھا جس میں بلوائیوں نے آپ کے اہلخانہ کو موت کے گھاٹ اتارا۔ شکر منایئے آپ سلامت بچ گئے ورنہ آپ اور آپ کی ہمشیرہ بھی مارے جاتے۔'' مرزا سراج الدولہ نے کہا تھا جلال نے سر ہلایا تھا۔

''ہم اس ذات پاک کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمیں اور ہماری ہمشیرہ کو محفوظ رکھا مگر ہم اپنے والدین کے قاتل کو ایسے معاف نہیں کریں گے آپ نے فسادات کی آڑ میں جو دشمنی نکالی ہے وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہمیں آپ کی سازشوں کی خبر ہوچکی ہے اور ہم آپ کو بخشنے والے نہیں ہیں سزا تو آپ کو مل کر رہے گی چاہے یہ مقدمہ برسوں چلے ہم انتظار کریں گے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا تھا اور مرزا صاحب اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔

❁……◉……❁

خوشنما نے اپنے اردگرد کے منظر کو کسی قدر اجنبی نظروں سے دیکھا تھا ہر منظر جیسے نگاہ کے لیے اجنبی تھا۔

پھول تو دو دن بہار فزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

دل کے اندر ایک آہ اٹھی تھی درد کے نالے تھے جو بہہ جانے کو منتظر تھے آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں وہ خالی خالی مناظر کو دیکھے گئے تھے۔

''یا اللہ اس دل کو محبت سے روشناس کیوں کیا اگر یہی کرنا تھا تو؟ یہ درد لامحدود ہے اس درد کا کیا کریں ہم ہمارے اختیار میں یہ دل کیوں نہیں یا رب اس دل کو چھوٹے نواب کی محبت سے یا تو خالی کر دے یا اس محبت سے بازیاب ہونے کا کوئی سلیقہ دے دے۔'' اس نے آنسوؤں کے ساتھ سوچا تھا۔

''ہم دعاؤں کے مستجاب ہونے کی دعا بھی نہیں مانگ سکتے میرے رب کیوں ہم جانتے ہیں ان دعاؤں کا کوئی سبب نہیں ہماری دعائیں کسی اور کی خیر نہ چاہتی ہوں تو خودغرض بن جاتی ہیں تمہاری خواہش ہماری دعائیں بنتی ہیں مگر جن سے ہماری خواہش منسوب ہیں ان کی زندگی کسی اور سے منسوب ہے ایسے میں ہم خودغرض نہیں بن سکتے ہمیں جلال کی خوشیاں عزیز ہیں ہم ان کی زندگی آباد دیکھنا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی زندگی کو کسی غم سے بھی ہمکنار نہ کرے وہ جہاں بھی رہیں ہمیشہ خوش رہیں شاد وآباد رہیں۔'' انہوں نے بھیگتی آنکھوں سے جلال کے حق میں خیر کی دعا مانگی تھی ان کے اردگرد سناٹا تھا خیالوں میں کئی

آوازیں گونج رہی تھیں۔
اماں کی...... دوستوں...... سہیلیوں کی...... شگن کے گیت ماں کی لوری سہیلیوں کے گیت جو کھیل کے دوران گایا کرتی تھیں ان آوازوں میں اسے اپنی آہیں ڈوبتی دکھائی دی تھیں کتنے شگن کی گھڑی تھی مگر اردگرد ایسا سناٹا تھا جیسے کوئی میت ہوگئی ہو، حمزہ چلتا ہوا اس کی سمت آیا تھا اور اسے خاموشی سے دیکھا تھا خوشنما نے اسے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تبھی وہ بولا تھا۔
''کوٹھوں پر باراتیں نہیں آتیں نا شادی بیاہ کے گیت گائے جاتے ہیں وہاں ایسی خوشیوں کی جگہ نہیں ہوتی، ہم نہیں جانتے آپ کے دل میں کیا ہے یا آپ کیا سوچ رہے ہیں مگر ہم خود کو اس رشتے کے لائق نہیں سمجھتے ہم خود کو آپ کے لائق بھی نہیں سمجھتے ہم یہ نکاح نہیں کرسکتے ہم جلال سے محبت کرتے ہیں اور ہمارے دل میں کسی اور رشتے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے نہ ہی محبت کی کوئی گنجائش ہم آپ سے محبت نہیں کرسکتے، ہم کسی سے بھی محبت نہیں کرسکتے۔'' خوشنما نے کہا تھا اور حمزہ نے اسے خاموشی سے دیکھا تھا۔

❀......۞......❀

''یہ لونڈا تو جان کو آرہا ہے اس کا کچھ کرنا ضروری ہے میاں ہم اس کو مزید نہیں جھیل سکتے۔'' مرزا سراج الدولہ غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولے تھے وکیل صاحب مسکرا دیے تھے۔
''مرزا صاحب بچے کو کھیل لینے دیجیے ہوگا تو وہی جو آپ چاہیں گے آپ گھاگ انسان ہیں آپ کے سامنے اس کی کیسے چل سکتی بچہ ہے کرنے دیں تھوڑی چھیڑ چھاڑ بچے خوش ہوتے ہیں چھوٹے کھیل کھیل کر آپ بھی لطف لیجیے۔'' وکیل صاحب نے مسکراتے ہوئے سمجھایا تھا مگر وہ غصے سے بولے تھے۔
''ہم ایسے مذاق پسند نہیں کرتے چھوٹے نواب جلال الدین پٹوڈی کو سبق دینا ضروری ہے۔'' وہ غصے سے گویا ہوئے تھے۔
''کیا سزا دیں گے میاں ہم تو کہتے ہیں جانے دیں مقدمے میں دم نہیں پھر ان کے پاس کسی شے کے ثبوت ہوں ضروری نہیں مان لیجیے کہ وہ آپ کو صرف اکسا رہے ہیں کہ آپ خود اپنا کیا قبول کریں آج کے بچے میں اتنا دم نہیں کہ وہ ایسی چالیں چل سکے اور ایسے ثبوت ڈھونڈنا بچوں کا کھیل نہیں موصوف کا ارادہ آپ کو ڈرانا یا محض خوفزدہ کرنا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں یوں بھی فیڈرل کورٹ آف انڈیا ایسے مقدمات کو فوراً خارج کردیتا ہے بچوں کا کھیل نہیں ایسے مقدمات لڑنا یا تو چھوٹے نواب بہت بے وقوف ہیں یا بہت زیادہ نااہل اگر فیڈرل کورٹ آف انڈیا اس کیس کو رد کرتا ہے تو وہ اس کے خلاف آواز اٹھانے کے لائق نہیں ہوں گے۔''

❀......۞......❀

مسافروں سے بھری ٹرین جب 1860ء کے بنے لاہور اسٹیشن پر رکی تھی تو کئی لوگوں نے جیسے منزل مقصود پر پہنچنے پر سکھ کی گہری سانس لی تھی ان کے چہرے اس تفکر یا پریشانی سے بے فکر تھے کہ ان کو آئندہ دنوں میں کیا پریشانیاں ہوں گی یا وہ کن حالات سے گزریں گے مسافر مطمئن اور پرسکون چہروں کے ساتھ ٹرین سے اترنے لگے تھے۔
نواب زادی عین النور نے اجنبی نظروں سے منظر کو دیکھتے ٹرین سے باہر قدم رکھا تیمور ان کے ہمراہ تھا۔
''آزادی کی قیمت ہوتی ہے اور بہت قیمت چکائی ہے ہم نے کاش ہم اس قیمت کے عوض کچھ اور ادائیگی کرسکتے اور وہ ہمارا اہل خانہ نہ ہوتا۔'' انہوں نے مدہم لہجے میں کہا تھا۔
تیمور نے ان کو بغور دیکھا تھا۔
''دنیا میں ہر شے کی قیمت مختص کردی گئی ہے نواب زادی قیمت کی ادائیگی کے بنا کچھ نہیں ملتا اگر ہم پتھر کے دور میں بھی زندہ ہوتے تو وہاں بھی اس آزادی کی قیمت ضروری ہوتی ادوار سے فرق نہیں پڑتا انسانی فطرت ایک ہی طرح کی واقع ہوئی ہے۔'' تیمور نے ان کو سمجھانا چاہا تھا لوگوں کے ہجوم میں رستہ بنائے وہ ان کو لے کر آگے بڑھنے لگے تھے یکدم کچھ دکھائی دیا تھا اور عین کے قدم تھم گئے تھے نظریں پتھرا گئی تھیں اور وہ ساکت سی حیرت سے پھٹی آنکھوں سے سامنے کا منظر دیکھنے لگی تھیں۔
''کیا ہوا عین؟'' تیمور نے پوچھا تھا عین النور نے اس جانب اشارہ کردیا تھا کوئی بھاگتا دکھائی دیا تھا تیمور نے

عین کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔
''وہ......!'' عین کی آواز ابھری تھی۔
❁......◈......❁
فتح النساء نے بے دھیانی سے چلتے ہوئے چھوٹے نواب کی سمت سے لگائے گئے الزامات کو سوچا تھا اس نے بے وفائی نہیں کی تھی مگر جلال نے اس کی خاموشی سے کھلے عام الزام لگا دیا تھا کہ وہ بے وفا ہیں اور وہ اپنی صفائی میں ایک لفظ نہیں کہہ سکی تھیں وہ ان سے کہہ رہے تھے کہ وہ آزادی چاہتی ہیں تو وہ ان آزاد کرسکتے ہیں مگر وہ ان کے ہمراہ تھیں تو کیوں شاید وہ سمجھنے کو تیار نہیں تھے جو حالات اور کڑا وقت درپیش رہا تھا وہ ان کو تنہا نہیں چھوڑ سکی تھیں اب جبکہ نواب صاحب اور بیگم بھی نہیں رہے تھے وہ ان کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھیں اور وہ کیسے کہہ جاتے تھے جیسے سرے سے ان کو ضرورت ہی نہ تھی۔
''کیا ہوا آپ بہت پریشان لگ رہی ہیں۔'' بوا نے پوچھا تھا۔ اس نے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔
''یہ پریشانی تو جیسے عمر بھر کی ہے بوا ہم چھوٹے نواب کے متعلق سوچ رہے تھے ہم نے طے کیا کہ ہمیں ان پر مسلط رہ کر نہیں جینا چاہیے جبکہ وہ بھی ایسا نہیں چاہتے سو ان پر بوجھ کیونکر بننا؟'' وہ مدہم لہجے میں بولی تھیں بوا چونکی تھیں۔
''آپ ان سے رشتہ ختم کرنا چاہتی ہیں فتح النساء۔'' وہ جیسے ان کے فیصلے پر حیران رہ گئی تھیں فتح النساء نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔
''ہمیں نہیں لگتا اس کے علاوہ کوئی راستہ ہے۔'' وہ عجیب سے سرد لہجے میں گویا تھیں بوا نے حیرت سے دیکھا۔
''یہ بہت بھیانک فیصلہ ہوگا فتح النساء آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں۔'' طلاق کے معنی جانتی ہیں آپ اپنی پیشانی پر بٹہ لگوانا کیوں چاہتی ہیں کہ طلاق سے تو بہتر تھا آپ ان سے علیحدگی برقرار رکھیں کس سوچ میں ہیں آپ اگر ہم آپ کی سگی والدہ بھی ہوتے تو ہم آپ کو ایسے کسی اقدام کے لیے مشورہ نہ دیتے اس معاشرے میں عورت کا طلاق شدہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے اور عورت کو کس نطاہ سے دیکھتے ہیں کیا آپ نہیں جانتیں، اس محل کی مالکن ہیں آپ چھوٹے نواب کی بیگم ہیں نواب سیف الدین کی بہو ہیں آپ اتنے بڑے خاندان سے وابستہ ہیں آپ کسی لڑکی کی خواہش ہوسکتی ہے یہ اور یہ ایک حقیقت ہے اور کیا درکار ہے آپ کو اور کیا چاہتی ہیں آپ آپ کو یہ حیثیت یہ مرتبہ نہیں چاہیے اگر یہ عزت بھی آپ کو درکار نہیں تو پھر اور کیا ترجیحات ہیں آپ کی۔'' بوا نے غصے سے کہا تھا وہ تلخی سے مسکرادی تھیں۔
''بوا بٹہ تو عزت پر تب بھی لگا تھا جب حیدر میاں نے ہمارا آنچل سر سے کھینچ دیا تھا اور چھوٹے نواب نے بجائے اپنی عزت کے لیے آواز اٹھانے کے ان موصوف حیدر میاں کے لیے کھڑے ہونا ضروری خیال کیا تھا ہماری اس لمحے کیا عزت رہی تھی کسی نے سوچا تھا یا اس نواب خاندان نے سوچا تھا چھوٹے نواب کے اس اقدام پر تب کسی نے مزاحمت کیوں نہیں کی تھی بٹہ تو ہماری پیشانی پر تب بھی لگ گیا تھا جب ہمیں محفل سے نکال دیا گیا تھا اور ان ہی خاوند نے پلٹ کر ایک بار بھی ہمیں پوچھا تک نہ تھا ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم نے چھوٹے نواب سے محبت کی اور اس محبت کے لیے ہم وفادار رہے وہ ذات پاک گواہ ہے ہم چھوٹے نواب کے علاوہ کسی سے وفادار نہیں ہم نے کسی کو کبھی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ہم نے اس روئے زمین پر فقط ایک انسان سے محبت کی ہے اور وہ چھوٹے نواب ہیں چھوٹے نواب کے علاوہ ہم نے کبھی کسی کو دل میں جگہ نہیں دی۔
مگر اس کا اجر ہمیں کیا ملا چھوٹے نواب نے کبھی اس محبت کو نہیں سمجھا نہ اس محبت کی قدر کی ہماری محبت یکطرفہ محبت تھی جس کو بھگتنا بھی ہمیں ہی پڑا ہم نے کس شے کی سزا پائی ہے اس گھر میں قدم رکھا تو ہم نے خود پلٹ کر اس گھر کا رخ مصلحتاً کیا کیا اس عمل کو سراہا گیا ہم نے محبت کے لیے انا کو کچل دیا پھر بھی کیا پذیرائی ہوئی بوا ہم نے ہر طرح سے اس رشتے کو بنانا چاہا ہے مگر یہ رشتہ شاید اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا ربر کی لچک بھی ایک حد تک ہوتی ہے اس رشتے میں بھی بس اتنی ہی گنجائش تھی اس سے آگے ہماری محنت جواب دے جاتی ہے اور اس سے آگے کی برداشت ختم ہوئی چاہتی ہے ہم سے اور قربانیاں مت مانگیے اس سے زیادہ قربانیاں ہم نہیں دے سکتے۔'' وہ آنسوؤں کے درمیان بولی تھیں اور پلٹ کر چلتے ہوئے وہاں سے نکل گئی تھیں بوا ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

❀ ...... ◈ ...... ❀

تیمور نے اس شخص کو بھاگتے دیکھا تھا اور اس کا تعاقب کیا تھا مگر وہ کہیں غائب ہوگیا تھا اس نے ہجوم کا فائدہ اٹھایا تھا تیمور نے یہاں وہاں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی اور پھر مایوس ہوکر لوٹ آیا تھا عین بہت افسردہ بہت بے چین دکھائی دیں۔

"عین یہ کون تھا شہاب؟" تیمور نے اندازہ کر کے کہا تو نواب زادی نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"یہ یہیں ہوگا ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے آپ فکر نہ کریں۔" تیمور نے سمجھایا اور عین کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنے لگا کئی پہلے آجانے والے اپنے پیاروں کے انتظار میں کھڑے تھے عین کی نظریں بھی کسی کو بے چینی سے ڈھونڈ رہی تھیں۔ تیمور جانتا تھا وہ کون تھا وہ نواب زادی کا منگیتر تھا جس کا انتظار ان کو تھا وہ چاروں سمت لوگوں کے ہجوم میں جیسے اس ایک چہرے کو دیکھ رہی تھیں یہ جانے بنا کہ حیدر میاں اس ٹرین سے پاکستان پہنچے ہی نہ تھے وہ تو اس ٹرین سے اتر کر واپس گھر کو لوٹ گئے تھے بعدازاں ان کے والد محترم نے ان کو دوبارہ روانہ کیا تھا اور اب یقیناً ان کی آمد عین کی آمد کے بعد متوقع تھی۔ اگر وہ صحیح سلامت پہنچ گئے تھے تو یقیناً وہ پاکستان کی سرحد عبور کر کے عین سے ضرور ملنے والے تھے مگر عین کے وہم و گمان میں حقیقت نہ تھی کہ وہ پاکستان نہیں پہنچے۔ سو وہ اندراج کرنے والوں کے پاس جا کر حیدر میاں کے متعلق پوچھتی رہیں۔ ایسی افراتفری اور بے ضابطگی تھی کہ اندراج کرنے والے خال خال دکھائی دیے کیمپوں میں مقیم مہاجرین عجیب یاسیت کا شکار دکھائی دیے تیمور عین کا ہاتھ اس طرح تھامے ہوئے تھا گویا وہ کوئی چھوٹی سی بچی ہو اور ابھی وہ ان کا ہاتھ چھوڑیں گے اور وہ کہیں گم ہوجائیں گی کیمپوں کی حالت عجیب تھی سو تیمور مضبوط ڈھال بنے ان کے ہمراہ تھے۔

"ہم انہیں کہاں ڈھونڈیں گے تیمور۔" وہ پپڑی زدہ لبوں پر زبان پھیر کر لبوں کو تر کرتی ہوئیں فکرمندی سے گویا ہوئی تھیں تب تیمور نے سر ہلا دیا تھا۔

"آپ فکرمند نہ ہوں نواب زادی ہم آپ کے ہمراہ ہیں اور تب تک واپس نہیں لوٹیں گے جب تک آپ کا ہاتھ حیدر میاں کے محفوظ ہاتھوں میں نہ تھما دیں۔" تیمور نے ان

کو یقین دلایا تھا۔
عین نے جیسے سنی ان سنی کرتے ہوئے قدم آگے بڑھاتے ہوئے ایک عورت کی سمت پیش قدمی کی تھی تیمور مجبوراً ان کے ہمراہ ہولیا تھا وہ خاتون اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھیں اوران کی آنکھیں اس تکلیف کی غماز تھیں۔
''آپ کو کیا ہوا آپ ٹھیک ہیں۔'' عین نے جھک کر کیمپ کے باہر گری عورت کے قریب جھک کر پوچھا تھا۔
''پا...... پا...... ن...... ی......!'' وہ کراہی تھیں عین نے تڑپ کران کا سر اٹھا کر اپنے گھٹنوں پر رکھا تھا اور تیمور کی طرف دیکھا تھا مگر تیمور عین کو اس طرح بے یارو مددگار چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔
''آپ کا نام کیا ہے، آپ کے ہمراہ کون ہے؟'' عین نے ان کی تکلیف کا اندازہ کرتے ہوئے پوچھا تھا مگر وہ خاتون کرب کے احساس سے آنکھیں موند گئی تھیں اوران کی آنکھوں کے کناروں سے نمکین پانی کے قطرے بہہ کر بے قدر ہو کران کی میلی چادر میں جذب ہو گئے تھے۔
''پا...... پا...... نی......!'' وہ عین کے سوال کے جواب میں بولی تھیں تب عین نے ان کے چہرے سے چادر کا کونا ہٹا دیا تھا اور وہ ان کا چہرہ زخموں سے بھرا دیکھ کر کراہ کر رہ گئی تھیں تیمور بھی اپنی جگہ حیران تھے انہوں نے جھک کران خاتون کا چہرہ دیکھا تھا۔
''بہن کون ہیں آپ کے ہمراہ کون ہے معذرت چاہتا ہوں میں نواب زادی کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا، ان کی حفاظت کا وعدہ ہے مگر مجھے آپ سے ہمدردی ہے آپ کو کس نے اس طرح زخمی کیا؟'' تیمور نے تڑپ کر پوچھا تھا ان کو اپنا آپ بہت بے بس لگا تھا اگر وہ تنہا ہوتے تو مدد کرنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے مگر وہ عین کی ذمہ داری لے کر آئے تھے وہ ان کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔
تبھی ایک ضعیف خاتون چلتی ہوئی پاس آئی تھیں اور تیمور کی سمت پانی بڑھایا تھا۔
''سنا ہے کیمپ کے نزدیک جو کنواں ہے اس میں نیلا تھوتھا ملا دیا گیا ہے یہ کس نے کیا ہم نہیں جانتے مگر ہم ان کو کنویں کا پانی نہیں پلا سکتے تھے سو ان کے لیے پانی کی تلاش میں گئے تھے آپ یہ پانی ان کو پلا دیں۔'' تیمور نے سر اٹھا کران ضعیف خاتون کو دیکھا تھا نواب زادی نے تیمور کے ہاتھ سے پانی لے کران خاتون کو پلایا تھا۔
''یہ تو بہت زخمی ہیں ان کا چہرہ بہت مجروح ہے کس نے کیا یہ سب آپ ان خاتون کے ہمراہ ہیں۔'' تیمور نے پوچھا تھا ضعیف خاتون نے تیمور کی طرف دیکھا تھا اور سر ہلا دیا تھا۔
''اس بدقسمت نے خود کو محفوظ رکھنے کی غرض سے اپنا چہرہ آہنی سلاخوں سے خود داغدار کیا ہے تاکہ کیمپ میں شکاریوں کی نظر ہوس سے محفوظ رہ سکیں اگر یہ چہرہ نہ داغتی تو اس سرحد کے پار نہ ہوتیں اور اب تک ان کا جسم کئی داغوں سے داغا جا چکا ہوا اس بچی نے جو کیا وہ ایک غیرت مند بیٹی کا اقدام ہے جو اپنی عزت کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں ان جیسی جانے کتنی بیٹیوں نے اپنے خوب صورت چہروں کو داغدار کیا ہے اس سرحد سے اس سرحد کے پاس آنے کا سفر کرب اور تکلیفوں سے بھرپور تھا مگر اب اس سرحد پر بے یارو مددگار بیٹھ کر پتا چلا کہ اس سفر سے بڑھ کر بھی اذیت باقی ہے وہاں کے بلوائیوں کے حملوں سے جو بچ کر یہاں پہنچ گئے ان کو اب یہاں کے ہوس پرستوں کی غلاظت سے بھری نظروں کا سامنا ہے یہاں پہنچ کر پتا چلا کہ جو کام وہاں بلوائیوں کے سپرد تھا یہاں وہ کام مقامی سورماؤں نے سنبھالا ہوا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے اس کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا مگر اس تقسیم نے کئی ستم اس قوم کی بچیوں پر ڈھائے ہیں جن کو تاریخ رقم کرنے سے قاصر رہے گی، تاریخ فقط ان مہاجرین کی تعداد کا تخمینہ لگائے گی اس کرب کا نہیں جو جسم و جان پر ٹوٹے دنیا کی سب سے بڑی ہجرت میں درندگی کا سامنا بننے والی خاتون کسی کو یاد نہیں ہوگی، کیونکہ اس کا ذکر کرنے سے کئی سر شرم سے جھک جائیں گے اور تاریخ ایسے حوالوں کا ذکر نہیں کرتی جس پر شرمساری کا گماں ہو۔'' ان خاتون کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔
عین اپنے آنچل کا کنارہ پھاڑ کر اس پانی کی مدد سے ان خاتون کے چہرے کو زخموں کو صاف کرنے لگی تھیں۔
''ان کو دوا کی ضرورت ہے تیمور اس کے لیے کوئی انتظام کرنا ہوگا۔'' عین نے تیمور کی سمت مدد طلب نظروں سے دیکھا تھا۔
''کیمپ میں موجود کنویں کے پانی سے کئی لوگوں کی آنتیں کٹی پڑی ہیں وہ خون کی الٹیاں کر رہے ہیں ان کے

لیے ابھی تک کوئی طبی امداد نہیں تو اس بچی کو طبی امداد کیسے ملے گی، اس کا چہرہ ایسے ہی داغدار رہنے دیں آپ سے درخواست ہے اس کے چہرے کی مرہم پٹی کے متعلق نہ سوچیں اگر ان کا چہرہ ٹھیک ہو گیا تو کئی نگاہیں ان کی سمت اٹھیں گی اور یہ شریف زادی ان نظروں کا سامنا نہیں کر سکیں گی یہ اپنے ہمراہ آنے والے ساتھیوں کی منتظر ہیں جو دوران سفر ان سے بچھڑ گئے تھے آپ اس کے حق میں دعا کردیں کہ یہ ان کے یہاں آنے تک باخیر و عافیت رہیں اور اپنے پیاروں کا چہرہ ایک بار دیکھ سکیں۔'' ضعیف خاتون دردناک لہجے میں بولی تھیں اور کیمپ کے اندر چلی گئی تھیں عین نے ان خاتون کو سہارا دے کر کیمپ کے اندر پہنچایا تھا درد کی شدت اور زخموں کے باعث ان کا چہرہ اور وجود بخار سے جل رہا تھا عین کو بہت دکھ ہوا تھا کرب کی کیفیت سے ان کی آنکھوں سے آنسوں رواں ہو گئے تھے تیمور نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ان کو دلاسا دیا تھا۔

❊......۞......❊

حمزہ نے خوشنما کو نرمی سے دیکھا تھا۔

''میں نہیں جانتا آپ کن حالات سے گزری ہیں کن حالات سے دوچار ہیں مگر کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہوں گا اگر آپ اس نکاح کے لیے تیار نہیں تو میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ خالہ جان کی آمد سے قبل یہاں سے چلی جائیے اگر آپ کو علم ہے کہ آپ کو کہاں جانا ہے تو ہم آپ کی اتنی مدد کر سکتے ہیں کہ آپ کو اس محفوظ مقام پر چھوڑ آئیں۔'' حمزہ نے ان کو ایک نگاہ دیکھا تھا۔

''جہاں تک ممکن ہوسکا ہم آپ کی مدد ضرور کریں گے آپ فکرمند نہ ہوں ہمارے فوجی دوست اور ان کے اہلخانہ پاکستان کے لیے روانہ ہو رہے ہیں مگر اس کے لیے ہمیں آپ کو بحفاظت دلی پہنچانا ہوگا مگر آپ کو ابھی سے رخت سفر باندھنا ہوگا خالہ جان آگئیں تو آپ کا جانا ممکن نہیں ہوگا معذرت چاہتا ہوں ان کی بیٹی کی موت کا صدمہ انہیں بدحواس کیے ہوئے ہے وہ آپ کو اپنی ہاجرہ تصور کر رہی ہیں ایک مشورہ ہے اگر کسی رشتے دار کا کوئی اتا پتا ہے تو آگاہ کریں آپ کو فوری طور پر وہاں پہنچا دیتا ہوں تا کہ پاکستان روانگی سے قبل آپ کسی محفوظ مقام پر تسلی سے قیام کریں۔'' حمزہ نے کہا تھا تو اس نے زرتار آنچل سر سے کھینچ کر اتارتے ہوئے سیاہ چادر اپنے گرد پھیلا کر چہرہ چھپا لیا تھا اور مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

''ہم کسی کو نہیں جانتے ہمارا یہاں کوئی نہیں۔'' خوشنما نے کہا تھا۔

''چلیے جلدی کیجیے ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں اگر خالہ جان آگئیں تو یہاں سے نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔'' حمزہ نے کہا تھا خوشنما سر ہلاتے ہوئے چل پڑی تھیں اسی دم کوئی دروازہ پیٹنے لگا تھا حمزہ نے دانستہ خوشنما کو اشارے سے وہیں روک دیا تھا اور خود آگے بڑھ کر اندازہ کرنا چاہا تھا کہ دوسری طرف کون ہے اس نے آواز دے کر پوچھا تھا۔

''کون ہے؟'' اس نے پکارا تھا اگر خالہ ہوتیں تو یقیناً دوسری طرف سے آواز دے کر مطلع کرتیں مگر جواب نا پا کر حمزہ چونکنا ہو گیا تھا اور پلٹ کر خوشنما کو خاموش رہنے کو کہا تھا اور اشارے سے خبردار کیا تھا کہ وہ کوئی حرکت نہ کرے پلٹ کر اس پر جھک کر دروازے کی جھری سے جھانکا تھا اور دروازے کے باہر بلوائیوں کو دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو کر پلٹا تھا اس دوران اس نے پلٹ کر خوشنما کو اشارے سے آگاہ کردیا تھا کہ دروازے کے اس طرف بلوائی ہیں دستکوں کا تسلسل بڑھ گیا تھا ایسے زور سے کوئی پیٹ رہا تھا کہ گویا دروازہ توڑ کر اندر آجائے گا۔ اس کا ہاتھ تھام کر چھت کی سمت بھاگنا چاہا تھا تاکہ کوئی فرار کا راستہ تلاش ہو سکے مگر تبھی بلوائی دروازہ توڑ کر اندر گھس آئے تھے۔

''خوشنما بھاگیں آپ میں ان کو سنبھال لوں گا آپ چھت کر جا کر دوسری طرف سے کود جائیں پچھلی گلی سے راستہ باہر کی طرف نکلتا ہے مطمئن رہیں وہاں بوسی کا ڈھیر ہے آپ کو چوٹ نہیں لگے گی۔'' وہ چیختے ہوئے اپنی سمت آنے والے بلوائیوں سے نمٹنے لگا تھا مگر خوشنما ششدر سی کھڑی تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہیں میں نے کہا بھاگیں میں ان کو روک لوں گا۔'' وہ چیخا تھا مگر خوشنما نے نفی میں سر ہلایا تھا وہ مضبوط جسم کا فوجی خاصا بہادر تھا لمبی چوڑی جسامت کا مالک وہ نوجوان یقیناً طاقتور تھا مگر بلوائیوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے، کرپانیں، تلواریں تھیں۔ وہ خالی ہاتھ تھا مگر وہ پھر بھی ان کو روکنے کو تیار تھا خوشنما چیخی تھی۔

''ہم نہیں جائیں گے آپ کو مشکل میں چھوڑ کر ہم نہیں

جا پائیں گے یہ خود غرضی ہوگی۔" وہ آنسوؤں کے بھیگتی آنکھوں کے ساتھ بولی تھیں۔

"آپ جائیں درخواست ہے آپ سے۔" وہ لکڑی کے ایک ستون کو ان پر تانتا ہوا رستہ روک کر بولا تھا خوشنما نے اس کی جانب دیکھا تھا اور بھیگتی آنکھوں سے پلٹ کر زینہ چڑھنے لگی تھی۔

❁......◈......❁

موٹر گاڑی محل کی طرف بڑھ رہی تھی شام گہری ہو رہی تھی چھوٹے نواب جلال الدین پٹوڈی گہری سوچ میں ڈوبے دکھائی دیے تھے ڈرائیونگ سیٹ پر ان کے وفادار پرانے ملازم براجمان تھے۔

"چھوٹے نواب گستاخی معاف ہم اس قابل تو نہیں کہ آپ کو کوئی مشورہ دیں مگر ہم نے نواب خاندان کا نمک کھایا ہے اور ہم خاموش نہیں رہ سکتے۔" ملازم نے کہا تھا اور جلال نے سر ہلایا تھا۔

"کہیے ہم منتظر ہیں۔" جلال نے اجازت دی تھی اور ملازم گویا ہوا تھا۔

"چھوٹے نواب آپ کا مرزا سیف الدین سے الجھنا مناسب نہیں ان کی شہرت سے زمانہ واقف ہے کہنے کو وہ نواب صاحب کے اچھے اور پرانے دوستوں میں سے تھے مگر وہ فقط نام کے دوست تھے انہوں نے جو بھی کیا ہوا سو ہوا سمجھ کر نظر انداز کر دیجیے آپ نواب خاندان کے آخری چراغ ہیں آپ کے دم سے نواب خاندان کا نام جڑا ہے اس خاندان کے چراغ کو جلتا رہنے دیں سب جانتے ہیں آپ حق پر ہیں مگر وقت آنے پر آپ کے ہمراہ کوئی کھڑا نہیں ہوگا اور اگر کوئی آپ کو تکلیف پہنچتی ہے تو اس کا ازالہ ممکن نہیں ہوگا سو اس مقدمے کو واپس لے لیں تو بہتر ہوگا نواب صاحب اپنے اثر و رسوخ کے حساب سے ایک بلند پایہ شخصیت تھے مگر مرزا صاحب سے الجھنا انہوں نے بھی ضروری نہیں سمجھا، وہ چاہتے تو وہ بھی میدان میں اتر سکتے تھے اپنے خلاف کی گئی سازشوں کے خلاف مرزا صاحب کو منہ توڑ جواب دے سکتے تھے مگر انہوں نے اس متعلق ہمیشہ خاموشی اختیار کیے رکھی تو اس کا ضرور کوئی سبب رہا ہوگا۔" ڈرائیور ڈرائیونگ کرتے اور بولتے بولتے یکدم چونکا تھا۔ وہ مسلسل بریک پر پاؤں مارے جا رہا تھا اس کی آنکھوں سے خوف صاف ظاہر تھا اور چہرہ حواس باختہ تھا۔

"کیا ہوا غلام دین؟ گاڑی کی بریکس کو کیا ہوا؟" چھوٹے نواب نے پوچھا تھا ڈرائیور کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی صاف دکھائی دی تھیں۔

"چھوٹے نواب گاڑی کی بریکس کام نہیں کر رہیں یہ ضرور کوئی سازش ہے برائے کرم آپ دروازہ کھول کر کود جایئے، اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے ہم آپ کے وفادار ہیں آپ کو محفوظ دیکھنا چاہتے ہیں۔" آپ گاڑی سے نکل جایئے بریکوں کو کام نہ کرنا خطرے کا الارم ہے۔" ڈرائیور غلام دین نے کہا تھا چھوٹے نواب نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

❁......◈......❁

"تقسیم کا عمل سوائے تکلیف کے کچھ نہیں دیتا تیمور، جسم کا کوئی حصہ کاٹو تو سوائے درد کے کوئی احساس نہیں ابھرے گا۔" عین نے کہا تھا۔ تیمور ان کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"بٹوارہ شراکت کی بد ترین مثال ہے۔ بٹوارہ ظاہر کرتا ہے کہ شراکت میں سکون نہیں ہوتا ہمیشہ اختلاف رہتا ہے مگر یہ اختلاف بٹوارے کے بعد بھی نہیں جاتا بلکہ مزید بڑھتا جاتا ہے یہ اختلاف کبھی نہ ختم ہونے والا ایسا مسئلہ بن جاتا ہے جو اپنی شدت پسندی کے ساتھ پلتا رہتا ہے اور اکساتا رہتا ہے دیکھیں اس تقسیم سے کیا نتائج برآمد ہوئے کبھی کبھی سب بے معنی لگتا ہے مگر ایسا ہونا بھی ضروری تھا مگر اس دنیا کی اتنی بڑی ہجرت نے سوائے تکلیفیں کے کچھ نہیں دیا اور تکلیفوں بھی کیسی جن سے روح تک چھلنی ہو کر رہ گئی، ہر چہرہ ایک کہانی ہے اور ہر کہانی اپنے اندر درد کی انتہا رکھتی ہے اور اس تکلیف کا گویا کوئی ازالہ نہیں کر سکتا، زمین کے ٹکڑوں کو بانٹنا زمین کے لیے دردناک ہونا چاہیے پھر یہ انسانوں کی تکلیف کا باعث کیوں بنتا ہے؟" وہ مدہم لہجے میں بولی تھیں۔

"کیونکہ یہ تقسیم انسانوں کے باعث ہوئی۔"

"اور یہ کیسی تقسیم ہے کہ انسانوں نے انسانیت کو شرمندہ کر دیا؟" عین کرب سے بولی تھیں تیمور نے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

"آپ زیادہ مت سوچیں ورنہ آپ کی طبیعت پھر خراب ہو جائے گی۔" تیمور نے ان کا خیال کرتے ہوئے

کہا تھا۔
نواب زادی نے ان کی سمت دیکھے بنا جیسے کسی گہری سوچ میں کسی غیر منطقی خیال کو سوچا تھا اور مدہم لہجے میں بولی تھی۔
سوچیں قسمتی نہیں ہیں تیمور بہادر یار جنگ مگر سوچوں کا المیہ ہے کہ سوچنے سے کوئی معرکہ نہیں مارا جاسکتا ہم سب جو اس سفر سے ہو کر گزرے ہیں اس سفر کی تکلیف ہم سے بڑھ کر کوئی نہیں جان سکتا کوئی نہیں سمجھ سکتا فقط ہم جانتے ہیں مگر ان تکلیفوں میں اندیشے نہیں تھے یہ بات سوچنے والی تھی ہم بس پر جوش تھے ہم نے اس سے آگے نہیں سوچا تھا کہ نئے دیس میں جا کر کیا ہوگا کیسی زندگی ہوگی کیسی دنیا ہوگی مگر اس کیمپ میں آ کر ہم نے زندگی کی مزید سچائیاں بھی جان لی ہیں ہم جو ناز و نعم سے پلے بڑے تھے ہم نے سفر کی صعوبتوں کو جھیلا اور آج بے سرو سامان کھلے آسمان تلے بیٹھے ہیں سوچیں ایک عام انسان نے کیا کیا سیکھا ہوگا یہ سفر ایک سمت سے دوسری سمت نہیں بلکہ دنیا اور زندگی کے کئی معنی سمجھانے کا سفر تھا کچھ کھو کر جاننا اور سیکھنا کبھی بھولنے نہیں دیتا کہ کیا سیکھا وہ ایک گہرے کرب کے احساس سے بولی تھی تیمور اس کا دکھ جانتا تھا سو اس کے لہجے میں چھپے کرب کے اس احساس کو اس نے واضح محسوس کیا تھا۔
''عین زندگی کے تجربات بلا شبہ سکھانے کا عمل ہیں مگر یہی زندگی ہے ہم سب اسی عمل سے گزرتے ہیں لیکن واقعات اور صورت حال کی نوعیت مختلف ہوسکتی ہے مگر بہر حال ہم سب کسی نہ کسی تجرباتی عمل سے گزرتے ضرور ہیں کسی کی شدت زیادہ یا کم ہوسکتی ہے مگر یہ سیکھنے کا عمل بہر طور معنی رکھتا ہے مگر ان تجربات سے مثبت طور پر سیکھنا اور زندگی میں ایک خاص فکر عمل اختیار کرنا ہی زندگی ہے اچھے یا برے تجربات بہر حال زندگی کے رویوں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور ہمارا طرز عمل بھی اس کا مرہون منت ہے۔'' تیمور نے مثبت انداز فکر سے سمجھایا تھا وہ جھکتی آنکھوں کے ساتھ سر اثبات میں ہلانے لگی تھی۔
''مگر پھر بھی دل چاہتا ہے کہ ایک بار پلٹ کر دیکھوں، جہاں سے سفر اختیار کیا ہے وہاں کچھ تو باقی ہے ہماری باقیات وہی ہیں تیمور ہم اپنا وجود یہاں لے آئے ہیں مگر ہماری روح ہمارے اپنوں کے ساتھ وہیں رہ گئی ہے دل چاہتا ہے خود کو ڈھونڈنے کا یہ عمل اختیار کریں اور خود کو کھوج نکالیں ہمارا اپنا آپ ہم سے کھو گیا ہے تیمور سوچتے ہیں ہم نے یہاں آنے کا فیصلہ کیوں کیا، ہم نے ابا جان کی مانی کیا اچھا ہوتا ہم اس واقعے کے بعد وہیں رک جاتے جیسے جلال بھائی وہاں ہیں کتنا خوش کن احساس ہے کہ اس روئے زمین پر کوئی اپنا اب بھی باقی ہے ہم اڑ کر اپنے ماں جائے تک پہنچنا چاہتے ہیں ہمارے پیارے بھائی اللہ ان کو سلامت رکھیں کوئی گرم ہوا ان کو کبھی نہ چھوئے۔'' وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی تھیں جیسے وہ تصور کی آنکھ سے اپنے ماں جائے سے مخاطب تھیں تیمور ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

❀......✿......❀

جلال نے دروازہ کھول کر موٹر گاڑی سے نیچے چھلانگ لگائی تھی اور لڑھکتے ہوئے سڑک کے ایک طرف پہنچ گئے تھے اس عمل کے دوران انہوں نے اپنی موٹر کار کو ایک دھماکے سے تباہ ہوتے ہوئے دیکھا اور پھر ان کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئی تھیں۔

❀......✿......❀

''یا اللہ ہمارا دل بہت بے چین ہوا جا رہا ہے اللہ خیر کرے۔'' فتح النساء نے بے چینی سے ایک طرف سے دوسری طرف چکر کاٹا تھا انہوں نے فون اٹھا کر ان کے دفتر کا نمبر ملایا تھا مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا تھا اور تب وہ اور زیادہ پریشان ہو گئی تھیں۔
''ہم کیوں اس قدر بے چین ہوئے جا رہے ہیں جلال ٹھیک تو ہیں کیوں ان کا خیال آئے جا رہا ہے اور دل اختیار میں ہی نہیں لگ رہا ہم کیا کریں؟'' وہ پریشانی سے سوچنے لگی تھیں پھر حکمت چاچا کا خیال آیا تھا اور فتح النساء نے ان کے گھر کا نمبر ملایا تھا دوسری طرف حکمت چاچا تھے۔
''آداب چاچا جان۔''
''تسلیمات بیٹا خیریت آپ کی آواز سے لگ رہا ہے کہ آپ پریشان ہیں؟'' حکمت چاچا نے پوچھا تھا۔
''جی چاچا جان ہمیں جلال کے متعلق فکر ہو رہی ہے وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچے اور ہمارا دل دہلے جا رہا ہے آپ کی ملاقات آج جلال سے ہوئی تھی آج کب ملے تھے آپ

ان سے؟'' فتح النساء نے فکر سے پوچھا تھا۔
''جب وہ دفتر سے نکل رہے تھے تب ہی ان سے ملے تھے وہ خیریت سے تھے آپ بے فکر رہیں، ہم ہیں، ہم دیکھتے ہیں۔'' حکمت چاچا نے ڈھارس بندھائی تھی فتح النساء کا دل جوں کا توں پریشان رہا تھا۔
''چاچا جان، ہمیں نہیں لگتا جلال کا مرزا چاچا سے الجھنے کا فیصلہ کوئی قابل ستائش عمل تھا ہم نے ان کو منع کیا تھا مگر وہ سنتے ہی نہیں۔'' فتح النساء فکر مندی سے بولی تھیں۔
''آپ اس کے متعلق فکر مند نہ ہوں بیٹا ہم جلال بیٹے کے ساتھ ہیں اور رہی بات مرزا سراج الدولہ کی تو وہ جلال کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' حکمت چاچا بولے تھے۔
''اللہ کرے ایسا ہی ہو چاچا جان ہمیں تو جلال کی بہت فکر ہو رہی ہے ہمیں مرزا چاچا سے کچھ اچھی امید نہیں انہوں نے نواب چاچا کے ساتھ اتنا برا سلوک روا رکھا وہ جلال کا خیال کیا کریں گے جبکہ جلال ان کو اکسا بھی رہے ہیں سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنا ٹھیک نہیں۔'' فتح النساء اندیشوں اور ڈر کا شکار دکھائی دی تھیں۔
''آپ فون رکھیے ہم دیکھتے ہیں شاید وہ وکیل کی طرف گئے ہوں دو دن بعد مرزا صاحب کی پیشی بھی ہے اگر ان پر لگائے گئے الزامات کے ثبوت عدالت میں پیش ہوجاتے ہیں تو پھر مرزا صاحب کو گرفتار ہونے سے کوئی نہیں روک پائے گا تب نہ تو ان کی کانگریس کی حمایت کام آئے گی نہ کوئی اور بڑی سفارش اور ان کی بے عزتی جو ہوگی وہ الگ مرزا صاحب اتنا اشتعال میں اس باعث ہیں کہ ان کی سبکی ہو رہی ہے آج کے بچے نے ان کو گھیر لیا ہے اور الزامات بھی اپنی طرز کے انوکھے ہیں کسی بلوائی کے خلاف ایسا کوئی مقدمہ درج نہیں ہوا بلوائیوں کیخلاف پاکستان میں یا یہاں اب تک کسی نے کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی، اور جلال نے نواب صاحب کی طرف سے ہتک عزت کا دعویٰ تو کیا ہی ہے ساتھ ہی بلوائیوں کی طرف سے ہونے والے حملوں کو بھی مرزا صاحب سے جوڑ دیا ہے اب جلال کے لیے ان کے متعلق ثبوت ہیں کہ نہیں یا انہوں نے یہ الزام کس بنا پر لگایا یہ تو ابھی نہیں کھلا مگر ایسا کچھ ضرور ہے جس کی بنا پر جلال نے ایسا قدم اٹھایا ہے جلال ایک سمجھ بوجھ رکھنے والا انتہائی عقلمند نوجوان ہے سب اسی مدعے پر بات کر رہے ہیں کہ اگر جلال نے یہ نقطہ اٹھایا ہے تو ضرور ان کے پاس کوئی شواہدات ضرور ہیں اب پتا نہیں یہ درست ہے کہ نہیں مگر حلقوں میں اس مقدمے کو لے کر بہت چہ چا ہو رہا ہے اور ان الزامات کی بنا پر مرزا صاحب کو خاصی کڑی تنقید کا سامنا ہے اور مرزا صاحب سے یہ سبکی ہضم نہیں ہو رہی، کھسیانی بلی کھمبا نوچے والا معاملہ ہے بہر حال کئی آنکھیں ان پر لگی ہوئی ہیں اور اگر وہ جلال کے متعلق یا خلاف کوئی انتہائی قدم اٹھاتے ہیں تو وہ اس جال میں خود پھنسیں گے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ ایسا کوئی بچکانہ اقدام کرنا نہیں چاہیں گے۔'' حکمت چاچا نے فتح النساء کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی اور فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا مگر فتح النساء کے دل کو قرار نہیں ملا تھا۔

❁......◈......❁

عین نے اندراج کرانے والوں سے حیدر میاں کے متعلق باز پرس کی تھی کسی نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا تھا عملاً اندراج درج ہونے کی شرح بہت کم تھی عین تیمور کے ہمراہ حیدر میاں کو ڈھونڈتی رہی تھیں کیمپ میں ان کا کہیں پتا نہیں تھا۔
''ہم نہیں جانتے تیمور ہم حیدر کو کیوں ڈھونڈ رہے ہیں مگر شاید اس لیے کہ ابا جان ایسا چاہتے تھے ہم نے آج تک ابا جان کی ہر رضا کے سامنے سر جھکایا ہے ہم ان کی حکم عدولی کرنے کے قابل نہیں ہم نے ایسا کبھی نہیں کیا اور اب تو یوں بھی ہم ان کے کسی حکم سے انحراف نہیں کر سکتے ان کی روح کو تکلیف دینا سوہان روح ہوگا، ہم ان کی زندگی میں ایک وفادار اولاد رہے ہیں سو اب کس طور ان کی حکم عدولی کر سکتے ہیں۔'' عین النور کے کہنے پر تیمور نے ان کو بغور دیکھا تھا۔
''آپ کو ان سے محبت نہیں رہی؟'' وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ عین ان کی طرف سے نگاہ پھیر گئی تھی ان کی خاموشی تیمور کو جیسے الجھانے لگی تھی اور تبھی عین النور بولی تھیں۔
''محبت کیا ہے تیمور؟'' عین نے مدہم لہجے میں پوچھا تھا۔
تیمور نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔
''ہم نہیں جانتے نواب زادی۔'' اس نے پس و پیش سے کام لیا تھا عین نے خاموشی سے تیمور کو دیکھا تھا اور نگاہ

پھیر کر چلنے لگی تھیں تیموران کے ہمراہ چلنے لگا تھا۔
''آپ لوٹ جائیں گے؟'' عین نے غیر متوقع سوال کیا تھا تیمور نے سر ہلایا تھا۔
''ابا اماں وہاں ہیں ہم کو لوٹنا ہوگا ہم ان کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔'' تیمور نے کہا تھا اور نواب زادی کی آنکھوں میں جانے کیوں بے چینی پھیلنے لگی تھی ان کا مدہم لہجہ ابھرا تھا۔
''ہمیں جلال بھائی کی بہت یاد آ رہی ہے تیمور، ہمیں نہیں لگتا ہم ان کے بنا رہ سکیں گے ہمارا دل بہت بے چین ہو رہا ہے اللہ خیر کرے وہ خیریت سے ہوں مگر ہم ان سے دور آ کر بہت افسردہ ہیں وہ ہمارا باقی بچ جانے والا واحد خون کا رشتہ ہیں ہمیں ان کے قریب ہونا چاہیے تھا ہمیں حیرت ہو رہی ہے ہم نے جلال بھائی کے متعلق کیسے نہیں سوچا ہمیں ابا جان کو انکار کر دینا چاہیے تھا اس زمین پر آ کر احساس ہوا ہے کہ ہم اپنے آپ سے بچھڑ کر یہاں پہنچے ہیں۔'' عین النور بے چین دکھائی دی تھیں۔
''اب کیا چاہتی ہیں آپ نواب چاچا کی ہدایت کے مطابق ہمیں حیدر میاں کے ہاتھ میں آپ کا ہاتھ دینا ہے۔'' وہ عہد نبھانے میں جیسے باقی کچھ نہیں سوچ رہا تھا حتیٰ کہ وہ اپنے دل کی بھی نفی کر رہا تھا وہ عین النور کا چہرہ پڑھنا چاہتا تھا مگر اس چہرے پر کچھ زیادہ درج نہ تھا وہ آہستگی سے سر انکار میں ہلا رہی تھیں۔
''ہم نہیں جانتے تیمور مگر ہم اپنے اکلوتے بھائی کو کھونا نہیں چاہتے زندگی کتنی باقی ہے ہم نہیں جانتے مگر ہم رشتوں کے بنا رہنے اور جینے کے عادی نہیں ہیں ہم سوچ کر ہی پریشان ہیں کہ ہم اپنے ماں جائے سے دور کیسے رہیں گے آپ پوچھ رہے تھے محبت کے متعلق محبت یہ ہے تیمور جب ہمارا دل میلوں کے فاصلے پر رہ کر ہی ہمارے بھائی سے بندھا ہے اس رشتے کا احساس ہماری روح کو جیسے کھینچ رہا ہے یہ احساس محبت ہے ہمارا دل اماں ابا جان اور دادی جان کا سوچ کر تڑپتا ہے یہ احساس محبت ہے اور محبت کے سوا کچھ نہیں ہمارا دل خون روتا ہے۔ ہماری جان سلگتی ہے ہم چین نہیں پاتے یہی احساس محبت ہے ہماری محبت ہماری ترجیحات کا تعین کرتی ہے اور محبت بتاتی ہے کہ کون سی محبت زیادہ ہے محبت کئی حصوں میں بٹ جاتی ہے کئی رنگوں میں منتشر ہو جاتی ہے اور اس کے گہرے ہوتے رنگ وجود کا احاطہ کرنے لگتے ہیں۔'' وہ مدہم لہجے میں کہہ رہی تھیں تیموران کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

❀......✺......❀

خوشنما نے زینے پر قدم رکھ کر اوپر کی سمت بڑھنے کو قدم اٹھایا تھا جب ایک دلخراش آواز نے قدم روک دیے تھے خوشنما نے پلٹ کر دیکھا تھا بلوائیوں نے مقابلہ کرتے بہادری سے لڑتے اس مضبوط اور بہادر نوجوان کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا تھا۔
خوشنما ساکت رہ گئی تھی اس دلخراش منظر نے جیسے اس کے قدموں کو جکڑ دیا تھا۔
خوشنما ساکت رہ گئی تھی اس دلخراش منظر نے جیسے اس کے قدموں کو جکڑ دیا تھا اس کی پتھرائی آنکھوں نے حمزہ کی تن سے جدا کی گئی گردن کو دیکھا تھا اس کی نظریں تحیر سے کھل گئی تھیں اور اس کا جسم سر سے جدا ہو کر بے جان ایک طرف پڑا تھا زمین کا بڑا حصہ خون سے رنگنے لگا تھا جس کرپان سے اس کے تن کو داغا گیا تھا وہ اس کے تن میں اب بھی پیوست تھا جس تلوار سے اس کا سر تن سے جدا کیا گیا تھا وہ خون سے لتھڑی ہوئی تھی اور بلوائی کا چہرہ سرخرو دکھائی دے رہا تھا۔
خوشنما نے اس سے زیادہ دلخراش منظر اپنی اب تک کی زندگی میں نہیں دیکھا تھا ان کے قدم زمین سے جم گئے تھے بلوائیوں نے ان کی سمت دیکھا تھا اور مسکرائے تھے ان کی ہوس بھری آنکھیں انہیں نظروں ہی نظروں میں ناپنے تولنے لگی تھیں۔
''ہاجرہ میری بچی۔'' خالہ کی چیخنے کی آواز آئی تھی خوشنما نے پتھرائی نظروں سے بلوائیوں کے عقب میں دیکھا تھا خالہ کا لرزتا ہوا وجود استادہ تھا وہ ان کی عقب سے نکل کر سامنے آئی تھیں۔
''بھاگ میری بچی ہاجرہ بھاگ۔'' مگر خوشنما کے قدم زمین سے بندھ گئے تھے۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

بے وفا مرد

محمد شعیب

دھرتی ماں کے لیے سگے رشتوں خونی رشتوں سے بے وفائی
کرنے والوں کا فسانہ، کیا وطن پر قربان ہو جانا بے وفائی ہے۔

ان لوگوں کا احوال، جو زمانے میں بے وفا مشہور ہیں

گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہ اپنا سامان تیزی سے ایک بیگ میں ڈال رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے چند ساتھ اور تھے جو مخجل اپنا کام سرانجام دے رہے تھے۔ روشنی برائے نام تھی جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی کے تنکوں سے چھن چھن کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ اسی روشنی میں رخت سفر باندھنے میں مصروف تھے۔ رات کی سیاہی میں سب کے چہرے سیاہ تھے ایسے جیسے کسی نے سیاہ کوئلوں پر سیاہ چادر اوڑھا دی ہو۔

''ہمارے پاس وقت بہت کم ہے جلدی سامان سمیٹو۔'' ایک گمبھیر آواز اس جھونپڑی میں گونجی تھی۔ پانچ راتیں مسلسل جاگنے کے بعد آج کی رات آرام کے لئے میسر آئی تھی مگر خدا کی قدرت...... آج بھی سکون قسمت میں نہ تھا۔ فقط چند لمحے ہی نیند مہربان ہوئی ہوگی کہ گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ دور کہیں آگ کے بھڑکتے شعلے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ جو اس ظلمت سے بھرپور رات میں روشنی کا سامان پیدا کئے ہوئے تھے۔

''شرجیل! ہم تیار ہیں۔'' یہ بائیس سالہ نوجوان تھا۔ قد پانچ فٹ نو انچ۔ رنگ گندمی جو تاریکی میں کافی سیاہ لگ رہا تھا اور پھر پہاڑی علاقے کی سیاہ مٹی نے رنگ مزید سیاہ کر دیا۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ مزید سیاہی میں نہا گیا۔ ثاقب نے اثبات میں سر ہلایا اور باقیوں کی طرف دیکھا۔ سب اپنا اپنا سامان پیک کر چکے تھے۔ سامان تھا ہی کیا؟ فقط ایک چادر، پانی کا پیالہ، بندوق اور گولیاں......!!

''ساجد...... تم ایسا کرو یہ سارا سامان دوسری چھاؤنی لے کر جاؤ، ہم سب اس علاقے کو کلیئر کروانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہاں یاد رہے اس سامان میں جو میپ (نقشہ) ہے وہ کسی بھی قیمت پر خود سے جدا نہیں کرنا۔'' ثاقب نے ہدایات جاری کی تھیں۔ ساجد نے لمحہ ضائع کئے بغیر سب ساتھیوں سے سامان لیا اور اس میپ کو اپنی شرٹ کے اندر اس طرح رکھا کہ سینے سے جا لگا۔ اب وہاں تین ساتھی باقی بچے تھے۔

''چلو میرے ساتھ......'' ساجد کے نکلتے ہی ثاقب باقی دونوں ساتھیوں کو لے کر نکلا اور اس آگ کی طرف دوڑا۔ جہاں سے آگ کے فلک بوس شعلے بلند ہو رہے تھے۔ تینوں کے پاس ایک ایک بندوق کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

......❀❀❀......

''تم نے کبھی ہماری پروا بھی کی ہے؟ جب دیکھو موبائل میں بیٹھ کر کسی نہ کسی مجرم کے پیچھے بھاگتے رہو گے۔ اوپر سے احکام جاری ہوتے ہیں تو تم انہیں منع بھی تو کر سکتے ہو۔'' ہمیشہ کی طرح آج بھی عشنا راحیل کے دیر سے آنے پر برہم ہوئی تھی۔ اٹھارہ گھنٹوں کی تھکا دینے والی ڈیوٹی کے بعد گھر میں قدم رکھا تو بیوی کے طعنوں کو اپنا منتظر پایا۔ وہ انگڑائی لیتا ہوا صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھا تو عشنا کو جیسے آگ لگ گئی۔

''ہاں...... ہاں، اب تو میری باتیں بھی سننا گوارہ نہیں ہے تمہیں تو۔ تمہاری بلا سے ہم مریں یا جئیں تمہیں کیا پروا؟'' گردن جھٹک کر اس نے آخری حربہ استعمال کیا تھا۔

''تمہیں کتنی بار کہا کہ یہ مرنے مارنے کی باتیں نہ کیا

کرو۔ منے اور تم میں تو میری جان بستی ہے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح اس کے جملے برداشت نہ کر سکا تھا۔

''بس ...... بس...... اب زیادہ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ مرد ذات ہوتے ہی بے وفا ہیں۔ انہیں نہ گھر کی پروا ہوتی ہے اور نہ گھر میں رہنے والے کی۔ ایک میں ہی پاگل ہوں جو تمہارے انتظار میں رات رات بھر دروازے کو تکتی رہتی ہوں مگر تمہیں اس سے کیا......!! تم تو ٹھہرے اپنی نوکری کے دیوانے'' وہ منہ بسور کر سالن گرم کر رہی تھی۔ جملے کسنا تو اپنا فرض سمجھا تھا۔ راحیل بھی خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جو اس کے غصے کو ہوا دینے کے مترادف تھا۔

''اب گونگے بنے رہو تم۔ پلٹ کر دو بول محبت کے نہ بولنا۔'' پانی کا گلاس چارپائی پر جھٹکے سے رکھا تھا۔

''مجھ سے یہ اوٹ پٹانگ باتیں نہیں ہوتیں۔ سمجھی اور جہاں تک نوکری کی بات ہے وہ بھی تمہارے لئے ہی کرتا ہوں۔ اگر نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا تو اپنے میکے سے کھانا لا کر کھاؤ گی؟'' مختل جواب دیا تھا۔

''تو میں یہ تو نہیں کہتی کہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے گھر کی شکل ہی نہ دیکھو۔ جاؤ...... کماؤ...... مگر گھر کی بھی خیر خبر لو......'' وہ اب کھانا کھا رہا تھا جبکہ وہ شکوہ کناں لہجے میں اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ ابھی اس نے پیٹ بھر کر روٹی بھی نہ کھائی ہوگی کہ اس کے فون کی رنگ ہوئی۔

''ہیلو......'' فون ریسیو کیا تو دوبارہ ڈیوٹی پر آنے کا حکم دیا گیا۔ ایک ایمرجنسی تھی اور تمام فورس کا حاضر ہونا ضروری تھا۔

''او کے سر...... میں آتا ہوں'' وہ یہ کہتے ہی کھڑا ہوا تو عشنا کا منہ اس وقت غصے میں لال پیلا ہو چکا تھا مگر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''بس اب پھر چل دیئے اٹھارہ بیس گھنٹوں کے لئے۔ میری مانو تو وہیں ڈیرہ جمالو اپنا۔ گھر کی شکل دیکھنے کبھی کبھار آجایا کرنا۔'' وہ پیچھے سے جملے کستی رہی مگر وہ خاموشی سے چل دیا۔ صبح سے کھانا کھانا بھی اسے نصیب نہ ہوا تھا۔ ایک روٹی چنگیری میں دی تھی جس میں آدمی روٹی ابھی تک ویسی کی ویسی تھی۔

''بے وفا...... کوئی خیال ہی نہیں بیوی بچے کا۔'' لہجہ گلوگیر تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔

''ڈیوٹی اتنی اہم ہوگئی کہ پیٹ بھر کر کھا بھی نہیں سکتے۔'' وہ خفگی کے ساتھ اب کھانا سمیٹ رہی تھی۔

''جانے کب کا کھانا کھایا ہوگا اور اب بھی پیٹ بھر کر نہ کھا سکے۔ مجھ سے نہ سہی اپنی جان کے ساتھ تو وفا کرنا سیکھ لو'' لہجے میں فکر نمایاں تھی۔ آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے مگر دل میں ایک ہی شکوہ تھا۔ مرد اپنی بیویوں سے اس قدر بے وفا کیوں ہوتے ہیں؟ اسے گزرے لمحے یاد آنے لگے جب وہ اکثر راحیل سے کہیں جانے کی فرمائش کرتی مگر وہ ڈیوٹی کی وجہ سے انکار کر دیتا۔ شادی کی پہلی رات بھی اسے اچانک سے کسی ریڈ پر جانا پڑا۔ ولیمہ بھی اسی وجہ سے تاخیر کا شکار ہوا تھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا انبار جمع ہو چکا تھا مگر دل سے شکوے ختم نہ ہوئے تھے۔

......❁❁❁......

یہ دہشت گردوں کا حملہ تھا۔ جس نے معصوم لوگوں کو نشانہ بنایا تھا۔ اس وادی میں پچاس کے قریب گھرانے آباد تھے مگر ایک دھماکے نے انہیں ملیا میٹ کر دیا۔ ہر طرف سے آہ و بکا سنائی دے رہی تھی۔ ثاقب اور اس کے دو ساتھی وہاں پہنچے تو ہر طرف زخمی مدد کے لئے پکار رہے تھے۔

''اوہ مائے گاڈ ...... کتنی تباہی ہوگئی ہے یہاں۔'' شرجیل کے لہجے میں آزار نمایاں تھے۔ کل شب ہی آرمی نے یہ علاقہ کلیئر کروایا تھا۔ جس بنا پر تقریباً ساری نفری وہاں سے ہٹالی گئی تھی۔ صرف یہ چار جوانوں کا دستہ تھا۔ جسے ایک روز بعد وہاں سے جانا تھا۔ ایسا اس لئے کیا گیا کیونکہ نفری کی دوسرے شہر ضرورت تھی جہاں دہشت گردوں نے خوف و ہراس پھیلایا ہوا تھا۔ جوانوں کے کندھوں پر ذمہ داریوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا مگر مجال ہے جوان کی پیشانی پر شکن بھی ابھری ہو۔ پانچ راتوں کی نیند قربان کرنے کے بعد بھی ان کے چہرے شاداب تھے اور مدد کے لئے بالکل تیار۔ ثاقب نے شرجیل اور اویس کو زخمیوں کی مدد کرنے کا کہا اور خود ان دہشت گردوں کا سراغ ڈھونڈنے کے لئے پہاڑی کے دامن کی طرف بڑھا۔ جہاں ایک غار دکھائی دے رہا تھا۔ شاید کسی دہشت گرد نے وہاں پناہ لے رکھی تھی۔

لاشوں کے ڈھیر سے گزرتا ہوا وہ ناک کی سیدھ میں آگے بڑھ رہا تھا۔ مٹی رنگ کی ٹی شرٹ جو جسم کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ پسینے سے شرابور دکھائی دے رہی تھی۔ آگ کے شعلے مسلسل بلند ہو رہے تھے۔

''اللہ...... کتنی تباہی ہو چکی ہے۔ میرا تم سے وعدہ ہے لوگو۔ جب تک تمہارے خون کا بدلہ نہیں لے لیتا مجھ پر پانی پینا بھی حرام ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے عہد لیا تھا۔ بستی کو اپنے عقب میں جلتا چھوڑ کر وہ اب اس غار کی طرف بڑھا تو گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی یعنی شک حقیقت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ حملہ آور نے اسی غار کا سہارا لیا تھا۔ اس نے قلابازی کھاتے ہوئے اپنی جان بچائی اور ایک پتھر کی اوٹ میں کچھ دیر کے لئے پناہ لی۔ اس کا سانس بری طرح اکھڑا ہوا تھا۔ رات کا منظر اور گولیوں کی بوچھاڑ جان کو ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھنے کے مترادف تھا۔

''نہیں...... میں یہاں نہیں رک سکتا۔ مجھے آگے بڑھنا ہے۔ اپنے معصوم بھائیوں کے خون کا بدلہ لینا ہے۔'' یہ سوچتے ہی اس نے بائیں جانب کو پلٹا کھایا اور خم دار جھاڑیاں اس کے جسم سے مس ہو رہی تھیں۔ ایک طرف گولیوں کی بوچھاڑ تھی تو دوسری طرف خم دار جھاڑیاں۔ اس نے انہی جھاڑیوں کا سہارا لیا اور کہنیوں بل گھسیٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پانچ منٹ کا فاصلہ اب گھسیٹ کر طے کرنا آسان نہ تھا۔ رات کا اندھیرا جہاں راستے کو اجنبی بنا رہا تھا وہیں راہ میں پڑے کانٹوں کو بھی آنکھوں سے اوجھل کیئے ہوئے تھے۔ وہ آگے بڑھنے کے لئے کہنیاں زمین پر رکھتا تو کانٹے اس کے جسم میں اترنے لگے۔ درد کی ٹیسیں ابھرتی مگر لبوں پر تو جیسے ہلنا بھی حرام تھا۔ چوں کہ آواز بھی اس کی جان لے سکتی تھی۔ مگر آنسوؤں پر کسی کا کیا ضبط؟ جب ایک بڑا سا کانٹا کہنی کے اندر تک اتر گیا تو ابر نیساں موتی

برسانے لگا۔ درد کی شدید لہر جسم میں سرایت کرگئی تھی مگر وہ ڈٹا رہا اور آگے منزل کی طرف دیکھا۔ پیچھے پلٹا تو معصوم لوگوں کی فریاد سنائی دی۔

''ہم کس جرم میں مارے گئے؟''

''کون سا گناہ ہم سے سرزد ہوا تھا کہ ہمارے بچوں پر بھی رحم نہ کھایا گیا اور خون کے پانی سے انہیں غسل دے دیا گیا؟''

''آخر کون سی خطا ہم نے کی تھی کہ ہمارے گھروں کو قبرستان بنا دیا گیا؟'' معصوم مگر درد سے بھری فریادیں اسے سنائی دے رہی تھیں، حوصلہ ایک بار پھر پروان چڑھا۔ وہ آگے بڑھا اور غار کے عقبی حصے میں جا پہنچا۔ جہاں سے اگلے حصے کی طرف جانا اب اگلا ٹاسک تھا تاکہ جو زندہ لوگ بچے ہیں ان کو بے موت مرنے سے بچایا جا سکے۔

❀❀❀

کندھے تھک کر ہلکان ہو چکے تھے مگر لاشوں کے ڈھیر ختم نہ ہوئے تھے۔ وائرلیس پیغام اگرچہ چوکی تک پہنچا دیا گیا تھا مگر جوانوں کے آنے میں تاخیر ہو سکتی تھی کیونکہ اگلے محاذ پر معرکہ جاری تھا۔ دہشت گردوں نے پوری پلاننگ کے ساتھ شہر شہر حملہ کیا تھا۔ کیا جنگل؟ کیا صحرا؟ ہر جگہ خون کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ کہیں کسی معصوم شہری کا خون بہہ رہا تھا تو کہیں وطن کی خاطر اپنی جان قربان کرتے جوان اپنا لہو بہا رہے تھے۔ کہیں وطن کے دشمن جہنم رسید ہو رہے تھے تو کہیں شہید اپنے خون سے وطن کی مٹی کو سیراب کر رہے تھے۔ جو علاقے محفوظ تھے ان کے پیچھے بھی انہی شہیدوں کا لہو تھا کہ دوسرے آرام کی نیند سو رہے تھے۔

''ساجد کو واپس نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو ہماری مدد کرتا۔'' اویس رکوع کی سی حالت میں جھکا تھا۔ پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ گرتی جا رہی تھیں۔ وہ زخمیوں کو آرمی کیمپ میں کندھوں پر اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ جہاں خدا کے حکم سے ایک ڈاکٹر پہلے سے موجود تھا۔ وہ بھی بس وہاں سے جانے ہی لگا تھا مگر یہ دھماکہ ہو گیا اور اس نے جانا منسوخ کر دیا اور خدمت خلق میں جت گیا۔

''ساجد کا جانا ضروری تھا۔ تم جانتے ہو اس کے پاس میپ ہے۔ جو آرمی کے خفیہ رازوں کو پنہاں کیے ہوئے

ہے۔ اگر غلطی سے بھی کسی دشمن کے ہاتھ لگ جاتا تو کتنا بڑا نقصان ہوسکتا تھا اور جہاں تک ان زخمیوں کا سوال ہے۔ تو ہمارے کندھے ابھی زندہ ہیں۔ جب تک سانس میں سانس ہے۔ ہمیں ان کی مدد کرنا ہوگی۔ آخر یہی تو ہمارا فرض ہے'' شرجیل نے اویس کی ہمت باندھی تھی۔ اسے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ آخر اس مٹی کا قرض بھی تو چکانا تھا۔ سپاہی چاہے میدان میں اکیلا ہی کیوں نہ رہ جائے۔ آخری دم تک ہمت نہیں ہارتا اور یہاں تو بات وفا کی تھی۔ جس دیس میں خوشی کے لمحے جیے۔ آج جب اس نے قربانی مانگی تو وہ کیونکر پیچھے ہٹ سکتے تھے؟ وفا کا بدلا وفا ہوتا ہے اور ملک کے جوان کبھی بے وفا نہیں ہوتے۔

''اویس ......!!'' وہ زخمی کو اٹھا رہا تھا جب ایک گولی اس کی ٹانگ میں آکر لگی تھی۔ وہ فوراً زمین پر آگرا۔ شرجیل نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنا چاہی مگر اس نے وہیں روک دیا۔ پاس ہی زخموں سے چور ایک بچے نے پانی مانگا۔ شرجیل چکرا کر رہ گیا۔ ایک طرف اس کا ساتھی تھا تو دوسری طرف معصوم سا بچہ۔

''بچے کو پانی پلاؤ'' اویس نے ہکلاتے ہوئے کہا تو شرجیل بھی آنسوؤں کو پیتے ہوئے پلٹا اور بچے کو گود میں اٹھا کر کیمپ کی طرف بڑھا۔ اویس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر درد کی ٹیسیں مسلسل اٹھ رہی تھیں۔ اس نے ٹی شرٹ پھاڑ کر ٹانگ پر باندھی تاکہ زہر جسم میں نہ پھیل سکے مگر آنسو مسلسل بہتے جا رہے تھے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور ایک بار پھر فرض کو پورا کرنے لگا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے مگر حوصلے جوان تھے۔ وہ دائیں جانب مڑا۔ وہاں ایک عورت اپنے معصوم سے بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اس کا پورا خاندان اس دنیا سے رخصت ہوچکا تھا۔

''بہن ...... یہاں رکنا آپ کا مناسب نہیں ......آپ کو کیمپ چلے جانا چاہیے'' اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ چکرا کر رہ گیا۔ آنسوؤں کے انبار میں بھوری آنکھیں جانے کون سا غم سمیٹے ہوئے تھیں۔ یہ بھوری آنکھیں اس کو کسی اپنے کی یاد دلا رہی تھیں۔

''تم بہت بے وفا ہو اویس...... بہت بے وفا...... تمہارے باپ نے بھی گھر سے بے رخی اختیار کئے رکھی اور اب تم بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہو۔ نہ تمہاری ماں کو اپنے شوہر کا ساتھ نصیب ہوا اور نہ ہی مجھے تمہارا...... تمہیں جانا ہے ناں ڈیوٹی پر تو جاؤ...... رہ لیں گے میں اور امی اکیلے۔ آگے بھی تو اکیلے ہی رہتے آئے ہیں۔ جاؤ......'' چمکتی بھوری آنکھیں شکوہ کناں لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ اس کے قدم لڑکھڑا ضرور تھے مگر وہ رکا نہیں۔ فرض کو اپنے پورا کرنے اس نے بیوی کی ناراضگی مول لی تھی۔ بیوی کی نظر میں لاکھ بے وفا سہی مگر وطن کے لئے وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس معصوم سے بچے کو چھوا تو سانسیں ابھی باقی تھیں۔ شاید دھویں کے سبب بیہوش ہوچکا تھا۔ اس نے اس خاتون کو حوصلہ دیا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کیمپ کی طرف بڑھا۔

''میرا بچہ ٹھیک تو ہوجائے گا ناں ......!!'' گلوگیر لہجہ اپنے بچے کے لئے بے تاب تھا۔

''اللہ نے چاہا تو اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' کیمپ میں وہ بچہ ڈاکٹر کے حوالے کرنے کے بعد وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ پلٹا تھا۔ ڈاکٹر کی نگاہیں بے ساختہ خون سے لت پت ٹانگ کی طرف گئی۔

''اویس...... تمہاری ٹانگ سے تو خون بہہ رہا ہے۔ میرے خیال سے تمہیں گولی لگی ہے۔ تمہیں علاج کی سخت ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں فکر تھی۔ عورت کی نگاہیں بھی اب اس خون میں لت پت جوان کی ٹانگ کی طرف گئی تھی۔

''نہیں ڈاکٹر...... گولی صرف چھو کر گزری ہے اور پھر اس بچے کو زیادہ علاج کی ضرورت ہے۔ میرے لوگوں کو میری ضرورت ہے'' یہ کہہ کر وہ پلٹا۔ ڈاکٹر نے بھی وقت ضائع کئے بغیر اس بچے کی جان کو اہمیت دی۔

''کتنا وفا شعار تھا یہ اپنے ہم وطنوں کے لئے ......!!'' اپنے بچے کے لئے تڑپتی ماں کی زبان سے جاری ہوا تھا۔

''بہن ...... یہ اکیلا ہی نہیں ...... ہر سپاہی اپنے وطن کے لئے باوفا ہوتا مگر اس وفا کی قیمت اسے بہت بڑی چکانی پڑتی ہے۔'' ڈاکٹر نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ وہ عورت ایک پل کے لئے سوچ میں پڑ گئی۔

''ایسی کون سی قیمت چکاتے ہیں یہ جوان؟'' اس نے دل میں سوچا تھا۔ پلٹ کر باہر دیکھا تو اویس باقی زخمیوں کی

مدد کرتا نظر آرہا تھا۔

❀❀❀

ساجد جلد سے جلد چھاؤنی پہنچ کر وہ میپ کمانڈر کے حوالے کرنا چاہتا تھا تاکہ واپس آکر اپنے ساتھیوں کی مدد کرسکے۔ اسے اندازہ تھا کہ صورت حال کافی نازک ہے۔ زخمی مدد کے لئے پکار رہے ہیں اور اس کے تین ساتھیوں کو نہ صرف ان کی مدد کرنی تھی بلکہ اس دہشت گرد کو بھی ختم کرنا تھا جو ان پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا جنگل کے عین وسط تک پہنچ چکا تھا۔ اندھیرے میں اونچے نیچے راستے پر جہاں آرام سے چلنا بھی محال ہوتا ہے وہاں یہ بھاگ رہا تھا۔ ایسے جیسے کوئی ہموار راستے پر دن کی روشنی میں بھاگ رہا ہو اور ایسا صرف اس لئے تھا کہ اس کے دل میں اپنے ساتھیوں کا درد تھا۔ راستے میں وہ کئی بار گرا مگر ہر بار ایک نئے ولولے کے ساتھ کھڑا ہوا۔ وائرلیس کے ذریعے حالات کے بارے میں آگاہ کرتا جارہا تھا۔ یکدم اس کی ٹھوکر ایک بڑے سے پتھر سے ہوئی اور وائرلیس پتھر کے عقب میں بہتے پانی میں جاگرا۔ اس نے کچھ دیر ڈھونڈا پر وہ نہ ملا۔

''مجھے آگے بڑھنا چاہئے۔'' اس نے سوچا اور آگے بڑھنے لگا۔ یکدم اس کے سامنے دشمن کا ایک آدمی آکھڑا ہوا۔

''نقشہ ہمارے حوالے کردو'' وہ بری طرح چونکا۔ پلٹنا چاہا تو پیچھے بھی ایک آدمی کھڑا تھا۔ جس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک مکا اس کی ناک پر رسید کردیا۔ اس کی نکسیر پھوٹ گئی۔ خون کا ایک فوارہ چہرے پر بہنے لگا مگر وہ دوبارہ جواں مردی سے اٹھا اور ان کا مقابلہ کرنے کے لئے رائفل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ایسا سوچنا بھی مت'' اس کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی اس کی کنپٹی پر بندوق رکھ دی گئی۔ ہاتھ ہوا میں معلق رہ گئے۔

''تمہارے پاس صرف دو راستے ہیں کہ ایک تم اپنی زندگی میں وہ نقشہ ہمارے حوالے کردو اور دوسرا ہم تمہیں مار کر وہ نقشہ حاصل کرلیں گے۔''

اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ سوجھ بوجھ کی صلاحیت ذرا سی دیر کو مفلوج ہوئی مگر اس نے گردن نہ جھکائی اور نقشہ

دینے پر راضی نہ ہوا۔ جس پر ان کا چہرہ غصے میں لال ہوتا دکھائی دیا۔
''یہ ایسے نہیں مانے گا...... بڑے ہی ڈھیٹ ہوتے ہیں فوج کے مرد......!!'' یہ کہتے ہی ان میں سے ایک نے اس کے پیٹ پر زبردست لات ماری تھی۔ درد سے وہ جھکتا چلا گیا۔
''اسے ڈھیٹ پن نہیں وفا کہتے ہیں مگر تم جیسے درندے کیا جانیں وفا کیا ہوتی ہے'' منہ سے خون کا فوارہ پھوٹا مگر اپنے ہم منصب بھائیوں کے خلاف ایک لفظ بھی برداشت نہ کیا۔
''وفادار ہو...... دیکھتے ہیں کہاں تک وفا نبھاؤ گے؟'' یہ کہتے ہی انہوں نے لاتوں اور گھونسوں کی برسات کر دی تاکہ اذیت کے ڈر سے وہ خود نقشہ ان کے حوالے کر دے مگر وہ شاید یہ بھول چکے تھے۔ فوج کے جوان جو کام کرنے کے لئے ایک بار ٹھان لیں تو کر کے ہی گزرتے ہیں اور یہاں تو معاملہ ہی ملک کا تھا۔ ملک کے اہم رازوں کا۔ پھر بھلا وہ کیسے غداری کر سکتا تھا؟ کیسے اپنے ملک سے بے وفائی کر سکتا تھا؟ رشتوں میں لاکھ بے وفائی کا ٹیگ اپنے سر پر لگوانے والا مرد ملک کے لئے انتہا کے باوفا ہوتے ہیں۔ یہ مرد کی وفا ہی تو ہے جس کے بھروسے پورا ملک رات کو سکون کی نیند سوتا ہے۔ یہ مرد کی وفا ہی تو ہے جو سیلابوں اور قدرتی آفات میں اپنے آپ کو پرسکون علاقوں سے تباہ حال بستیوں کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ مرد کی وفا ہی تو ہے جو نرم گرم بستر کو چھوڑ کر سرد راتوں میں ہاتھوں میں بندوق تھامے پہاڑیوں پر گشت کرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ مرد کی وفا ہی تو ہے ہنگامی حالات میں سب کو یکجا کرتی ہے۔ ہاں محبت میں اسے اکثر بے وفا ضرور کہا جاتا ہے مگر وہ بھی مجازی محبت میں۔ اگر یہی محبت ملک کی ہو تو ایسی وفا کا ثبوت دیتے ہیں کہ ایک منٹ میں اپنے دشمن کی کمر توڑ کر رکھ دیں۔
''اب بتا نقشہ کہاں ہے؟'' مار مار کر انہوں نے ساجد کو لہولہان کر دیا تھا مگر مجال ہے اس بے وفا مرد نے ملک کے ساتھ بے وفائی کی ہو۔ آنکھوں کے آگے گھر سے رخصت ہونے کا منظر تھا۔ خوشیوں کے گیت سے پورا محلہ کھل اٹھا تھا۔ اُس دن ساجد کی منگنی تھی۔ اس کی مستقبل کی شریک حیات اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ گھر والے بھی سامنے تھے۔ انگوٹھی پہنانا ابھی باقی تھا کہ کمانڈر کی طرف سے فوری طور پر ڈیوٹی جوائن کرنے کا حکم نامہ ملا۔ انگوٹھی پہنانے والے ہاتھ اب وہاں سے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہونے والے ساجن کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب آنکھیں بنا کسی بندھن بندھے آنسو برسا رہی تھیں۔ گھر والوں نے روکا کہ آج رات رک جائے۔ منگنی کر کے صبح چلے جانا۔ مہمان کیا کہیں گے؟ مگر وہ نہ رکا۔ مہمانوں سے پہلے میزبان رخصت ہونے جا رہا تھا۔ چوکھٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا تو بہتی آنکھوں کو شکوہ کرتے ہوئے پایا۔
''تم کتنے بے وفا ہو۔ شادی سے پہلے ہی بیچ راہ میں چھوڑ کر جا رہے ہو......!!'' شاید اُس وقت وہ ان فریادی آنکھوں کو نہ پڑھ سکا تھا مگر اب پڑھ بھی چکا تھا اور سمجھ بھی چکا تھا۔ پیچھے سے حملہ ہوا۔ کسی بھاری چیز سے اس کے سر پر وار کیا گیا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل آ بیٹھا۔ لبوں پر زندگی کی آخری کسک ابھری تھی۔ منہ سے خون کی ندیا جاری تھی۔
''آخر بار پوچھ رہے ہیں۔ کہاں ہے نقشہ؟'' کرخت لہجہ سامنے سے گویا ہوا تھا مگر یہ بے وفا مرد مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ یکا یک گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور اس کا سینہ چھلنی ہو گیا۔ درد کی ٹیس ابھری مگر چیخ تک جسم سے نہ نکلی۔ آخری نگاہ سینے کی طرف گئی۔ جہاں نقشہ تھا۔ سینے کے ساتھ ساتھ وہ بھی چھلنی ہو چکا تھا۔ مقصد پورا ہو گیا۔ ملک کا اہم راز دشمن کے ہاتھوں سے بچانے کا فریضہ تکمیل کو پہنچا۔ جان کا کیا ہے؟ وہ تو ایک نہ ایک دن جانی تھی مگر بے وفا مرد نے جاتے جاتے ایک وفا نبھا ڈالی۔

❀❀❀

ڈاکوؤں نے ایک بلڈنگ کے لوگوں کو یرغمال بنایا ہوا تھا۔ پولیس نے کلیئر کروانے کی کئی بار کوشش کی مگر ناکام رہی۔ راحیل کو بھی اسی سلسلے میں وہاں بلایا گیا تھا۔ آپریشن کئی گھنٹے سے جاری تھی مگر معصوم لوگوں کی جان داؤ پر تھی۔ جنہیں ہر قیمت پر ڈاکوؤں کے قبضے سے چھڑانا تھا۔
''راحیل ہمارے پاس ایک پلان ہے......!!'' افسر نے پلان بتایا مگر اس میں جان کا خطرہ تھا۔ اس نے سوچے بنا ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایک جان کے بدلے اگر

سیکڑوں کی جان بچتی ہے تو اس جان کا چلے جانا ہی بہتر ہے۔
ڈاکوؤں کا ایک سردار پولیس کے قبضے میں تھا۔ اس کو آزاد کروانے کی خاطر ہی یہ سب ڈرامہ رچایا گیا تھا۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد جب حالات کنٹرول سے باہر دکھائی دیئے اور ڈاکوؤں نے اب لوگوں کی لاشیں گرانے کی دھمکی دی تو انہیں عملی قدم اٹھانا پڑا۔
راحیل کے جسم کے خدوخال اس ڈاکو سے میل کھاتے تھے۔ انہوں نے پلان بنایا کہ راحیل کو سیاہ کپڑے پہنا کر اس طرح ان کے حوالے کیا جائے جیسے وہ ان کے سردار کو سونپ رہے ہوں۔ راحیل کے دل کی دھڑکنیں اگرچہ بے ترتیب تھیں مگر سیکڑوں کی زندگیاں بھی سامنے تھیں۔
''تم سب لوگوں کو بلڈنگ سے باہر بھیج دو۔ ہم تمہاری ڈیمانڈ پوری کردیں گے۔'' کام اگرچہ خطرے سے بھرپور تھا مگر سکیورٹی کا انتظام بھی خوب کیا گیا۔ ڈاکوؤں نے سوچ سمجھ کر ہاں کردی۔ تمام لوگوں کو باہر جانے کی اجازت دے دی سوائے دس لوگوں کے۔ وہ بھی چال پر چال چل رہے تھے۔ بندوقیں تنی ہوئی تھیں اور راحیل کو چہرے پر نقاب چڑھائے ان کی طرف بھیجا جارہا تھا۔ دوسری طرف سے معصوم جانیں بھی محفوظ ہاتھوں میں آرہی تھیں۔ سب کی دھڑکنیں تیز تھیں۔ وسط میں معصوم لوگ اور راحیل ملے۔ لوگ آگے بڑھ گئے مگر راحیل کھڑا رہا۔ وہ سیاہ نقاب سے دھندلا دھندلا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ڈاکوؤں کو تشویش ہوئی۔ ایک ڈاکو آگے بڑھا اور اس کا نقاب اتارا تو حقیقت عیاں ہوگئی۔
''دھوکا......!!'' گولیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ لوگ زمین کے ساتھ چپک گئے۔ اس سے پہلے کے راحیل اپنی پشت سے پستول نکالتا ایک گولی سیدھی اس کے سینے میں جا لگی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ سر چکرایا۔ عشنا کی حسرت سے بھری نگاہیں آنکھوں کے سامنے لہرائی۔
''بے وفا مرد ......میری خواہشوں کو کبھی پورا نہ کرنا......'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
''صحیح کہا تھا تم نے عشنا...... میں بہت بے وفا ہوں۔ تبھی دیکھ لو آخری سانسوں میں تمہارا ساتھ بھی میسر نہیں۔'' وہ زمین پر آ گرا۔ آخری بار اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ سماعت میں گولیوں کی آواز گونجی۔ شاید مقابلہ ابھی تک جاری تھا مگر ایک مقابلہ وہ ادھورا چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وہ مقابلہ تھا وفا اور بے وفائی کا۔

......❁❁❁......

''مجھے معاف کردینا عشنا! میں تمہیں وہ خوشی نہیں دے پایا۔ جس کی تم حق دار تھیں۔ تم ہمیشہ مجھ سے جھگڑا کرتی رہی، مجھ پر جملے کستی رہیں اور میں خاموشی سے سنتا رہا۔ تم نے کبھی اس خاموشی کا جواز نہیں پوچھا۔ تم جانتی ہو عشنا...... میں کیوں خاموش رہتا تھا؟ کیونکہ تم حق بجانب تھیں۔ تمہیں میری ذات سے صرف وقت چاہیے تھا۔ تمہیں نہ مال و دھن کی چاہ تھی اور نہ ہی اوروں کی طرح نمود ونمائش کی فکر تمہیں تو وفا چاہیے تھی جو شاید میرے اندر نہیں تھی۔ تم ٹھیک کہتی تھیں مرد ہوتے ہی بے وفا ہیں۔'' راحیل کی شہادت کے کئی روز بعد اسے الماری سے ایک خط ملا تھا۔ جو شاید راحیل نے اپنی زندگی میں لکھا تھا۔ آج وہ خط عشنا کے ہاتھوں لگا تھا۔ جسے پڑھ کر ایک بار پھر آنکھوں سے جل تھل شروع ہوگئی۔ شاید اس روز کی جل تھل سے بھی زیادہ جل تھی جس روز اس کی موت ہوئی تھی۔
''مرد ذات میں ذرا وفا نہیں ہوتی مگر تم جانتی ہو ایسا کیوں ہے؟ وہ اس لئے اگر مرد ذات میں وفا ہوتی تو میں بھی وفا کا پجاری ہوتا اور اسی وفا کے دھوکے میں کئی معصوم زندگیوں کو بچا نہ سکتا۔ مرد ذات بے وفا ہوتے ہیں تاکہ وفاداروں کو سکون کی نیند مہیا کرسکیں۔ جب وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پیار ومحبت کے نت نئے وعدے کررہے ہوتے ہیں، عین اسی وقت کہیں نا کہیں بے وفا مرد اسی وطن کی خاطر اپنی جان قربان کررہا ہوتا ہے اور یہ وفا شعار اس بے وفا مرد کی قربانیوں سے بے خبر اس پر زندہ دلیری کے ساتھ بے وفائی کا ٹیگ لگا دیتے ہیں۔ مرد ذات ہوتی ہی بے وفا ہے عشنا! کیونکہ اگر مرد ذات میں وفا ہوتی تو وہ کبھی راتوں کی نیند قربان کرکے اپنے بچوں کے روشن مستقبل کے لئے محنت نہ کرتا۔ اپنی نیند سے محبت کرتا۔ اپنے آرام کو سراہتا۔ مرد میں اگر وفا ہوتی تو وہ کبھی اپنوں سے دور رہ کر ان کے سکون کا سامان پیدا نہ کرتا کیونکہ وفا تو دوریاں مٹاتی ہیں جبکہ بے وفائی فاصلے بڑھاتی ہیں۔ مرد ذات اسی بے وفائی کے راستے پر

چل کر کل کو سہانا بنانے کی جستجو کرتا ہے۔ خود کانٹے سہہ کر پیچھے رہ جانے والوں کے لئے پھول بکھیرتا ہے۔ مرد ذات میں وفا اس لئے بھی نہیں ہوتی کیونکہ وفا محبت سکھاتی ہے اور محبت پاؤں میں زنجیر کی مانند اور اگر مرد وہ زنجیر باندھ لے تو شاید اپنوں سے دور ہی نہ جا سکے۔ ان کے لئے وہ کچھ نہ کر سکے جو وہ چاہتا ہے۔ مرد ذات ہوتی ہی بے وفا ہے۔ تم ٹھیک کہتی تھی۔ اماں بھی سچی تھیں۔ مرد ہوتے ہی بے وفا ہیں۔ اتنے بے وفا کے وفادار بھی انہیں سمجھ ہی نہیں سکتے۔'' آنکھوں سے جل تھل رکی نہیں۔ وہ روتی چلی گئی۔ پہلی بار اسے اپنے الفاظ سے گھن آرہی تھی۔ کیوں وہ اس بے وفائی کے پیچھے چھپی وفا کو نہ سمجھ سکی؟ کیوں وہ مرد ذات کی بے وفائی کا سبب نہیں سمجھ سکی؟ کیوں؟

......❀❀❀......

وہاں دو دہشت گرد تھے۔ جو مسلسل گولیوں کی بارش کر رہے تھے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ فضا میں گونجتی مسلسل گولیوں کی بارش ذرا تھمی تھی۔ تو سیاہی میں نہائے چہرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ان درندوں کو دیکھتے ہی اس کے جسم میں جیسے خون کھول اٹھا تھا۔ درد کی ٹیسیں جو وہ مسلسل برداشت کرتا آ رہا تھا اپنے دشمن کو سامنے دیکھ کر بھول گیا۔ آنکھوں کے آگے معصوم جانیں تھیں۔ جن کا خون بہایا گیا تھا۔ سماعت میں آہ و بکا گونج رہی تھی۔ اس نے اپنی رائفل نکال کر ان پر تانی۔ گولیوں کی برسات دونوں طرف سے ہوئی۔ سیاہ رات میں ہر طرف چنگاریاں نظر آرہی تھیں۔ اس کا سینہ بھی چھلنی ہو چکا تھا مگر ایک خوشی تھی کہ اس نے اپنے ملک کے لوگوں سے وفا نبھا ڈالی۔ جن درندوں نے ان معصوموں کا خون بہایا تھا ان کا نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ آنکھوں کے آگے مزید اندھیرا چھا گیا۔ جسم پسینے اور خون سے بری طرح نہا چکا تھا۔ وہ زمین بوس ہوتا چلا گیا۔ رائفل ہاتھ سے گری تو ہاتھ بے جان دکھائی دیئے۔

''ثاقب ...... میرے بھائی ...... تم جیو ہزاروں سال......'' ایک بہن کا مان سماعت سے ٹکرایا تھا۔

''یہ کیا تم عید کے دن بھی ڈیوٹی پر جارہے ہو۔ بھلا ایسی بھی کیا ڈیوٹی کہ بہن کے ساتھ عید بھی نہ منائی جا سکے۔'' ایک روٹھی بہن گلہ کر رہی تھی۔

''میری پیاری سی بہن...... جانا تو ہوگا آخر میرے دیس نے مجھے بلایا ہے۔ اسے میری ضرورت ہے'' وہ اسے منانے کی کوشش کررہا تھا۔ لہجے میں ہلکا سا مزاح تھا۔

''اور ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے کیا؟'' وہ اپنے چہرے کا رخ دوسری طرف کر چکی تھی۔

''لیکن تم سے زیادہ ضرورت میرے ہم وطنوں کو ہے۔ آخر وفا کا تقاضا بھی تو یہی ہے ناں'' وہ اپنا رخت سفر باندھ چکا تھا۔

''اس کا مطلب ایک وفا کی خاطر تم ہم سے بے وفائی کرو گے۔''

''شاید......'' اس نے بنا سوچے سمجھے کندھے اچکائے تھے اور وطن کی پکار پر لبیک کہتا ہوا نکل کھڑا ہوا۔

''شوہر تو ہوتے ہی بے وفا ہیں۔ اب بھائی بھی وفا سے نالاں دکھائی دیتے ہیں'' اس نے منہ بسور کر کہا تھا مگر الفاظ وہ سن سکتا تھا۔ سینہ زمین بوس ہو رہا تھا۔ دھڑکنیں اپنے وطن کی مٹی میں ضم ہو رہی تھیں۔

''معاف کر دینا میری بہن ...... میں واقعی بے وفا نکلا۔ یہ عید تو کیا، اب سے کوئی عید بھی تمہارے ساتھ نہیں گزار سکوں گا......کوئی عید بھی نہیں۔'' آنکھیں بند ہو رہی تھیں مگر دل میں کوئی ملال نہ تھا۔ نہ ہی اس بے وفائی سے گلہ۔ وطن کی وفا کے آگے ہزاروں وفائیں قربان۔

......❀❀❀......

صبح تک ریسکیو کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ اویس کی ٹانگ میں لگی گولی کا زخم ابھی تک ہرا تھا اور مسلسل متحرک رکھنے سے زہر کا اثر پھیل چکا تھا۔ صبح صادق کی پہلی کرن کا نکلنا تھا کہ ایک اور زندگی کا چراغ بجھنے کو تیار تھا۔ شرجیل نے جب اویس کو لڑکھڑاتا ہوا دیکھا تو اس کی جانب بڑھا۔

''اویس...... یہ کیا ہو رہا ہے تمہیں؟'' اس نے اویس کے سر کو اپنی گود میں رکھا تھا۔ جب کہ اس کی آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں۔

''اپنی آخری منزل کا رخت سفر باندھ رہا ہوں'' ہکلاہٹ کے ساتھ جواب آیا تھا۔

''نن...... نہیں ...... کچھ نہیں ہوگا تمہیں...... میں ابھی تمہیں کیمپ لے جاتا ہوں'' شرجیل نے اپنے زخمی ساتھی کو اٹھانا چاہا مگر وہ تو جیسے مٹنے کے لئے تیار تھا۔

”نہیں شرجیل ...... یہ موقع ہر کسی کو نہیں ملتا۔ قسمت والے ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں یہ مٹی اپنے لئے چنتی ہے۔ مجھے ان خوش قسمت لوگوں میں شامل ہونے دو۔ میرا لہو اس مٹی میں ضم ہونے دو تا کہ بروز قیامت یہ مٹی گواہ بن سکے کہ میں نے کبھی اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کی۔ جب جب اس سرزمین پاک کو میری ضرورت محسوس ہوئی، میں نے لبیک کہا۔ اس نے خوشیوں کی قربانی مانگی، میں نے دی۔ اس نے اپنوں سے جدا ہونے کو کہا، میں ہوا۔ اس نے لہو مانگا، میں نے دیا۔ اب اگر یہی مٹی میری جان مانگ رہی ہے تو میں کیسے پیچھے ہٹ سکتا ہوں؟ وفا کے آخری پڑاؤ میں بھلا کیسے بے وفائی کر سکتا ہوں؟ کیسے؟“

پرنم آنکھیں اب ہمیشہ کے لئے بند ہو رہی تھیں اور پھر دن کے اجالے نے جہاں ہر شے کو روشن کیا وہیں اس جوان کی زندگی کے چراغ کو گل کر دیا۔ ساتھی مدد کو آ چکے تھے۔ باقی تین شہیدوں کو بھی وہاں لا موجود کیا۔ ثاقب، ساجد اور اویس کے جسدِ خاکی کو ایک قطار میں رکھ کر وطن کی چادر اوڑھائی گئی۔ ہر آنکھ ان جوانوں کی قربانی پر اشک بار تھی۔ جنہوں نے اپنوں سے بے وفائی کا خطاب لیا مگر وطن کے ساتھ بے وفائی نہ کر سکے۔

شاید یہی مرد ذات کی خصلت ہے کہ وہ بے وفائی کرتا ہے وفا کو نبھانے کے لئے۔

وہ بے وفا کہلاتا ہے، وفاداروں کو سلانے کے لئے۔

وہ بے وفا بنتا ہے، وفا کے غنچے کو قائم رکھنے کے لئے۔

اگر اپنوں کے لئے جان سے گزر جانا بے وفائی ہے تو ہاں مرد بے وفا ہے۔

اگر اپنوں کے لئے لہو کا نذرانہ دینا بے وفائی کے زمرے میں آتا ہے تو ہاں مرد بے وفا ہے۔

اگر لاکھ زندگیوں کی خاطر اپنوں سے بے رخی اختیار کرنا بے وفائی ہے تو ہاں مرد بے وفا ہے۔

اگر بچوں کی خاطر دھوپ کی سختی میں جل کر پاؤں میں چھالوں کا بن جانا بے وفائی کی سزا ہے تو کیا ہی خوب سزا ہے......!!

اگر اپنوں کی خوشیوں کی خاطر، اپنی خواہشوں کو مار دینا بے وفائی ہے تو ہاں مرد بے وفا ہے۔

مرد بہت بے وفا ہوتے ہیں کیونکہ وہ اکثر اپنی ذات کو فراموش کر دیتے ہیں۔

مرد بے وفا ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنی زبان سے وفا کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے۔

مرد بے وفا کہلاتے ہیں کیونکہ غم روزگار کا پہیہ انہیں گھمانا پڑتا ہے۔

مرد ذات بے وفا کہلاتی ہے کیونکہ انہیں اپنی زندگی پیاری ہوتی ہے۔ معمولی سی باتوں پر مرنے کی دعائیں نہیں مانگتے کیونکہ وہ جانتے ہیں اپنے لاکھ برا چاہیں مگر اس ذات کی اُنہیں ضرورت ہے۔

مرد بے وفا کہلاتے ہیں کیونکہ وہ دور رہ کر وفا کا نیا سبق پڑھاتے ہیں۔

مگر یہی مرد وفا کی ہر حد کو پار کر جاتے ہیں جب لاکھوں زندگیاں داؤ پر ہوں۔

جب وطن کو ان کی ضرورت ہو۔

جب ہزاروں مائیں رو رہی ہوں۔

جب بہنوں کے سر سے دوپٹے اتر جائیں۔

جب بچوں کے بچپن اجڑ جائیں۔

تب یہی بے وفا مرد وفا کا پہاڑ بن جاتے ہیں۔

پھر ایک وقت ایسا آتا ہے۔

یہی وفا کا پہاڑ، روئی کے گالوں کی طرح فضا میں بکھرنے لگتا ہے۔

جب اس کا لہو ویرانے میں مٹی میں ضم ہونے لگتا ہے۔

نہ کوئی دردمند ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مسیحا۔

مگر اس کے حوصلے تب بھی جواں ہوتے ہیں۔

آخری سانس میں بھی اپنے وطن سے وفا کر جاتے ہیں۔

برسوں کی پیاسی مٹی کی پیاس بجھا جاتے ہیں۔

اس لئے مرد بے وفا ہوتے ہیں۔

مرد بہت بے وفا ہوتے ہیں

ہاں......!!!

بے وفا مرد ہوتے ہیں۔

فتنہ گر

محمد عرفان رامے

اس مجرم کا قضیہ، دنیا اسے صاف ستھرے کاروباری شخص کی حیثیت سے جانتی تھی مگر اس کے قریب ایک شخص ایسا تھا جو اس کی فتنہ گری سے واقف تھا۔

جرم و سزا پر مبنی ایک خوب صورت کہانی

شام چار بجے سکندر شہزاد نے وال کلاک پر نظر دوڑاتے ہوئے انگڑائی لی اور سامنے پڑی فائل بند کر کے بریف کیس میں رکھتے ہوئے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا.... اپنی بیوی الماس کی ناگہانی موت کے بعد اس کا زیادہ وقت دفتر میں ہی گزرنے لگا تھا۔ وہ دفتری اوقات کے بعد بھی اپنا غم غلط کرنے کے لیے آفس میں بیٹھا رہتا تھا۔ دوست یار یہی سمجھتے تھے کہ الماس کا دکھ بھلانے کے لیے وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنا چاہتا ہے مگر حقیقت شاید کچھ اور تھی۔

بریف کیس اٹھا کر سکندر شہزاد اپنے کیبن سے باہر نکلا تو سامنے بیٹھی زرقا پر نظر پڑتے ہی اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ سی کھیلنے لگی تھی۔ زرقا کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی مگر ہلکی سانولی رنگت، دراز قد، گھنگریالے بالوں اور قاتل آنکھوں نے اسے بہت سی لڑکیوں سے ممتاز بنا دیا تھا۔ سکندر شہزاد حسن پرست ضرور تھا مگر کلی کلی منڈلانے والا بھنورا ہرگز نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے دفتر میں کام کرنے والی پانچ لڑکیوں کو تقرر نامہ تھماتے ہوئے یہ ضرور سوچا تھا کہ ان کی موجودگی سے یہاں آنے والے لوگوں کو سپاٹ چہرے دیکھ کر منہ نہ بسورنا پڑے۔

ناخنوں کی تراش خراش میں مصروف زرقا کو جیسے ہی اپنے سامنے کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس ہوا وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیل کٹر اس کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد ہو کر زمین پر جا گرا۔

''سوری سر! مجھے احساس ہی نہ ہو سکا آپ کی آمد کا۔''

''اٹس او کے.... ویسے سب خیریت تو ہے نا۔ چند روز سے تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو۔ گھر میں سب ٹھیک ہے؟''

''جی سر! سب ٹھیک ہے۔ بس ویسے ہی آج کل طبیعت کچھ ناساز ہے۔ نیا فلیٹ مل گیا ہے سوچ رہی ہوں کل چھٹی لے کر سامان شفٹ کر لوں۔''

''کیوں نہیں.... بلکہ مدد کے لیے دفتر سے ایک دو ملازم بھی بلوا لینا۔ اگر مناسب سمجھو تو شفٹنگ کے بعد ایک دو روز آرام کر لو۔ مجھے احساس ہے کہ تم پر کام کا کافی بوجھ ہے۔ جلد ہی میں ایک نئے آفس اسسٹنٹ کا انتظام کر لوں گا پھر اضافی کام اس کے سپرد کر کے تم اپنا بوجھ کم کر لینا۔''

''جی بہت بہتر؟'' زرقا نے حسب عادت مختصر جواب دے کر سر جھکا لیا۔ پھر کوئی نیا خیال ذہن میں آتے ہی دوبارہ بولی: ''آج آپ جلدی جا رہے ہیں؟''

''ہاں مجھے ذرا مارکیٹ جانا ہے۔ تمہیں یہ بتانے کے لیے رک گیا تھا کہ پانچ بجے آفاق نامی ایک کار ایجنٹ آفس میں آئے گا۔ میں نے اپنی گاڑی تبدیل کی ہے اور آج اسے اضافی رقم کی ادائیگی کے لیے بلایا

ہے۔ہم نے اسے پچاس ہزار روپے ادا کرنے ہیں۔ چیک بک میری میز کے دراز میں ہے۔اس میں بیس ہزار روپے کیش بھی موجود ہے۔تم ایسا کرنا کہ تیس ہزار روپے کا چیک اور بیس ہزار روپے کیش دے کر نمٹا دینا اور ہاں رسید پر دستخط لینا مت بھولنا۔“

”جی بہتر۔“

زرقا نے اثبات میں سر ہلایا تو سکندر شہزاد دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

زرقا دو برس سے سکندر شہزاد کی امپورٹ ایکسپورٹ فرم میں بطور سیکرٹری کام کر رہی تھی۔سکندر شہزاد کو بھی اس پر مکمل اعتماد تھا۔یہی وجہ تھی کہ دفتر میں کیش سے متعلقہ تمام معاملات زرقا ہی کے سپرد تھے۔اس کا تعلق ایک گاؤں سے تھا۔یونیورسٹی کے آخری سال میں جب والد کا انتقال ہوگیا تو اس نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ ملازمت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب اس پر بہت سی ذمہ داریاں تھیں چنانچہ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک گرلز ہاسٹل میں رہائش اختیار کرتے ہوئے سکندر شہزاد کی فرم میں بطور سیکرٹری ملازمت شروع کردی تھی۔

زرقا کا رشتہ بچپن میں ہی اپنے تایا زاد کے ساتھ طے کر دیا گیا تھا۔ وہ لوگ ہمیشہ اس کی پڑھائی اور ملازمت کے خلاف رہے۔چنانچہ چند روز قبل زرقا کے تایا نے باضابطہ طور پر اس رشتے کو ختم کر کے اپنے بیٹے کی شادی کہیں اور کر دی تھی .... زندگی میں رونما ہونے والے اس بڑے سانحے نے زرقا کو اندر سے بری طرح گھائل کر دیا تھا۔اس نے دفتر میں کسی سے اپنا دکھ بانٹنا مناسب نہ سمجھا۔یہی وجہ تھی کہ سکندر شہزاد نے اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے

استفسار کیا تھا اور چند روز آرام کا مشورہ بھی دیا تھا۔
سکندر شہزاد کے جاتے ہی زرقا ایک مرتبہ پھر سوچوں میں غرق ہو گئی۔ کل اسے اپنی رہائش بھی تبدیل کرنا تھی۔ ان دنوں وہ جس پرائیویٹ ہاسٹل میں رہائش پذیر تھی اس کی زبان دراز مالکن سے ہر وقت جھگڑا رہتا تھا۔ کل اسے ہر حال میں اپنے نئے ٹھکانے پر منتقل ہونا تھا۔
یہ ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا جس کا انتظام اس کی سہیلی کے والد کی مہربانی سے ہوا تھا۔ زرقا نے اس مرتبہ ہاسٹل کے بجائے فلیٹ کو ترجیح دی تھی تاکہ مستقبل قریب میں اپنی ماں اور تین چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی شہر میں لے آئے۔
زرقا بدستور اپنی زندگی کی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے میں مگن تھی کہ بند دروازے پر ہونے والی دستک نے اس کی سوچوں کو منتشر کر دیا۔ زرقا سمجھ گئی تھی کہ یقیناً وہی آفاق نامی کار ایجنٹ اپنی رقم وصول کرنے آیا ہو گا جس کے بارے سکندر شہزاد نے ہدایت کی تھی:
''یس۔۔۔کم ان۔''
اس نے باوقار لہجے میں کہا۔ لیکن دروازہ کھلتے ہی وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے نہایت وجیہہ شخصیت کا مالک وہ خوب صورت نوجوان کھڑا تھا جسے زرقا بخوبی جانتی تھی۔
''آفاق احمد تم....؟'' وہ اسے دیکھتے ہی چونک کر بولی تو نوجوان کے چہرے پر بھی خوشگوار حیرت نے انگڑائی لی۔
''کیسا حسین اتفاق ہے....میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم سے یوں اچانک ملاقات ہو جائے گی۔'' آفاق احمد کے لہجے میں بھی خوشی کے وہی جذبات تھے۔
دونوں یونیورسٹی کے پہلے سال میں کلاس فیلو رہے تھے اور کسی حد تک ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔ مگر زرقا اپنا رشتہ طے ہو جانے کے باعث ہمیشہ اس موضوع کو ٹال دیا کرتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اپنے معاشی مسائل کے باعث آفاق کو تعلیم ادھوری چھوڑنا پڑ گئی اور ان کے درمیان رابطہ بھی منقطع ہو گیا۔ مگر آج یوں اچانک ملاقات پر دونوں بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔
وہ کافی دیر تک گزرے دنوں کی حسین یادیں دہراتے رہے۔ آفاق احمد کے مالی حالات پہلے سے کافی بہتر ہو گئے تھے۔ وہ کار ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ گفتگو کے دوران کافی کا مگ خالی ہو گیا تو آفاق احمد کو بھی وقت گزرنے کا احساس ہوا۔ چنانچہ اس نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے سکندر شہزاد کے بارے دریافت کیا۔
''وہ تو آج جلدی چلے گئے ہیں۔ مگر جانے سے قبل انہوں نے تمہاری آمد کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا....ویسے سکندر صاحب تمہارے ہتھے چڑھ کیسے گئے۔ وہ تو کسی ڈیل کرنے سے قبل سو مرتبہ سوچتے ہیں پھر تم نے انہیں کیسے پھنسالیا۔'' زرقا نے ہنستے ہوئے کہا۔
''یہ کوئی خالص کاروباری ڈیل نہیں تھی۔ ہماری ملاقات ایک کار پارکنگ میں ہوئی تو انہوں نے میری کار میں دلچسپی لیتے ہوئے معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ پھر کیا تھا بکی اور پوچھ پوچھ۔ میں بھی منجھا ہوا کار ایجنٹ ہوں۔ موقع ہاتھ سے کیسے جانے دیتا۔ میں نے بات سے بات نکالی اور وہیں کھڑے کھڑے ہمارے درمیان سودا طے پا گیا۔ انہیں اپنی پرانے ماڈل کی کار فروخت کر کے بہتر گاڑی خریدنا تھی۔ میں نے انہیں مناسب ریٹ دیا تو وہ اپنی گاڑی اور پچاس ہزار کے عوض میری گاڑی خریدنے پر رضامند ہو گئے ... یہ ہے مختصر سی کہانی۔'' آفاق احمد نے تفصیل بتائی تو زرقا قابل ستائش نظروں سے اسے دیکھنے لگی اور پھر اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولی۔
''تم واقعی ایک اچھے کار ایجنٹ ہو جو ڈیل کرنے کے لیے دفتر پہنچنے کا انتظار نہیں کرتا۔ مگر یہاں تمہیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا تاکہ میں باس کے آفس سے تمہاری امانت اُٹھا لاؤں۔''
زرقا کی بات سن کر دونوں نے مسکراہٹ کا تبادلہ کیا

اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد زرقا واپس لوٹی تو ہاتھ میں چیک اور کیش تھا۔ اس نے دونوں چیزیں آفاق احمد کے سامنے رکھیں تو وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا:

''کیا یہ ممکن نہیں کہ تم مجھے چیک کے بجائے کیش دے دو۔ کل اور پرسوں چھٹی ہے۔ بنک بند ہوں گے اور بات سوموار تک ٹل جائے گی جب کہ مجھے آج کیش کی اشد ضرورت ہے۔''

''سوری یہ ممکن نہیں۔ باس نے مجھے یہی ہدایت کی تھی۔ ویسے باس کے دراز میں کچھ کیش موجود تو ہے مگر میں ان کی اجازت کے بغیر دے نہیں سکتی۔'' زرقا نے کاندھے اچکائے۔

''میں تمہاری مجبوری سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن یقین کرو مجھے آج کیش کی اشد ضرورت ہے۔ اگر ممکن ہے تو سکندر شہزاد سے فون پر بات کرلو، ہوسکتا ہے وہ اس کیش میں سے ادائیگی کرنے پر رضا مند ہوجائے۔''

''یہ بہتر رہے گا۔''

زرقا نے اس کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے سکندر شہزاد کے گھر کا نمبر ڈائل کیا تو ملازمہ نے یہ بتا کر ریسیور رکھ دیا کہ صاحب ابھی گھر نہیں پہنچے۔ پھر اس نے سکندر شہزاد کے موبائل پر کال کی مگر وہ بند تھا۔ وقفے وقفے سے کئی بار کوشش کرنے کے باوجود رابطہ نہ ہوسکا تو زرقا نے گہری سانس لیتے ہوئے آفاق احمد کے چہرے پر نظر دوڑائی جہاں اُمید اور پریشانی کے ملے جلے اثرات تھے۔

''تم ریلکس ہوجاؤ۔ میں باس کے کیش میں سے ادائیگی کر دیتی ہوں۔ کل میں خود ان سے بات کرلوں گی۔'' زرقا نے حتمی فیصلہ کرتے ہوئے تسلی دی: ''تم اس چیک اور رسید پر دستخط کردو۔ چیک میں خود کیش کروالوں گی، تم مجھ سے کیش لے کر اپنی ضرورت پوری کرلو۔''

''ارے واہ! تم تو بہت عقل مند ہوگئی ہو اے بھولی بھالی لڑکی۔'' آفاق احمد نے چیک پر دستخط کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر زرقا، سکندر شہزاد کے آفس میں چلی گئی۔ آفاق احمد سے اس کی طویل عرصے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس موقع پر وہ کسی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی حدود سے بڑھ کر آفاق کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ سوموار کو آفس آتے ہی کسی کو بنک بھیج کر چیک کیش کروالے گی اور پھر تیس ہزار روپے اسی جگہ واپس رکھ دے گی۔

سکندر کے دفتر میں پہنچ کر زرقا نے دراز میں موجود خاکی لفافے میں سے ہزار ہزار روپے کے نئے نوٹوں کی گڈی نکالی اور تیس نوٹ گن کر الگ کر لیے۔ آفاق احمد کا سائن کیا ہوا چیک اور رسید اس نے اسی لفافے میں ڈال دی تھی تا کہ اگر سکندر کو اچانک رقم کی ضرورت پڑ جائے تو نوٹ کم ہونے پر پریشان نہ ہو اور چیک بمعہ رسید دیکھ کر اصل معاملہ سمجھ لے۔

اپنے کیبن میں آکر زرقا نے آفاق احمد کو تیس ہزار روپے کے کڑکتے نوٹ پیش کیے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ بار بار زرقا کا شکریہ ادا کرتا رہا اور پھر واپسی کے لیے اٹھتے ہوئے بولا: ''اس وقت تو میں جلدی میں ہوں۔ اس کیش سے کئی معاملات نمٹانے ہیں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ کل رات ہم دونوں کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں اور بیتے دنوں کی یادیں تازہ کریں۔''

''کل نہیں۔'' زرقا بولی ''کل میں اپنی رہائش تبدیل کرنے والی ہوں۔ البتہ اتوار کو میں ہر کام سے فارغ ہوں۔''

''تو پھر طے پا گیا۔ اپنی رہائش تبدیل کرتے ہی تم مجھے فون کر دینا اور اتوار کی شام میں خود تمہیں لے جاؤں گا۔''

آفاق احمد نے اسے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیتے ہوئے کہا اور خدا حافظ کہہ کر کیبن سے باہر نکل گیا۔

☆

سکندر شہزاد گزشتہ کئی برسوں سے امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کر رہا تھا اور کسی حد تک تنہائی پسند بھی تھا۔ اس کی دوستی گنتی کے لوگوں سے تھی۔ سکندر کو

دیکھنے والے بہت جلد نتیجہ اخذ کرلیا کرتے تھے کہ اس شخص کو زندگی کی رنگینیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔لوگ اسے دیانت دار، خوش اخلاق اور نہایت شریف انسان سمجھتے تھے۔ یہ باتیں کسی حد تک درست بھی تھیں۔ کسی نے آج تک یہ ثابت نہیں کیا تھا کہ سکندر شہزاد درحقیقت ایک جرائم پیشہ انسان ہے۔

کم لوگ جانتے تھے کہ چند سال قبل اس نے اپنی بیوی الماس کو قتل کردیا تھا۔مگر ثبوت نہ ملنے کے باعث پولیس کو اسے ہر قسم کے شبہ سے بری قرار دینا پڑا اور پھر بھی اس معاملہ میں تکلیف نہ دی تھی۔

پولیس سے جان چھوٹنے پر سکندر شہزاد نے سکون کا سانس لیا تھا۔انہی دنوں اس نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر جعلی کرنسی کا دھندا شروع کردیا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ الماس کے قتل کی تفتیش کے دوران پولیس کا دھیان اس طرف جائے۔

جب سکندر شہزاد کا ستارہ گردش سے باہر نکلا تو اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنی بیوی کے قتل سے بری الذمہ قرار دیا جاسکتا ہے تو جعلی کرنسی کے دھندے میں بھی قسمت ضرور اس کا ساتھ دے گی۔ چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے دھندے پر زیادہ توجہ دینا شروع کردی۔سکندر شہزاد روز اول سے یہ کام نہایت احتیاط سے کررہا تھا مگر آج جانے کیوں اس سے اتنی بڑی غلطی سرزد ہوگئی تھی کہ وہ پورے ایک لاکھ کے جعلی نوٹ اپنی دراز میں بھول آیا تھا۔

گھر پہنچ کر جیسے ہی اس کے ذہن میں یہ خیال آیا وہ یکلخت بے چین سا ہوگیا۔اس معاملے میں کسی پر بھروسہ کرنا سکندر شہزاد کی فطرت کا حصہ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ فوراً کار کی چابی اُٹھا کر گھر سے باہر نکل گیا۔ آفس میں جعلی کرنسی کی موجودگی کسی طور مناسب نہیں تھی۔انہی خیالوں میں غرق وہ اپنے دفتر پہنچ گیا جہاں ڈیوٹی پر موجود چوکیدار نے جلدی سے گیٹ کھول کر اسے اپنے چوکس ہونے کا ثبوت پیش کیا۔

عملہ چھٹی کے بعد گھروں کو جاچکا تھا۔کار پارک کر کے سکندر شہزاد سیدھا اپنے دفتر میں پہنچا اور جلدی سے میز کی دراز چیک کی۔ یہ دیکھ کر اس نے ایک گہری سانس لی تھی کہ خاکی لفافہ ابھی تک اپنی جگہ پر موجود تھا۔چند لمحے توقف کے بعد سکندر شہزاد نے لفافہ اٹھا کر جیکٹ کی جیب میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو اس کا ہاتھ راستے میں ہی رک گیا۔لفافے کا وزن کچھ کم محسوس ہوا تھا۔

سکندر شہزاد نے لفافہ کھول کر اپنے سامنے میز پر پلٹا تو اس میں آفاق احمد کو دیا جانے والا چیک، اس کی رسید اور ایک چٹ بھی موجود تھی جس پر زرقا کی تحریر اس کا منہ چڑا رہی تھی کہ نئی گڈی میں سے تیس نوٹ آفاق احمد کو بطور کیش ادا کردیے گئے ہیں جب کہ چیک اس لفافے میں موجود ہے۔

اس وقت لفافے میں کل ستر جعلی نوٹ تھے۔ یہ دیکھ کر سکندر شہزاد سارا معاملہ سمجھ گیا تھا اور اندر ہی اندر غصے سے کھولنے لگا تھا۔اسے زرقا کی حماقت پر شدید غصہ آرہا تھا جس نے حکم عدولی کرتے ہوئے آفاق احمد کو پچاس ہزار روپے کیش ادا کردیا تھا۔

جلد ہی اس کا غصہ ہرن ہوگیا اور دماغ تیزی سے مسئلے کا حل ڈھونڈنے لگا۔اس کا مستقبل شدید خطرے میں تھا۔ دفتر سے وصول کیے جانے والے تیس ہزار کے جعلی نوٹ ایک ایسے شخص کے قبضے میں تھے جو جانتا تھا کہ اس نے یہ رقم کہاں سے حاصل کی۔ اگر آفاق احمد مارکیٹ سے خریداری کرتے ہوئے یا بنک میں یہ رقم جمع کرواتے ہوئے پکڑا گیا تو سکندر شہزاد کا بچنا بھی ناممکن تھا۔

وہ سکتے کے عالم میں یہ سب سوچتے ہوئے روح تک کانپ گیا تھا۔سکندر شہزاد کے دماغ پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔اسے اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ سوچ کر اسے اپنے دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہونے لگی کہ گھر پہنچنے پر کسی بھی وقت پولیس اس پر دھاوا بول دے گی اور اسے جعلی کرنسی پھیلانے کے سنگین جرم میں گرفتار کر لیا جائے گا۔

بہت دیر گم صم کھڑے رہنے کے بعد وہ جیب سے

رومال نکال کر اپنی پسینے سے تر پیشانی صاف کرنے لگا۔ جیسے جیسے اس کا دماغ کام کرنے لگا جسمانی حالت بھی سنبھلنے لگی تھی۔
چند برس قبل جب سکندر نے الماس کا خون کیا تھا تو اس لمحے بھی اس کی حالت ایسی ہی تھی۔ مگر خود کو سنبھالتے ہی اس کے اعصاب پھر سے مضبوط ہو گئے تھے۔ یہ خیال آتے ہی وہ خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا کہ کسی بھی مشکل سے نکلنا کوئی مشکل کام نہیں۔
موجودہ مسئلے کا صرف ایک ہی حل تھا کہ کسی بھی طرح آفاق احمد سے وہ رقم واپس حاصل کی جائے۔ اس کام کے لیے وہ ہر خطرہ مول لے سکتا تھا اور ذہنی طور پر بالکل تیار تھا۔ اس کا ارادہ آفاق احمد کو قتل کرنے کا نہیں تھا۔ مگر مزاحمت کی صورت میں وہ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔
سکندر شہزاد نے گاڑی آفاق احمد سے خریدی تھی ۔اس لیے آفاق احمد کا مکمل ایڈریس اور رابطہ نمبر اس کے پاس محفوظ تھا۔ خود کو اس نئے مشن کے لیے تیار کرتے ہی سکندر شہزاد نے کلاک پر نظر دوڑائی تو سات بج چکے تھے۔
یعنی آفاق نے قریباً ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے رقم حاصل کی تھی۔ لہٰذا اُمید کی جا سکتی تھی کہ رقم ابھی تک محفوظ ہو گی۔ ممکن ہے وہ سیدھا اپنے گھر گیا ہو۔ اگر وہ کہیں اور جانے کا ارادہ رکھتا تھا تو گھر سے تیار ہو کر گیا ہو گا۔
سکندر نے عقل کا گھوڑا دوڑاتے ہوئے مفروضہ قائم کیا اور واپس کار میں آ بیٹھا۔ اب وہ ڈیش بورڈ سے گاڑی کے کاغذات نکال کر آفاق احمد کا ایڈریس دیکھنے لگا۔ اسے آفاق احمد کے گھر پہنچنے کے لیے صرف پندرہ منٹ درکار تھے۔
''جلدی بازی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ مجھے مکمل منصوبہ بندی سے کام کرنا ہو گا۔ اگر میں بنا سوچے سمجھے آفاق احمد سے ملنے پہنچ گیا اور سوچی سمجھی کہانی سنا کر کرنسی نوٹ تبدیل کرنے کی بات کی تو آفاق احمد کو شک پڑ جائے گا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ یا تو ادا کیے گئے نوٹ جعلی ہیں یا پھر چوری کے۔ ایسی صورت میں اگر اس نے یہ کہہ کر چند نوٹ سائیڈ پر کر لیے کہ میں انہیں خرچ کر چکا ہوں تو میرے لیے نیا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ کیونکہ بعد میں اصلی اور نقلی نوٹوں کا موازنہ کر کے وہ مجھے بلیک میل کرنے کے علاوہ پولیس کے پاس بھی جا سکتا ہے۔''
یہ سب سوچ کر سکندر شہزاد نے خود ہی اپنی تجویز کو نظر انداز کر دیا۔ اب اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ اپنا حلیہ تبدیل کر کے آفاق احمد کا تعاقب کرے اور پھر موقع ملتے ہی جعلی کرنسی برآمد کر لے۔ حتمی فیصلہ کرنے کے بعد اس نے گاڑی کا رخ واپس گھر کی جانب موڑ لیا۔
گھر پہنچ کر سکندر شہزاد نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے اور اپنا میک اپ شروع کر دیا۔ دائیں گال پر بڑا سا تل، گھنی بھویں، مصنوعی مونچھیں اور فرنچ کٹ داڑھی لگانے کے بعد اس نے ایک نفیس عینک ناک پر سجائی اور اپنا حلیہ دیکھنے کے لیے قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اب وہ بالکل ایک نیا آدمی بن گیا تھا۔
اس قسم کا بہروپ سکندر شہزاد اس وقت دھارتا تھا جب وہ گرد و نواح کے چھوٹے شہروں میں جعلی نوٹ استعمال کرنے کے لیے نکلتا تھا۔ وہ اکثر دکانداروں سے چھوٹی چھوٹی اشیا خرید کر بڑے جعلی نوٹ چلا لیا کرتا تھا جب کہ دکاندار اس کی شخصیت سے مرعوب ہو کر بغور کرنسی نوٹ نہیں دیکھا کرتے تھے۔
اس کام سے فارغ ہو کر سکندر شہزاد نے بیڈروم کی الماری کھول کر اپنا چمکتا ہوا ریوالور بھی نکال لیا جو اس نے بغیر لائسنس کے رکھا ہوا تھا۔ تیاری مکمل ہونے کے بعد وہ اپنی کار میں آ بیٹھا۔
سکندر شہزاد کا ارادہ آفاق احمد کے گھر میں داخل ہو کر ڈائریکٹ ایکشن لینے کا تھا۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ آفاق احمد کے سامنے آتے ہی وہ فوراً ریوالور تان لے گا اور اسے بے بس کر کے گھر سے جعلی کرنسی ڈھونڈ نکالے گا۔ اس دوران اگر آفاق احمد نے اسے پہچان لیا تو وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔

اپنی بیوی کے قتل کے بعد سکندر شہزاد کا حوصلہ بہت بڑھ چکا تھا۔ اب دوسرے قتل کا منصوبہ بناتے ہوئے اسے کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

منزل پر پہنچ کر سکندر شہزاد نے گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور خود آفاق احمد کے گھر کی طرف بڑھا۔ یہ ایک اوسط درجے کا مکان تھا۔ سکندر شہزاد نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو ایک اُدھیڑ عمر ملازمہ نے دروازہ کھلا اور اس کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔ آفاق احمد گھر پر موجود نہیں تھا اور واپسی کی کوئی خبر نہیں تھی۔

''گستاخی معاف! ان کا موبائل بند ہے اور ہمارا رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں وہ اس وقت کہاں ملیں گے۔ مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔ اگر ہماری ملاقات نہ ہو سکی تو ان کا بہت نقصان ہو جائے گا۔''

''اگر ایسی بات ہے تو بتائے دیتی ہوں.... آج ان کی ہونے والی منگیتر کی سالگرہ ہے۔ رات کا کھانا وہ اس کے ساتھ ہی کھائیں گے۔ آفاق صاحب نے مجھے سختی سے منع کیا ہے مگر پھر بھی میں ان کے سسرال کا ایڈریس اور فون نمبر آپ کو دے دیتی ہوں تاکہ میری وجہ سے صاحب کا نقصان نہ ہو۔''

یہ کہہ کر ملازمہ واپس چلی گئی اور ایک کاغذ پر ایڈریس اور فون نمبر لکھ لائی۔ سکندر شہزاد نے شکریہ کے ساتھ اس سے کاغذ لے لیا۔

لڑکی کا نام شاہدہ تھا اور وہ نو تعمیر کالونی میں رہتی تھی۔ سکندر شہزاد، شاہدہ کے گھر کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ جب وہ مطلوبہ مکان کے سامنے سے گزرا تو اپنی سابقہ گاڑی گیٹ کے سامنے موجود پائی۔ یہی وہ گاڑی تھی جو اس نے آفاق احمد کے ہاتھ فروخت کی تھی۔

''یعنی وہ خود بھی اندر موجود ہے اور رقم لے کر سیدھا یہیں آیا ہوگا۔''

پہلے تو سکندر شہزاد نے سوچا کہ اچانک اندر داخل ہو کر ان دونوں کو گولیوں سے بھون ڈالے اور رقم حاصل کر لے۔ مگر پھر سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ آج شاہدہ کا برتھ ڈے ہے۔ ممکن ہے کچھ اور لوگ بھی اندر موجود ہوں۔ بہتر یہی تھا کہ وہ تنہائی میں آفاق احمد کو قابو کرے تاکہ پولیس اسے ڈکیتی یا راہزنی کی واردت خیال کرے۔

چنانچہ وہ کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی کر کے انتظار کرنے لگا۔ ویسے بھی اصل مقصد آفاق احمد کا قتل نہیں بلکہ کرنسی کا حصول تھا۔

فرصت کے لمحے میسر آئے تو سکندر شہزاد ایک مرتبہ پھر الماس کے بارے سوچنے لگا۔ اس نے الماس کو قتل کرنے سے قبل بہت صبر سے کام لیا تھا۔ اگر وہ اس رات سکندر شہزاد کا صبر نہ آزماتی تو یوں بے موت نہ مرتی۔ وہ سکندر شہزاد کو ذہنی مریض قرار دے کر اس سے طلاق لینا چاہتی تھی۔ مگر سکندر شہزاد اسے ساری زندگی گڑگڑاتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔

بیوی کو قتل کرنے سے قبل سکندر شہزاد خون کرنا بہت مشکل کام سمجھتا تھا۔ مگر اس رات معلوم ہوا کہ قتل کرنا کتنا آسان کام ہے۔ اس نے اپنی ازدواجی زندگی کے دو سال عذاب میں گزارے تھے۔ سکندر شہزاد جب رات گئے تھکا ہارا واپس لوٹتا تو بیوی کی طنزیہ گفتگو اس کے تن بدن میں آگ لگا دیتی تھی اور وہ دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔

سکندر شہزاد کو شک تھا کہ الماس کے تعلقات غیر مردوں کے ساتھ ہیں۔ علاقے کے چند لوگوں نے بھی بتایا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کچھ لوگ الماس سے ملنے آتے ہیں۔

وہ ایک سرد اور بے رحم رات تھی جب سکندر شہزاد اپنے چند دوستوں کے ہمراہ پینے پلانے کی ایک محفل میں موجود تھا۔ یہ کام بھی وہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے کر رہا تھا کہ اچانک ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ وہ اپنے دوستوں کو نشے میں دھت چھوڑ کر باہر نکلا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے گھر کی راہ لی۔ اس نے گاڑی کو گھر سے کچھ فاصلے پر پارک کیا اور پھر ڈپلیکیٹ چابی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ جب وہ اپنے بیڈروم میں پہنچا تو الماس کا بکھرا بکھرا سا حلیہ اور قریب

ہی میز پر مشروب کے دو گلاس اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ چند لمحے تاخیر سے پہنچا ہے۔ سکندر شہزاد اگہری نظر سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ الماس سخت لہجے میں گویا ہوئی:

''تم بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو سکندر..... کچھ دیر پہلے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ تھی۔ وہ آج پہلی مرتبہ نہیں آیا تھا۔ یہ سلسلہ ایک سال سے جاری ہے.... مجھے تم سے نفرت ہے اور میں تمہارے ساتھ مزید ایک دن بھی اس گھر میں نہیں گزارنا چاہتی۔''

اس پل سکندر شہزاد کو اپنا سر گھومتا محسوس ہوا۔ اس نے سوچا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس عورت کا جسم کسی اور کی ملکیت تھا۔ یہ عورت اگر اپنے شوہر کی وفادار نہیں تو اسے جینے کا کوئی حق نہیں۔ آج پہلی مرتبہ اس کا دماغ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے پوری طاقت سے ایک گھونسا الماس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ چوٹ لگتے ہی الماس تیورا کر بیڈ پر جا گری۔ ابھی وہ سنبھل کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ سکندر شہزاد نے آگے بڑھ کر تکیہ اٹھایا اور الماس کے سینے پر سوار ہو کر تکیہ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

چند لمحے بعد ہی الماس ماہی ۔بے آب کی طرح تڑپنے لگی مگر شہزاد کی گرفت سے آزاد ہونا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ مضبوطی سے اس کے چہرے کو تکیے سے دبائے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد الماس کا احتجاج ختم ہو گیا تو سکندر نے تکیہ اُٹھا کر سائیڈ پر پھینک دیا۔

الماس مر چکی تھی۔ اس کی بے نور آنکھیں اب بھی حیرت سے کھلی تھیں جیسے وہ سوچ بھی نہ سکتی ہو کہ سکندر شہزاد اس حد تک چلا جائے گا۔ دوسری جانب سکندر شہزاد کی اپنی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ وہ کبھی اپنے ہاتھوں کو دیکھتا تھا تو کبھی الماس کی لاش کو۔

چند منٹ بعد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔ اسے اپنے دوستوں کی محفل چھوڑ کر واپس آئے بمشکل پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ وہ سب نشے میں دھت تھے۔ سکندر شہزاد نے سوچا کہ اگر وہ فوراً ان کے پاس لوٹ جائے تو سب اس کی وہاں موجودگی کی گواہی دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ بنا وقت ضائع کیے دوستوں کے پاس پہنچ گیا جہاں کسی کو اس کی غیر موجودگی کا شائبہ تک نہ ہوا تھا۔

اگلی صبح گھر واپس پہنچتے ہی وہ الماس کو مردہ حالت میں دیکھ کر واویلا مچانے لگا۔ پولیس کے آنے پر بھی اس نے کمال اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا اور یہی بتایا تھا کہ وہ رات بھر اپنے دوستوں کے ہمراہ ایک فلیٹ میں موجود تھا اور صبح گھر پہنچنے پر الماس کی لاش دیکھی۔

سکندر شہزاد کی اس فلیٹ میں موجودگی کی تصدیق اس کے دوستوں اور چوکیدار نے بھی کر دی تھی۔ ارد گرد کے لوگوں نے پولیس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ سکندر شہزاد کی غیر موجودگی میں بعض مشکوک افراد کا اس کے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔ بہت سے لوگوں کی نظر میں الماس کا کردار اچھا نہیں تھا۔

پولیس نے اس کے بیڈ روم سے دو گلاس بھی برآمد کیے تھے جن میں سے ایک پر الماس کی انگلیوں کے نشان تھے جب کہ دوسرے گلاس پر نشان کسی حد تک مٹ چکے تھے اور قابل شناخت نہیں رہے تھے البتہ یہ بات کنفرم کر دی گئی تھی انگلیوں کے یہ نشان سکندر شہزاد کے ہرگز نہیں تھے۔

چنانچہ سکندر شہزاد کو شک کے دائرے سے خارج کر دیا گیا۔ اب پولیس اس نامعلوم قاتل کی تلاش میں تھی جس سے الماس نے آخری ملاقات کی تھی۔

ان خیالات کے ساتھ ہی الماس کی یاد اس کے ذہن میں پھر سے تازہ ہو گئی تھی۔ سکندر شہزاد سوچ رہا تھا کہ اگر الماس اس سے بے وفائی نہ کرتی تو آج زندہ ہوتی مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ سب سوچتے ہوئے سکندر شہزاد نے گھڑی پر نظر دوڑائی تو اسے وہاں کھڑے نصف گھنٹہ ہو چکا تھا۔

-☆-

آفاق احمد کی شاہدہ سے ملاقات ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ جو پہلے دوستی اور پھر محبت میں بدل گئی۔ شاہدہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے خاص طور پر آفاق احمد کو اپنی سالگرہ کے روز گھر بلایا تھا تا کہ اپنی

ماں سے ملوا سکے۔
پہلی ملاقات میں ہی شاہدہ کی ماں نے آفاق احمد کو اپنی بیٹی کے لیے پسند کرلیا تو منگنی کے لیے اگلے اتوار کا دن طے پا گیا تاکہ اس دوران آفاق احمد اپنے والدین کو بھی دوسرے شہر سے منگنی کی تقریب میں شرکت کے لیے بلا سکے۔
رات کا کھانا کھانے کے بعد آفاق نے جیب سے ہزار ہزار کے بیس نئے نوٹ نکال کر شاہدہ کی ہتھیلی پر رکھ دیے اور کہا کہ وہ اپنی پسند کے مطابق منگنی کی شاپنگ کرلے۔
الماس یہ رقم لینے کے لیے تیار نہیں تھی مگر آفاق احمد کا دل رکھنے کے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ پھر آفاق احمد، شاہدہ اور اس کی والدہ کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے باہر آ گیا۔
اس روز آفاق احمد بہت خوش تھا اور نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ چنانچہ اس نے گھر واپس جانے کے بجائے گھومنے پھرنے کا پروگرام بنایا اور کار آگے بڑھا دی۔ ابھی اس نے سنسان سڑک پر چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا کہ عقب سے وہ کار نمودار ہوئی جو اس نے سکندر شہزاد کے ہاتھ فروخت کی تھی۔
کار سکندر شہزاد ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ برابر میں پہنچ کر اس نے آفاق احمد کو رکنے کا اشارہ کیا تو اُس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے۔ اس نے یہ سوچ کر گاڑی سائیڈ پر روک لی کہ ممکن ہے یہ اتفاقیہ ملاقات ہو اور سکندر شہزاد اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہو۔
جونہی گاڑیاں سنسان سڑک پر ساکت ہوئیں سکندر شہزاد اپنی گاڑی سے نکل کر آگے بڑھا اور اس کی کار کا دروازہ کھول کر آفاق احمد کے مقابل بیٹھ گیا۔ پھر اس سے قبل کہ آفاق احمد زبان سے کچھ کہتا سکندر نے جیکٹ کی جیب سے ریوالور نکالا اور اس کا دستہ پوری قوت سے آفاق احمد کے سر پر دے مارا۔
ضرب اس قدر اچانک اور شدید تھی کہ آفاق احمد کا سر اسٹیئرنگ سے جا ٹکرایا۔ سکندر شہزاد اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا دوسرا اور پھر تیسرا وار کر کے اس کی کھوپڑی کو عقب سے چکنا چور کر دیا۔
اپنے کام سے فارغ ہو کر سکندر شہزاد نے اس کی نبض چیک کی۔ آفاق احمد کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ مکمل اطمینان کر لینے کے بعد سکندر شہزاد نے ڈیش بورڈ پر پڑا پرس اٹھا کر اپنی جیب میں منتقل کیا۔ پھر اس کی گھڑی، سونے کی چین، گھر کی چابی وغیرہ بھی اٹھا لی تاکہ تمام شواہد ڈکیتی کی طرف اشارہ کریں۔ اس کے بعد سکندر شہزاد نے کار کے ہینڈل وغیرہ صاف کر کے اپنی انگلیوں کے نشان مٹا دیے اور واپس اپنی کار میں آ بیٹھا۔
جب وہ جائے وقوعہ سے دور نکل آیا تو اس نے ایک شاپنگ مال کی پارکنگ میں گاڑی روک کر جیب سے آفاق کا پرس نکالا اور بے تابی سے تلاشی لینے لگا۔ مگر یہ دیکھتے ہی اس پر سکتہ طاری ہو گیا کہ بٹوے میں سے تیس ہزار روپے برآمد ہوئے تھے جن میں صرف دس نوٹ جعلی تھے۔
اس ناکامی پر سکندر شہزاد نے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ ایک ایسا قتل کر بیٹھا تھا جس سے اس کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ وہ پھانسی گھاٹ کے مزید قریب پہنچ چکا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ آفاق احمد، شاہدہ کو بتا چکا ہو کہ آج اس نے کس شخص سے اتنا منافع کمایا ہے۔
''آفاق احمد کی شاہ خرچیاں ایسی دکھائی نہیں دیتیں کہ وہ اتنے تھوڑے وقت میں بیس ہزار روپے کی جعلی کرنسی خرچ کر ڈالے اور پھر پکڑا بھی نہ جائے.... ایسا نہیں ہوسکتا، معاملہ کچھ اور ہے۔'' سکندر شہزاد نے بڑبڑاتے ہوئے سوچا: ''دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو آفاق احمد بیس ہزار روپے کہیں رکھ کر آیا ہے اور یا پھر شاہدہ کو دیے ہیں۔''
اب اس کے پاس دو راستے تھے یا تو آفاق احمد کے گھر کی تلاشی لے اور یا شاہدہ کے گھر کی....اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔ آفاق احمد کی لاش سڑک کے کنارے پڑی تھی اور کسی بھی وقت پولیس کو مل سکتی تھی۔
ان حالات میں سکندر شہزاد کا زیادہ شک شاہدہ کی

جانب تھا کیوں کہ مرد کی فطرت ہے کہ وہ محبوبہ پر نوٹ نچھاور کرتے وقت کبھی کنجوسی سے کام نہیں لیتا۔
لہٰذا اس نے فوری طور پر شاہدہ سے ملنے کا فیصلہ کیا اور چہرے پر دوبارہ میک اپ کر کے گیٹ اپ بدلنے لگا جو اس نے آفاق احمد کی کار کو روکتے وقت صاف کر لیا تھا۔

-☆-

شاہدہ روز مرہ کے کام نمٹا کر سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ آفاق کی گھر میں آمد اور پھر آناً فاناً منگنی کا فیصلہ ہو جانا یقیناً اس کے خوابوں کی تکمیل تھی۔
آفاق احمد کے دیے ہوئے بیس ہزار روپے اس نے اپنی الماری میں رکھ دیے تھے اور ماں کے ساتھ پروگرام بنایا تھا کہ پرسوں دونوں بازار جا کر منگنی کی شاپنگ کر لیں گی۔ وہ جاگتی آنکھوں سے سپنے دیکھنے میں محو تھی کہ اطلاعی گھنٹی نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔
''اس وقت کون آ سکتا ہے؟'' وہ سوچتے ہوئے بستر پر اُٹھ بیٹھی۔ اسی لمحے گھنٹی دوبارہ بجی تو شاہدہ کی والدہ بھی اپنے کمرے سے باہر آ گئیں اور گھر کے صدر دروازے کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں پوچھا:
''کون ہے....؟''
''جی میں ہوں آفاق احمد....''
باہر سے دھیمی اور کھانستی ہوئی آواز سنائی دی تو شاہدہ کی والدہ آفاق کی آواز نہ پہچان پائیں اور یہ سوچ کر دروازہ کھول دیا کہ ممکن ہے وہ کوئی چیز بھول گیا ہو اور یاد آنے پر واپس لوٹ آیا ہو۔
دروازہ کھولتے ہی انہوں نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے سامنے دیکھا تو وہاں آفاق احمد کے بجائے کوئی اور شخص کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں لوہے کا راڈ تھا۔
''کون ہو تم....؟''
ایک اجنبی کو سامنے دیکھ کر انہوں نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔ جواب میں اجنبی کا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور لوہے کا راڈ پوری قوت سے بزرگ خاتون

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ کہانیوں پر آپ کے تبصروں پر مشتمل خطوط (گفتگو) ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔
☆ خصوصی توجہ: ای میل سے کہانیاں ارسال کرنے والے مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کے اختتام پر اپنا اردو میں مکمل ایڈریس اور موبائل فون نمبر ضرور تحریر کریں۔
☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

7، فرید چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

کے سر سے جاٹکرایا۔ نحیف خاتون کے لیے ایک ہی ضرب کافی ثابت ہوئی تھی اور وہ بنا منہ سے آواز نکالے زمین بوس ہوگئی۔
سکندر شہزاد سمجھ گیا تھا کہ گھر میں بڑھیا کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے چنانچہ وہ جلدی سے ایک پودے کی اُوٹ میں ہوگیا۔ اسے وہاں چھپے بمشکل چند سیکنڈ گزرے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک خوب صورت لڑکی اندازِ بے نیازی سے چلتی ہوئی باہر نکل آئی.... یقیناً یہی شاہدہ تھی۔ جونہی لڑکی کی نظر زمین پر گری ہوئی خاتون پر پڑی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ امی جان کا نعرہ لگاتے ہوئے اس کی جانب بڑھی۔
ماں کو خون میں لت پت دیکھ کر شاہدہ وقتی طور سکتے میں آگئی تھی۔ اسی لمحے کا سکندر شہزاد کو فائدہ اٹھانا تھا۔ وہ پودے کی اوٹ سے باہر نکلا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا راڈ لڑکی کے سر پردے مارا۔ بیٹی بھی ماں کی طرح ایک ہی ضرب سے ڈھیر ہوگئی تو سکندر شہزاد نے انہیں کھینچ کر نیم تاریکی میں پھینک دیا اور خود گھر کی اندرونی عمارت میں جا گھسا۔
گھر میں تین کمرے تھے۔ سکندر شہزاد کو شاہدہ کا کمرہ تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس کی کتابیں، سٹڈی ٹیبل اور تصاویر دیکھ کر سکندر شہزاد کو یقین ہوگیا تھا کہ یہی شاہدہ کا کمرہ ہے۔
چنانچہ اس نے کمرے کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ بمشکل پندرہ منٹ بعد اسے ایک الماری سے جعلی کرنسی کے وہ بیس نوٹ مل گئے جن کی تلاش میں وہ تین قتل کر چکا تھا۔
گھر واپسی کے دوران سکندر شہزاد نے ہر وہ چیز جس کا تعلق مقتولین سے ہوسکتا تھا ایک نہر میں پھینک دی۔ اس میں وہ سامان بھی شامل تھا جو اس نے آفاق احمد کی کار اور شاہدہ کے گھر سے ڈکیتی ظاہر کرنے کے لیے اٹھایا تھا۔

-☆-

اگلے روز سکندر شہزاد دیر تک بے فکری کی نیند سوتا رہا۔ آج اس کا گھر سے باہر جانے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔
اس وقت شام کے پانچ بجے تھے کہ ملازمہ نے اسے انسپکٹر شرجیل کی آمد کی اطلاع دی۔ انسپکٹر شرجیل اس کے دوستوں میں سے تھا اور اکثر ملنے آتا رہتا تھا۔ سکندر شہزاد نے اسے اپنے بیڈ روم میں ہی بلوالیا۔
''کافی دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اچھا کیا ملنے چلے آئے....'' سکندر شہزاد نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود بھی قریب ہی بیٹھ گیا۔
''تم نے صحیح کہا واقعی بہت دنوں بعد ملاقات ہو رہی ہے.... لیکن آج میں ایک سرکاری کام سے آیا ہوں اس لیے زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔'' شرجیل نے کیپ اتار کر میز پر رکھی۔
''کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہیں میری الماس کے قاتل کا سراغ مل گیا ہے؟'' سکندر شہزاد کے لہجے میں ایک آس تھی۔
''نہیں دوست! میں اس لیے نہیں آیا.... یہ بتاؤ تم کہ کسی آفاق احمد نامی نوجوان کو جانتے ہو؟''
''آفاق احمد! ہاں جانتا ہوں۔ وہ ایک کار ایجنٹ ہے۔ میں نے اپنی گاڑی اس کی گاڑی سے تبدیل کی تھی۔'' سکندر شہزاد نے بے پروائی سے جواب دیا: ''ویسے مسئلہ کیا ہے؟ کہیں اس نے چوری کی کار تم نہیں بیچ دی مجھے۔''
''ایسی بات نہیں۔ دراصل آفاق احمد گزشتہ رات قتل ہوگیا ہے.... تفتیش کے دوران ہمیں اس کے گھر سے ایک ٹرانسفر لیٹر ملا جس میں تم نے اپنی گاڑی فروخت کرنے کی تصدیق کی تھی۔ بس یہی پوچھنے تمہارے پاس آگیا کہ ممکن ہے اس کیس کو سلجھانے کے لیے کوئی نئی بات معلوم ہوجائے۔'' انسپکٹر شرجیل نے تفصیل بتائی اور پھر سامنے میز پر رکھا ہوا مشروب کا گلاس اٹھا کر چسکیاں لینے لگا۔
''میری آفاق احمد سے ملاقات ایک کار پارکنگ میں ہوئی تھی۔ مجھے اس کی گاڑی پسند آگئی۔ جب اس

نے بتایا کہ وہ ایک کار ایجنٹ ہے تو ہمارے درمیان سودے بازی ہونے لگی۔ معاملہ یہ طے پایا کہ میں اسے اپنی گاڑی اور پچاس ہزار روپے ادا کر کے اس کی کار حاصل کر سکتا ہوں یہ سودا طے پانے کے بعد کاغذی کارروائی مکمل کی گئی اور آفاق کو پچاس ہزار روپے بھی ادا کر دیے گئے.... بس اتنی سی بات ہے۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے.... حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ہی رات میں آفاق احمد کے ساتھ ساتھ اس کی ہونے والی منگیتر اور ساس کا قتل بھی ہو گیا۔ جب کہ تمام قتل ایک ہی طریقے سے کیے گئے.... یعنی قاتل نے سب کے سر پر آہنی چیز سے وار کیا ہے۔ بہر حال میں پر اُمید ہوں کہ جلد قاتل اپنے انجام تک پہنچ جائے گا۔ مجرم جتنا بھی ہوشیار کیوں نہ ہو جرم کے بعد تفتیش کے لیے کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور چھوڑ جاتا ہے۔"

انسپکٹر شرجیل نے اس سے الوداعی مصافحہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

-☆-

نئے فلیٹ میں اپنا سامان شفٹ کرنے کے بعد زرقا، آفاق احمد کو فون کرنے کی متعدد بار کوشش کر چکی تھی مگر اس کا موبائل مسلسل بند تھا۔ چنانچہ زرقا نے غصے میں مزید کوشش کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

زرقا کی شروع سے عادت تھی کہ وہ سنڈے کا اخبار ضرور پڑھتی تھی۔ فرصت کے لمحات میسر آتے ہی اخبار کی طلب ہونے لگی تو اس نے ہمسائے سے ایک بچے کو پیسے دے کر مارکیٹ سے اخبار منگوا لیا اور گرما گرم چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے مطالعہ کرنے لگی۔

اخبار کے پہلے صفحے پر سرسری نظر دوڑا کر جیسے ہی دوسرا صفحہ پلٹا اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اور ہاتھ کانپنے سے چائے چھلک کر اخبار پر گر گئی.... یہ خبر پڑھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی کہ آفاق احمد نامی نوجوان کو گزشتہ رات قتل کر دیا گیا۔ پولیس نے اسے ڈکیتی کی واردات قرار دیا تھا۔"

"اوہ خدایا! آفاق احمد کو قتل کیوں کر دیا گیا۔ وہ بھی صرف پچاس ہزار کے لیے جو اسے دفتر سے ادا کیے گئے تھے۔" زرقا روتے ہوئے تفصیل پڑھ رہی تھی جس میں قتل کی وجہ ڈکیتی قرار دی جا رہی تھی مگر کہیں پچاس ہزار روپے کا ذکر نہیں تھا۔

اخبار کے اسی صفحے پر شاہدہ اور اس کی والدہ کے قتل کی خبر بھی موجود تھی۔ شاہدہ کو آفاق کی ہونے والی منگیتر قرار دیا جا رہا تھا۔ زرقا یہ سوچ کر پریشان تھی کہ آخر شاہدہ کو کیوں قتل کیا گیا۔

خبر پڑھنے کے بعد زرقا نڈھال سی ہو گئی۔ وہ ہر پہلو سے اس واردات کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر زرقا یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ سکندر شہزاد سے مشورے کے بعد کل خود پولیس اسٹیشن جا کر تفتیشی افسر کے سامنے اپنا بیان ریکارڈ کروائے گی اور ان پچاس ہزار کا ذکر بھی ضرور کرے گی۔

-☆-

سکندر شہزاد مقررہ وقت پر آفس پہنچا تو زرقا حسب معمول پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ سکندر شہزاد نے بھی اس کی پریشانی بھانپ لی تھی:

"خیر تو ہے.... تم آج پھر پریشان دکھائی دے رہی ہو؟" اس نے خود زرقا کو کریدا۔

"سر کیا آپ کو معلوم ہے کہ مسٹر آفاق احمد کو قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ بھی پیمنٹ وصول کرنے کے صرف چند گھنٹے بعد؟"

"ہاں میں نے اخبار میں پڑھا ہے اور مجھے بہت افسوس ہوا ہے اس واردات پر۔ پولیس اس سلسلے میں تفتیش کر رہی ہے۔ وہ لوگ میرے پاس بھی آئے تھے۔ میں نے انہیں کار کے بارے میں بھی بتا دیا ہے جو آفاق احمد سے خریدی تھی۔ اُمید ہے اصل مجرم جلد بے نقاب ہو جائے گا۔" سکندر شہزاد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ وہ اس قتل کو معمول کی واردات قرار دینا چاہتا تھا۔

"سر میرا خیال ہے کہ میں خود بھی پولیس اسٹیشن جا کر اپنا بیان قلمبند کروا دوں، ہو سکتا ہے اس طرح

قاتل تک پہنچنے میں آسانی ہو جائے۔"
زرقا کا ارادہ معلوم ہوتے ہی سکندر شہزاد کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے چہرے کے تاثرات پر قابو رکھا اور پرسکون لہجے میں بولا:
"تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں نے پولیس کو سب کچھ تفصیل سے بتا دیا ہے.... مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے اسے پچاس ہزار روپے کیش دیا تھا۔ دراصل اسی شام مجھے پیسوں کی ضرورت پڑ گئی تو میں آفس آیا اور لفافے میں پڑا چیک دیکھ کر سمجھ گیا کہ تم نے اسے کیش دیا ہے۔"
"لیکن سر آپ نے پولیس کو یہ نہیں بتایا ہوگا کہ آفاق احمد کو ادا کیے گئے نوٹ بالکل نئے تھے اور ایک ہی گڈی سے حاصل کیے گئے تھے.... اگر انہیں نوٹوں کے سیریل نمبر بتا دیے جائیں تو یقیناً قاتل تک پہنچنے کی راہ نکل سکتی ہے۔"
زرقا کی باتیں سن کر سکندر شہزاد کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ دھان پان سی لڑکی اتنی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ انسپکٹر شرجیل اکثر سکندر شہزاد سے ملنے آفس آ جاتا تھا اور زرقا کی خیریت ضرور دریافت کرتا تھا.... ان حالات میں اگر احمق زرقا یہ ساری باتیں اسے سنانے بیٹھ جاتی تو تفتیش کے نئے در وا ہو جاتے۔ ویسے بھی شرجیل نہایت اصول پسند پولیس افسر تھا اور اپنے کام کے سلسلے میں کسی کی غلط بات نہیں سنتا تھا۔
سکندر شہزاد نے دبے لفظوں میں کئی بار زرقا کو سمجھایا کہ وہ کورٹ کچہری کے چکر میں پڑ کر خود کو مصیبت میں نہ ڈالے مگر اس پر تو اپنا فرض ادا کرنے کا بھوت سوار تھا۔ جب پانی سر سے اونچا ہوتا دکھائی دینے لگا تو اس نے زرقا سے کہا۔
"انسپکٹر شرجیل سے میری بات ہو گئی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آپ فی الحال زرقا کو پولیس اسٹیشن مت بھیجیں.... وہ تمہیں آج شام تمہارے فلیٹ میں ملنا چاہتا ہے۔ ایسا کرنا کہ جاتے ہوئے اپنا نیا ایڈریس لکھ کر مجھے دے جانا۔ انسپکٹر شرجیل نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں اسے تمہارا ایڈریس بتا دوں گا۔"
جواباً زرقا نے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے اپنی سیٹ پر جا بیٹھی.... وہ شدید ڈپریشن میں دکھائی دے رہی تھی۔ سکندر شہزاد نے اسے دوپہر کو ہی گھر بھیج دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انسپکٹر شرجیل اچانک یہاں آ دھمکے اور زرقا کو اس سے گٹ مٹ کرنے کا موقع مل جائے۔
چھٹی ملنے پر زرقا نے سکندر شہزاد کا شکریہ ادا کیا اور اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر خاموشی سے گھر چلی گئی۔
اب سکندر شہزاد کے لیے زرقا کا قتل ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس بے وقوف لڑکی نے پرائی آگ میں کود کر اپنے لیے موت کا سامان پیدا کر لیا تھا۔ سکندر شہزاد نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ زرقا کو اس کے نئے فلیٹ میں قتل کرے گا۔ چنانچہ ایک گھنٹہ بعد اس نے زرقا کو فون کر کے یہ جھوٹی اطلاع دے دی کہ انسپکٹر شرجیل آج رات آٹھ بجے تفتیش کے لیے تمہارے فلیٹ پر آئیں گے۔

☆

شام ڈھلتے ہی سکندر شہزاد نے اپنی گاڑی زرقا کے فلیٹ کے قریب پارک کی اور پرسکون انداز میں چلتا ہوا آگے بڑھا۔ سکندر شہزاد اس وقت میک اپ میں تھا اور اسے پہچان لیے جانے کی فکر نہیں تھی۔
جب وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا فلیٹ کے سامنے پہنچا

بکھرے موتی
قرآن مجید کی برکت
حضرت انس و جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانو!
اپنے گھروں میں اکثر قرآن مجید پڑھتے رہا کرو کیوں کہ جس گھر میں قرآن مجید نہیں پڑھا جاتا اس میں خیر و برکت نہیں ہوتی۔
(دراقطنی جی السنن)
عثمان عبداللہ.... کراچی

تو دروازہ خلاف توقع کھلا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازے پر دستک دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ سکندر نے اس لمحے یہی سوچا کہ ممکن ہے زرقا دروازہ کھلا چھوڑ کر پڑوس میں گئی ہو تا کہ انسپکٹر شرجیل دروازہ بند دیکھ کر واپس نہ لوٹ جائے۔

یہ تجزیہ کرنے کے بعد اس نے جیکٹ سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور بجلی کی سی تیزی سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی سکندر شہزاد نے دیوار پر ہاتھ پھیر کر بجلی کا بورڈ تلاش کرنا چاہا کمرہ یکلخت تیز روشنی میں نہا گیا اور انسپکٹر شرجیل کی آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا:

''خوش آمدید سکندر شہزاد.... مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔''

''شرجیل تم....اور زرقا کہاں ہے؟'' سکندر شہزاد نے چونک کر پوچھا۔

''زرقا اس وقت پولیس کی حفاظت میں ہے۔ مگر تم یہ مت بھولنا کہ میرے ریوالور کا رخ تمہاری جانب ہے ....اپنا ریوالور زمین پر پھینک دو۔ تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے ....اور ہاں کوئی چالاکی مت دکھانا۔'' اس نے سکندر شہزاد کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کرخت لہجے میں خبردار کیا۔

سکندر شہزاد سمجھ گیا تھا کہ اس کا راز فاش ہو گیا ہے۔ انسپکٹر شرجیل اصول پسند آدمی تھا۔ اگر اس کے پاس ٹھوس ثبوت نہ ہوتا تو وہ کبھی سکندر پر ہاتھ نہ ڈالتا۔ اب اقبال جرم کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے ٹھنڈے دماغ سے کام لیتے ہوئے معاملے کو سلجھانے کا فیصلہ کیا اور بولا:

''میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں شرجیل ....اب بہتر یہی ہوگا کہ تم بھی اپنی دوستی کا حق ادا کرو اور مجھے واپسی کا محفوظ راستہ دے کر کیس کا رخ بدل دو۔'' سکندر شہزاد اس پل ہارے ہوئے جواری کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ ''ہاں البتہ میں اتنا ضرور جاننا چاہوں گا کہ مجھ سے ایسی کون سی غلطی ہوئی کہ تم مجھ تک پہنچ گئے۔''

''تم سے کوئی ایک غلطی نہیں ہوئی .... میں بہت عرصے سے تمہارے تعاقب میں تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ تم جعلی کرنسی کا دھندا بھی کرتے ہو۔''

''اگر تمہیں یہ سب معلوم تھا تو مجھے گرفتار کیوں نہ کیا؟'' سکندر شہزاد حیرت سے بولا۔

''کیوں کہ میں اس ایک لمحے کا منتظر تھا جو آج مجھے میسر آیا ہے....تم نے شاید یہ بات کبھی خواب میں بھی نہ سوچی ہو گی کہ وہ آخری مرد جس سے تمہاری بیوی الماس نے مرنے سے چند منٹ قبل ملاقات کی، وہ میں تھا....لہٰذا مجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ الماس کا قتل تم نے خود کیا تھا۔ میں اور الماس ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ وہ تمہارے مظالم سے تنگ آ گئی تھی اور طلاق لے کر مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ پر تم نے ہمارے خواب چکنا چور کر دیے....میں نے اسی دن عہد کر لیا تھا کہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔ اس کے بعد میں نے تم سے دوستی بڑھا کر نگرانی شروع کر دی اور زرقا سے بھی معلومات حاصل کرتا رہا کہ کس وقت تم کیا کرتے ہو.... یوں مجھے یہ راز بھی معلوم ہو گیا کہ تم نے جعلی کرنسی کا دھندا شروع کر دیا ہے۔ اگر میں تمہیں جعلی کرنسی کے کیس میں گرفتار کرتا تو محض چند سال کی سزا ہوتی جس سے مجھے سکون نہ ملتا۔ چنانچہ میں نے تمہیں مزید جرائم کرنے کی مہلت دی....اب تمہارے گناہوں کی فہرست اتنی طویل ہو چکی ہے کہ میں تمہیں پولیس مقابلے کے نام پر جان سے مار کر انتقام کی آگ بجھا سکتا ہوں۔''

یہ کہتے ہی انسپکٹر شرجیل نے ریوالور کے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا....لمحہ بھر میں سروس ریوالور نے دو دہکتے ہوئے انگارے اُگلے اور سکندر شہزاد کٹے ہوئے شہتیر کی مانند زمین پر گر گیا۔

ہم جان

فارس مغل

دوسرا حصہ

معروف ناول نگار فارس مغل اردو ادب میں ہَوا کے ایک جھونکے کی مانند ہیں ان کے لکھنے کا انداز دوسروں سے یکسر مختلف ہے نئے افق کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ہمیشہ اچھے لکھنے والوں کی پزیرائی کی سو فارس مغل کا ایک انوکھا ناول ''ہمجان'' نئے افق کے قارئین کے لیے قسط وار حاضر ہے یقیناً قاری اسے پسندیدگی کی سند عطا کریں گے بقول خالد شریف فارس مغل کا قلم معجزے تخلیق کرتا ہے وہ نثر میں شاعری کرتا ہے دہلی انڈیا کے ڈاکٹر نگار عظیم کے مطابق فارس مغل نے ہمجان میں زبان و بیاں کو ایک نیا پیراہن عطا کیا ہے کرافٹ اور تکنیک نے اس موضوع کو کمال کا بنا دیا ہے بقول محمود ظفر اقبال ہاشمی فارس نے ہمجان کی کہانی کو کسی فول پروف پراجیکٹ پلان کی طرح کچھ اس مہارت سے تراشا ہے کہ ناول کے مطالعہ کا تجربہ کسی سپرہٹ فلم کی طرح لگتا ہے۔

آیئے آپ بھی مطالعہ کیجیے اور اپنی رائے دیجیے کہ آپ نے اسے کیسا پایا

دو نومبر کو زمین کی سالگرہ تھی اور میں اسی فکر میں رہتا کہ اسے کیا تحفہ دینا چاہیے ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے جسے دیکھ کر وہ حقیقی معنوں میں خوش ہو سکے ایسی خوشی جس میں کوئی مصنوعی پن نہ ہو اور اپنی سالگرہ والے دن وہ سچ مچ کھلا ہوا گلاب دکھائی دے۔

اُس دن بھی میں اسی سوچ میں غلطاں اسکے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک اس نے سوال کیا ''میری سالگرہ پہ تم مجھے کیا تحفہ دو گے غفران۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا کہ اسے کیسے خبر ہو گئی کہ میں اس کی سالگرہ کے متعلق ہی سوچ رہا ہوں۔

وہ مونا لیزا کی مسکراہٹ کے ساتھ میری جانب دیکھے جا رہی تھی۔

''او میرے خدایا سچ بتاؤ تمہیں کیسے پتہ چل گیا کہ میں اس وقت اسی بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''محبت تو تم نے کر لی ہے اب اسے محسوس کرنا بھی سیکھ لو۔''

ایسی قاتلانہ مسکراہٹ میں نے پہلے کبھی اس کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

''میں نے سوچا ہے کہ اگر میں تمہاری سالگرہ پر تمہیں ایک بہت ہی خوبصورت لباس تحفتاً دوں اور جب تم وہی لباس اپنی سالگرہ والے دن پہن کر آؤ گی تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔۔کیا خیال ہے؟''

''پوچھتے کیوں ہو۔۔ پوچھو مت ۔۔حکم دو ۔۔مجھے بھی خوشی ہو گی۔''

ایسی محبت بھری شکایت میں نے کبھی نہیں سنی تھی آج تو وہ سراپا محبت کی دیوی بنی بیٹھی تھی۔ میں نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر ہونٹوں کی طرح رکھی ہوئی تھیں فضا میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ اچانک اس کی آواز نے ہلچل سی پیدا کر دی۔

''کیا تم مجھے میری سالگرہ پر میری مرضی کا بھی ایک تحفہ دے سکتے ہو۔''

''کیوں نہیں؟ لیکن جو بھی مانگنا وہ میری اوقات اور حیثیت کو مدنظر رکھ کر۔'' میرے اندر طبقاتی فرق نے سر اٹھایا۔

اس نے میری طرف گھورتے ہوئے بات کاٹی۔ ''بہت فضول انسان ہو تم۔'' وہ مسلسل کچھ دیر تک مجھے گھورتی رہی۔

بالآخر میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''اچھا بابا۔ معاف کر دو اور بتاؤ کیا چاہیئے؟'

اگلے ہی لمحے اس نے گھورنا ترک کر کے آنکھیں جھکا لیں اور اپنے ناخن سے نوٹ بک کا کونا کریدتے ہوئے کچھ توقف کے بعد لب وا کیئے ''مجھے تم سے ایک وعدہ چاہیے''

میری نظر اس کی نوٹ بک کا کونا کریدتے ہوئے ناخن پر تھی اور اس لمحے مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی اپنے ناخن سے میرے دل کو کریدنے والی ہے

'' کیسا وعدہ۔'' میرے حلق میں اچانک صدیوں کی پیاس اتر آئی

اس نے میرے ہاتھوں پر اپنے ہاتھوں کو رکھتے ہوئے اداس نظروں سے میری طرف دیکھا ''وعدہ کرو کہ۔۔''

میری آنکھوں میں نمی کے آثار دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی

میں کہ اس کے ہاتھوں کی زبان سے واقف تھا اور جان چکا تھا کہ اس کے دل میں ضرور کوئی اداس وعدہ لبوں پر آنے کو مچل رہا ہے

''مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر کبھی میں کہیں کھو گئی تو تم مجھے تلاش نہیں کرو گے اپنی زندگی کو میری گمشدگی کی بھینٹ چڑھا کر اسے برباد نہیں کرو گے۔۔وعدہ کرو''

میرے پورے وجود کا شہر آن ہی آن میں زلزلے کی نذر ہو کر ملبے کا ڈھیر بن گیا ''یہ کیسا وعدہ ہے کہاں کھو جاؤ گی''

''فکر نہ کرو اتنی جلدی نہیں مرنے والی''

''کیا تمھاری شادی ہو رہی ہے؟'' میں نے ٹھہر ٹھہر کر استفسار کیا
وہ خاموش ہو گئی۔
''بتاؤ نرمین ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا'' اس سے واقعی مجھے اپنا سانس اکھڑتا ہوا محسوس ہوا۔
بے نیاز دکھائی دینے والی محبت درحقیقت کتنی بے بس ہوتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ 'کھو جانے' سے اس کی کیا مراد ہے لیکن میں چپ چاپ اپنے وجود کے ملبے پر آنسو بہاتا رہا اس نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کو اوپر اٹھا کر میری آنکھوں سے آنسو پونچھنے کی کوشش کی۔
''وعدہ ہے ناں'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔
میں نے کافی دیر تک اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے رکھے۔
''کہا بھی تھا کہ جو کچھ بھی مانگنا وہ میری اوقات اور حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مانگنا لیکن تم نے تو۔'' میری آنکھیں اور اس کے ہاتھ آنسوؤں میں بھیگتے چلے گئے۔
''میں وعدہ کرتا ہوں۔۔'' انگار کی صورت دہکتا ہوا وعدہ میں نے اپنی زبان پر رکھ دیا۔
میری بے بسی کیمپس کی اداس فضا میں دھنکی ہوئی روئی کی مانند اڑتی ہوئی سدا بہار پائن کے درختوں کے ساتھ ٹکرانے لگی۔۔

☆

اس دن کے بعد نرمین بہت کم کم یونیورسٹی آنے لگی تھی میری اس بات پر اس سے بہت لڑائی رہتی لیکن ہر مرتبہ لڑائی میں فتحیاب اس کی مسکان ہو جاتی۔ اس کی سالگرہ میں ابھی دو ہفتے باقی تھے کہ جب میں نے اسے ایک خوبصورت لباس یہ وعدہ یاد دلاتے ہوئے تحفتاً پیش کیا کہ وہ اسی لباس میں اپنی سالگرہ والے دن یونیورسٹی میں داخل ہو گی ورنہ میں بھی اس کا دیا ہوا وعدہ توڑ دوں گا۔
اس کے جواب میں اس نے بہت پیار سے میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں رکھتے ہوئے کہا تھا۔ میں اپنی سالگرہ والے دن اگر تم سے ملے بغیر اگر مر بھی گئی تو تمھیں بعد میں پتہ چل جائے گا کہ میں نے اپنے مرن دن پر یہی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔''
وہ بہت دیر تک میرے تحفے کو سینے سے لگائے مجھے دیکھتی رہی اس کی آنکھوں میں محبت کے اتنے سارے رنگ تھے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی اس کی باتوں میں کڑواہٹ در آئی تھی وہ بظاہر عام سی بات عام سے لہجے میں ہی کرتی لیکن اس کی باتوں پر دل کو کاٹ کر ٹکڑے کر دینے والے کچھ الفاظ ضرور شامل ہوا کرتے کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے مجھ پر اس کے عشق کا دبدبہ ہے کیونکہ میں اس سے کئی باتیں پوچھنا چاہتا تھا لیکن میری کبھی ہمت نہ ہوئی مثلاً میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کے علاج کے بارے میں اس سے پوچھوں، یہ بھی پوچھوں کہ ڈاکٹر اب کیا کہتے ہیں؟ میڈیکل سائنس میں اگر اس بیماری کا علاج نہیں تو کسی حکیم، ہومیو پیتھک، پیر، فقیر سے کبھی رجوع کیا؟ تم اپنے باپ کے رویے کی سزا خود کو کیوں دے رہی ہو؟ اور زمانے کی بے رخی کا بدلہ میری محبت سے کیوں لے رہی ہو؟ یہ وہ تمام باتیں تھیں جو اسے اداس کر کے اس کے اندر بھرے ہوئے زہر کو باہر کھینچ نکالنے کیلئے کافی تھیں لیکن میں اپنی محبت کے ہاتھوں بے بس و مجبور تھا کہ اس کے نمکین آنسوؤں کے قطرے میرے دل کے زخموں پر گر کے درد کی انتہا کر دیتے!
وہ ایک شاندار لڑکی تھی اندر سے بکھری ہوئی لیکن ظاہری طور پر اپنی شخصیت میں پروقار، بے مثال ذہین اور باکمال اخلاق۔۔ وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے بھی اس کی قابلیت کا قد اتنا اونچا تھا کہ کلاس میں لیکچررز اس سے بدکتے تھے وہ اپنے بے پناہ حسن کے ساتھ ایک مکمل زندہ لڑکی تھی لیکن یہ بات صرف میں اور نرگس جانتے تھے کہ وہ اندر سے مر چکی تھی!

☆

یکم نومبر والے دن ڈیپارٹمنٹ میں زرمین کی سالگرہ کی تمام تیاریوں کو حتمی شکل دی جا رہی تھی کل پروگرام کے مطابق آخری پیریڈ کے اختتام پر کیک کاٹ کر خوب ہلہ گلہ ہونا تھا چونکہ سالگرہ ایک معذور لڑکی کی تھی اس لیے چیئرمین ڈیپارٹمنٹ نے بھی بخوشی اجازت دے دی تھی۔ پڑھے لکھے لوگ ثواب حاصل کرنے کیلئے ایسے مواقع کب ہاتھ سے جانے دیتے ہیں تمام کلاس فیلوز موجود تھے لیکن زرمین پچھلے تین روز سے یونیورسٹی سے غیر حاضر تھی لیکن سب کا یہی خیال تھا کہ آج اسے ضرور آنا چاہیے پہلا پیریڈ ختم ہو گیا لیکن زرمین کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا جب دوسرے پیریڈ کے اختتام تک بھی وہ نہ آئی تو سب کو تشویش ہونے لگی میں نے نرگس کو اس کے گھر فون کرنے کو کہا تب گھر سے معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے اس لیے وہ یونیورسٹی آنے سے قاصر ہے جب نرگس نے مجھے یہ بات بتائی تو مجھے محسوس ہوا جیسے اس نے آدھی بات چھپائی ہے۔ تمام کلاس فیلوز پہلے ہی سے یہ بات اچھی طرح سے جان چکے تھے کہ بھلے ہی زرمین کا تعلق ماڈرن طبقے سے تھا لیکن وہ آزادانہ طور پر اس کے گھر آ، جا نہیں سکتے تھے اور اسکی وجہ زرمین کے باپ کی سخت طبیعت تھی۔ جب سب زرمین کی ناساز طبیعت کو ڈسکس کر رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ نرگس کچھ زیادہ ہی افسردگی اور گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی میں اس کے قریب کرسی ڈال کر بیٹھ گیا اور وہ میری آنکھوں میں عیاں سوال کو بھانپ گئی کچھ لمحے خاموشی میں گزر گئے اس کے بعد اس نے ایک لحظہ ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے نہایت اداس لہجہ میں کہا۔

دو روز پہلے اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی اس لیے اسے کراچی لے گئے ہیں کل اس کا آنا ناممکن ہے۔''

میں چند لمحے بت بنا اسے تکتا رہا اور جب دل نے بیٹھنا شروع کر دیا تو میں بوجھل قدم اٹھاتا کلاس روم سے باہر نکل گیا۔ ذرا دیر بعد نرگس میرے پیچھے تیز قدم اٹھاتی ہوئی آئی اور ہم ساتھ چلتے ہوئے ڈیپارٹمنٹ سے دور نکل آئے وہ میری نمناک آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا بس ہم تو دعا ہی کر سکتے ہیں''

وہ زرمین کے لیے میری محبت کی شدت جانتی تھی اس لیے مجھے بہت دیر تک تسلیاں دیتی رہی!

جب ہم محبت کے عمل میں ہوتے ہیں تو اس کی دو میں سے ایک وجہ ضرور ہوتی ہے یا تو ہم اپنی ذات کی تکمیل کے خواہاں ہوتے ہیں یا پھر اپنے محبوب کے ادھورے وجود کو مکمل کرنا چاہتے ہیں اس کی ذات کے خالی حصوں میں رنگ بھرنے کی خواہش ہمیں ایسا کرنے پر خود بخود مجبور کرتی ہے میں محبت کی دوسری وجہ کا اسیر تھا۔۔ میں زرمین کی ادھوری پھیکی تصویر میں رنگ بھرتے بھرتے اپنی ذات بھی اس میں کہیں گم کر بیٹھا تھا اور اس کا احساس مجھے شدت سے ہو رہا تھا کہ میرے اپنے ہی آنسوؤں پر اختیار نہیں تھا میں اپنے سارے اختیار جانے انجانے میں زرمین کے حوالے کر چکا تھا میں اس کے غم نیت باندھ کر سنتا، فرض نماز کی طرح اس کے درد سہلاتا اور اس کے ہاتھوں پر سجدہ کرتا رہا لیکن آج جب اپنا درد دل کی دیواروں سے ٹکریں مارنے لگا تو معلوم ہوا دل کی کال کوٹھری کے اندر سے غم کی لاش ہی روح کے ساتھ پرواز کرتی ہے۔ جیتے جی غم سے فرار ممکن نہیں ہے۔

میری راہ میں اس کا وعدہ راستہ روکے کھڑا تھا کہ 'اگر کبھی میں کھو جاؤں تو مجھے تلاش مت کرنا' لیکن اس کا وعدہ نبھانے کیلئے میرا زندہ رہنا ضروری تھا۔ سو میں نے نرگس کو ٹیلی فون کر کے اس سے گزارش کی کہ وہ کسی بھی طرح سے مجھے کراچی کے اس اسپتال کا پتہ معلوم کر دے جہاں زرمین داخل تھی نرگس جانتی تھی کہ

میرے لیے نرمین تک پہنچنا زندگی اور موت کا سوال بن سکتا تھا چنانچہ اس نے دس منٹ بعد ہی مجھے میری منزل کا پتہ سمجھا کر مجھ پر احسانِ عظیم کر دیا!

......☆......

میں اسی شام کراچی جانے والی کوچ میں سوار ہو گیا

جوں جوں کوچ آگے بڑھتی جا رہی تھی میرے انتظار کا پیمانہ بھرنے لگا ایک عجیب سی بے چینی دل کے ساتھ دھڑکتی تھی

ہماری زندگی کتنی پرسکون ہوتی اگر اس میں انتظار نہ ہوتا خوشیوں اور غموں کے وقفے اتنے طویل نہ ہوتے کہ انہی وقفوں کے درمیان انسان بننے اور ٹوٹنے کے عمل سے گزرتا ہے۔کوئٹہ تا کراچی بارہ گھنٹے کے سفر میں مجھے نرمین کا ہجر توڑتا اور انتظار دوبارہ تعمیر کرتا رہا راستے، پہاڑ، گاؤں، شہر، ہوٹلز، کچے پکے گھروندے مجھے انتظار گاہیں معلوم ہوتی تھیں۔ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کے انتظار میں ہاتھ بھر فاصلے پر کھڑا تھا۔آنے والا راستہ جانے والے راستے کا منتظر تھا۔گاؤں کو شہر بننے اور شہر کو بڑا شہر بن جانے کا انتظار تھا۔ہر شے کسی نہ کسی کے انتظار میں مبتلا دکھائی دیتی تھی۔

صبح کے آٹھ بجے کوچ اپنی آخری منزل پر پہنچ گئی۔

میں کوچ سے اتر کر گلشن اقبال کیلئے ٹیکسی میں بیٹھ گیا گلشن میں میرے کزن شاہمیر کی ایک اپارٹمنٹ میں رہائش تھی وہ کراچی میں انجینئرنگ کالج میں زیر تعلیم تھا میری اور اس کی ملاقات بلڈنگ کی سیڑھیوں پر ہی ہوگئی جب وہ نیچے ہوٹل میں ناشتہ کرنے کے لیئے اتر رہا تھا میری آمد پر حیرت اور خوشی کا ملا جلا اظہار کرتے ہوئے وہ مجھے اوپر اپنے اپارٹمنٹ میں لے گیا ،میرے لیے صاف تولیہ نکالا اور تازہ دم ہونے کی ہدایت کرتا ہوا دوبارہ ناشتہ لانے کیلئے اپارٹمنٹ سے باہر دوڑ گیا۔میرا بدن واقعی تھکاوٹ سے ٹوٹ چکا تھا اس لیے میں بنا وقت ضائع کیے غسل خانے میں چلا گیا باہر نکلا تو کمرے میں پنکھے تلے ناشتہ چنا ہوا تھا۔چائے کی پیالی تلے ایک کاغذ پھڑ پھڑا رہا تھا۔میں نے شاہمیر کو ادھر ادھر تلاش کرنے کے بعد کاغذ کو اٹھایا تو اس میں انتہائی عجلت میں لکھی گئی تحریر میری نگاہوں کے سامنے تھی"آج کالج میں presentation دینی ہے already لیٹ ہو گیا ہوں تم ناشتہ کر کے سو جانا afternoon کے بعد ملاقات ہوگی"تحریر کے نیچے ایک بڑی سی مسکراہٹ بنی ہوئی تھی۔میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو وہ ساڑھے نو کا وقت تھا۔میں نے اطمینان سے پیالی میں چائے انڈیلی اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر چسکیاں لینے لگا۔دسترخوان پر حلوہ پوریاں بھی اخبار میں لپٹی دھری ہوئیں تھیں لیکن میرا ذہن جو کہ کچھ دیر کیلئے نرمین کو یکسر بھول چکا تھا دھیرے دھیرے واپس اس کی یاد کے حصار میں لوٹنے لگا۔میٹھی الائچی والی چائے یک دم پھیکی اور بد مزہ سی ہوگئی اضطراب میں اضافہ ہوتا چلا گیا کمرے میں مدھم رفتار سے چلتے ہوئے پنکھے کا ہلکا سا شور میرے ذہن پر حاوی ہونے لگا میں نے چائے کی پیالی دسترخوان پر رکھ کر دیوار کے ساتھ سر ٹکا دیا اور نرمین کے تصور میں آہستہ آہستہ میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور نا جانے کس وقت سفر کی تھکاوٹ نے مجھے نیند کی آغوش میں دے دیا

میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو زمین پر بچھے موٹے گدے پر پایا۔میں نے نیم وا آنکھوں سے کمپیوٹر کے سامنے شاہمیر کو دیکھا جو کہ اپنا سر کھجا کھجا کر کچھ ٹائپ کرنے میں بے انتہا مگن تھا۔مجھ پر نیند ابھی غالب تھی کہ اچانک میرے ذہن میں ہزار واٹ کا بلب روشن ہوا اور نرمین کا چہرہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دمکتا ہوا میری نگاہوں کے پردے پر نمودار ہو گیا میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔شاہمیر نے پلٹ کر اپنی عینک کے پیچھے سے مجھے دیکھا لیکن میری نظریں وال

کلاک پر جم گئیں۔۔ کلاک ساڑھے سات بجے کا اعلان کرر ہا تھا میں نے جلدی سے اٹھ کر باہر جھانکا تو روشنی جا چکی تھی

''سارے گھوڑے بیچ کر اٹھے ہو بھائی'' شاہمیر نے مجھے مخاطب کیا لیکن میں تیزی سے غسل خانے میں گھس گیا

''کیا میں کراچی سونے آیا تھا؟' میں نے غصے میں خود سے سوال کیا۔ غسل خانے سے نکل کر میں جوتے پہننے لگا تو شاہمیر کمپیوٹر کو چھوڑ کر میرے پاس آن بیٹھا۔

''ہیلو! یہ چکر کیا ہے' اس نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنی عینک ماتھے پر چڑھائی

''کچھ نہیں یار بہت دیر ہوگئی ہے واپس آ کر سارا معاملہ سمجھاؤں گا' میں جوتے پہن کر کھڑا ہو گیا

اس نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا اور پھر فوراً ایک پرچی پر کچھ لکھ کر میرے ہاتھ میں تھما دیا' یہ نیچے درزی کی دکان کا ٹیلی فون نمبر ہے کوئی مسئلہ ہو جائے تو اطلاع کر دینا' اس کی لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی

میں پرچی کو جلدی سے جینز کی جیب میں ٹھونس کر خدا حافظ کہتا ہوا باہر کی جانب لپکا لیکن میرے قدم رک گئے اور نا جانے میرے دل میں کیا خیال آیا کہ میں پلٹ کر اسکے پاس گیا اور اسے گلے لگا کر کہا' یار میری واپسی تک دعا کرتے رہنا کہ۔۔ میری ایک دوست بہت بیمار ہے' یہ کہتے ہوئے میں تیزی سی باہر ی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

اپارٹمنٹ سے نکل کر میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا یونیورسٹی روڈ کی طرف روانہ تھا جہاں سے مجھے ٹیکسی با آسانی مل جاتی تھی۔ کراچی میں رات کا آغاز دن کے مقابل کئی زیادہ دلفریب ہوتا ہے لوگ گھروں کو چھوڑ کر سمندر کی جانب سے آنے والی نم ہواؤں میں گھومنا پھرنا پسند کرتے ہیں سڑکیں، پارک، شاپنگ مال، فوڈ پوائنٹ، ہر جگہ لوگوں کا جم غفیر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ساحل سمندر پر لوگ اپنی پریشانیاں قہقہوں میں اڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور دن بھر کی تھکن سمندر کے حوالے کر کے گھروں کو واپس لوٹ جاتے ہیں لیکن میں اپنے اردگرد سے یکسر بے خبر چلتا جا رہا تھا پرانی ریلوے لائن کراس کر کے سامنے اردو سائنس کالج کے سامنے میں ٹیکسی پر سوار ہو گیا۔ راستے میں، میں نے ایک بجے سے سگنل پر تروتازہ گلدستہ خرید لیا ۔جوں جوں ٹیکسی اسپتال کے قریب ہوتی جا رہی تھی میرے دل پر بوجھ سا بڑھنے لگا۔

اسپتال کے مین گیٹ پر اترتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یکدم میری ٹانگوں نے مزید چلنے سے انکار کر دیا ہو ٹانگوں میں جیسے جان ختم ہو گئی ہو۔ آسمان پر ستارے اور زمین پر بیمار لوگوں کے چہرے بجھے ہوئے دکھائی دیتے تھے ٹیکسی جا چکی تھی لیکن میں ہاتھوں میں گلدستہ لیئے وہیں کھڑا سوچ رہا تھا انسان بیمار کیوں ہوتے ہیں؟ اس میں بیمار کی آزمائش مقصود ہے یا اسکے پیاروں کی؟

آج نرمین کی سالگرہ ہے میرے لبوں پر خود بخود ایک مسکراہٹ سی پھیل گئی اور چلنے کی سکت بھی پیدا ہو گئی میں تیزی سے اسپتال کے اندر داخل ہو گیا یہ کراچی کا ایک بہت نامور پرائیویٹ اسپتال تھا ۔یہاں مجھے نرمین کو تلاش کرنے میں زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا وہ ایک اسپیشل روم میں موجود تھی لیکن استقبالیہ پر چھوٹی سی انکوائری کے بعد وہاں موجود لڑکی نے انٹرکام کے ذریعے نرمین کے روم کا نمبر ملایا اور میرا نام بتایا۔ وہ ابھی اور کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ ایک دم اس کے لبوں کو چپ سی لگ گئی اس نے صرف 'یس میم' کہہ کر ریسیور نیچے رکھا اور ہاتھ کے اشارے سے سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا ''فرسٹ فلور پر تشریف لے جائیے روم نمبر 18''

میں 'شکریہ' ادا کر کے سیڑھیوں کی جانب لپکا

۔سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے پہاڑ پر چڑھنے جیسا احساس ہونے لگا میرے ذہن میں اچانک نرمین کے کمرے میں موجود اس کے ماں باپ بہن بھائیوں رشتہ داروں کا خیال آیا کہ اگر انہوں نے پوچھ لیا کہ میں اتنی دور سے کس رشتہ کے ناتے نرمین سے ملنے آیا ہوں؟ اگر صرف دوست ہوں تو باقی کلاس فیلوز کیوں ملنے نہیں آئے؟ کیا میرے ملنے سے نرمین کے باپ کے دل میں نرمین کا امیج خراب نہیں ہو جائیگا؟ اس کے خاندان والے کیا سوچیں گے کہ نرمین یونیورسٹی میں یہ گل کھلانے جایا کرتی تھی؟ ایک معذور لڑکی اور محبت؟ اس کے رشتہ دار تو توبہ توبہ کر کے کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔۔ میرے دماغ پر ہتھوڑے برس رہے تھے اور میں تھک کر آخری سیڑھی پر بیٹھ گیا۔تازہ گلابوں کا گلدستہ میری جھولی میں تھا اور میں نے آہستہ سے اس پر اپنا سر رکھ دیا ایک نرس نے انتہائی شائستہ انداز میں مجھے مخاطب کیا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے'' میں نے فوراً سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''جی ،شکریہ''

نرس مسکرا دی اور تشویش آنکھوں میں رکھ کر آگے بڑھ گئی

میں نے آنکھیں موند کر دل ہی دل میں آواز لگائی 'اے اللہ میری مدد فرمانا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کمرہ نمبر 18 کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگا ایک منٹ بعد ہی میں کمرہ نمبر 18 کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ہلکی سی دستک دی تو ایک خاتون نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا میری نگاہیں اس کے چہرے سے ٹکراتے ہی بیڈ پر لیٹی ہوئی نرمین پر جا گریں اور وہیں پڑی رہ گئیں

''اندر آ جاؤ'' خاتون کی آواز سے میرے قدم خود بخود حرکت میں آ گئے اور میں نرمین کے چہرے کو تکتا ہوا اس کے بیڈ کے قریب آن پہنچا۔

اس نے اپنی سرخ حاشیوں والی نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا'' کیسے ہو میرے شاعرِ محبت؟''

وہ معمولی سی کروٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔

گلدستہ اس کے پہلو میں احتیاط سے رکھ کر وہیں کھڑا ہو گیا کہ میں اپنی نگاہ اس کی آنکھوں سے اب تک نہیں چھڑا سکا تھا جیسے اس کے سارے جسم میں صرف آنکھیں رہ گئی تھیں۔۔ جو کہ زندہ تھیں۔

میری خاموشی کو بھانپتے ہوئے عقب میں کھڑی ہوئی عورت نے مداخلت کی۔

''آپ یہاں آرام سے بیٹھ جائیے'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے دیوار کے ساتھ لگے ہوئے صوفوں کی طرف دائیاں ہاتھ پھیلا رکھا تھا۔

'یہ میری چھوٹی خالہ ہیں' نرمین کی خفیف آواز ابھری۔

میں سر ہلا کر صرف ہلکا سا مسکرا سکا اور صوفے پر چپکا سا بیٹھ گیا۔

کمرے میں گہرا سکوت تھا۔

چند لمحوں بعد اس کی خالہ نے مجھے باقاعدہ مخاطب کیا۔

''عموماً اس وقت ملاقاتیوں کو ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی لیکن آپ دور سے تشریف لائے ہیں اس لیے اطمینان سے باتیں کر لیجئے''

مجھے سمجھ نہیں آیا کہ وہ مجھے کیا باور کروانے کی کوشش کر رہی تھیں بہر حال میں نے نہایت ادب سے ان کا شکریہ ادا کیا۔

''آپ کا بہت شکریہ مجھے ذرا دیر ہو گئی ورنہ ارادہ شام کو آنے کا تھا'

خالہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نرمین کے سرہانے جا بیٹھیں، نہایت پیار سے اس کے ماتھے سے بال پیچھے کیے اور کچھ توقف کے بعد اس کے کان میں

چند لمحے سرگوشیاں کرنے کے بعد میں میری طرف اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں
اب کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا وہی میں تھا اور وہی زمین لیکن ایسا محسوس ہوا جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیئے اجنبی ہوں دونوں کے درمیان ہچکچاہٹ اچانک نا جانے کہاں سے در آئی تھی میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر بے تحاشا چومنا شروع کر دوں منہ سے ایک لفظ نہ نکالوں بس آنسوؤں سے اس کے زرد رخساروں پر دل کی ساری باتیں لکھ دوں۔
'غفران' اس کی آواز نے میرے خیالات میں کنکر پھینکا اور میں نے یوں چونک کر اس کی جانب دیکھا جیسے ابھی نیند سے جگایا گیا ہو۔
''وہاں مت بیٹھو یہاں آ کر میرے پاس بیٹھو۔'' اس نے اپنی نازک سپید انگلی سے بیڈ کی اس جگہ ہاتھ رکھا جہاں تھوڑی دیر پہلے اس کی خالی براجمان تھیں۔
میری نگاہیں بے اختیار دروازے کی جانب اٹھ گئیں تو وہ مسکرا دی 'فکر مت کرو جب تک تم کمرے میں ہو یہاں اب کوئی نہیں آئیگا۔۔موت کا فرشتہ بھی نہیں۔
میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوا اور اس کے چہرے کا طواف کرتا ہوا اس کے قریب بیٹھ گیا۔
''تم نے مجھے سالگرہ کی مبارک نہیں دی'' اسکے ہونٹوں پر شکوہ اور آنکھوں میں مسکان چمکتی تھی۔
''سالگرہ مبارک ہو زمین۔'' میں کہ اس کی حالت دیکھ کر تکلیف میں مبتلا تھا بڑی مشکل سے اسے مبارکباد دی۔
وہ میرا درد جان چکی تھی لیکن نظر انداز کرتے ہوئے بولی ''بندہ کیک ہی لے آتا ہے''
اس کی بیمار آنکھیں میرے چہرے پر گویا گڑی ہوئی تھیں۔
یہ بھی سچ ہے کہ میں دھیرے دھیرے مدہوشی سے ہوش میں آ رہا تھا کہ مجھے زمین کے دیدار کرنے کے سوا اور کچھ بھی یاد نہیں تھا۔
''بہت فضول عاشق ہو تم'' اس نے قہقہہ لگانے کی ناکام کوشش کی۔
میں جانتا تھا کہ وہ یہ سب باتیں میرا دھیان اپنی بیماری سے ہٹانے، مجھے بہلانے کے لیے کر رہی تھی لیکن کبھی کبھی انسان کو سب کچھ جاننے کے باوجود بھی انجان بننے کی اداکاری کرنا پڑتی ہے سو وہی میں کرنے لگا۔
''میں تیری یاد سے نکلوں تو کچھ یاد رہے۔''
میرے اندر کے شاعر نے مجبوراً انگڑائی لی حالانکہ میرا دل اسے گلے لگا کر بہت زور زور سے رونے اور چیخنے کو کر رہا تھا۔
''کتنی خوبصورتی سے بات کو ٹال دیا۔۔آخر ہو نا شاعر'

تری قربت میں آ کر سوچتا ہوں
میں شاعر تھا کہ اب شاعر بنا ہوں'
'میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ تم ضرور آ ؤ گے'
'میں سنوار دوں اسے تمہاری آنکھوں سا
اگر یہ رات میرے پیار کی گواہی دے'
'میں جانتی تھی کہ تمہاری محبت کے طوفان کے آگے میرا وعدہ ایک تنکا ثابت ہوگا
'وعدہ کیا تھا تم سے برائے جانِ تمنا
وعدہ وفا کروں گا وعدہ نہیں کیا تھا'

کمرے میں ایک بار پھر خاموشی بنا پازیب رقصاں تھی اور میں ہمیشہ کی طرح ذہن میں سیکڑوں سوالات لیے چپ چاپ اپنی دیوی کے سامنے عجز کے ساتھ دوزانو تھا اس کے بے حس و حرکت بدن کو دیکھ کر میرے دل پر چھریاں سی چلتی رہیں لیکن میں لبوں پر مسکراہٹ سجا کر اس کی جانب دیکھنے پر مجبور تھا کہ یہی بیمار پرسی کی روایت ہے۔

''جی'' اس نے مجھے کچھ یوں مخاطب کیا کہ ایک لحظہ کے لیے اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ 'غفران بہت لمبا نام ہے مجھے اجازت دو کہ میں تمھیں صرف 'جی'، کہہ کر پکاروں۔۔ پلیز''
''اجازت مت مانگو۔۔ حکم صادر کرو'' ظالم نے مانگا بھی تو کیا مانگا کہ وہ سے تو جان مانگنے تھا
''تھینک یو'' معصوم سی مسکراہٹ اس کے خشک ہونٹوں پر کھل کر مرجھا گئی
'اچھا کیا کہنا چاہ رہی تھی۔۔ جان جی'
اس نے دو لمحوں کے لیئے آنکھیں موند لیں اور پھر آہستہ سے کہا 'یہ میرے اوپر سے سفید چادر کھینچ کر اتار دو گے پلیز' اتنے وقت میں اس کے زردی مائل چہرے پر سرخی کی مہین تہہ پہلی بار دکھائی دی
میں نے اس سے پہلے کبھی کسی مریض کے ساتھ اسپتال میں وقت نہیں گزارا تھا اس لیے مریض کی دیکھ بھال کیسے کرتے ہیں، اس تجربے سے میں فارغ تھا 'الجھن ہو رہی ہے؟' میں ذرا سا گھبرا گیا
اس نے پلکیں جھپکا کر 'ہاں' کا اشارہ دیا
میں نے انتہائی سلیقے اور آرام کے ساتھ اس کے بدن سے سفید چادر کو اٹھا کر پائنتی کی جانب رکھ دیا اور اگلے ہی لمحے میری نگاہیں اس کے سر سے پاؤں تک دوڑتی چلی گئیں میری آنکھوں میں آنسوؤں نے قیامت برپا کردی میرا جی چاہ رہا تھا کہ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر اتنا چیخوں کہ سات آسمان ہلا دوں وہ نظارہ جان لیوا تھا محبت کمرے میں اتراتی پھر رہی تھی لیکن میرا دل درد کے پاتال کو چھو رہا تھا
نرمین نے وہ لباس پہن رکھا تھا جو میں نے اسے سالگرہ سے پہلے تحفتاً دیا تھا میں نے زبردستی کی بھرپور مسکراہٹ سے اس کا دل رکھتے ہوئے کہا۔ 'محبت میں پہل میں نے کی تھی لیکن اب تم مجھ سے کوسوں آگے چل رہی ہو نرمین''
''جی! خدا کی قسم میری حالت ایسی نہیں کہ میرا جسم یوں سج دھج کے تیار ہو اور اس کے بعد چوبیں گھنٹے بستر پر پڑا رہے لیکن آج خدا جانے کیوں صبح سے میرے دل کی یہ آواز مجھے مسلسل سنائی دے رہی تھی کہ تم ضرور آؤ گے۔۔ یقین مانو یہ طاقت مجھے محبت نے ادھار دے کر مجھ سے یہ سب کروایا ہے اور میں۔۔ صرف تمھارے لیے، ایک مبہم سی امید کے سہارے یہ لباس پہننے پر آمادہ ہوگئی اور پتہ ہے جی؟ میرا تمام تر خوف آج ختم ہو گیا کیونکہ آج میں نے صرف وصرف اپنے دل کی آواز سنی ہے میں جب سے اس اسپتال میں آئی ہوں آج پہلی مرتبہ مجھے سکون نصیب ہوا ہے۔''
وہ سچ مچ اپنی خلوت گاہ میں چت لیٹی ہوئی کسی مُلک کی شہزادی لگ رہی تھی۔
''تم شاعر ہو، رائٹر ہو لیکن میری یہ بات لکھ لو کہ محبت کوئی بے اختیاری شے ہے یہ بھی خدا کی طرح اَن دیکھی اَن چھوئی سہی لیکن بے حد طاقتور ہے انسان سے وہ سب کچھ کروانے پر قادر ہوتی ہے جو وہ نہیں کرنا چاہتا یا پھر جسے کرنے کی اس میں ہمت نہیں ہوتی۔ میں اتنے دنوں اس سفید چادر تلے مریضوں والے لباس میں نیم مردہ جسم کے ساتھ بستر پر مشینوں سے مصنوعی سانس لیتی رہی لیکن آج جب تم نے اس سفید کفن کو میرے اوپر سے اتارا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے محبت نے مجھے چھو لیا۔۔ قسم لے لو سچ مچ چھو لیا۔۔ جیسے موسم برف کے بعد بہار زمین کا بوسہ لیتی ہے اور چاروں جانب پھول ہی پھول کھل اٹھتے ہیں''
وہ سچ کہہ رہی تھی وہ اب واقعی ویسی نہیں دکھائی دیتی تھی جیسا کہ میں نے کمرے میں داخل ہوتے سمے اسے دیکھا تھا اس کی آواز میں واضح فرق آ چکا تھا آنکھوں میں ناقابل بیان خوبصورت چمک اور چہرے پر گہرا سکون اس کے ہونٹوں پر زندگی کا سرخ بوسہ ثبت تھا لیکن اس کے باوجود میں اپنے آنسوؤں کو نہ روک پایا شاید میرے دل کی آنکھوں نے اس

کے اندر کے جان لیوا روگ کو دیکھ لیا تھا وہ درد جسے بیان کرنے کے لیے کبھی الفاظ نہیں ملتے اور کبھی آنسو۔۔اس سے میرے پاس آنسوؤں کی متاع کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا جو میں دیوی کے چرنوں میں چڑھا سکتا' تم نے مجھے تو بتایا ہوتا کیوں ایسے اتنی دور چلی آئیں مجھے اطلاع دینے کے قابل بھی نہیں سمجھا؟ میری طرف دیکھو زمین۔۔میں ہوں تمھارا طبیب، قسم لے لو میرے علاوہ تمھیں کوئی اچھا نہیں کر سکتا کہ تمھیں ان مشینوں دوائیوں اسپتالوں کی نہیں صرف محبت کی ضرورت ہے محبت ہی تمھارے درد کا درماں ہے محبت کی پناہ گاہ میں تمھیں سکون ملے گا اور محبت ہی تمھارے زخموں کا مرہم ہے'

اس کے چہرے پر افسردگی کی دھند اتر آئی"جی! تم اتنی دور سے میرے پاس رونے اور رلانے آئے ہو ؟ پلیز ایسا مت کرو یہ چند گھڑیاں مسکرا کر میرے ساتھ گزار دو"

میں اسے کیا بتاتا کہ آنسوؤں کا موت سے بہت گہرا تعلق ہے موت کی چاپ سن کر بہنے والے آنسوؤں کا ذائقہ بڑا ہی کسیلا ہوتا ہے اور اس وقت ایسا ہی ذائقہ میرے ہونٹوں کے کناروں سے اندر میری زبان کو چھو رہا تھا

"جی، میرا ہاتھ تھامو' اس نے اپنے ساکت ہاتھ کی انگلیوں کو جنبش دی۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھام لیا اس کے لمس نے اینٹی بائیوٹک کی طرح اثر کرتے ہوئے میرے آنسوؤں کو کافی حد تک روک دیا کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر گہری سوچ کی دہلیز پر بیٹھے رہے اور پھر اس نے بہت آہستہ سے ٹھہر ٹھہر کر مجھے گزشتہ ماہ لکھی ہوئی میری ہی اک نظم سنائی جس کا عنوان میں نے "یاد" رکھا تھا لیکن اس نے بہت بحث کے بعد بدل کر "تنہائی" رکھ دیا تھا

سحر ہوتی ہے شام ڈھلتی ہے
نہ جی کہیں بہلتا ہے
نہ نگاہ کہیں ٹھہرتی ہے
تیری یادوں کے بیابانوں میں
جیسے رُک رُک کے ہوا چلتی ہے
ایسے تھم تھم کے جاں نکلتی ہے

شاعری بھی سو موقعوں پر سو روپ بدلتی ہے جو شعر کسی ایک موقع پر صرف چھو کے گزر جاتا ہے وہی کسی دوسرے موقع پر دل میں تیر کی طرح پیوست ہو جاتا یہ نظم جو میں نے یادِ یار میں لکھی تھی وہی نظم اس وقت کوئی اور ہی مفہوم بتا رہی تھی

"جی! میں جانتی ہوں تم بہت اچھے ادیب ہو ،شاعر ہو میں نے کبھی تم سے شاعری کے حوالے سے کوئی فرمائش نہیں کی لیکن آج میرا دن ہے میرے لیے کوئی نظم کہو ناں۔۔پلیز"

عمیق اداسی سے ایک پھیکی سی مسکراہٹ ابھر کر خود بخود میرے لبوں پر پھیل گئی اور میرا ذہن فوراً کسی نظم کا تانا بانا بننے لگا ان گنت الفاظ تتلیوں کی مانند میرے اردگرد اُڑنے لگے میری سوچ کے ساتھ کمرے کا سکوت بھی گہرا ہوتا چلا گیا اسی اثناء ایک دبلی پتلی نرس دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر ہاتھ میں ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ وہ مسکراتے ہوئے زمین کے بیڈ کے قریب آئی اور ٹرے ایک طرف رکھ کر اسے مخاطب کیا' آج تو آپ بالکل گلاب کا پھول بنی ہوئی ہیں"

زمین نے جواباً مسکرا کر اسے 'شکریہ' کہا اور ہلکا سا میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے دبایا

"نازلی، تم نے دیکھا نہیں کہ آج کون آیا ہوا ہے" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے نرس کو مخاطب کیا۔

"ان سے تو میں غالباً مل چکی ہوں" نازلی نے بلڈ پریشر چیک کرنے کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔

"کب؟ کہاں۔" زمین کے منہ سے بے

اختیار نکلا۔

نازلی کی بات سن کر میں نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا اور میرے ذہن میں نظم کی تعمیر کا کام فوری طور پر رک سا گیا

''ابھی کچھ دیر پہلے سیڑھیوں پر۔۔'' اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا تو مجھے یاد آ گیا کہ یہ وہی نرس ہے جس نے مجھے سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ کر میری طبیعت پوچھی تھی 'معذرت چاہتا ہوں، اب یاد آیا''

'معذرت کی ضرورت نہیں ہے سر' نازلی کے لہجے میں خلوص تھا

ابھی نرمین نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ نازلی نے مجھے مسکراتے ہوئے مخاطب کیا''اگر میں ایک درخواست کروں آپ برا تو نہیں مانیں گے''

''نہیں۔ بالکل نہیں۔۔آپ کہیے''

''میں نے ان کا بلڈ پریشر چیک کر کے انہیں میڈیسن دینی ہیں اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو آکسیجن ماسک بھی لگا دوں گی'' نازلی نے اطمینان سے اپنی بات مکمل کی۔

میں نے آہستہ سے نرمین کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے چھڑا کر بیڈ پر رکھا تو وہ مجھے روکتے ہوئے نازلی سے مخاطب ہوئی''پلیز نازلی خدا کے لیے۔۔آج یہ سب رہنے دو۔۔آج میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔نہیں پلیز آج نہیں'' وہ بچوں کی طرح روہانسی ہو کر ضد کرنے لگی۔

میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر کھڑکی کے پاس چلا آیا میری پیٹھ ان دونوں کی جانب اور نگاہیں کھڑکی کے شیشے پر پڑنے والے کمرے کے اندر ہونے والی کاروائی کے دھندلے عکس پر تھیں۔

نازلی نے اس کے رخسار پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا 'ڈیئر۔ میں اپنی ڈیوٹی کے ہاتھوں مجبور ہوں''

''نہیں ناں، تمہاری میڈیسن سے مجھے ایک دم نیند آ جاتی ہے اور آج میں سونا نہیں چاہتی۔ پلیز'' نرمین کی آواز گلے میں رندھ گئی

ذرا سی خاموشی کے بعد نازلی نے جیسے ہار مان لی

''اچھا ابھی صرف بلڈ پریشر چیک کروا لو اور کمر کے زخموں پر دوا لگانے دو میڈیسن تھوڑی دیر بعد آ کر دے دوں گی۔۔اب خوش؟'

''تھینک یو، نازلی'' گویا اب نرمین کی جان میں جان آئی ہو

وہ اس کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگی اور میری نظریں خود بخود شیشے کے پار ستاروں بھرے آسمان پر جا ٹھہریں میرا ذہن نظم کی دوبارہ تعمیر کرنے لگا اور آنسوؤں کا کاروان ایک مرتبہ پھر میرے گالوں پر خراماں خراماں ان دیکھی منزلوں کی جانب روانہ ہو گیا میری گیلی پلکیں ستاروں پر الفاظ بکھیر رہی تھیں کیا لکھوں کیا نہ لکھوں امید لکھوں یا درد لکھوں دلاسا لکھوں کہ شکوہ لکھوں محبت اے محبت۔۔میری مدد کر ،وہ حرف سخن عطا کر کہ جو میری دوست میری جان میری دلربا کو چبھے نہیں دکھ کا باعث نہ بنے مجھ سے اس کا ایک بھی آنسو دیکھ نہیں جائیگا۔۔برداشت نہیں ہوگا۔

میں دیر تک کسی مجسمے کی مانند کھڑا رہا اور پھر اچانک نازلی کی آواز نے چونکا دیا 'سنیئے'

میں جلدی سے اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے اس کی جانب مڑا تو وہ مدھم آواز میں بولی''میں نے ابھی انہیں میڈیسن نہیں دی کچھ دیر بعد آ کر دونگی لیکن آپ نے ایک بات کا خیال رکھنا ہے''

میں نے نرمین کی طرف دیکھا تو وہ بالکل کروٹ پر لیٹی ہوئی تھی

'میں نے ان کی کمر کے زخموں کو صاف کر کے دوا لگا دی ہے بس آپ نے دھیان رکھنا ہے کہ یہ ایک گھنٹے تک کروٹ نہ بدلیں'

''جی بہتر''

'ہاں ایک اور ضروری بات کہ کسی بھی ایمرجینسی کی صورت میں آپ نے فوراً بیڈ کے ساتھ نصب لال بٹن دبا دینا ہے'

میں نے محسوس کیا کہ نازلی کا لہجہ کچھ ٹوٹا ہوا سا تھا پیشہ ور نرس ہونے کے باوجود اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ انسان ہونے کے ناتے مریض کی ضد کو بالکل نظر انداز کرنے سے قاصر رہی تھی اس نے مسکرا کر زمین کی طرف دیکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے باہر نکل گئی

میں زمین کو دیکھ کر یوں مسکرایا جیسے اس پر احسان کر رہا ہوں

''ادھر آجاؤ۔ میرا ہاتھ تھام لو۔ زخموں میں بہت تکلیف ہے''

''تمام زخم بھر جائیں گے زخموں کو تو بھرنا ہی ہوتا ہے'' میں نے اس کا ہاتھ دوبارہ تھام لیا وہ دائیں کروٹ پر لیٹی ہوئی تھی بالوں کی لٹ اس کے رخسار پر پڑی ہوئی تھی' لیکن میرے زخم بھی میری قسمت کی طرح بگڑے ہوئے ہیں ان کا بھر جانا محال ہے'

میں نے پیار سے اس کے ہاتھ کو دبایا' مایوسی کی باتیں مت کرو پلیز'

اسی لمحے میرے دل نے سینے سے جھانک کر اسے دیکھا اور کہا آہ۔۔ کتنی خوبصورت جوان لڑکی بہار کے دنوں میں خزاں کے خوف سے لرز رہی ہے!

'اچھا چھوڑو ساری باتیں' لڑکی کے لہجہ میں یک دم بچوں کی سی معصومیت آگئی

'مجھے نظم سناؤ۔۔ اگر ابھی نہیں سوچ پائے تو کوئی پرانی ہی سنا دو'

میں نے اس کے رخسار سے بالوں کی لٹ کو پیچھے کی طرف سمیٹا اور اپنی پوری ہمت کو یکجا کرتے ہوئے نظم کا آغاز کیا۔۔

اے رفیقِ من، سن، میری دلربا

مرض کس نے کہا ہے ترا لا دوا

گو طبیبوں کے نسخے موثر نہیں

یہ مگر میری جاں حرفِ آخر نہیں

مجھ کو معلوم ہے یہ کٹھن مرحلہ

آزمائے گا پل پل تیرا حوصلہ

کوئی آئے گا پھولوں کی کلیاں لیے

کوئی آئیگا یونہی تسلیاں لیے

جان کیا ہے خدا کی امانت فقط

مانگ ایمان اپنا سلامت فقط

رکھوں جو تیری روح پر کہیں

وہ مرہم مرے ہاتھ میں ہی نہیں

ترے درد کی موڑ دے جو مہار

میری شاعری میں نہیں وہ قرار

تری خوں اُگلتی کہانی کے صدقے

پلکوں پہ ٹھہرے پانی کے صدقے

میں صدقے تیری جوانی کے صدقے

آزمائی ہے جس نے تیری بندگی

وہی دے گا تجھے پھر نئی زندگی

اِک دن تیرگی یہ بھی چھٹ جائیگی

چھین کر تیری اُمید سے روشنی

زمین جواب تک اپنے دل پر ضبط کا بھاری پتھر رکھے ہوئے تھی یکا یک اس کی بند پلکوں سے آنسو ابلنے لگے

میں چپ چاپ سر جھکائے اس کا سرد ہاتھ تھامے بیٹھا تھا

سسکتی ہوئی خوبصورتی قسمت کی غلامی میں رنجور تھی

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں گیلی پلکوں کے اس طرف غمگین مدھم سی روشنی میرے چہرے پر پڑنے لگی۔

''جی، تم مجھے بھول جانا، مجنوں جیسی حالت نہ بنا لینا' وہ جل تھل آنکھوں سے مسکرا دی

'تم نے بتایا نہیں کہ نظم تمہیں کیسی لگی' میں نے موضوع بدل دیا
'سچ بتا دیا تو تم ناراض ہو جاؤ گے اور جھوٹی تعریف مجھے نہیں کرنی'
'سچ بتادو۔۔نہیں ہوتا ناراض'
'آخری دو مصرعوں کے علاوہ تمام نظم بے انتہا خوبصورت تھی' اب اس کا چہرہ گوتم جیسا شانت تھا
میں تڑپ اٹھا' پھر وہی مایوسی کی باتیں'
'نہیں، سچ میں میری امیدوں کے تمام چراغ بجھ چکے ہیں میرے درد کا درماں زندگی سے نجات میں پنہاں ہے معذور بیمار جسم کا بوجھ اب نہیں سہا جاتا تھک کے چور ہوگئی ہوں مجھے موت کے اندھیروں میں کوئی امید کی کرن نہیں دیکھتی کہ مجھے موت کا گہرا ہوتا ہوا اندھیرا ہی اب سکون دے گا'
اس کے ہونٹوں سے موت کا لفظ سن کر میری روح کانپ اٹھی اور آنکھیں بھیگ گئیں' کیا تم یہ چاہ رہی ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں'
'نہیں' اس نے میرے ہاتھوں کو بمشکل اپنی جانب کھینچتے ہوئے اپنی اداس نگاہیں میری آنکھوں میں رکھتے ہوئے کہا 'میرے قاتل، میرے دلدار، میرے پاس رہو، تم ہو تو اس سے میرے پاس موت بھی نہیں آسکتی'
میری بے بسی کے آنسو بدستور میرے گالوں پر رینگ رہے تھے وہ کس قدر تکلیف میں مبتلا ہو کر کروٹ پر لیٹی ہوئی تھی اور میں اس حالت میں دیکھنے کے سوا اسکے لیئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا اے خدا بس۔۔اب بس کر دے۔۔نازک ناتواں جسموں پر اتنا بوجھ مت ڈال کہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔۔بس اے خدا رحم کر رحم!۔۔میرا دل خدا کے آگے گڑگڑا تا رہا لیکن نرمین کا درد کم نہیں ہوا۔
'جی، کیوں لڑکیوں کی طرح روئے جا رہے ہو
'Be a brave man
بھیگی آنکھوں میں نرمین کا چہرہ ڈوبتا ہوا دکھائی دیا تو میں نے گھبرا کر فوراً آنسو پونچھ لیے
'جی، تم نہیں چاہتے کہ میں سکون حاصل کروں؟ بولو'
'یہ کیسا سوال ہے میں کیوں نہیں چاہوں گا'
کچھ توقف کے بعد وہ شکستہ لہجے میں بولی 'قسم لے لو، اگر میں جی سکتی تو ضرور جیتی۔۔میں جان بوجھ کر زندگی سے نجات حاصل کرنا نہیں چاہ رہی یہ تو میرے درد اور تکلیف کی شدت کا تقاضا ہے جو خود بخود میری زبان پر چلا آتا ہے میں مانتی ہوں کہ دنیا میں کوئی شخص سو فیصد اپنی مرضی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا لیکن میں کیا کروں کہ لاکھ کوششوں کے باوجود میں اپنے مایوس دل کو یہ بات نہیں سمجھا سکی۔۔میں جینا چاہتی تھی لیکن نا جانے کب کس گھڑی موت کی الفت میں گرفتار ہوگئی مجھے پتہ ہی نہیں چلا'
'بس چپ کرو' میری برداشت جواب دے چکی تھی لیکن وہ چپ ہونے پر آمادہ ہی نہیں تھی
'نہیں۔ میں تماشا نہیں بننا چاہتی'
اس وقت میرے اندر شدید توڑ پھوڑ جاری تھی لیکن میں اپنے جذبات پر قابو رکھے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا 'تمہیں کچھ نہیں ہوگا کچھ نہیں'
'جی، تم بہت دیر سے ملے ہو کاش تم کچھ سال پہلے میری زندگی میں آجاتے تو شاید۔۔'
میں نے اس کے خشک ہونٹوں پر انگلی رکھ دی 'فیصلے تو خدا کرتا ہے۔ درست فیصلے۔۔اور تمہیں اسی خدا کا واسطہ مایوسی کی باتیں نہ کرو'
'فیصلہ تو ہو چکا ہے۔۔بس تم ہی بے خبر ہو'
میں جانتا تھا وہ ٹھیک کہہ رہی ہے کہ کبھی کبھی انسان کو اپنی زندگی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کا پہلے سے علم ہو جاتا ہے لیکن کوئی اسکی بات کا یقین نہیں کرتا یا پھر نہیں کرنا چاہتا کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتا ہے۔۔میں یہ بھی جانتا تھا کہ خشک

دیمک لگے تیزی سے کھوکھلے ہوتے ہوئے پیڑ کا انجام کیا ہوتا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کبھی ہم جنہیں مایوس سمجھ رہے ہوتے ہیں وہ درحقیقت مجبور ہوتے ہیں بے انتہا بے بسی کے عالم میں گرفتار ہوتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے جاننے کے باوجود میں خود اسے تسلیاں دینے پر مجبور تھا کہ میں اس کی محبت کے ہاتھوں بے بس تھا مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں فقط ایک کھوکھلا جسم ہوں اور میری روح میری نگاہوں کے روبرو بیڈ پر کروٹ لیئے پڑی ہے زخم خوردہ، چھلنی، دکھی، مایوس اور۔۔اور۔۔جاں بلب۔۔آہ!

'کاش میں تم سے ملنے سے پہلے مرجاتی۔کاش'

وہ اچانک کمر کے بل لیٹ گئی جبکہ نرس نے مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ یہ کروٹ نہ بدلنے پائے

'دوبارہ کروٹ پر آجاؤ نرمین' میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا

'نہیں' وہ دائیں بائیں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولی 'مجھے اسی طرح سکون مل رہا ہے'

'تمہاری حالت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی میں نرس کو بلاتا ہوں' میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑا کر لال بٹن دبانا چاہا لیکن اس نے منع کردیا۔

'تمہیں میری قسم جی، تم کسی کو نہیں بلاؤ گے بس تم میرے پاس رہو بس تم۔۔تم اور میں'

اسکی آنکھوں میں مجھے اپنا عکس صاف دکھائی دیتا تھا اسکی نگاہوں سے نگاہیں چرانا میرے لیئے مشکل ہو چکا تھا

'نرمین۔۔ایسا مت کرو'

'بس چپ، اب کچھ مت کہو بس میری سنو، ایک معذور لڑکی سمجھ کر مجھ پر ترس کھاؤ اور صرف سنو'

میں چپ چاپ بت بنا کھڑا تھا میرے دل جو ذرا ذرا سی بات پر دیواروں سے سر پھوڑنے لگتا تھا اب ایسا شانت ایک کونے میں پڑا تھا جیسے اس نے نوشتہ دیوار پڑھ لیا ہو

'سنو! تم شاعر ہو ادیب ہو کل تمہارا سارے زمانے میں نام ہوگا۔ہاں! میں جانتی ہوں تم شہرت کے آسمان پر بہت جلد چمکنے والے ہو، جی۔کبھی وقت ملے تو تم مجھ جیسی معذور لڑکیوں کے بارے میں ضرور لکھنا، پلیز اور اس خود غرض دنیا کو بتانا کہ ہر ایک معذور جسم میں دھڑکنے والا اور محبت کو محسوس کرنے والا دل ہوتا ہے جو ہزاروں غم والم برداشت کرنے کے باوجود ظالم رویوں کی ذرا سی ٹھیس لگنے پر ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے! تم لکھو گے ناں؟'

'ہاں لکھوں گا۔۔اب مجھے نرس۔۔'

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے آنکھیں موند لیں 'اور یہ بھی لکھنا کہ ہم جیسے معذور لوگ وقت سے پہلے صرف اور صرف عدم محبت کا شکار ہو کر مرتے ہیں معاشرے کے منفی رویوں میں ہمارا دم گھٹتا ہے ہم جس گھر میں ہوں وہاں صف ماتم بچھی رہتی ہے دنیا کی نگاہ میں ہم زمین پر رینگتی ہوئی بیماریاں ہیں ہماری کوئی شناخت نہیں ہوتی، ہمارا کوئی نام نہیں ہوتا، ہم صرف معذور ہوتے ہیں صرف معذور'

'خدا کے لیے چپ کر جاؤ نرمین' میں ہاتھ جوڑ لیئے

'میں چپ نہیں کرسکتی، جی۔ سے بہت تھوڑا رہ گیا ہے'

میری آنکھوں سے آنسو امڈ آئے لیکن وہ انکی پرواہ کیئے بغیر بس اپنی دھن میں بولتی چلی جارہی تھی

'تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟'

میرا حلق جواب سے چکا تھا

'تمہیں حیرت ہونی چاہیے کہ اس مرن گھڑی میں میرے پاس میرے ماں باپ، بہن بھائی کوئی بھی تو نہیں'

'تمہاری خالہ تو ہیں ناں۔۔میں بلا کر لاتا ہوں خدا کے لیئے مایوسی کی بات تم کو زیب نہیں دے رہیں'

'میرے پاس رہو' اس نے التجا کی میرے قدم

رک گئے

'سنو ناں، آج مجھے میری بہن نے فون کیا تھا اور کہہ رہی تھی کہ کل اسکا فائنل پرچہ ہے اسکے بعد وہ کراچی میرے پاس آ کر رہے گی، میرا بھائی دو دن پہلے مجھ سے بڑے پیار سے اجازت لے کر لاہور گیا ہے کہ وہاں اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ کسی فیسٹیول میں جانا تھا' اب اسکی آنکھ سے ایک آنسو کنپٹی پر رینگ گیا' اور میری ماں۔۔وہ بیچاری دن کے وقت میرے پاس ہوتی ہے لیکن بلڈ پریشر کی مریضہ ہے تھک جاتی ہے اور شام تک گھر چلی جاتی ہے' وہ یک لحظہ چپ ہو گئی' اب پتہ چلا کہ دنیا کے کام کسی کے ہونے نہ ہونے سے نہیں رکتے'

اب اس کی آنکھیں باقاعدہ نم آلود ہونے لگیں

'اور تمہارے ابو' بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں خود ہی پشیمان ہو گیا

اسکی آنکھوں کے کنپٹیوں پر آنسوؤں کی دو لکیریں بن چکی تھیں اور کرب کے آثار اسکے چہرے پر ہویدا تھے' یہ بہت مہنگا اسپتال ہے، جی۔ اس کا ایک دن کا خرچ برداشت کرنا عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا یہ تمام خرچ کون برداشت کر رہا ہے؟ میرا باپ۔ کیا ہوا جو وہ اپنی کاروباری مصروفیت کی وجہ سے یہاں میرے پاس نہیں ہے کیا یہ کم ہے کہ اس کی دولت کی بدولت ہی تو اس ہسپتال میں مجھے مصنوعی سانس دیا جا رہا ہے، شاید میرا باپ ٹھیک سوچتا ہے مجھے زندہ رہنے کیلئے اس کی محبت کی نہیں بلکہ ایک اچھی نرس کی ضرورت ہے جو میرا خیال رکھ سکے، دن رات میری خدمت میں حاضر رہے'

'نرمین پلیز' اس بار میں نے ہمت کر کے اسے کروٹ کے بل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے پہلو میں سمٹ گئی لیکن درد اسکی زبان سے بہتا ہی چلا جا رہا تھا

'جی، تم یہ بھی ضرور لکھنا کہ ہم جن پر تمام عمر ساتھ دینے اور رشتے نبھانے کا دھوکا کھائے ہوتے ہیں وہی لوگ ہماری مرن گھڑی میں ہمارے پاس نہیں ہوتے یہ دنیا بڑی بے وفا جگہ ہے یہاں ہر کسی کو تنہا جینا سیکھنا چاہیے رشتوں پر اعتبار کرنا چاہیے لیکن انحصار نہیں سہاروں کے عادی لوگ بے سہارا ہو کر میری طرح بستر مرگ پر اپنے پیاروں کو یاد کریں تو تکلیف دگنی ہو جاتی ہے آخری سانس بھی یادوں کا دامن بڑی ہی مشکل سے چھوڑتی ہے۔ اذیت اُف اذیت' اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ میرے سینے میں چھپا لیا

اب شاید مجھے بھی یقین ہو چلا تھا کہ یہ گھڑیاں واقعی الوداعی گھڑیاں ہیں میں اس کا زخمی بدن تھامے بیڈ پر بے حس و حرکت بیٹھا رہا میری جبین اس کے سر پر تھی اور آنکھوں سے سیلاب امڈ رہا تھا۔ کمرے میں میری سسکیوں کی آواز تھی

وہ دیر تک چپ چاپ سمٹی رہی

'جی، میرے بعد تمہاری زندگی میں جو بھی خوش قسمت لڑکی تمہاری بیوی بنے اسے میرے بارے میں ضرور بتانا'

میں چپ رہا کہ مجھے لگا اب بولا تو سینہ پھٹ جائیگا

'جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ میں چاہتی ہوں اسے پتہ چلے کہ تم کتنے عظیم انسان ہو ایک قبر کے دہانے لیٹی ہوئی معذور بے بس لڑکی کے لیے رو رہے ہو'

'ہاں! ہاں! میں تمہاری مایوس باتوں پر رو رہا ہوں' میرے دل پر جیسے خنجر سے وار ہوا

'یہ تمہاری محبت تمہاری قربت، اس معاشرے کے میرے ساتھ ناروا سلوک کا مداوا ہے'

'تم نہیں تو تمہارے بعد کوئی نہیں، نرمین'

'پاگل' اس نے سر اٹھا کر میری جانب نیم باز نظروں سے دیکھا' اپنے ہاتھوں کو میرے لبوں پر رکھ دو، جی'

میرا آنسوؤں سے تربتر ہاتھ اس کے یخ لبوں پر تھا اس کا سانس اکھڑنے لگا تو میں نے ہاتھوں کو پیچھے کھینچ لیا
'تم ضرور شادی کرو گے۔تم زندگی میں مصروف ہو جانا ورنہ جتنا مجھ کو یاد کرو گے میں اتنا ہی بے چین رہوں گی میری دعا ہے خدا تمہیں ایسی بیوی عطا کرے جو تمہیں راحت وسکون دے پیار کرے تمہارے دل کے تخت پر براجمان ہو۔آمین'
میں خاموش رہا میرے پہلو میں میرا آدھا حصہ میرا ہمجان مجھ سے جدا ہو رہا تھا
'کہوناں۔۔ثم آمین'
'ثم آمین'
وہ ہلکا سا مسکرا دی اور ساتھ ہی اس کی سانسیں بے قابو ہونے لگیں
'اب میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا' میں نے اسے آرام سے بیڈ کر لٹا کر فوراً ہاتھ بڑھا کر لال بٹن دبا دیا
'اب کوئی فائدہ نہیں۔۔رخصت کی گھڑی آن پہنچی ہے' اسکے چہرے پر اطمینان اور آواز میں مسرت تھی
'نہیں زرمین' میں قریباً چیخ اٹھا
نرس نازلی اور اس کے پیچھے زرمین کی خالہ تیزی سے اندر داخل ہوئی نرس نے فوراً سے پیشتر زرمین کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس کے منہ پر آکسیجن ماسک چڑھا دیا زرمین کی سانسیں قابو میں آنے لگیں کچھ توقف کے بعد مجھے محسوس ہوا جیسے زرمین کی خالہ کی نظریں میرے ہاتھوں پر تھیں جن میں زرمین کا ہاتھ تھا میں نے آہستہ سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر زرمین نے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط کر لی اس وقت مجھے اپنا آپ مجرم محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں کچھ دیر پہلے ہی زرمین کی ضد نہ مان کر بٹن دبا دیتا تو شاید نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

نرس نازلی بالکل خاموشی سے اپنی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ اسے اٹینڈ کرنے میں مصروف تھی جبکہ خالہ کا چہرہ پہلے سے زیادہ افسردہ تھا کچھ دیر بعد زرمین نے آکسیجن ماسک ہٹانے کیلئے نرس کو سر ہلا کر آنکھوں سے اشارہ کیا تو اس نے بیڈ کے ساتھ پڑی مشین میں دیکھ کر اس کی بات مان لی آکسیجن ماسک اتر چکا گیا زرمین ایک مرتبہ پھر نارمل ہو گئی میری جان میں جان آئی جیسے ماسک اس کے نہیں بلکہ میرے منہ سے اتارا گیا ہو۔
نرس سر ہلاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی 'تم کمر کے بل کیوں لیٹ گئیں'
اس نے کوئی جواب نہیں دیا بس آنکھوں میں خاموش مسکان لیئے میری جانب دیکھتی رہی
اس بار نرس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا اور اس نے براہ راست سنجیدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا' کیا آپ تھوڑی دیر کیلئے کمرے سے باہر جائیں گے'
'نہیں' زرمین کی آہستہ سے آواز ابھری
میں بمشکل اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے چھڑا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں کہ زرمین کو نرس کی ہدایات پر عمل کروانے میں بالکل ناکام رہا تھا چند لمحوں بعد خالہ بھی میرے پیچھے آ گئیں ہم دونوں باہر کرسیوں پر خاموش بیٹھے تھے میری پلکیں ابھی تک گیلی تھیں
'ڈاکٹرز نے دو دن سے جواب دے رکھا ہے کہ زرمین کسی بھی وقت۔۔' اس کی خالہ کی آواز میں بے انتہاء درد تھا
میں نے دونوں آنکھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا
'میری لاڈلی بھانجی، ہم اس کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر سکتے۔ کچھ بھی نہیں' شدت جذبات سے رندھی ہوئی آواز سن کر میرا دل پاش پاش ہو گیا
کمرے کا دروازہ کھلا تو میں نے فوراً سر اٹھا کر

دیکھا ایک لمبا چوڑا قد آور ڈاکٹر کمرے میں تیزی سے داخل ہو رہا تھا خالہ فوراً اس کے پیچھے بھاگی میں بھی کمرے کے اندر داخل ہو گیا نرمین کے منہ پر آکسیجن ماسک چڑھا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود سانسیں بے قابو ہوئی چلی جا رہی تھیں اس کی نگاہیں دروازے پر جمی ہوئیں تھیں جہاں پر میں اور میرے سامنے خالہ کھڑی تھیں بیڈ کے آس پاس ڈاکٹر اور اسکا سٹاف دم توڑتے مسافر کو بچانے کی اپنی سی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ مشین میں سے عجیب و غریب سگنلز کی آوازیں گویا الوداعی دھن کا تاثر دے رہی تھیں بالآخر آکسیجن ماسک اتار دیا گیا میں نے دیکھا نرمین بستر پر بے حس و حرکت پڑی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی

گویا مسیحا کو ہرا کے وہ اپنی جیت پر مسرور تھی!

زندگی سے مایوس لوگ اگر اس وقت نرمین کو دیکھ لیتے تو اتنی خوبصورت موت کو گلے لگانے میں ذرا تاخیر سے کام نہ لیتے

نرس نے اس کی آنکھیں بند کیں تو ایک دم مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہر طرف اندھیرا چھا گیا ہے میری ٹانگوں سے جیسے کسی نے جان کھینچ لی ہے میں بڑی مشکل سے دروازہ کھول کر دیوار کے سہارے واپس کرسی پر جا بیٹھا میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا میں نا جانے کتنی دیر اپنی بدنصیبی پر روتا رہا، اپنی حسرتوں کا ماتم اور ادھوری محبت پر غش کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ میں بے ہوش ہو گیا!

☆☆☆

خزاں کی پہلی شام

ہیلپ کیفے کا آغاز شہر کے وہیل چیئرز پر بیٹھے چند تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اس وقت کیا جب ایک مقامی ریستوران کے مالک نے ان کی وہیل چیئرز کو دروازے سے باہر یہ کہہ کر روک دیا تھا کہ 'معذرت کے ساتھ، وہیل چیئرز آپ اندر نہیں لا سکتے'۔ مالک کی معذرت نے ان کی عزتِ نفس کو گہری چوٹ پہنچائی اور انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کہا ہو 'sorry, dogs are not allowed'

غم اور غصہ کے شکار نوجوانوں نے کسی دوسرے ریستوران کا رُخ کرنے کی بجائے شہر کی خوبصورت ٹھنڈی شاہراہ کے کنارے ایستادہ گھنے چنار کے درختوں میں سے ایک درخت کا انتخاب کرتے ہوئے اس کے سائے میں شام ڈھلے اپنی محفل جمانا شروع کر دی اس محفل میں نوجوان اردگرد سے بے نیاز اپنی باتوں میں مگن، زمانے بھر کے قصے، لطیفے، یادداشتیں ایک دوسرے کے گوش گزار کرتے، قہقہے لگاتے کبھی بے حد سنجیدگی سے شاعری افسانہ ناول پر گرما گرم بحث شروع کر دیتے کبھی کسی کی آنکھیں گردشِ حالات کی وجہ سے نم ہونے لگتیں تو باقی اسے ہنسا ہنسا کر اسکا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے کبھی خاموشی کے گہرے وقفوں میں شام کی گنگناہٹ سنتے کبھی کوئی زیر غور مسئلہ سہانی شام کے حسن کو نگل جاتا اور کبھی معمولی سی خوشی ایک شام کے ہاتھوں سے پھسل کر اگلی کئی شاموں کے ہاتھوں میں اچھلتی پھرتی۔

دور سے گزرتے راہگیر اور گاڑیوں سے جھانکتی نظریں انھیں ایسے دیکھتیں جیسے بچے دیو مالائی کہانیوں کی کتاب میں پہلی مرتبہ غیر مرئی مخلوق کی تصاویر دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہیل چیئرز پر بیٹھی اس انسان نما مخلوق کی تمام عادات و سکنات، جذبات عام انسانوں جیسے ہی تھے اس کے باوجود نا جانے کیوں ریستوران کے مالک نے انہیں اندر آنے سے روک دیا تھا یہ بھی ممکن ہے اسے کسی نے خواب میں آکر یہ بات بتائی ہو کہ وہیل چیئرز پر بیٹھے معذور لوگ انسان نہیں بلکہ Aliens ہوتے ہیں ذرا ان سے بچ کے رہنا کہیں انہیں دیکھ کر تمھارے سارے گاہک بھاگ نہ کھڑے ہوں اور ریستوران کا مالک سچ مچ ڈر گیا ہو

واقعہ کچھ بھی ہو ریستوران کے مالک کے منفی رویئے نے نوجوانوں میں مایوسی کی بجائے مثبت سوچ کو جنم دیا اور یوں چنار کے درخت تلے قائم اپنی نوعیت کی منفرد محفل ایک دن 'ہیلپ کیفے' کے نام سے ایک عمارت میں منتقل ہوگئی جہاں شہر کے تمام افراد باہم معذوری اور دیگر انسان دوست لوگ شام کو اکٹھے ہوتے اپنے خیالات کا اظہار، تخلیقات کا پرچار کرتے اور درپیش مشکلات کا دیگر ساتھیوں سے حل طلب کر کے گھروں کو لوٹ جایا کرتے

کیفے کے اندر اک عبارت جلی حروف میں تحریر تھی 'تمام انسان کمزور ہیں اور ہر کمزور انسان دوسرے انسان کے تعاون سے ہی زندگی گزارتا ہے۔۔ہم اسی کو معاشرہ کہتے ہیں'

ویرا بھی اسی کیفے کی ایک فعال ممبر تھی

......☆......

شہر کوئٹہ میں زرد موسم کا راج تھا

کوہِ مہر در کے ماتھے پر ثبت ڈھلتے سورج کا آخری بوسہ رات کی گھنیری زلفوں تلے چھپ چکا تھا کہیں سے ہوا کا تیز خنک جھونکا بار بار آ کر درختوں پر لرزتے ہوئے زرد پتوں کو ٹہنیوں کے ہاتھوں سے چھڑا کر آوارہ کر دیتا۔خلاف معمول سڑکوں پر ہجوم کم تھا رات کے وقت زرغون روڈ کی رونق ماند پڑی ہوئی تھی اسمبلی ہال اور ہائی کورٹ کی پرشکوہ عمارتیں اس وقت جنات کے مسکن دکھائی دیتی تھیں سرینا ہوٹل کی خوبصورت مٹیالی عمارت کے عقب سے پت جھڑ کا اداس چاند نکلا ہوا تھا دو رویہ روشن کشادہ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں وقفے وقفے سے دکھائی دے جاتیں پوسٹ آفس کی عمارت کے سامنے آسمان کی طرف نکلے ہوئے چیڑ کے دیو قامت درخت خنک ہوا میں بازو لپیٹے ہوئے کھڑے تھے گورنر ہاؤس سے لیکر سریاب پھاٹک تک سارا دن ٹریفک کا بے ہنگم شور رہتا لیکن اس وقت رات کی ٹھنڈی چادر اوڑھے خاموش سڑک تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے راہ گیروں کو نیند کی ماری آنکھوں سے تکتے ہوئے سونے کی کوشش میں تھی

خزاں کا کوئٹہ شہر سے بہت پراسرار تعلق ہے

وسط اکتوبر سے نومبر کے آخر تک شہر کی فضاؤں پر خزاں کا سحر طاری رہتا ہے قبائلی خانہ بدوش اسی موسم میں وادی کوئٹہ سے خیمے اکھاڑ کر اپنے مال مویشوں کے ساتھ گرم علاقوں کی طرف کوچ کر جاتے ہیں اور یہ سلسلہ صدیوں سے جاری وساری ہے سردیوں کی آمد کے ساتھ ہی ریلوے اسٹیشن، پی آئی اے اور بس اڈوں کے بکنگ آفس میں لوگوں کا بے تحاشا رش دیکھنے میں آتا ہے خانہ بدوشوں کی طرح شہریوں کی کثیر تعداد بھی اس موسم میں کوئٹہ شہر سے بھاگنے کی تیاریوں میں مصروف رہتے ہیں سرما کے اوائل میں شہر کے تمام سکول کالجز اور یونیورسٹیوں میں تالے لگ جاتے ہیں سرکاری و نیم سرکاری دفاتر میں ملازمین چھٹی کی درخواستیں جمع کروا چکے ہوتے ہیں بازاروں میں فارغ دکاندار اپنے سرد کاروبار دیکھ کر قہوے اور چائے کی چسکیاں لیتے دکھائی دیتے ہیں۔

سردیوں سے نفرت کرنے والوں، برفیلی ہوا کے شور سے ڈرنے والوں، اَن دیکھے حوادث کا وہم پالنے والوں کے لئے بہتر ہے وہ کوئٹہ شہر کی پراسرار وادی سے سندھ پنجاب کے گرم میدانی علاقوں میں رہنے والے اپنے پیاروں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہو کر یہ بھول جائیں کہ کوہ چلتن کے اس پار رہنے والی ہزار سالہ ضعیف جادوگرنی وادی کوئٹہ کو برفیلی سفید چادر تلے ڈھانپ کر یخ ہوا میں شور مچاتی ہوئی سنسان سڑکوں اور بازاروں میں اپنے سفید بال کھولے گھومتی ہوگی شاید کچھ لوگ ایسا گمان رکھتے ہیں!

دراصل خزاں، گرما اور سرما کے بیچ میں ٹھہرے ہوئے وقت کا نام ہے اسی جامد وقت میں سارے

مناظر 1935ء کے زلزلے سے پہلے والے کوئٹہ شہر میں تبدیل دکھائی دیتے ہیں بالکل ویسے مناظر جیسے ہر سال 31 مئی کے اخبارات میں انگریزی دور کے خوبصورت صاف ستھرے شہر کوئٹہ کی تصاویر چھپتی ہیں یہی کوئٹہ تھا جسے انگریز منی لندن پکارا کرتے تھے

کوئٹہ کی خزاں ان لوگوں کیلئے پراسرار ہے جو یہیں رہ جاتے ہیں انہیں سرما کی آمد تک عجیب سی چپ لگی رہتی ہے وہ گفتگو کرتے ہیں لیکن اپنے اختیار سے نہیں کرتے، مریض شفاء نہیں پاتے، ٹریفک کا بے ہنگم شور تھم سا جاتا ہے، دور کسی ڈھول کے بجنے کی صدا یوں محسوس ہوتی ہے گویا پڑوس میں بج رہا ہو

اس موسم میں انسان اپنے اختیارات سے باہر ہوتا ہے کسی نادیدہ قوت کے خوف سے لوگ یہاں سے بھاگتے ہیں خزاں میں اختیار صرف اور صرف شاداب درختوں کے سبز پتوں کے پاس ہوتا ہے جو سبز رنگ سے زرد ہونے تک اپنی مرضی سے کہیں رنگوں میں بدلتے ہیں!

کوہ مہردر کے دامن سے اگر خزاں میں لپٹے کوئٹہ شہر کو دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ سارا شہر کسی سوگ میں مبتلا ہے جوں جوں شہر کا نظارا گہرا ہوتا جاتا ہے خزاں اپنے جسم پر خنکی کی چادر تان لیتی ہے وہی لوگ جو موسم گرما میں رات گئے تک دکانیں سجائے بیٹھے رہتے خزاں میں بوقتِ مغرب ہی سرپٹ گھروں کی جانب بھاگ نکلتے ہیں جیسے یک دم کسی نادیدہ قوت نے دیر تک بازاروں میں رہنے کا اختیار چھین لیا ہو۔ عورتوں کی چھٹی حس بھی اسی موسم میں انتہائی تیز ہوجاتی ہے جب حضرات شانوں پر چادر اوڑھ کر احباب کے ساتھ گھروں سے ہوٹل، سینما یا کسی اور پناہ گاہ کا رخ کرتے ہیں اور خزاں کے جامد وقت اور بے اختیاری کے عالم میں کسی محبوب چہرے، فریب دیتی آنکھوں میں قربت کی گھڑیاں گزار کر واپس گھروں کو لوٹتے ہیں تب دہلیز پر قدم رکھنے کی آہٹ کے ساتھ ہی ان کی بیویوں کی چھٹی حس خطرے کا الارم بجاتی ہے لیکن مشرقی عورت سے خزاں کی بے اختیاری سے بہت پہلے ہر اختیار چھین لیا گیا تھا اور خاص کر شہر کوئٹہ کی عورت جو قبائلی نظام میں رائج رسم و رواج کی پاسدار ہے، باحیا اور اپنی زینت کو ڈھانپ کر رکھتی ہے اس میں بڑے جدید شہروں والی عورت سی تیزی نہیں ہوتی شاید یہ بات اسکی گھٹی میں شامل ہوتی ہے کہ چادر و چار دیواری ہی عورت کا اصل زیور ہے قانون قدرت کے خلاف جا کر وہ کسی صورت بھی مردوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی اس کی عزت و ناموس کی ضمانت حد میں رہ کر زندگی بسر کرنے میں ہی ہے اور اسی حد کی پاسداری کرتے ہوئے۔

اُس روز ویرا، ماجد کو زوردار طمانچہ مار کے اسکی گاڑی سے اتر کر ٹیکسی میں جا بیٹھی تھی۔

......☆......

وہ ۹ نومبر کا دن تھا اس روز یوم اقبال کی عام تعطیل تھی

ویرا نے اپنے مقابل بیٹھی ہوئی سہیلی میمونہ کو احتیاط سے چائے کی چسکی لیتے دیکھا

میمونہ کی قوتِ بینائی سے محروم بھوری آنکھیں ہیلپ کیفے کی کھڑکی سے داخل ہونے والی نومبر کی سنہری دھوپ میں چمکتی تھیں

ویرا چائے کا کپ ہاتھ میں اٹھائے کھڑکی کے کانچ سے باہر چاروں طرف پھیلی روپہلی دھوپ کو دیکھ رہی تھی ایک فوجی ہیلی کاپٹر نیلے کھلے آسمان پر نیچی پرواز کرتا ہوا اپنی منزل کی جانب روانہ تھا ایک کوا اونچے صنوبر کے درخت اوپر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ اچانک ہیلی کاپٹر کی گڑگڑ کے ساتھ ہی کائیں کائیں کرتا ایک جانب اڑ گیا

کیفے کا باہر کا سارا منظر دلکش تھا مگر کیفے کے اندر ویرا اُداس تھی

اسلام آباد سے واپسی کے دو ہفتے بعد آج دوسرا

روز تھا کہ ویرا صبح گیارہ بجے کیفے میں آ کر بیٹھ جاتی حالانکہ اسلام آباد جانے سے پہلے وہ ہمیشہ شام کو کیفے کا رُخ کرتی تھی

میمونہ نے چائے کی آخری چسکی لینے کے بعد دونوں ہاتھوں کی مدد سے احتیاط کے ساتھ کپ طشتری میں رکھا اور ٹشو پیپر ہونٹوں کے حاشیوں پر پھیرتے ہوئے ویرا سے مخاطب ہوئی 'تم جب سے اسلام آباد سے لوٹ کر آئی ہو بہت چپ چپ رہنے لگی ہو۔ سب ٹھیک تو ہے ناں'

ویرا نے یوں میمونہ کی طرف چونک کر دیکھا جیسے اس نے کہا ہو کہ 'تم جب سے اسلام آباد میں لُٹ کر آئی ہو۔۔۔'

اسے اپنے دل میں ٹیس سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی 'نا جانے کب اس اداسی سے چھٹکارا ملے گا' اس نے سوچا اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بڑی مشکل سے لب کھولے

'میمونہ ایک بات بتاؤ۔۔کیا واقعی محبت اس روئے زمین پر ناپید ہو چکی ہے؟'

اس نے ویرا کا میز پر دھرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا 'ویرا، کیا بات ہے، مجھے سب ٹھیک نہیں لگ رہا'

ویرا نے جواباً اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے نفی میں سر ہلاتے ہوئے 'نہیں' کہا اور ساتھ ہی کیفے کا جائزہ لینے کے لیے ادھر اُدھر یوں آنکھوں کو حرکت دی جیسے ان میں بننے والے آنسوؤں کے قطروں کو منتشر کرنے کی کوشش کر رہی ہو تا کہ وہ باہر آ کر شور نہ مچا دیں۔ اس کی نگاہیں اب دوبارہ میمونہ کے چہرہ پر مرکوز تھیں لیکن اسے اچانک سے کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا اسکا ذہن کیفے میں کہیں اٹک چکا تھا بالکل اسی طرح وال کلاک کی بیٹری کا چارج ختم ہو جانے کے بعد اسکی سیکنڈ والی سوئی ایک جگہ اٹک جاتی ہے ایک بے نام سی الجھن نے اسے گھیر رکھا تھا۔

'ویرا' میمونہ نے اسے مخاطب کیا 'خدا کے لیئے چپ نہ رہو، مجھے بتاؤ کیا معاملہ ہے'

اس عجیب سی الجھن کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ میمونہ کو اپنی اور ماجد کی کہانی سنانے لگی اور جونہی کہانی محبت کی حدود سے نکل کر ہوس کی سرحد میں داخل ہوئی اسکی آواز گلے میں رندھنے لگی۔ میمونہ کی بے نور آنکھوں سے اشک چیختے چلاتے اسکے گالوں پر دوڑ آئے۔

کہانی کے اختتام تک ویرا کا ضبط بھی جواب دے چکا تھا سارا شہر چمکیلی دھوپ میں ڈوبا ہوا تھا جبکہ کیفے کے اندر زوروں کی بارش ہو رہی تھی دونوں کے ہاتھ میں ٹشو پیپر لرز تا تھا۔

'کیا ہم جیسے لوگوں کا محبت پر کوئی حق نہیں ہوتا' اسکی آواز سسکیوں سے ابھری

میمونہ اپنی نشست سے اٹھ کر میز کو ٹٹولتی ہوئی اسکے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی اور حوا کی دونوں بیٹیاں ہچکیاں لیتی ہوئیں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئیں!

ہیلپ کیفے کی یہی بات اچھی تھی یہاں ہم خیال لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر آدمی دل کا بوجھ ہلکا کر سکتا تھا

'میرا نام ارمان ہے' دونوں اس آواز پر چونک اٹھیں ویرا کو یوں آواز سنائی دی جیسے اسکی سماعت بحال ہو گئی ہو۔

ارمان اس نشست پر براجمان تھا جہاں پہلے میمونہ بیٹھی ہوئی تھی ویرا نے نم آنکھوں سے کیفے کا جائزہ لیا جہاں ان تینوں کے علاوہ ایک اور ممبر اپنی وہیل چیئر پر بیٹھا اخبار کے مطالعہ میں غرق تھا جبکہ دور کینٹین کی کھڑکی میں دائیں بازو سے محروم حلیم خان اپنے قوتِ سماعت سے محروم معاون کے ساتھ اشاروں کی زبان میں گفتگو کرنے میں مصروف تھا دونوں آدم کے بیٹے ایک ہی کیفے تلے ہوتے ہوئے حوا کی بیٹیوں کے دکھ سے بے خبر تھے۔

کیفے کی دیوار پر نصب گھڑیال سے دن کے بارہ بجنے کا باآوازِ بلند اعلان ہوا

'میں آپ کی تمام کہانی سن چکا ہوں جس کے لیئے میں آپ سے معذرت چاہوں گا'

ویرا کی گیلی پلکیں ارمان کے ہونٹوں پر مرکوز تھیں

'آپ کون ہیں؟ ہم آپ کو نہیں جانتے' میمونہ نے اسے قدرے غصے سے مخاطب کیا 'اور آپ نے یہاں بیٹھنے کی اجازت بھی طلب نہیں کی، یہ آداب کے خلاف ہے'

'میں پہلے ہی معذرت کر چکا ہوں' ارمان نے نرمی سے جواب دیا 'آپ مجھے غلط نہ سمجھیں میں تو اس دکھ کے ناتے یہاں چلا آیا جو کسی نہ کسی حوالے سے ہم سب کا مشترک دکھ ہے'

ویرا ابھی تک اجنبی کے چہرہ پر نگاہ جمائے خاموش بیٹھی تھی

'بہرحال اب آپ جبکہ سب کچھ بنا اجازت سن چکے ہیں تو مہربانی فرما کر ہمیں مزید پریشان نہ کریں' میمونہ نے اپنی نمناک آنکھوں کو بنا جھپکائے دو ٹوک انداز میں کہا

'میں آپ کی دوست سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اگر۔۔'

ویرا کا دل بہت زور سے دھڑکا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہاں کچھ گڑ بڑ ہے وہ اچانک میمونہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی 'میرا خیال ہے اب ہمیں گھر چلنا چاہیئے' اس نے کچھ توقف کے بعد لب کھولے اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے میمونہ کا ہاتھ تھام کر کینٹین کے کاؤنٹر پر چائے کا بل ادا کرتے ہوئے کیفے سے باہر نکل گئی

سارا راستہ میمونہ اس سے پوچھ پوچھ تھک گئی کہ آخر یکا یک اسے ہوا کیا ہے مگر ویرا پر چپ طاری رہی

گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سیدھا اپنے کمرے میں گھس گئی۔ ہینڈ بیگ کو میز پر پھینک کر خود بیڈ پر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اسکا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا چند لمحوں بعد وہ آنکھیں موند کر چت لیٹ گئی

'میرا نام ارمان ہے، کیا میں ویرا سے مل سکتا ہوں؟' ویرا کے آلہء سماعت میں جیسے کسی نے سرگوشی کی تھی اس نے فوراً اپنے آلہء سماعت کو چھو کر دیکھا اور اسے کان سے اتار کر تکیے پر اچھال کر دوبارہ آنکھیں موند لیں

کچھ دیر بعد اسکے کمرے کا دروازہ زور زور سے بجنے لگا وہ اپنے دونوں کان ہاتھوں سے ڈھانپتے ہوئے اٹھی اور دروازہ کھولتے ہی ملازمہ کو سامنے پا کر اس پر برس پڑی 'یہ دستک دینے کا کون سا طریقہ ہے؟'

ملازمہ حیران و پریشان اسے ہاتھوں سے کان ڈھانپے دیکھ کر بولی 'بے بی، میں نے تو بہت آہستہ دستک دی تھی'

آلہء سماعت کے بنا بھی ویرا کو ملازمہ کی آواز بالکل صاف سنائی دی 'یہ کیا ماجرا ہے' اس نے سوچا

'بے بی آپ سے کوئی ارمان نام کا نوجوان ملنا چاہ رہا ہے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا' ملازمہ نے دروازہ پر دستک کی وجہ بیان کی

ویرا کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسکے ساتھ کیا ہو رہا ہے، کیا واقعی اسکی سماعت لوٹ آئی ہے؟ اور یہ ارمان ہے کون جو میرے پیچھے پڑا ہوا ہے ۔۔ یہی سوچتے ہوئے بے اختیار اسکے قدم آہستہ آہستہ مین گیٹ کی جانب اٹھنے لگے

ملازمہ باورچی خانے کی جانب چل دی

جوں جوں وہ گیٹ کی جانب بڑھتی چلی گئی اسکے ذہن میں بپا شور کم ہوتا چلا گیا اور پھر اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا

سفید قمیض اور نیلی جینز میں ملبوس، ہلکے گندمی رنگت کا نوجوان، جسکی عمر چھبیس، ستائیس سال کے لگ بھگ تھی اپنے ترتیب سے بنائے ہوئے قدرے لمبے سیاہ بالوں کے ساتھ لبوں پر مسکان اور آنکھوں میں ایک خاص چمک لیئے پیروں میں سفید کینوس کے جوتے پہنے کھڑا تھا۔اس نے اپنے بائیں بازو کی آستین ہاتھ سے اوپر چڑھا رکھی تھی جس پر ایک خوبصورت رومال انتہائی سلیقے سے کلائی پر بندھا ہوا تھا۔رومال میں نیلا، سبز اور میرون رنگ نمایاں تھے جبکہ دائیں ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھی تھی جس میں نیلم جڑا ہوا تھا

'کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟' ارمان نے ویرا کی حیران اور گم صم آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اجازت طلب کی

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی اور پھر بغیر کچھ کہے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کی اجازت دیدی۔وہ بے تکلفی سے اندر داخل ہوگیا۔

ویرا نے جونہی دروازہ بند کیا دوسرے ہی لمحہ اس پر دوبارہ دستک ہوئی۔اس نے فوراً دروازہ کھولا تو سامنے ایک بوڑھا فقیر ہاتھ میں کشکول لیے صدا لگا رہا تھا 'خدا تیری الجھنیں دور کرے بیٹی، بنامِ خدا کچھ دیدے'

ویرا نے ناگواری سے 'معاف کرو بابا' کہہ کر دروازہ بند کر دیا مگر اسے عجیب سا محسوس ہونے لگا جیسے۔۔جیسے۔۔او میرے خدایا، ویرا کے وجود میں اپنی ہی آواز گونجی 'وہ فقیر نہیں بلکہ پروفیسر جادوگر تھا'۔۔اس نے ارمان کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر عجلت میں دروازہ کھولا لیکن وہاں کوئی موجود نہیں تھا اس نے گلی میں جا کر دائیں بائیں نگاہیں دوڑائیں لیکن ساری گلی سنسان پڑی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو پریشانی اسکے چہرہ سے عیاں تھی۔ملازمہ ارمان کے عقب میں کھڑی اسے تشویش بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔اس نے ارمان کی طرف دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے ملازمہ کو مخاطب کیا 'مائی تم جاؤ، میں ٹھیک ہوں' ملازمہ ارمان کو مشکوک نظروں سے دیکھتی ہوئی اندر باورچی کی جانب روانہ ہوگئی۔

'کون ہو تم' وہ ارمان کے روبرو کھڑی ہوگئی اسکی آنکھوں میں خوف اور حیرانگی کے ملے جلے تاثرات تھے

'کیا ہم کہیں بیٹھ کر کچھ دیر کے لیئے بات چیت کر سکتے ہیں' ارمان نے برآمدے میں پڑے کین کے صوفوں کی جانب اشارہ کیا تو ویرا نے نگاہیں اسکے چہرہ سے چھڑاتے ہوئے صوفوں کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے اسے ابھی ابھی معلوم ہوا ہو کہ اس کے گھر میں کین کے صوفے بھی برآمدے میں موجود ہیں

وہ ویرا کے پیچھے چلتا ہوا برآمدے میں داخل ہوا دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔فضا میں عجیب وغریب سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔آنگن میں دھوپ کا چمکیلا فرش بچھا تھا جسکی میٹھی میٹھی حدت ہوا کے نرم جھونکوں کے ساتھ برآمدے میں دوڑی چلی آتی۔

ویرا کی نگاہ ارمان کے ہونٹوں پر مرکوز تھی جبکہ وہ آنکھیں جھکائے بیٹھا تھا

'میں تمھارے جواب کی منتظر ہوں۔۔کون ہو تم' اس نے سوال دہرایا

اس نے ایک لمبا سانس لیا اور اپنی پلکوں کو اٹھاتے ہوئے نہایت ہی اداس لہجہ میں گویا ہوا 'ویرا، میں تمھارا ہمجان ہوں'

ویرا کے دل کی دھڑکن تیز اور جسم برف ہو چکا تھا ارمان نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا 'تم نے مجھے چار منزلہ عمارت سے فٹ پاتھ پر زرد روشنی تلے کھڑا دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔۔تمھیں یاد ہے؟'

ویرا کے خشک حلق سے آواز برآمد ہوئی 'لیکن وہ

تو۔۔۔'

'ہاں میں جانتا ہوں' ارمان نے اسکی بات کاٹتے ہوئے کہا

ویرا کے ہونٹ سل چکے تھے وہ بے حس وحرکت کسی مجسمہ کی طرح اسکے سامنے بیٹھی ہوئی تھی

'ویرا' اس نے بے تکلفی سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا 'میری مختصر سی کہانی سنو'

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اسکی آنکھوں میں حیرانی اور چہرے پر خوف تھا

ارمان نے اطمینان سے کچھ سوچتے ہوئے اپنی کہانی کا آغاز کیا 'بازار میں میری کتابوں کی دکان تھی وہاں بیٹھ کر میں فارغ اوقات میں اکثر علم فلکیات اور علمِ نجوم کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھا کرتا اور رفتہ رفتہ میرا شوق جنون میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔۔اور پھر ایک دن سفید داڑھی والا ادھیڑ عمر آدمی میری دکان میں آیا۔اسے پامسٹری کی کوئی کتاب درکار تھی جو کہ میری دکان میں دستیاب نہیں تھی لیکن وہ کافی دیر تک علمِ مابعد الطبیعات کی کتب کو باری باری کھول کر ان کے صفحات الٹتا پلٹتا رہا اور جب وہ اکتا کر دکان سے باہر جانے لگا تو مجھے اپنے ہم ذوق سے بات کرنے کو جی چاہا۔۔بس یہی مجھ سے سنگین غلطی سرزد ہوگئی' وہ سر کو پشیمانی سے ہلانے لگا

ویرا چپ چاپ کہانی سن رہی تھی

'میں نے اسے چائے کے بہانے روک کر کرسی پیش کی ۔وہ سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ہم کافی دیر تک علمِ فلکیات و نجوم پر بات کرتے رہے۔اس نے مجھے مابعد الطبعیات کے بارے میں بتایا اور اتنا تفصیل سے سمجھایا کہ میں وہیں بیٹھے بیٹھے اسکا مرید ہوگیا اور جب وہ مجھ سے رخصت لے کر جانے لگا تو پتہ نہیں کیوں میرے دماغ میں ایسے ہی اک سوال کوند آیا اور میں اس سے پوچھ بیٹھا 'یہ جو آپ نے ہمجان کے بارے میں بتایا ہے اگر میں اپنے ہمجان سے ملنا چاہوں تو کب ،کہاں اور کیسے مل سکتا ہوں؟'

میرا سوال سن کر وہ ذرا پریشان سا ہوگیا اس نے بار ہا کہا کہ بہتر ہے میں اس سے یہ سوال نہ پوچھوں لیکن میں بضد رہا

اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد اپنی آنکھوں کو موند کر مجھے بتایا کہ 'جس روز تمھارا جوتا راہ چلتے ہوئے ٹوٹ جائیگا اسی روز تمھاری ہمجان تمھیں اپنے پاس آنے کا اشارہ کریگی'

ارمان خاموش ہوگیا ماحول پر افسردگی چھاگئی

'اس کا نام عبدالعلیم تھا' ویرا نے پہلی مرتبہ اپنے لب کھولے

'ہاں'

'اور وہ انڈیا کی کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہے'

'ہاں' ارمان نے اپنی بات جاری رکھی 'لیکن عبدالعلیم نے ایک اضافی بات یہ ضرور کی تھی جس کی اس وقت مجھے بالکل سمجھ نہیں آئی تھی'

ویرا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا

'اس نے کہا تھا کیا تمہیں راز کی بات بتاؤں؟ ۔۔جن لوگوں کی محبتیں کامیاب نہیں ہو پاتیں اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہوتی کہ ان کے ہمجان مر چکے ہوتے ہیں بلکہ وہ لوگ محبت سے ہار مان لیتے ہیں بھلا محبت سے بھی کوئی ہار مانتا ہے'

اب ویرا کے پورے جسم میں خوف اتر آیا

ارمان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا 'میں بھی مر چکا ہوں'

ویرا کا چہرہ ایک دم زرد ہوگیا اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے جسم سے جان کھینچ لی ہو وہ چیخنا چاہے بھی تو نہیں چیخ سکتی وہ اٹھ کے بھاگنا چاہے بھی تو ٹانگیں گویا مفلوج ہو چکی تھیں۔

'گھبراؤ مت' ارمان نے اسے نرم لہجے میں مخاطب کیا 'تمھیں میری وجہ سے پہلے ہی بہت دکھوں

کا سامنا کرنا پڑا ہے، نہ ہی میں پروفیسر سے اپنے ہمجان کے بارے میں سوال پوچھتا اور نہ ہی تم کو معلوم ہوتا کہ بیچ سڑک کے مرنے والا تمھارا ہمجان تھا'

'اب تم کیا چاہتے ہو' ویرا کے حلق سے خوف سے لرزتی آواز نکلی

'بس دو روز کے لیئے تمھارا ساتھ'

'لیکن ۔۔کیوں'

'یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا' اس نے آسمان کی جانب نگاہ اٹھاتے ہوئے کہا

ویرا کی حالت یہ سوچ سوچ کر غیر ہوتی جا رہی تھی کہ وہ ایک مردہ انسان کے پاس بیٹھی ہم کلام ہے

'اب مجھے اجازت دو' ارمان اپنی نشست سے اٹھا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا 'ہم کل شام پھر ملیں گے'

'نہیں' ویرا کی نگاہیں اوپر اسکے چہرے کی جانب اٹھی ہوئی تھیں

ارمان اسکے آگے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اسکی آنکھوں میں چند لمحے دیکھنے کے بعد بولا 'ہم کل شام ہنہ جھیل جائیں گے'

ویرا پر غشی طاری ہونے لگی اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں موند کر اسکی بات دہرائی اور دہراتی چلی گئی 'ہم کل شام ہنہ جھیل جائیں گے'

'شاباش' ارمان مسکرا دیا

چند لمحوں بعد یخ ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا جس سے اس کی آنکھیں خود بہ خود کھل گئیں اس نے اپنے اردگرد یوں دیکھا جیسے ابھی ہوش میں آئی ہو

ارمان جا چکا تھا

آنکھوں کے پردوں پر ایک لمحے کیلیئے پروفیسر جادوگر کا مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہو کر غائب ہو گیا۔ وہ پہلی بار پروفیسر کا چہرہ دیکھ کر مسکرا دی!

......☆......

کوئٹہ شہر سے ہنہ وادی کا فاصلہ 20 کلو میٹر ہے !

اس کے بعد وادی اوڑک کی حدود شروع ہو جاتی ہے۔ ہنہ کے مقام پر ایک خوبصورت جھیل ہے جو 'ہنہ جھیل' کے نام سے مشہور ہے۔

جھیل کا پانی سبزی مائل نیلا ہے جس میں سنہری مچھلیاں بہ کثرت پائی جاتی ہے موسم گرما میں اس کے کناروں پر سائبیریا سے چھٹیاں گزارنے کیلیئے آئے آبی پرندے اس کے ماحول کو اور دل کش بنا دیتے ہیں۔ بالعموم کوئٹہ شہر اور بالخصوص پاکستان بھر سے آنے والے لوگ اس خوبصورت جھیل کو اپنے غم، تھکن، الجھنیں دے کر بدلے میں قہقہے مسکراہٹیں اور رقص و سرور کی کیفیات لے کر واپس اپنے شہروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ یہ ایک بہترین تفریح گاہ ہے

جھیل کے پس منظر میں خشک خاکستری پہاڑوں کا سلسلہ ہے وہ حصہ جہاں پانی بہت گہرا ہے اس جگہ اریگیشن ڈیم کسی فوجی قلعہ کی مانند کھڑا ہے۔ جھیل کے مضافات میں اس کو مزید خوبصورت بنانے میں 'مرک مارکر' کے تعاون سے شجر کاری کی گئی ہے۔ حیات درانی واٹر اسپورٹس اکیڈمی بلوچستان کا واحد ادارہ ہے جہاں سے لوگ کشتی رانی کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔

کوئٹہ کنٹونمنٹ سے ہنہ جھیل کی طرف جانے وال سڑک کے بائیں جانب شفاف پانی سال کے بارہ مہینے بہتا ہے جس کے کنارے لوگ گاڑیاں، موٹر سائیکلز اور رکشے کھڑے کر کے انہیں نہلاتے دکھائی دیتے ہیں کچھ لوگ ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈالے خوش گپیوں میں مصروف غم زمانہ کا مذاق اڑاتے ملتے ہیں اطراف میں چائے کے متعدد ہوٹلز ہیں جن کے چھوٹے چھوٹے باغیچوں میں شام کے وقت شہر کی گھٹی ہوئی فضا سے فرار حاصل کر کے لوگ دوستوں پیاروں کے ساتھ یہاں آتے ہیں اور لڈو بازی کے ساتھ چائے اور قہوے سے لطف اندوز ہو کر واپس

گھروں کو لوٹ جاتے ہیں
بلند و بالا سنگلاخ پہاڑوں پر منچلے نوجوان گاڑیوں، موٹر سائیکلوں کی دوڑیں لگاتے ہوئے اور کوہ پیمائی کے شوقین دیو مالائی پہاڑوں کی چٹانوں میں رینگتے نظر آتے ہیں۔ جمعہ اور اتوار کے دنوں میں اس مقام پر بے حد رش ہوتا ہے، جمعہ کے دن کاروباری حضرات بازاروں کو تالے لگا کر اس طرف کا رخ کرتے ہیں جبکہ اتوار کے دن سرکاری اور نجی اداروں کے ملازمین اپنے خاندانوں کے ساتھ ایک بڑی تعداد میں یہاں تفریح کے غرض سے آتے ہیں۔ یہ کوئٹہ واسیوں کا ایک بہترین پکنک پوائنٹ ہے ہنہ جھیل کے بالکل وسط میں ایک بے حد خوبصورت چھوٹا سا جزیرہ ہے جس نے جھیل کے حسن کو چار چاند لگا رکھا ہے برف باری کے موسم میں اس کے دلربا حسن کا بیان ناممکنات میں سے ہے دیکھنے والوں کو فردوس بروئے زمیں کا گمان ہوتا ہے

......☆......

شام کے 4 بجے تھے
شاہراہ گلستان پر ڈیری فارم مسجد سے لیکر آخری موڑ تک خزاں اپنے تمام رنگوں کے ساتھ بال کھولے شام کی گلابی روشنی میں مدہوش پڑی تھی۔ شاہراہ کے دائیں بائیں جانب فوجی کرنیلوں اور بریگیڈیئرز کے خوبصورت بنگلے ہیں بائیں جانب کے بنگلوں کے باہر حسین باغیچوں کی قطار ہے، جن میں سبز گھاس کی چادر پر خزاں کی زردی غالب آنے کو بیقرار تھی جبکہ دائیں جانب شاہراہ سے ہٹ کر گھنے درختوں تلے کوئٹہ شہر کا سب سے دلکش و دل فریب رومانوی فٹ پاتھ ہے!
ویرا اور ارمان اسی فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں تھے ان کے قدموں تلے انمول قدیم پیڑوں کے طلائی اوراق بچھے ہوئے تھے۔ سرد ہوا مٹی کی خوشبو کے بوسوں سے لجائی ہوئی تھی فضاؤں میں جادو گھلا ہوا تھا جو زخمی روحوں کی مسیحائی میں مشغول تھا
سڑک کنارے ایک مالی اپنی سائیکل پر خشک گھاس کا گٹھہ باندھنے میں مگن تھا
'اگر ہمارے چلنے کی رفتار یہی رہی تو ہم کل شام تک ہی جھیل پہنچ پائیں گے' ویرا نے چنار کے اس پیڑ کے پاس پہنچ کر ارمان کو مخاطب کیا جہاں میناؤں کا بے تحاشا شور تھا
اس نے مسکرا کر ویرا کی طرف دیکھا اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے یونہی ٹہلتے ٹہلتے ایک جگہ تھم گیا 'کیا واقعی گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ وقت بھی گزرتا رہتا ہے' اس نے چہرہ اٹھا کر درخت کی نیم برہنہ شاخوں کو دیکھا
'مجھے نہیں معلوم۔۔لیکن میری بات کا اس سوال سے کیا تعلق؟' ویرا نے سنجیدگی سے استفسار کیا
'تعلق شاید کوئی نہیں، ویسے ہی ایک خیال ذہن میں آیا تھا' اس نے کاندھے اچکا کر کہا
'ٹائم پاس کرنا چاہ رہے ہو؟'
چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ارمان چلتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا 'دراصل جب ہم اپنی منزل کی جانب روانہ ہوتے ہیں اس وقت ننانوے فیصد لوگوں کا دھیان دھیرے دھیرے منزل سے ہٹ کر وقت کی ٹک ٹک پر مرکوز ہو جاتا ہے اور پھر وہ کبھی بھی منزل تک نہیں پہنچ پاتے۔۔۔جانتی ہوں کیوں؟'
ویرا نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا
'کیونکہ وقت ایک آسیب ہے، عفریت کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ رہتا ہے'
ویرا کو اس کی بات بہت عجیب معلوم ہوئی لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا
ارمان نے اچھل کر درخت کی ایک ٹہنی کو ہاتھ لگاتے ہوئے بات جاری رکھی 'اسی لیے تو ہر معاشرے میں چند افراد ہی ایسے ہوتے ہیں جنہیں سب لوگ 'کامیاب انسان' کہنے پر متفق ہوتے ہیں کیونکہ جب

وہ منزل کی جانب روانہ ہوتے ہیں تو ان کا دھیان کبھی بھی وقت کے مایا جال میں نہیں پھنستا'

'میں نے تو ہمیشہ یہی سنا ہے کہ انسان کو وقت کی قدر کرنی چاہیئے کیا یہ سب فضول باتیں ہیں؟'

'ہاں واقعی فضول بات ہے' اس نے سر ہلایا 'انسان کو ہمیشہ اپنی اور اپنے مقصد کی قدر کرنی چاہیئے'

'تو پھر وقت گزارنا کسے کہتے ہیں؟' اس بار ویرا نے دلچسپی لی

'وقت ایک کھلا دھوکا ہے' ارمان بے حد سنجیدہ ہوگیا ویرا کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ پروفیسر جادوگر سے ہم کلام ہے

'انسان ہمیشہ امید اور انتظار کے وقفے میں زندگی گزارتا ہے اپنے خوابوں ارادوں، مقاصد کو پالینے کی امید۔۔ اور موت کا انتظار۔۔ وہ ساری عمر امید پر گزارتا ہے لیکن آخری عمر میں امید اس سے رخصت لے لیتی ہے اور اسکی جگہ انتظار لے لیتا ہے بس حضرتِ انسان کی اتنی سی کہانی ہے'

سرد ہوا کے جھونکے نے اچانک ڈھیروں طلائی اوراق پیڑوں کی شاخوں سے جدا کر ڈالے۔ ویرا نے شہر کراپنی شال پر چپکے ہوئے خشک پتوں کو سلیقے سے اتارا اور بولی 'یہ تو آئن اسٹائن بہت پہلے کہہ چکا ہے کہ وقت ایک فریب ہے'

'درست، دیکھو یہ شام کا وقت کل پھر آئیگا۔ شام کے بعد رات اور صبح کے بعد دوبارہ شام۔ ایسی خزاں اگلے برس پھر آئے گی۔ خزاں کے بعد سرما اور گرما کے بعد دوبارہ خزاں۔ یہ طے شدہ عمل ہے لیکن ہم نے بدل جانا ہے بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے میں داخل ہونا ہے واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔وقت تو ویسے ہی گول گول چکر کاٹ رہا ہے درحقیقت کائنات کا مرکزی کردار انسان ہے قدرت ہمیں صرف مواقع فراہم کرتی ہے اور ہم انہیں مواقعوں کو چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کر کے خود کو اپنے آقا 'وقت' کا غلام مان لیتے ہیں وہ آقا جسے آج تک کوئی دیکھ سکا ہے اور نہ ہی کوئی چھو سکا ہے!

'کیا تم یہ کہنے کی کوشش کر رہے ہو کہ وقت کا وجود سرے سے ہے ہی نہیں'

'آج ہم دونوں اس خوبصورت فٹ پاتھ پر اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہیں یہ خزاں رسیدہ پتوں کی سرسراہٹ یہ چڑیوں کا شور، آسمان میں بادلوں کی ٹکڑیاں، قدموں تلے بھیگا ہوا رستہ۔۔ شاید یہ ایک نہ بھولنے والی شام ہے لیکن ابھی رات اترے گی اور اس شام کو ماضی کی ایک یادگار شام میں تبدیل کر دیگی پھر صبح ہوگی اور ایک نئے دن کا آغاز ہو جائے گی اور اس اگلے روز کی شام ہرگز ایسی نہیں ہوگی سب کچھ ایسا نہیں ہوگا کل اس فٹ پاتھ پر ارمان اور ویرا زرد سوکھے پتوں پر نہیں چلیں گے آج کے تندرست اور توانا خدا جانے کتنے لوگ کل بسترِ علالت پر ہونگے، نا جانے کتنے افراد اس دنیائے فانی سے کوچ کر چکے ہونگے، ہمارا مستقبل ہماری نگاہوں کے سامنے ہم سے چھین لیا جائیگا اور ہم کچھ بھی نہیں کر پائیں گے جو لوگ لمحۂ موجود میں زندگی بسر کرتے ہیں انہیں ماضی اور مستقبل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور جو لوگ ہاتھ میں ہاتھ لیئے ساحل کے گیلی ریت پر دور تک ساتھ چلتے ہوئے بھی بار بار اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہیں ان کیلئے ایسی حسین شامیں کبھی یادگار نہیں بن سکتیں یہ لمحات ان کے نزدیک محض 'چھ بجکر پندرہ منٹ' یا 'سات بجکر پینتیس منٹ' کے علاوہ کچھ اہمیت نہیں رکھتے ان کیلئے وقت اہم ہے لمحۂ موجود کے حسن کو کھا جانے والا وقت!

ویرا کچھ دیر سوچنے کے بعد گویا ہوئی 'اگر وقت کا وجود نہ ہوتا تو ہمیں کیسے پتہ چلتا کہ ہم نے صبح آٹھ بجے کالج پہنچنا ہے دو بجے والی پوائنٹ پر بیٹھ کر واپس گھروں کو لوٹنا ہے ہماری زندگیوں میں ٹائم ٹیبل نہ ہو تو زندگی درہم برہم ہو کے رہ جائے وقت ہمارے معمولات زندگی کو منظم کرتا ہے وقت تو سرمایا ہے اس

کی ٹھیک جگہ سرمایا کاری کرنے والا ہی نفع کمائے گا اور یہی قدرت کا اصول ہے‘

ارمان نے ایک لمبی سانس بھر کر آسمان کی طرف دیکھا‘ اچھا مجھے تم یہ بتاؤ کہ کل یعنی آنے والے کل میں جب تم صبح برش سے اپنے دانت صاف کر رہی ہوگی تو گھڑی میں کیا وقت ہوگا‘

ویرا کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی‘ کل کی کسے خبر۔ کل کا چہرہ دیکھنا نصیب میں ہے بھی یا نہیں‘

’مان لو کہ نصیب میں ہے اب بتاؤ‘

’یہی کوئی سات سوا سات کا وقت ہوگا‘

’نہیں یوں بتاؤ جیسے اس وقت جب تم نے ٹھہر کر اپنی چادر سے خشک پتے اتارے تھے تو گھڑی میں چار بجکر بیس منٹ اور دس سیکنڈ ہو رہے تھے‘

’ایسا بتانا تو مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے‘

اچھا یہ بتاؤ کہ کل یعنی گزشتہ کل جب میں نے تمہیں یہ بتایا تھا کہ میں تمہارا ہمجان ہوں تو اس لمحے گھڑی میں وقت کیا شور مچا رہا تھا‘

’بالکل کوئی اندازہ نہیں‘ اس نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا

’حالانکہ وہ لمحہ تمہارے کیلئے کتنا اہم تھا کہ جب تم پر ایک سربستہ راز افشا ہوا تھا جس کا تمہاری ذات سے گہرا تعلق ہے‘

’اب صرف یہ بتاؤ کہ۔۔۔‘

ویرا نے مسکراتے ہوئے اسکی بات کاٹ دی‘ بس اب تم بتاؤ۔ میں ہمہ تن گوش ہوں‘

’سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے کیوں وقت کو چوبیس گھنٹوں میں بانٹ کر خود کو ایک مشین کے حوالے کردیا ہے‘ اس نے ویرا کی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف اشارہ کیا‘ جبکہ ہم ماضی قریب ماضی بعید سے لیکر آنے والے پل اور مستقبل کے بارے میں کچھ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ فلاں عمل، واقعہ، حادثہ،

ہماری زندگی میں کتنے بجکر کتنے منٹ پر رونما ہوا تھا'

'ماضی کے ایک حادثے کے بارے میں میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ کتنے بجکر کتنے منٹ پر رونما ہوا تھا' ویرا نے مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا

ارمان بھی دھیما سا مسکرادیا جیسے وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے جارہی ہے

'اکتیس مئی 1935ء میں جب رات کے وقت کوئٹہ شہر زلزلے کی زد میں آکر ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا تو اس ملبے میں سے ایک گھڑیال برآمد ہوا جس کی سوئیاں تین بجکر دو منٹ پر جامد تھیں'

ارمان نے قہقہہ لگایا' اور اب ہر سال اکتیس مئی کو پورے کوئٹہ میں یہ افواہ گردش میں رہتی ہے کہ جیسے History Repeats It Self اسی طرح Earth Quake Also Repeats سے It Self At The Same Time and Day ۔۔۔اور ہوتا کچھ بھی نہیں ہے نہ ملبے سے گھڑیال ملتا اور نہ ہر سال تیس مئی کی شب کوئٹہ کے شہریوں کی نیندیں حرام ہوتیں'

اب کے ویرا نے ہلکا سا قہقہہ فضا میں بلند کیا

'میں وقت کے وجود سے انکار نہیں کررہا لیکن صرف اتنا سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ وقت صرف اور صرف لمحہ موجود کا دوسرا نام ہے جس کا ماضی و مستقبل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا' ارمان نے سنجیدگی سے کہا' فجر کی اذان کا گھڑی کی ٹک ٹک سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا ساڑھے چودہ سو سال پہلے کا موذن بھی نور کا تڑکا لگتے ہی مومنوں کو بیدار کرنے لگتا اور آج کا موذن بھی یہی کرتا ہے اور اسی طرح مغرب کی اذان غروب آفتاب کی منتظر رہتی ہے'

'تو پھر آخر یہ وقت ہے کیا' ویرا نے گویا حتمی سوال کیا

'وقت ایک بہلاوا ہے' اس نے تحمل سے جواب دیا' جب کوئی دوست رشتہ دار آپ کو راستے میں اچانک مل جائے اور وہ یہ کہے کہ اسے آپ کے گھر آنے یا ملاقات کا وقت نہیں ملتا تو درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ آپ سے ملنے کی خواہش نہیں رکھتا لیکن آپ با آسانی وقت کے فریب میں آجاتے ہیں'

خزاں رسیدہ پتے مستقل دونوں کے پیروں کا طواف کررہے تھے

'کیا تم یہ بات جانتی ہو ویرا' ارمان کی آنکھوں میں چمک اتر آئی' جب گناہوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگ صبح بیدار ہوتے ہیں تو سب سے پہلے انہیں شیطان کا چہرہ نظر آتا ہے اور وہ اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا وقت ہوا ہے؟ اور شیطان مسکرا کر جواب دیتا ہے بتاؤ تمہیں کتنا وقت چاہیئے پیارے؟'

ویرا کو یہ بات بہت ہی عجیب لگی

تھوڑی دیر بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے شہر بالکل خالی ہوچکا ہے کافی دیر سے کوئی گاڑی، موٹر سائیکل یا سائیکل سڑک سے نہیں گزری اس نے پیچھے مڑکر دیکھا تو فٹ پاتھ دور تک زرد پتوں کا قبرستان بنا ہوا تھا ہوا کافی حد تک سرد ہوچکی تھی۔ ہنہ جھیل اس جگہ سے بہت دور تھی اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ آج کی تاریخ میں اس طرح ٹہلتے ہوئے کیسے جھیل تک پہنچ سکتے ہیں اور جونہی اس نے دوبارہ یہ سوال ارمان سے کرنے کا سوچا اچانک بہت تیز اور سرد ہوا نے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ویرا نے اپنے دونوں بازو اپنے چہرے کے سامنے ڈھال بنالیئے فضا میں لاتعداد پتے پروانوں کی طرح اڑنے لگے ارمان آنکھیں موند کر ساکت کھڑا تھا ذرا دیر بعد جب ہوا تھم گئی اور ویرا نے آہستہ سے اپنے بازو چہرے کے سامنے سے ہٹا کر نیچے کیئے تو منظر بدل چکا تھا

اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ واقعی اس وقت ہنہ جھیل کے اس پار کھڑی ہے جہاں جنگی طیارے کا بڑا سا ماڈل نصب

ہے دائیں طرف بینچ پر ارمان بیٹھا تھا اور سامنے خوبصورت نیلی جھیل میں سورج کی کرنیں تیرتی تھیں وہ حیرت میں گم آہستہ آہستہ بینچ کی طرف بڑھنے لگی جیسے خواب میں چل رہی ہو!

'گھبراؤ مت' ارمان نے بنا اس کی طرف دیکھے اسے مخاطب کیا جبکہ اس کی نگاہیں دور افق میں گڑی ہوئی تھیں 'بیٹھ جاؤ'

ویرا چند لمحے اس کے چہرے کو بغور دیکھنے کے بعد بینچ کے دوسرے کونے پر بیٹھ گئی

موسم خزاں میں جھیل کا رخ بہت ہی کم لوگ کرتے ہیں اور اس سے جھیل پر پراسرار سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اب ویرا سمجھ چکی تھی کہ ارمان نے وقت کا موضوع اس لیئے چھیڑ رکھا تھا کہ اسے سمجھنے میں آسانی ہو کہ وہ اس وقت ایک روح کے ساتھ سفر کر رہی ہے اور جیسے وہ بچپن سے سنتی آئی تھی کہ روحیں وقت کی قید سے آزاد ہوتی ہیں اور سب کچھ کر سکتی ہے وہ کوہ تلکو سے کوہ زرغون پر منٹوں میں چھلانگ لگا کر پہنچ سکتی ہیں بند دروازے کھولے بغیر اندر داخل ہو سکتی ہیں کسی سے بدلہ لے سکتی ہیں اور کسی پر عاشق ہو سکتی ہیں

خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تو ارمان نے سکوت توڑا 'اس وقت تم میرے ساتھ اس بینچ پر بیٹھی ہو یہ لمحہ 'موجود تمہاری زندگی کا حقیقی لمحہ ہے یہ لمحات تمہاری مٹھی میں ہیں اور اسی کو تم بصد شوق وقت کہہ سکتی ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم میرے ساتھ ٹہل رہی تھی لیکن وہ سب یاد کے قبرستان میں دفن ہو چکا ہے تمہاری عمر بڑھ چکی ہے ،، بہت معمولی ہی سہی لیکن بڑھی ضرور ہے اب تمہاری وہ عمر نہیں ہے جو سوکھے پتوں پر ٹہلتے سے تھی۔ وہ عمر تم اپنی گھڑی کے مطابق پانچ منٹ پیچھے چھوڑ آئی ہو اب تمہاری عمر میں پانچ منٹ کا اضافہ ہو چکا ہے اور اضافے کے ساتھ تمہاری سوچ میں بھی پختگی آ چکی ہے'

......☆......

جھیل کے اس پار چیڑ کے درختوں تلے کوئی منچلا ریڈیو پر استاد نصرت فتح علی خاں کی قوالی سن رہا تھا یہ جو ہلکا ہلکا سرور ہے۔۔۔ یہ تیری نظر کا قصور ہے

قوالی کے بول ہوا کے جھونکوں کے ساتھ پانی پر رقص کرتے ہوئے چند لمحوں کیلیئے اس پار آ کر خاکستری پہاڑیوں کی طرف جا نکلتے۔۔ ارمان ویرا کا ہاتھ تھام کر آہستہ سے اٹھا اور جھیل کے کنارے کی جانب چل دیا۔ شام اپنی پوری رعنائی کے ساتھ جھیل پر چھائی ہوئی تھی۔ پانی کی سطح پر سکون تھی سورج کی کرنوں کے بھیگے ہونٹوں نے اسکے بدن کو چوم چوم کر لال کر رکھا تھا گویا اب کے ہم بچھڑے پھر ملیں نہ ملیں۔

کنارے پر پہنچ کے خنکی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ شمال کی جانب سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ویرا کے ریشمی بالوں کو چہرے پر پھیلا کر آگے نکل گیا اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ ارمان نے ایک چھوٹا سا پتھر جھیل کی سطح پر پوری قوت سے یوں پھینکا کہ پتھر تین چھلانگیں لگا کر چوتھی چھلانگ پر پانی میں ڈوب گیا۔ اس نے ویرا کی جانب دیکھا تو اس کی نظریں وہاں جمی ہوئی تھی جہاں پتھر کے سوگ میں پانی نے ایک دائرہ بنا رکھا تھا

'آؤ' ارمان نے اپنا دایاں ہاتھ ویرا کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا

'کہاں' ویرا نے چونک کر پوچھا

ارمان نے جھیل کے وسط میں کسی ملکہ کے تاج کی طرح ابھرے ہوئے جزیرہ کی طرف دیکھا 'وہاں'

ویرا نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی اس کے چہرہ پر خوف و حیرت کے ملے جلے تاثرات تھے 'ابھی کچھ دیر میں اندھیرا ہو جائے گا' اس نے آہستہ سے کہا لیکن ارمان کا ہاتھ بدستور اس کے سامنے پھیلا رہا وہ خاموش کھڑا اس کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ ویرا اپنے دونوں بازو آغوش میں سمیٹے چند

لمحے اسے دیکھ کر کچھ سوچتی رہی اور پھر فیصلہ کن انداز میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا
'آنکھیں بند کرلو ویرا' اس نے نرم لہجے میں کہا
ویرا نے آنکھیں موند لیں
اس نے پانی کی سطح پر قدم رکھا اور دونوں جھیل کی پرسکون سطح پر چلتے ہوئے جزیرے پر پہنچ گئے' اب آنکھیں کھول سکتی ہو' ارمان نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا
ویرا نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنی گردن کو ہلکا سا خم دے کر پیچھے کی جانب نگاہ کی اور خوفزدہ ہوکر ڈگمگانے لگی ارمان نے اسے سہارا دیا اور دونوں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے جزیرے کے سرے پر جا کر بیٹھ گئے۔
جھیل کی ہلکی مستی بھری لہریں جزیرے کے کناروں سے ٹکرا کر واپس لوٹ جاتیں۔شام تقریباً ڈھل چکی تھی چیڑ کے درختوں کے لمبے سائے غائب ہونے کو تیار تھے۔جھیل کے کنارے گہرے سرمئی اور ہوا باقاعدہ سرد ہوچکی تھی ارمان نے اپنا گرم کوٹ اتار کر اسے پہنا دیا ویرا کے کانپتے بدن کو یکا یک جیسے سکون آگیا لیکن اس کے کان ٹھنڈ سے گلابی ہورہے تھے ارمان نے اپنی کلائی سے ریشمی رومال کھول کر اس کے سر پر اسکارف کی طرح باندھ کر اس کے کان ڈھانپ دیئے۔
وہ کچھ دیر گھٹنوں پر سر رکھے ارمان کی باتوں کے متعلق سوچتی رہی تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے اچانک گھٹنوں سے سر اٹھا کر اس کی طرف نم آنکھوں سے دیکھا 'یہ محبت کا حصول اتنا کٹھن کیوں ہوتا ہے ارمان'
'میں جانتا تھا کہ تم کبھی نا کبھی یہ سوال ضرور کروگی'
اسے سمجھ نہیں آیا کہ ارمان کی بات کا مطلب کیا ہے 'میں سمجھی نہیں'
'محبت نہ ملنے کی دو وجوہات ہوتی ہیں ویرا' اس نے اپنی انگوٹھی کو انگلی میں گھماتے ہوئے کہا
'پہلی وجہ یہ کہ ہم خود سے محبت نہیں کرتے اور دوسری یہ کہ۔۔ ہم اپنی گزشتہ محبتوں کے زخموں کو بھرنے میں ناکام رہتے ہیں'
ویرا کے سینے میں ایک ٹیس اٹھی اور چہرہ اتر گیا
'محبت کا تعلق جسم سے نہیں روح سے ہوتا ہے' ارمان نے اس کی طرف سنجیدہ نگاہوں سے دیکھا 'محبت اپنی ذات کی ضرورتوں کو محبوب کی مجبوریوں پر قربان کرنے کا نام ہے جب محبت جسم تک محدود ہوکر رہ جائے تو ہمیں لینے پڑا کساتی ہے جس طرح ہم جسم کی زیبائش کیلئے کپڑے، زیورات، جوتے بازار سے خرید کر لاتے ہیں اور جسم کے تقاضے اور ضروریات کو پورا کرتے ہیں اور اسی طرح اگر محبت روح میں مقیم ہوتو ہمیں دینے کا درس دیتی ہے جس طرح ہم اپنی روح کی آرائش کیلئے صدقہ، خیرات، زکوۃ سے غرباء کی امداد کرکے اپنے رب کو راضی کرتے ہیں اور ہمیں روحانی طور پر تسکین ملتی ہے'
ماحول پر خاموش اداسی چھائی ہوئی تھی
'کیا تم واقعی میرے ہمجان ہو ارمان' ویرا نے ایک بار پھر اپنا شک دور کرنا چاہا
ارمان نے پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں محبت کا رنگ دیکھا اور یوں آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے 'ہاں' کہا جیسے جھوٹ بول رہا ہو۔حالانکہ حقیقت یہی تھی
'لیکن تم تو۔۔' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور پلکیں جھکالیں
'ہاں میں جانتا ہوں کہ میں مرچکا ہوں' اس نے سورج کی الوداعی روشنی کو دیکھتے ہوئے کہا 'ویرا کیا تم جانتی ہو کہ ہمجان کیا ہوتا ہے'
'ہمارا آدھا حصہ' اسکی نظریں ارمان کے چہرے پر جم گئیں 'وہ جسے آسمانوں میں ہمارے لئے منتخب کیا جاچکا ہوتا ہے'

ارمان کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا
ویرا کو اس کی خاموشی چبھنے لگی کیا Soulmate ہمارا کھویا ہوا حصہ نہیں ہوتا؟'
'ہمجان وہ ہوتا ہے جو ہماری خاموشی کی زبان سمجھتا ہے' ارمان نے لب کھولے 'اس دنیا میں ہماری سب سے پہلی ہمجان ہماری ماں ہوتی ہے' ویرا کیلئے یہ بات حیران کن تھی اس سے پہلے اس نے ہمجان کی یہ تعریف کبھی نہیں سنی تھی
'برداری کے تمام لوگوں میں سے ایک یا دو افراد میں ہم کشش محسوس کر کے ان سے دل کی بات کہتے ہیں۔سب بچوں میں سے ایک بچہ باقی بچوں میں سے زیادہ ہماری توجہ اپنی جانب کھینچتا ہے۔چار بیویوں میں سے صرف ایک بیوی سے آدمی بے پناہ محبت کا دعویٰ کرتا ہے۔ہم تمام بہن بھائیوں میں سے صرف ایک بہن یا بھائی سے زیادہ قربت رکھتے ہیں۔دوستوں میں سے ایک کو اپنا ہمراز بنانا پسند کرتے ہیں۔جانتی ہو کیوں؟'
ویرا حیرت میں گم نفی میں سر ہلانے لگی
'کیونکہ جن لوگوں سے ہماری سوچ کی فریکیئسی میچ ہوتی ہے وہ لوگ لاکھوں کے ہجوم میں بھی ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کروا لیتے ہیں۔ہمیں ان سے ملکر سکون ملتا ہے ہماری شخصیت مکمل ہونے لگتی ہے ہماری غمی اور خوشی میں ان کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ہماری ذات کو مضبوط کرنے میں یہ لوگ پیش پیش ہوتے ہیں۔ہم انہی لوگوں سے متاثر ہو کر انہیں زندگی کے اہم ترین فیصلوں میں شامل رکھتے ہیں۔ہاں! ہم ان کے بغیر ادھورے رہتے ہیں۔یہی ہمارا آدھا حصہ ہوتے ہیں'
ہنہ جھیل کی سرمئی شام کا نظارہ اب بدل چکا تھا
تیرھویں کا سرد چاند آسمان پر چمکنے لگا اسکا عکس پانی پر نقرئی چاندی کی مانند پگھلا ہوا تھا خاکستری پہاڑ چاندنی میں یوں اوندھے پڑے ہوئے تھے جیسے مغربی ممالک کے ساحلوں پر حسینائیں دنیا و مافیہا سے بے خبر دھوپ میں لیٹی ہوتی ہیں سردی کے باوجود جھیل کے جزیرے پر محبت کا معتدل موسم اترا ہوا تھا
'اور ایک شخص ایسا بھی تو ہوتا ہے جس کے پاؤں پر ہماری محبت شدتِ جذبات سے سرشار ہو کر سجدہ کرتی ہے' ویرا نے ہولے سے اپنا سر ارمان کے کاندھے پر رکھتے ہوئے کہا 'جو ہمارے جسم کا آقا اور روح کا مسیحا ہوتا ہے'
'وہ لوگ جنکی محبت کا دھاگہ ٹوٹ جاتا ہے یا وہ جنکی شادیاں دیرپا نہیں رہتیں یا پھر وہ جو ساری عمر ایک بستر پر سوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی محبت میں بیدار نہیں ہو پاتے اسکی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کو غلط فیصلوں کی بھینٹ چڑھا چکے ہوتے ہیں یہ مجبور لوگ ہوتے ہیں دل کی زبان سے ناآشنا لوگ'
'تو پھر وہ کون خوش بخت ہوتے ہیں جنہیں انکا ہمجان مل جاتا ہے ارمان؟'
'جنکا نفس انکے قابو میں ہوتا ہے جن کی خواہشات انکے تابع ہوتی ہیں جو پہلی بار نگاہیں ملنے پر ایک دوسرے کی آنکھوں کے رستے یوں ایک دوجے کی روح میں اترتے ہیں کہ انہیں یہ دھیان تک نہیں رہتا میرے محبوب کی آنکھوں کا رنگ کیسا ہے۔وہی ایک دوسرے کے اصل ہمجان ہوتے ہیں'
ویرا نے آنکھیں موند لیں اور ارمان نے اپنا گال اس کے سر پر ٹکا دیا
'ایک بات بتاؤں' اس نے گہری خاموشی کے بعد اسے مخاطب کیا
ویرا نے بہت آہستہ سے 'ہوں' میں جواب دیا
'کل کیفے میں جب تم سسکیوں کے ساتھ زارو قطار رو رہی تھیں اس وقت مجھے حکم ہوا کہ میں عالمِ ارواح سے دوبارہ اس دنیا میں جا کر تمہاری اشکبار آنکھوں کو مسکراتی نگاہوں میں بدل دوں، تمہیں محبت کی حقیقت سے آشنا کروں' ویرا نے دھیرے سے اپنی بند آنکھوں کو کھولا اور اسکے شانے سے سر اٹھا کر اسکے

چہرہ پر نگاہیں جمادیں 'کیا ایسا ممکن ہے؟'
'ہاں ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ہم جو مر چکے ہوتے ہیں کوئی ادھورا کام مکمل کرنے کے لیئے دوبارہ زمین پر بھیجے جاتے ہیں اور کام کی تکمیل کے بعد لوٹ جاتے ہیں'
'تم بھی لوٹ جاؤ گے' اسکے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی

'ہاں' ارمان نے نظریں جھکاتے ہوئے سر ہلایا 'یہ میری انگلی میں انگوٹھی دیکھ رہی ہو؟' اس نے اپنا ہاتھ چاند کے سامنے فضا میں اٹھایا تو انگوٹھی میں جڑا نیلم چاندنی میں جگمگانے لگا
ویرا کی نگاہ انگوٹھی پر مرکوز تھی
'جس روز یہ انگوٹھی میری انگلی سے نکل کر تمھاری مٹھی میں ہوگی اس روز میں عالم ارواح میں لوٹ چکا ہونگا'
'ایسا کب ہوگا ارمان'
'مقصد کی تکمیل کے بعد'
'پھر تو میں کبھی بھی نہ مسکراؤں گی' وہ ارمان کے اور قریب ہوگئی اور اسکا ہوا میں معلق ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے دوبارہ اپنا سر اسکے شانے پر ٹکا دیا
'میں اب اس دنیا میں نہیں ہوں ویرا'
'اسی دنیا میں ہو اور اس وقت میرے بہت پاس ہو'

ارمان خاموش ہوگیا وہ جانتا تھا کہ ویرا اندر سے چُور چُور ہے وہ چپ رہا
'دنیا میں لاکھوں لوگ اپنی ادھوری محبت کے غم میں آنسو بہاتے ہیں تو خدا سب کے لیئے تم جیسا مسیحا زمین پر بھیجتا ہے ارمان؟ جو انکے دکھوں کا مداوا کر سکے' ویرا کی نگاہیں چاند پر ٹکی ہوئی تھیں
'ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہوتا ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ ضروری نہیں ہر مسیحا عالم ارواح سے ہی دنیا میں بھیجا جائے ابھی دل کے زخموں پر مرہم رکھنے والوں سے دنیا خالی نہیں ہوئی'
'کیا خدا تمھیں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں' وہ اپنا ہاتھ ارمان کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے بولی
'اچھا یہ بتاؤ کہ جو لوگ مر چکے ہوتے ہیں ہم انکی واپسی کا انتظار کیوں نہیں کرتے' ارمان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا
'کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ لوٹ کر نہیں آسکتے'
ارمان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اسکے کان میں سرگوشی کی 'کیونکہ ہم اب انہیں زندہ نہیں دیکھ سکتے۔ مرنے والوں کی یہی بات تو اچھی ہوتی ہے کہ وہ انتظار کا عذاب سونپ کر نہیں بچھڑتے'
'ہمیں مرنے والوں کے واپس لوٹ کر نہ آنے پر اعتبار کیسے آجاتا ہے ارمان'
'کیا اس دنیا میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جو روزانہ صبح اٹھ کر یہ دیکھتا ہو کہ کہیں آج سورج مغرب سے تو نہیں نکل رہا'
'ایسا تو کوئی دیوانہ ہی کرتا ہوگا'
'ہاں۔ کیونکہ یہ ایک آفاقی سچائی ہے کہ سورج نے مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں غروب ہونا ہے'
'اسی لیئے تمام مذاہب کو موت کی وفا پر اعتبار آچکا ہے'
جھیل کا سناٹا بڑھتا جا رہا تھا
کچھ لمحوں تک ویرا کسی گہرے خیال میں ڈوبی ارمان کی انگلی میں چاندی کی انگوٹھی کو گھماتی رہی اور پھر اچانک بے حد سنجیدہ ہو کر بولی 'تم بھی مجھ سے وفا کرو گے ناں۔ ارمان'
'میں تمھارا ہمجان تھا لیکن مر چکا ہوں'
'جب تم لوٹ جاؤ گے تو کیا میں تمام عمر تنہا بسر کرونگی یا پھر کسی ایسے آدمی سے شادی کا فیصلہ کر کے ساری عمر عذاب میں گزار دونگی جو میرا ہمجان نہیں ہے'
ارمان اسے پیار سے الگ کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا 'اس سوال کا جواب میں تمھیں کل دونگا'
'کیوں۔ آج کیوں نہیں' اس نے احتجاج کیا
ارمان نے اسکا ہاتھ تھام کر اسے اوپر اٹھنے میں مدد

دی' کیونکہ اس سوال کا جواب ہماری جدائی سے جڑا ہے'
ویرا کی آنکھوں میں نم اتر آیا' پتہ نہیں یہ جدائی میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی۔۔۔ پہلے امی ابو جدا ہو گئے پھر مجھ سے میری سماعت رخصت ہوئی پھر میرا ہمجان جدا ہوا اسکے بعد ماجد قریب آ کر۔۔'
'تمھارے سوال کے جواب کے بعد ہم پھر کبھی نہیں مل سکیں گے لیکن ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب تمھارے تمام دکھوں کا مدوا ہو جائے گا' ارمان نے مسکراتے ہوئے کہا
'نہیں تمھارا جواب مجھے کبھی نہیں سننا'
'آؤ' ارمان اسکا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ جزیرے سے اترنے لگا اور جونہی دونوں نیچے کنارے پر پہنچے تو ویرا نے اپنے قدم روک کر مضبوطی سے اسکا بازو پکڑ لیا ارمان نے مسکرا کر اسکی طرف دیکھا اسکے سر سے ریشمی رومال سرک کر گلے میں لٹک گیا، سیاہ زلف چہرے کے سامنے لہرا گئی اور اسکی خوبصورت آنکھوں میں ہلکا سا خوف تیرنے لگا
'آؤ۔ ڈرومت' ارمان نے سرگوشی کی
'میں آنکھیں بند کر لوں' اس نے ایک نظر پانی کی جانب دیکھا
'نہیں' ارمان نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے آہستہ سے سر ہلایا
ویرا نے ایک لحظہ کے لیئے سانس روک لی کیونکہ اسے اپنے پاؤں ٹھنڈے نرم گداز مخواب پر محسوس ہوئے۔
وہ ارمان کے تھوڑی دیر قبل پہنائے گئے سیاہ کوٹ تلے ہلکے نیلے رنگ پر سرخ پھلکاری سے مزین لباس اور شانوں کے گرد سفید شال میں ملبوس بے انتہا خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ گلے میں ریشمی رومال اسکی زلفوں کے ساتھ ہوا میں لہراتا تھا
ارمان سردی کے احساس سے بے نیاز سفید قمیض اور ہلکے نیلے رنگ کی جینز میں ملبوس اپنے ہمجان کو پہلو میں لیئے گویا دل کے ارمانوں کو اس وقت حقیقت میں پورا ہوتا دیکھ رہا تھا قربت کی گھڑیاں بہت مختصر سہی لیکن اسکا احساس صدیوں پر محیط تھا دونوں نے ایک دوسرے کو تھام رکھا تھا وہ جھیل کی سطح پر یوں چلتے تھے جیسے وسیع ڈانسنگ فلور پر کسی انتہائی دھیمے سُروں میں ترتیب دی گئی رومانوی دھن پر کوئی شادی شدہ جوڑا بانہوں میں بانہیں ڈال کر ایک دوسرے کی خوشبو میں گم ناچ رہا ہو
جہاں جہاں انکے قدم پڑتے جھیل کی سطح پر گول گول دائرے بنتے چلے جاتے ان دائروں تلے سنہری مچھلیاں انکے ساتھ ساتھ تیرنے لگیں چاند چیڑ کے بلند درختوں کی اوٹ سے چھپ چھپ کر انہیں جھانکنے لگا۔ جھیل کی سطح پر سفید گلاب کی پنکھڑی کا گمان ہوتا تھا وہ دونوں یخ ہوا کی ہولناکی سے بے نیاز آنکھوں کے رستے ایک دوسرے کے اندر بہت دور تک اتر چکے تھے۔
ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور ویرا کے چہرے پر سیاہ زلفوں کا جال سا بچھ گیا۔ ارمان نے بہت پیار سے اسکے چہرہ سے بکھرے ہوئے بال ہٹا کر اسکے کان میں سرگوشی کی 'ڈر تو نہیں لگ رہا'
'بس! تمہاری جدائی سے' اس نے اپنی نم آلود آنکھوں کو موند کر یکدم اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا ارمان نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا ویرا نے اپنی بانہیں اور سر پیچھے کی جانب ڈال کر اپنا وجود اس کے حوالے کر دیا۔ ارمان کے قدم پوری جھیل پر گول گول دائرے بنانے لگے ایک جوان روح کی بانہوں میں ایک زندہ جوان لڑکی مدہوش تھی گناہ و سزا کے تمام فیصلے خاکستری پہاڑوں پر کھڑے انہیں حیرت سے تکنے لگے لیکن کسی فیصلے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ انہیں ایسا کرنے سے روک سکتا
حقیقی محبت، جھیل کی سطح پر رقصاں تھی!

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

عمر قید

محمد رفاقت

انسان جتنی بھی ترقی کر لے مگر رہتا وہ خواہشوں کا اسیر ہی ہے،
یہ خواہشیں زندگی بھر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

ایک حسینہ کی سرگزشت، اسے بچے کی خواہش نے قاتل بنا دیا تھا

جب میں شعور کی دنیا میں داخل ہوئی تو مجھے پتہ چلا کہ زندگی میں دکھ سکھ نیکی بدی سب ساتھ چلتے ہیں۔ میں بھی اس ہی معاشرے کا حصہ تھی۔ جہاں چھوٹے چھوٹے گناہ جس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور جن کو ہم کچھ اہمیت بھی نہیں دیتے وہ بعد میں معاشرے میں بڑے بڑے بگاڑ کا سبب بن جاتے ہیں اور جب یہ بڑے ناسور بن جاتے ہیں تو اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اس طرح کے مسائل کو ختم کرنے کے لیے ہمیں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور چھوٹی موٹی برائیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے آج میں جیل کی جس چھوٹی سی کوٹھری میں عمر قید کی سزا پوری کر رہی ہوں اپنے اس تجربے سے یہ بتا رہی ہوں یہ باتیں جو مجھ پر بیتی ہیں میں آپ لوگوں سے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں تاکہ دل کا بوجھ کم ہو سکے اور شاید مجھے سکون بھی مل جائے۔ رات دن ان یادوں کو اپنے ذہن سے نکال کر دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے کیے کی سزا تو مجھے مل ہی چکی ہے مگر ابھی اور سزا باقی ہے جو کہ اوپر والا دے گا' جس طرح میں نے لوگوں کا دل دکھایا ہے اس طرح کوئی کسی کا دل نہ دکھائے' اپنی زندگی کی میں پچیس بہاریں دیکھ چکی تھی اور میری شادی کو بھی پانچ برس ہو چکے تھے مگر میری گود بھری نہیں تھی میں اولاد کی دولت سے محروم تھی۔

اس دولت کو حاصل کرنے کے لیے میں نے جائز اور ناجائز ہر طرح کے عمل کیے مگر میں ناکام رہی اور اس طرح سے میں زندگی کی ڈگر سے اتر کر ایک نئی ڈگر پر چل پڑی جو کہ درست نہیں تھی۔

میں ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی جس کی وجہ سے مجھے بڑے ناز نخروں سے پالا گیا تھا' ہر فرمائش پوری ہوتی اور ہر خواہش میرے ماں باپ پورا کرتے' جس کی وجہ سے میں ضدی اور خود سر بھی ہو گئی تھی۔ وقت گزرتا گیا اور میں نے جوانی میں قدم رکھ دیا...... میرے ماں باپ کو میری شادی کی فکر ستانے لگی میں مشکل سے چند جماعتیں ہی پڑھ سکی' رشتے تو بہت آئے کچھ تو ماں باپ کو پسند نہ آتے اور کچھ میں میں نے ناک منہ چڑھا کر ناپسند کر دیئے' اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے' یہ سلسلے چل رہے تھے کہ اچانک میرے والدین کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ مجھے اس بھری دنیا میں اکیلا چھوڑ گئے۔

والدین کے جانے کے بعد میں اپنے ماموں کے پاس چلی گئی اور پھر میری شادی ایک بڑے چوہدری سے کر دی گئی جس کی پہلے سے دو عدد بیویاں تھیں۔ چوہدری اپنی والدہ اور اپنی بیویوں کے ساتھ رہتا تھا' جہاں نوکروں کی بھی فوج تھی۔ حویلی کے الگ الگ حصے تھے دو حصے تو دونوں بیویوں نے لے رکھے تھے ایک میں ماں نے بسیرا کیا ہوا تھا......!

☆
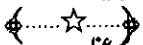
چوہدری شاہ نواز کی عظیم الشان حویلی گاؤں سے

ہٹ کر تھوڑے فاصلے پر بنی ہوئی تھی جو کہ تقریباً بیس بائیس کنال پر مشتمل ہوگی۔ وسیع وعریض ہونے کی وجہ سے ایک عالی شان محل لگتی تھی۔ اس کے چاروں طرف بڑی اونچی دیوار بنی تھی' جس پر کانٹے دار تار لگا کر ایک طرح سے چوروں' اچکوں سے محفوظ بنایا گیا تھا۔ اس میں بے شمار کمرے بنے ہوئے تھے۔

جب میں بیاہ کے آئی تو مجھے بھی ایک الگ کمرے میں جگہ دی گئی' یہ کمرہ کافی بڑا تھا' اور مکمل سجا ہوا تھا۔

چوہدری صاحب کی دونوں بیویاں بھی میری طرح اولاد سے محروم تھیں' میرے آنے سے چوہدری صاحب نے ان کو نظر انداز کر دیا اور میرے ناز اٹھانے لگا یہ دیکھ کر وہ دونوں تو جل بھن گئیں چوہدری صاحب نے بھی شادی اولاد کے لیے کی تھی مگر کوئی امید کی کرن نظر نہیں آ رہی تھی' دونوں بیویوں کو چوہدری پوچھتا تک نہ تھا اس وجہ سے وہ میری دشمن بن گئی تھیں۔

چوہدری کے گھر میں سب نظام چوہدری کی ماں کے ہاتھ میں تھا۔ حویلی میں حکم بھی اسی کا چلتا تھا۔ ایک الگ حصہ چوہدری کی والدہ کے استعمال میں تھا۔

چوہدری ہر طرح سے میرا خیال رکھتا تھا میں بھی خوب بن سنور کر زیور پہن کر پھرتی اس سے وہ دونوں اور زیادہ ناراض اور لڑائی جھگڑے پر اتر آتی تھیں' ہر وقت میری تاک میں لگی رہتیں اور کوئی نہ کوئی بات بنا کر لڑتیں۔

چوہدری صاحب کام کے سلسلے میں اکثر باہر ہی ہوتے اور شام تک ہی واپس آتے میرے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتے' مجھے کہتے کہ رجو تا نہ بنا سنورا کر ہر وقت زیور سے لدی رہتی ہو۔

میں جواب دیتی کیوں نہ پہنوں آخر اس گاؤں کے سب سے بڑے چوہدری شاہ نواز کی بیوی ہوں' چوہدری صاحب کہتے میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا کہ کہیں نظر نہ لگ جائے اور بات آئی گئی ہو جاتی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا مگر امید کی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔ ماں اور چوہدری کی طرف سے بچے کا تذکرہ بڑھ رہا تھا' مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا ماں نے تو سب پیروں فقیروں سے دم درود اور تعویذ کرا کے بھی دیکھ لیے تھے۔ چوہدری صاحب کو ایک دن میں نے کہا۔

''کیوں نہ ہم ڈاکٹروں سے رابطہ کریں اور چیک اپ کروائیں۔'' چوہدری صاحب بھی بولے۔

''ٹھیک ہے۔''

دوسرے دن ہم صبح ڈاکٹر کی طرف چلے گئے۔ چیک اپ کرا کے واپس آئے اور ڈاکٹر نے دوسرے دن کا کہا کہ رپورٹ کے لیے کل آئیں۔ دوسرے دن صبح چوہدری صاحب گاڑی لے کر آ گئے اور رپورٹیں لینے ہم چلے گئے۔ رپورٹیں مل گئیں سب کچھ ٹھیک تھا۔ ان رپورٹوں سے چوہدری صاحب بھی بہت خوش

ہوئے۔

میں بھی دل میں خوش تھی کہ میرا کوئی فالٹ نہیں آیا تھا' دل بھی مطمئن ہو گیا۔

☆

طرح طرح کے خیالات آتے ابھی تک امید کیوں نہ ہوئی۔ کیا بات ہے' آخر ایسا کیا ہے' جس سے مجھے امید کی روشنی نظر نہیں آ رہی۔ کہیں دونوں میرے خلاف دم درود یا کوئی تعویذ تو نہیں کر رہیں۔

یہ بات میں نے چوہدری صاحب سے بھی پوچھی۔

''آخر چوہدری صاحب کیا وجہ ہے خوشی میرا مقدر کیوں نہیں بن رہی۔ مجھے شک ہے کہ میرے اوپر تعویذ کرائے گئے ہیں۔ مجھے پکا شک ہے مگر چوہدری صاحب یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ یہ تمہارا وہم ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے مجھے لگ رہا تھا کہ دال میں کالا ضرور ہے۔

اس راز کو پانے کے لیے میں نے شاداں کو اپنے ساتھ ملایا۔ شاداں میری خدمت پر مامور تھی اور بڑی سیانی چیز تھی۔ ہر طرح سے کام آ سکتی تھی۔ مگر اس سے کام کیسے لیا جائے......!

ساری صورت حال میں نے شاداں کے سامنے رکھی' شاداں کہہ رہی تھی۔

''رجو بی بی آپ فکر نہ کریں یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں آپ فکر نہ کریں میں کوئی نہ کوئی ترکیب نکالتی ہوں۔''

شاداں یہ کام جلد سے جلد کرواور یہ پیسے رکھ لو میں نے اسے پانچ ہزار دیئے اس نے یہ رقم رکھ لی۔ شاداں پوری طرح میری مٹھی میں تھی۔ اور میری راز دار بن گئی تھی۔

کافی دن گزر گئے مگر شاداں لاکھ کوشش کے یہ پتہ نہ چلا سکی کہ میرے خلاف حویلی میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔

☆
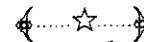
گاؤں سے ذرا ہٹ کر شیرو کا ڈیرا تھا' جس میں ٹیوب ویل چارا کاٹنے کا ٹوکا اور ایک طرف چھپر بنا ہوا تھا جس میں چند بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ گاؤں میں آنے والے راستے میں تھا' گھنے اور سایہ دار درخت سے ڈھکا ہوا ہونے کی وجہ سے اکثر گاؤں کے لوگ جب بھی شہر سے واپس آتے تو دم لینے کی خاطر اس جگہ ٹھہر جاتے اور پانی وغیرہ پی کر اپنے گاؤں کی طرف نکل جاتے۔ شیرو گاؤں کے امام کا بیٹا تھا۔ بڑا زور آور اور دراز قد گھبرو جوان تھا۔ اپنے کھیتوں میں ہل چلاتا اور اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا۔ شیرو کی گاؤں کے ہر شخص سے جان پہچان تھی۔ اس کے دوست بھی اس کے پاس آ کر ٹھہرتے' گپ شپ لگاتے' وقت اچھا گزرتا تھا۔

☆

میری کوکھ ویران تھی اور مجھے شدت سے بچے کی خواہش تھی مگر کوئی بھی میری خواہش پوری کرنے سے قاصر تھا شاداں کو میں نے کہا کہ کیوں نہ ہم شہر جا کر رہیں اور وہاں ہی علاج کرائیں۔ شاداں بھی راضی ہو گئی اور اس کا ذکر میں نے چوہدری شاہ نواز سے کر دیا۔ مگر وہ نہ مانے میں نے بھی ضد پکڑ لی' کہ چوہدری شاہ نواز صاحب اگر بچہ چاہیے تو شہر جانا ہی پڑے گا۔ میں اپنے ذہن میں ایک پلان بنا چکی تھی میں ہر قیمت پر چوہدری شاہ نواز کی بیویوں کو شکست دینا چاہتی تھی اس کے لیے مجھے کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے میں ادا کروں گی۔ شاداں کو میں نے اس سلسلے کی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ کیونکہ میں دل میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ چوہدری صاحب میری ضد کے آگے ہار گئے اور ہم شہر جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ شاداں بھی میرے ساتھ جائے گی یہ میں نے چوہدری صاحب کو کہہ دیا تھا۔ اس نے وہاں پر میری دیکھ بھال کرنی ہے اور میں اکیلے شہر میں کیسے رہ سکتی ہوں' چوہدری شاہ نواز نے ایک کوٹھی شہر میں کرائے پر لے لی' اور ہم شہر میں شفٹ ہو گئے۔ چوہدری شاہ نواز بھی ہمارے ساتھ ہی

شفٹ ہوگئے تھے۔مگر وہ کام کے سلسلے میں گاؤں بھی جاتے تھے۔ ڈاکٹروں سے ٹائم لیا جاتا اور چیک اپ کرائے جاتے دن یوں ہی گزرنے لگے۔ میں نے اسپتالوں کے چکر لگانے شروع کردیئے۔ شاداں میرے ساتھ ہوتی مگر مقدر میں کامیابی نہیں لکھی تھی۔ میں نے کوئی بات بھی شاداں کو نہیں بتائی تھی۔ مگر وہ کچھ نہ کچھ سمجھ چکی تھی مگر خاموش تھی۔

ایک دن میں نے شاداں کو کہا کہ کیوں نہ ہم گاؤں سے ہی ہو آئیں میرا دل کر رہا ہے کہ حویلی میں میرے خلاف کوئی نہ کوئی سازش ہو رہی ہے۔ چوہدری شاہ نواز بھی گاؤں گیا ہوا ہے یہاں اسپتالوں کے چکر لگاتے لگاتے میں تھک گئی ہوں اور کوئی بات بھی بن نہیں رہی۔ شاداں بھی تیار بیٹھی تھی فوراً ہی ہاں کردی۔

رجو بی بی چوہدری شاہ نواز کو فون کرکے گاڑی منگوالو ہم کل صبح ہی گاؤں روانہ ہوجائیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد شہر واپس آجائیں گے۔

شاداں کو بھی شہر پسند آگیا تھا۔ شاداں ٹھیک کہہ رہی تھی میں نے چوہدری شاہ نواز کو فون کردیا اور گاؤں واپس آنے کے لیے کہا تو چوہدری شاہ نواز نے گاڑی بھیجنے کی ہامی بھرلی اور دوسرے دن دوپہر کے بعد ڈرائیور گاڑی لے کر آگیا۔

شاداں اور میں تیار ہوکر گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے آسمان پر گہرے بادل بنے ہوئے تھے اور موسم بارش والا بنا ہوا تھا۔ ابھی ہم گاؤں کی طرف ہی مڑے تھے کہ بارش شروع ہوگئی جو کہ آہستہ آہستہ بڑھتی جارہی تھی۔ اور گاڑی چلانا مشکل ہو رہا تھا۔ کچھ دور ہی شیرو کا ڈیرا تھا شاداں کہہ رہی تھی اگر وہاں تک پہنچ جائیں تو بارش کے رکنے کا انتظار کیا جاسکتا ہے اور پھر چل پڑیں گے خدا خدا کرکے شیرو کے ڈیرے پر پہنچ ہی گئے۔ شیرو اپنے ڈیرے پر موجود تھا۔ بڑی عزت سے اس نے ہم کو ویل کم کہا اور ایک کمرے میں بٹھایا میں تو شیرو کو دیکھ کر دنگ ہی رہ گئی۔ کتنا خوبصورت جوان تھا مگر اس نے

میری طرف کوئی توجہ نہ کی۔ جب اسے پتہ چلا تو بہت خوش ہوا کہ میں گاؤں کے چوہدری شاہ نواز کی سب سے چھوٹی بیوی ہوں تو اس نے خوب آؤ بھگت کی۔

میرا دل اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ ساری زندگی اس ہی جگہ گزار دوں مگر یہ ممکن نہ تھا اور بہت سے خیالات ذہن میں جمع ہو رہے تھے۔ صبح ہوئی تو بارش بھی رک چکی تھی رات بڑی سکون سے گزری۔ شاداں میری ذہنی حالت جان چکی تھی مگر خاموش تھی ہم حویلی میں پہنچ گئے اور چوہدری صاحب کو تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

شیرو میرے دل میں گھر کر چکا تھا' مگر اس نے میری طرف بالکل بھی توجہ نہیں دی تھی۔ شاداں میری راز دار تھی۔ میں نے شاداں کو کہا کہ میں شیرو سے ملنا چاہتی ہوں' کوئی بندوبست کرو۔ شاداں نے کہا کہ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ سیر کے بہانے نکل جاتے ہیں' سو دوسرے دن ہم سیر کے بہانے شیرو کے ڈیرے پر موجود تھے۔ شیرو اپنے ڈیرے پر موجود نہیں تھا' وہ کھیتوں کو پانی لگانے گیا ہوا تھا کافی دیر کے بعد واپس آیا تو ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کسی پیش کی' میرا دل چاہتا تھا کہ ساری زندگی اس جگہ بسر کر دوں۔ تھوڑی دیر بعد ہم واپس آ گئے' حویلی میں آتے ہی شاداں نے مجھ سے کہا۔

بی بی جی شیرو کا خیال دل سے نکال دو۔

شاداں تم کہتی ہو میں شیرو کا خیال دل سے نکال دوں مگر یہ ممکن نہیں ہے جوں جوں میں اس کے متعلق سوچتی ہوں میرا دل اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے' ہر وقت وہ نظروں کے سامنے رہتا ہے' میں اس سے دور نہیں رہ سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ شہر جاتے ہوئے ایک رات اس کے ساتھ بسر کروں۔ اس بات کو تم نہیں سمجھ سکتی۔ کوئی ترکیب ایسی بناؤ کہ ہم رات وہاں ٹھہر سکیں۔

چند دن گزر گئے اور پھر ہم شہر جانے کی تیاری کرنے لگے مگر چوہدری شاہ نواز بھی ساتھ جانا چاہتا تھا' اس لیے اسے بھی مجبوراً ساتھ لے کر میں اور شاداں شہر آ گئے' چوہدری شاہ نواز تو مجھے چھوڑ کر دوسرے دن واپس ہو گئے اب میرے لیے راستہ صاف تھا۔ میں نے شاداں کو ساتھ لیا اور گاؤں کی طرف روانہ ہوئی۔ میں نے شام کا انتخاب کیا تھا کہ گاؤں میں جب داخل ہوں تو رات ہو رہی ہو۔ ایسا ہی ہوا میں اور شاداں جب شیرو کے ڈیرے پر پہنچے تو رات ہو رہی تھی۔

شیرو ہمیں دیکھتے ہی بہت حیران ہوا' شاداں نے بات بنائی کہ

''شیرو بھائی ہم یہاں سے شہر کی طرف جا رہے ہیں رجو بی بی چوہدری شاہ نواز سے لڑ کر ناراض ہو گئی ہیں اور اپنے شہر والے گھر جا رہی ہیں مگر رات کو سفر نہیں کرنا چاہتی اس لیے یہاں آ گئی ہیں اور صبح ہوتے ہی چلی جائیں گی اگر آپ ہماری مدد نہیں کرتے تو ہم دونوں یہاں سے شہر کی طرف چلی جاتی ہیں کیا تم ہمیں ٹھہرنے دو گے یہاں۔

شیرو مشکل میں پڑ گیا۔ کچھ سوچ کر بولا۔

''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔ شاداں نے کہا۔

''نہیں اس کی تم فکر مت کرو۔''

''ہم آج رات آپ کے قدموں میں گزارنا چاہتے ہیں۔'' پہلی بار میں نے لب کشائی کی تو چونک کر اس نے میری طرف دیکھا میں شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ اپنے پیار کو اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ اس سے لپٹ جاؤں مجھے شاداں کی بھی پروا نہیں تھی مگر اس کی طرف سے کوئی آمادگی نظر نہیں آ رہی تھی میں نے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر اس نے ہاتھ نہ ملایا اور بولا۔

''ٹھیک ہے آج رات رہ کر صبح چلے جانا میں کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔'' اور وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ کھانا لے آیا اور کھانا دے کر چلا گیا۔ ساری رات میں کرب میں مبتلا رہی نیند کوسوں دور تھی میں سوچ رہی تھی یہ مجھے لفٹ نہیں کرائے گا۔

صبح میں شاداں کے ساتھ واپس شہر کے لیے روانہ ہوگئی اس طرح کہ شیرو کو پتہ بھی نہ چلا ہم دونوں شہر کی طرف چل پڑے۔ یہ میری ناکام محبت کی آخری ملاقات تھی۔

شہر آ کے میں نے شاداں سے مل کر پھر اسپتالوں کے چکر لگانا شروع کر دیئے' ایک اسپتال میں شاداں کے گاؤں کی نرس مل گئی۔ اس سے اچھی سلام دعا ہوگئی۔ اب میں کھل کر شاداں کو اپنے راز میں شامل کرنا چاہتی تھی۔

☆

شاداں کچھ کچھ تو جانتی ہی تھی پر میں نے کھل کر اس سے بات کی تو شاداں کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔

''نہ بابا نہ ایسا نہیں ہوسکتا۔'' میں نے شاداں کو کہا۔ میں یہاں آئی ہی اس کام کے لیے تھی اب تم ہی میری مدد کرسکتی ہو اس کے لیے جو رقم درکار ہوگی وہ تم کو مل جائے گی۔ نرس سے بات کرو شاید بات بن جائے۔

شاداں بات مان گئی مگر اس نے شرط رکھ دی کہ میں اس کام میں الگ رہوں گی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بھی اس کی شرط مان لی اور اس نے نرس سے بات کی وہ بھی مشکل سے راضی ہوئی تھی۔

دن گزرتے گئے' چوہدری شاہ نواز بھی گاؤں سے کبھی کبھی آتے مجھے کچھ شک سا ہونے لگا کہ چوہدری صاحب کوئی نئی شادی کرنا چاہتے ہیں مگر بتا نہیں رہے تھے۔

ایک رات نرس کا فون آ گیا' شاداں دوڑی دوڑی میرے پاس آئی وہ کہہ رہی تھی کہ نرس نے بلایا ہے' اور ابھی اسی وقت جانا ہے۔

تھوڑی دیر میں شاداں کے ساتھ اسپتال میں آ گئے۔ نرس ہم کو لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھی' اس کمرے میں ماں اور بچہ موجود تھے۔ ہم تینوں تھوڑی دیر کھڑے رہے اور ارد گرد کا جائزہ لیتے رہے۔ نرس نے کہا کہ ماں سو رہی ہے' موقع اچھا ہے اور بچہ اٹھا سکتے ہو۔ میں ہمت کر کے آگے بڑھی اور کمرے میں داخل ہوگئی۔ بچہ ماں کے قریب ہی سو رہا تھا میں نے لپک کر اسے اٹھالیا اور تیزی سے باہر آ گئی۔ شاداں اور نرس وہاں موجود تھیں میں نے جلدی سے اسے اپنی چادر میں چھپالیا اور اسپتال کے گیٹ کی طرف چل پڑے۔ میں بچہ پا کر بہت خوش تھی شاداں میرے ساتھ تھی۔ جب ہم گھر پہنچے تو میں نے شاداں کو اس کے دودھ وغیرہ کا بندوبست کرنے کو کہا۔ بچہ بخار میں تپ رہا تھا۔ شاداں کو میں نے کہا۔

''اسے تو بہت تیز بخار ہے کوئی دوائی وغیرہ کا بندوبست کرو' شاداں نے نرس کو فون کر کے بتایا کہ بچے کو بہت بخار ہے کوئی دوائی مل جائے' مگر کوئی دوائی نہیں ملی مناسب دوائی نہ ملنے سے اور ٹھنڈ کی وجہ سے بچہ بہت رو رہا تھا اور کسی طرح چپ نہیں ہو رہا تھا۔ روتے روتے یہ چپ ہوگیا' میں نے اسے لٹا دیا' مگر مجھے پتا نہیں چلا کہ یہ سو نہیں گیا بلکہ یہ ہم سے بہت دور چلا گیا ہے' شاداں کہہ رہی تھی' بی بی جی یہ تو فوت ہوگیا ہے' میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

☆

صبح ہوتے ہی پولیس آ گئی کیونکہ سی سی ٹی وی کیمروں نے سارا منظر ریکارڈ کرلیا تھا اور نرس سے پوچھ گچھ ہوئی تو اس نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ مجھے عمر قید کی سزا سنادی گئی۔

خواب یا سراب

حارث حیات

بوائے فرینڈ ہمارے معاشرے میں کسی بھی لڑکی کے لیے ایک
گالی بن کر رہ گیا ہے لیکن جس بھی لڑکی پر نظر ڈالیں وہ انڈین ڈرامے
اور فلمیں دیکھ کر اس گالی کو خوشی سے گلے لگائے نظر آتی ہے۔

ایک دوشیزہ کا قصہ، اس نے کالج میں بوائے فرینڈ بنا رکھا تھا

''میرے خواب ہی سب کچھ ہیں کیا ہوا اگر میں مڈل کلاس گھر میں پیدا ہوا ہوں۔ مجھے فرق نہیں پڑتا کیا صحیح یا کیا غلط۔ میں وہ سب کچھ کروں گی جو میرا دل چاہے گا اور ہاں ہادیہ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ میرے معاملے میں دخل نا دو۔ ابھی تم چھوٹی ہو میٹرک میں ہو تم کو کیا پتہ خواب کیا ہوتے ہیں۔ اب تو گھر کے حالات ٹھیک ہیں۔ آج سے چار سال پہلے ایسے نہیں تھے۔ میرے کسی معاملات میں دخل اندازی مت کرنا۔ تم میری بہن ہو تو بہن ہی بن کر رہو میری ماں نا بنو اور یہ کیا رونا شروع کر دیا چلو جاؤ یہاں سے چلو۔'' اقراء نے غصے سے کہا وہ چپ چاپ روتی ہوئی چلی گئی اور سوچنے لگی کہ آپی ایسا کیوں کر رہی ہے جبکہ ان کی امی کو مرے ہوئے تین سال گزر گئے۔ وہ دو بہنیں تھیں جبکہ اس کے ابو کی کپڑوں کی دکان تھی جو اچھی چل رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کیا واقعی سچ ہے اقراء آپی ایسی ہیں جیسا فائزہ کے بھائی حسنین نے پیغام بھجوایا کہ اس کی آپی کی تصویریں اس نے کالج کے ایک آوارہ لڑکے شایان کے پاس دیکھی ہیں جو اپنے دوستوں میں تصویریں دکھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

''اس کا نام اقراء ہے۔ بہت تیز چیز ہے یہ اس کو پھنسانے کے لیے بہت محنت کی ہے۔ اب یہ تیرے بھائی کے جال میں پھنس گئی ہے۔ ہے لالچی چھوٹے گھر کی ہے۔ بہت خرچا کیا اس پہ۔ مجھے یہ کسی امیر باپ کا بیٹا سمجھتی ہے۔ وہ تو بھلا ہو ابو کا جہاں وہ کام کرتے ہیں۔ ان کے مالک کی کار مجھے مل جاتی ہے اور اس کا کالج بھی راستے میں پڑتا ہے۔ کار کو دیکھ کر مرعوب ہوگئی اور اوپر سے اللہ کا کرم ہے مجھے شکل اچھی دی ہے۔ فائدہ تو اٹھاؤں گا نا اور گندی سی گالی دے کر بولا جس کو خود اپنی عزت کا خیال نا ہو تو کون چھوڑے گا۔ پہلے پہلے کہتی تھی میں پردہ کرتی ہوں اپنی تصویریں کیسے دوں؟ ڈر لگتا ہے بس میں نے بھی قسم کھالی کہ تم میری عزت ہو۔ یہ لڑکیاں بھی نا ان کو پتا ہوتا ہے اللہ کے خلاف جا رہی ہیں اور پھر اللہ کی قسم پہ اعتبار کر کے اپنا سب کچھ دے دیتی ہیں۔''

''ایک قسم سے اگر ایسا مال مل جائے نا تو مجھ سے جتنی قسمیں اٹھوالو۔'' اچانک ایک اور لڑکا بولا۔

''بھائی شایان ہمارا بھی بھلا کروادے۔''

''ارے یار تم پریشان کیوں ہوتے ہو پہلے میں تو کچھ کرلوں پھر تم سب۔'' اور قہقہے لگانے لگے۔

''ہادیہ کا پریشانی سے برا حال تھا اگر ایسا واقعی ہے تو وہ اپنی بہن کے ساتھ نہیں ہونے دے گی۔ کیا پتہ فائزہ کا بھائی جھوٹ بول رہا ہو لیکن نہیں وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس نے وضو کیا اور دو رکعت نفل ادا کرنے لگی، سجدے میں رو رو کے دعائیں مانگنے لگی۔ یا اللہ میری بہن کو بچالے اسے بھٹکنے نا دے۔ تو غفور ہے تو رحیم ہے ہم پہ اتنی آزمائشیں نا ڈال۔ تو بچالے بچالے کوئی راہ دکھا۔ کب اس کو نیند آ گئی پتا نا چلا لیکن وہ نیند میں بھی یہی

بڑبڑا رہی تھی یا اللہ اقراء کو بچالے اچانک اقراء کمرے میں داخل ہوئی اور اس کو اس حالت میں دیکھا تو پریشان ہوگئی جب قریب آئی تو اس کے کانوں میں آواز پڑنے لگی تو وہ چیخ پڑی اور بولی۔

''اپنے ڈرامے بند کرو۔'' ہادیہ ایک دم ڈر کے اٹھ گئی اور اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

''میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ تم کیا سمجھتی ہو مجھے پتہ نہیں چلتا کیا، میری زندگی ہے میں جیسے بھی جیوں۔ اگر تم میری بہن نا ہوتی تو بتاتی تم کو۔'' اور پیر پٹخ کر کمرے سے چلی گئی۔

کب صبح ہوگئی پتہ نا چلا ہادیہ نے فجر کی نماز ادا کی اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں وہ اپنے ابو کے کمرے میں گئی تو دیکھا ابو نماز پڑھنے مسجد گئے ہوئے ہیں۔ اس نے فریج سے آٹا نکالا اور باہر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ نرم پڑ گیا تو اس نے پراٹھے بنانا شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ابو آئے تو وہ انتظار میں تھی کیونکہ وہ صبح چھولے لے کر آتے تھے۔ اس نے جلدی جلدی چھولے ڈالے اور کھانے کی ٹیبل پہ برتن سجائے۔ اچانک اس کے ابو کی نظر ہادیہ کی آنکھوں پہ پڑی تو پوچھا۔

''کیا ہوا کیوں آنکھیں سوجھی ہوئی ہیں کیا امی کی یاد آرہی ہے میری لاڈو رانی کو۔'' اور ماتھے پہ بوسہ دیا ہادیہ چپ ہوگئی۔ اقراء بھی کھانے کی میز پہ آچکی تھی اس نے سلام کیا۔ سب نے اِدھر اُدھر کی باتیں کی اور ناشتہ کرلیا۔

پھر اقراء کالج چلی گئی اور ہادیہ اسکول۔

......۞☆۞......

ہادیہ جب اسکول گئی تو وہ پریشان تھی۔ اس کا دل کلاس میں نہیں لگ رہا تھا۔ کسی طرح بریک کا وقت آگیا۔ فائزہ جیسے اس کے پاس آئی تو وہ رونے لگی اور کہنے لگی۔

''اقراء کیوں سمجھنا نہیں چاہتی؟ پتہ نہیں کیوں وہ اندھی ہوگئی ہے۔ کیوں وہ اللہ کی بنائی ہوئی حدود توڑ رہی ہے۔ کیوں وہ اپنے آپ کو کھلونا سمجھ رہی ہے۔ کیوں اس کو نہیں پتا یہ مرد ذات نکاح سے پہلے دھوکہ کا نام ہے؟ کیوں وہ خود کو ایسی لڑکی بنانا چاہ رہی ہے جس کے ساتھ مرد صرف رات گزارتا ہے لیکن نکاح نہیں کرتا ہے؟ بتاؤ فائزہ بتاؤ کیا کروں؟ ابا جی کو بتادوں تو وہ صدمے سے مر جائیں گے کہ جس بیٹی کو ماں کا بھی پیار دیا وہ کیا گل کھلا رہی ہے؟''

''تم ایسا کرو فائزہ پل پل کی خبر دو مجھے اپنے بھائی کے ذریعے میں نہیں چاہتی کے پوری زندگی وہ روتے ہوئے گزارے۔ یہ جو خواب دیکھ رہی ہے۔ وہ محض سراب ہی تو ہیں فائزہ۔''

''میری مدد کرو نا اپنے بھائی کو کہو شایان سے دوستی کرے۔ اقراء کی تصویریں کسی طرح لے اور اس کو بچائے ان کے چنگل سے میری مدد کروں گی نا؟''

''ہاں میں مدد کروں گی۔'' اور پھر بریک ٹائم ختم ہوجاتا ہے۔''

......❁☆❁......

اقراء جب کالج سے واپسی آ رہی ہوتی ہے تو شایان پہلے والی جگہ پر کھڑا نظر آتا ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پاس چلی گئی۔ وہ ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ پھر بولا۔

''تمہارا نمبر آف جا رہا تھا میں پریشان ہو گیا کہیں میری زندگی کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئی۔ یہ دیکھو میں تمہارے لیئے گفٹ لایا ہوں۔'' اس نے اقراء کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھما دی۔ وہ خوشی سے دمکنے لگی لیکن پھر بولی۔

''دیکھو شایان میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ مجھے دھوکہ تو نہیں دو گے نا۔ میں نے تمہارے کہنے پہ اپنی تصویریں دیں۔ تم جانتے ہو محبت کی کیا حقیقت ہے۔''

''پتا ہے محبت ایک کانچ کی مانند ہوتی ہے ایسا کانچ جو اگر کسی خوشنما گھر کی دیواروں پہ لگایا جائے اور اس کو اچھے سے تراشا جائے تو جب اس پہ روشنی پڑتی ہے تو خوب چمکتا دمکتا ہے لیکن اگر رکھ دیا جائے تو اس کی خوبصورتی نظر نہیں آتی۔ محبت بھی تب تک نظر آتی ہے جب تک اس کو اچھے سے تراشا جاتا ہے اس کو عقیدت کے نور سے روشن کیا جاتا ہے۔ پتا ہے جو خاص ہوتا ہے نا اس سے ہی خاص مانگا جاتا ہے۔ میں تم سے تمہارا ساتھ مانگتی ہوں۔ شروع شروع میں محبت بچے کی مانند ہوتی ہے پھر کب یہ بڑھتی جاتی ہے پتا نہیں چلتا پہلے دلاسوں پہ بہل جاتی ہے لیکن بعد میں اس کو محبوب کا ساتھ چاہیے ہوتا ہے۔ اگر وہی محبوب کہہ دے نا میں نے تو بس وقت گزاری کی تو یہ محبت جو دلکش کانچ جیسی ہوتی ہے نا کب ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے پتا نہیں چلتا پھر لوگ جیتے جاگتے انسان تو دیکھتے ہیں لیکن وہ مر چکے ہوتے ہیں۔ شایان مجھے تنہا نا چھوڑنا۔ میں تمہاری وجہ سے اپنی بہن سے بھی لڑتی ہوں۔ وہ کہتی ہے کہ میرا محبوب دھوکہ باز ہے۔ تم ثابت کر دو کہ سب سے الگ ہو۔ کرو گے نا ثابت خود کو۔ مجھ سے شادی کرو گے نا۔''

''ہاں میں تم سے شادی کروں گا۔ اب میرا گزارا نہیں ہوتا تم بن۔ ایک بات کہوں تم سے؟''

''ہاں بولو۔''

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ جہاں تم اور میں ہوں جہاں میں اپنے محبوب کا دیدار کروں اور جی بھر کے دیکھوں تم مجھ سے ملو گی نا؟ بولو۔''

''ہاں میں تم سے ملوں گی لیکن تھوڑا سا صبر کر لو۔ ہادیہ کو مجھ پہ شک ہے کہیں وہ ابو کو نا بتا دے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔'' اور پھر وہ خدا حافظ کر کے گھر چل پڑی۔

یہاں شایان دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اور خود کو کہہ رہا تھا بس ایک دفعہ مل جائے یہ جو اس نے خرچہ کروایا ہے وہ اس سے وصول کروں گا اور ویڈیو بنا کر اس سے جو چاہوں گا لوں گا۔ اقراء نے گھر پہنچتے ہی منہ ہاتھ دھویا کالج کا یونیفارم تبدیل کیا اور کچن میں چلی گئی کیونکہ کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے رات کا بچا ہوا سالن گرم کیا اور روٹیاں پکائیں۔ اتنے میں اس کے ابو بھی دوکان سے آ گئے۔ سب نے مل کر کھانا کھایا اور اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔

ہادیہ اپنے کمرے میں بیٹھی اسکول کا کام کر رہی تھی کہ اقراء کمرے میں آ گئی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نظر اوپر اٹھا کر دیکھا پھر اپنے ہوم ورک میں لگ گئی۔

''سنو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے اگر کچھ وقت ہے تو دے دو مجھے؟''

''جی آپی بولیں۔'' ہادیہ نے جواب دیا۔

''ہادیہ تمہاری نظر میں کیا محبت کرنا جرم ہے؟ کیا میں غلط کر رہی ہوں؟ کیا مجھے حق نہیں زندگی جینے کا؟ کیا میں اپنا مرضی سے جیون ساتھی نہیں چن سکتی؟ بولو ہادیہ جواب دو مجھے؟'' ہادیہ چپ چاپ سن رہی تھی اس نے لمبی سانس لی اور بولی۔

''آپی سنو میری بات میں نے کب منع کیا آپ محبت نا کرو۔ آپ کا حق ہے آپ جی سکتی ہو۔ آپ اپنا جیون ساتھی چن سکتی ہو۔ لیکن ہم عورت ذات ہیں۔ ایک ایسے دودھ کی مانند اگر اس کو کھلا چھوڑ دیا جائے اور ڈھانپ کے نا رکھا جائے تو اس میں مٹی، ریت، مکھیاں تک گر جاتی ہیں اور بلی بھی اس دودھ کو پی جاتی ہے۔ تم کو پتا ہے کہ آج تک ہم نے اپنے کسی ماموں، خالہ، پھپو

اور کسی رشتہ دار کو نہیں دیکھا کیونکہ ابو اور امی نے پسند کی شادی کی تھی۔ اپنے والدین کو چھوڑ کر یہاں رہنے آگئے تھے۔ ہر کوئی ابو جیسا نہیں ہوتا جو جس سے محبت کرے اس سے شادی بھی کرے لیکن مرنے سے پہلے امی کے الفاظ یاد کرو۔ وہ کہہ رہی تھیں میرے بچوں کبھی اس رب کے خلاف نا جانا اور والدین کو ناراض نا کرنا ورنہ تنہا ہو کر مرو گے میری طرح۔ میں امی کی آخری باتیں نہیں بھول سکتیں۔ پتا ہے امی کی خواہش تھی کہ ان کے جنازے کو ماموں وغیرہ کندھا دیں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ امی کا جب انتقال ہوا تو میں ساتویں کلاس میں تھی لیکن سمجھ سب آتا تھا۔ تم نے مجھے ایک ماں کی طرح پالا ہے اگر تم ہی غلط راہ پہ چلو گی تو میں بھی اس راہ پہ چل پڑوں گی۔ تم دھوکہ کھا کر بیٹھ کر رو رہی ہو گی اور میں نہیں کسی دوسرے سے کھا رہی ہوں گی۔ پھر تم مجھ کو سمجھاؤ گی اور میں نہیں سمجھوں گی۔ تم محبت کرو لیکن اگر تم سے وہ کہے کہ اکیلے ملو تو سمجھ لینا اس دن تمہاری عزت کو خطرہ ہوگا۔ کیونکہ مرد اور عورت کے درمیان اکیلے میں شادی سے پہلے تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ جو سب کچھ کروا دیتا ہے جو ایک مسلمان کی شان نہیں۔ جس کی بہت سخت سزا ہے میں نہیں چاہتی کہ میری بہن کو وہ سب ملے اور ہاں شادی کے بعد اگر مرد اور عورت ملتے ہیں تو وہ حلال ہے اور تیسرا ان کے درمیان اللہ پاک ہوتا ہے جو پیارہ محبت ڈال دیتا ہے۔ یاد ہے تم نے ہی مجھ کو کہا تھا۔ شادی سے پہلے کسی کو اپنے جذبات نا دینا کیونکہ مرد ذات شادی سے پہلے صرف اپنا مطلب نکالتی ہے۔ میں اس لیے تم کو بچانا چاہتی ہوں۔"

اقراء چپ چاپ سب کچھ سنتی رہی کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھی اور چلی گئی اس کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ پشیمان ہے۔

...... ۞☆۞ ......

فائزہ کو بار بار ہادیہ کی بات یاد آرہی تھی کہ تم میری مدد کرو گی نا بتاؤ۔ وہ پریشان ہو رہی تھی اس کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنی دوست کو اذیت میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ بے تابی سے اپنے بھائی کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ حسنین کرکٹ کھیل کے گھر آگیا۔ جب اس نے فائزہ کی طرف دیکھا تو پریشان ہو گیا اور بولا۔

"میری پیاری بہنا کو کیا ہو گیا ہے۔ بتاؤ کیوں چہرے پہ بارہ بجائے ہوئے ہیں؟"

"بھائی مجھ سے ہادیہ کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی آپ کچھ ایسا کرو کہ اقراء اس شایان کے چکر سے نکل آئے اور اس پر اس کی اصلیت کھل جائے۔ اچھا تم ٹینشن نا لو میں کچھ کرتا ہوں اور ہاں ہادیہ کو کہو کہ اقراء سے اپنا رویہ ٹھیک کرلے تاکہ اس کو پتہ نا چلے کہ ہم اس کو بچانے کے لیے کیا پلاننگ کر رہے ہیں۔"

اگلے دن حسنین کالج گیا تو شایان کو ڈھونڈنے لگا۔ آخر کار وہ اسے گیا۔ اس نے موبائل اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ریکارڈنگ آن کرلی۔ وہ سیدھا اس کے پاس گیا اور بولا۔

"بھائی مجھے آپ سے کام ہے اگر کچھ وقت دے سکیں تو......!"

شایان ایک دم حیران ہو گیا کہ اس کیا کام پڑ سکتا ہے پھر بولا۔

"بتاؤ؟ کیا کام ہے۔"

حسنین شایان کو سائیڈ پر لے آیا۔

"بات یہ ہے کہ مجھے آپ سے تھوڑی مدد چاہیے۔ مجھے ایک لڑکی سے دوستی کرنی ہے وہ بھی لائن دیتی ہے۔ اس کا نام صباء ہے۔ کس طرح نمبر لوں آپ تو یار ماسٹر ہو۔ اس دن میں نے آپ کو اپنے دوستوں میں بیٹھ کر باتیں کرتا سنا تھا کیا نام تھا اس لڑکی کا......شاید اقراء تھا۔ خیر میں سمجھ گیا تھا کہ آپ ہی میرا مسئلہ حل کر سکتے ہو؟"

یہ سن کر شایان ہنسنے لگا اور بولا۔

"یہ بھی کوئی مسئلہ ہے میں نے تو بڑی بڑی مچھلیوں کو اپنے جال میں پھنسایا۔ یہ جو مڈل کلاس لڑکیاں ہوتی ہیں کچھ تعریفوں پر کچھ گفٹوں پر اور کچھ محبت کے نام پر پھنس جاتی ہیں۔ اب وہ لڑکی جس کا تم نے سنا تھا وہ ایک انگوٹھی اور میرے ابا کے سیٹھ کی کار دیکھ کے پھنس گئی۔ بس جگہ کا بندوبست ہو جائے پھر دیکھنا۔ یہ جو لڑکیاں ہوتیں ہیں نا

ان پر قرآن کی قسمیں اور وعدے بہت اثر کرتے ہیں۔ یقین جھی اس اللہ کے نام کا کرنا اور اس کے ہی خلاف جانا۔ ان کو سزا ملے ہی گی نا اور میں پاگل ہوں جو اپنی گرل فرینڈ سے شادی کروں۔ جب فری میں سب کچھ مل جائے نا تو کون اپنے گلے میں ڈھول باندھے تو ایسا کر اس لڑکی کے پیچھے جائیو آج اور اپنا نمبر ایک پرچی میں لکھ کر اس کے ہاتھ میں دے دینا۔ اگر راضی ہوگی تو خود ماں، باپ یا کسی کے نمبر سے کال کرلے گی ورنہ بھول جائیو اور ہاں میرے بتائے ہوئے طریقے پہ عمل کرے گا نا تو مزے کرے گا۔ اب چل میرا نمبر سیو کرلے جب کہے گا مدد کے لیئے آجاؤں گا لیکن اگر کام ہوگیا تو حصہ دینا مت بھولیو۔''

''ٹھیک ہے بھائی آپ گریٹ ہو۔ آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔''

حسنین دل ہی دل میں کہنے لگا دیکھ بیٹا شایان تیرے ساتھ وہ کروں گا کہ عمر بھر سوچے گا کہ ہاتھ میں آیا مال کیسے نکل گیا۔

حسنین بھی کلاس میں چلا گیا لیکن سوچنے لگا کسی طرح اقراء کی تصویریں مل جائیں نا تو شایان کا کہانی کا اینڈ کردوں گا۔ لیکن کوئی بھی غلط قدم اقراء کی زندگی تباہ کرسکتا ہے۔ کہیں ایسا نا ہو جان بچاتے بچاتے خود ہی اس کی زندگی تباہ کردوں۔ خیر چھٹی کا وقت ہوگیا اور وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ جب وہ گھر پہنچا تو اس کی بہن اسکول سے آچکی تھی۔ وہ سیدھا کمرے میں چلا گیا اور اپنے کپڑے تبدیل کیے۔ کمرے سے باہر نکلا تو فائزہ گلاس میں پانی لیے کھڑی تھی اس نے پانی پیا اور بولا۔

''اتنی خوشامد اچھی نہیں پہلے تو کبھی پانی تک نہیں پوچھا آج کیسے خیال آگیا؟''

''وہ بھائی گرمی زیادہ تھی نا باہر اور آپ کے کالج کا سفر بہت زیادہ ہے۔ میں تو لیموں کا شربت بنانا چاہ رہی تھی لیکن وہ ختم ہوچکے تھے۔ امی جان ساتھ والوں کے گھر گئی ہیں آپ بیٹھو میں کھانا لگاتی ہوں۔'' وہ حیرانی سے اپنی بہن کو دیکھ رہا تھا کہ اتنی تبدیلی کیسے کیونکہ وہ جیسے ہی اسکول سے آتی یونیفارم سمیت سوجاتی جب وہ کالج سے تھک ہار کے لوٹتا تب جناب جاگتی۔ خیر وہ خوش تھا۔ جب وہ ٹیبل پر پہنچا تو اس کے منہ میں پانی آگیا کیونکہ اس کی من پسند ڈش سرسوں کا ساگ پکا ہوا تھا۔ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ فائزہ چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی پھر بولی۔

''بھائی وہ کام ہوا کچھ؟''

''کھانے دو پھر بتاتا ہوں۔'' وہ دیکھ رہا تھا کہ فائزہ مسلسل اپنے ناخن دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔

''پاگل ناخن کھانا تو بند کردو خون نکل آئے گا اب۔'' حسنین کے بولنے پر وہ ایک دم ہوش میں آگئی۔

کھانا کھا کر وہ بولا۔

''میں کچھ دیر آرام کرلوں پھر بتاتا ہوں بلکہ کچھ سنوانا ہے تمہیں۔''

''بھائی پلیز مجھے پہلے بتا تو دو پھر سو جانا۔ میری حالت کو سمجھو۔'' فائزہ بے تابی سے بولی۔

''اچھا اچھا ٹھیک ہے مجھے لگتا ہے میری بہن مجھ سے زیادہ ہادیہ سے پیار کرتی ہے۔'' پھر حسنین نے اپنا موبائل میں ریکارڈنگ پلے کردی فائزہ جیسے جیسے سنتی گئی اس کی آنکھیں حیرانی سے پھٹنے لگی اور جب وہ ریکارڈنگ ختم ہوئی تو وہ اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔

''آپ نے میرا سر فخر سے بلند کردیا ہے۔ اب دیکھتی ہوں شایان دھوکے باز کیسے اسے اپنے چنگل میں پھنساتا ہے۔

''میری بات غور سے سنو ہم نے کوئی کام جلد بازی سے نہیں کرنا کیونکہ اقراء نے اس بے حیاء انسان کو اس کی قسموں کی وجہ سے اپنی تصویریں دیں ہیں۔ اب کسی طرح وہ تصویریں ڈیلیٹ کرنی ہے اس کے موبائل سے۔ اب سنو تم نے میرا ساتھ دینا ہے کل تم نے چھٹی کرنی ہے اسکول سے میں تم کو کال کروں گا جب شایان کے ساتھ ہوں گا۔ تم نے مجھ سے بات ایسے کرنی ہے جیسے تم وہی صباء ہو جس کا ذکر میں نے اس سے کیا تھا۔ تم نے مجھ سے وعدے لینے ہیں اور تمام باتیں فائزہ کو سمجھا دیں اور کہا کہ ہادیہ کو بھی دینا تاکہ وہ ریلیکس ہوجائے۔'' فائزہ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔

''بھائی مجھے لگتا ہے آپ کی زندگی میں کوئی صباء نام کی لڑکی ہے۔'' فائزہ ہنسنے لگی۔تبھی حسنین بولا۔
''بہنا اگر کوئی اس نام کی لڑکی میری زندگی میں ہوگی تو تم کو سب سے پہلے بتاؤں گا۔اس کو چھپ چھپ کے ملنے کی بجائے تم کو اور ماما کو بتاؤں گا تا کہ اس سے خود اظہار محبت کروں گا۔''

......۞☆۞......

فائزہ نے ہادیہ کے گھر کا نمبر ملایا۔تین چار بیل بجنے کے بعد اقراء نے کال ریسیو کی۔
''ہیلو السلام وعلیکم آپی میں فائزہ بول رہی ہوں۔آپ ہادیہ کو بلا دیں میں نے ضروری بات کرنی ہے اس سے۔''
''اچھا میں بلاتی ہوں اسے تم کال پر رہنا۔''
ہادیہ ہادیہ یہ فائزہ کی کال آئی ہے تمہارے لیے جلدی آؤ۔اقراء کی آواز پر ہادیہ پریشان ہوگئی اب کیا ہوگیا اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اب آپی کیا گل کھلا آئیں، کیونکہ صبح تو وہ فائزہ سے ملی تھی اب اس وقت کال خیر اس نے اقراء سے موبائل لے کر کمرے میں آ گئی۔
''ہاں فائزہ خیریت ہے؟ کیا ہوگیا جو اس وقت کال کی؟''
''کیوں بندہ تمہیں کال نہیں کرسکتا کون سی تم پرائم منسٹر ہو جو مصروف ہوگی۔تم کو پتا ہے کیا ہوا ہے آج بھائی نے شایان سے دوستی کرلی ہے اور جو جو بات ہوئی حسنین اور شایان کے بیچ اس نے ہادیہ کو بتایا۔
''سنو! ابھی اقراء کو کچھ بھی نا بتانا کیونکہ بھائی چاہتے ہیں کہ کسی طرح اقراء کی تصویروں کا کوئی حل نکال لیں پھر شایان کی اصلیت سامنے لائیں گے تم اقراء کے قریب رہا کرو تا کہ تم کو پتا تو چلے شایان اور ان کے درمیان کیا چل رہا ہے اور اب اقراء کو مت سمجھانا بھی اب اس کو ایسا ظاہر کرنا کہ وہ ٹھیک تھی۔اور ہاں میں کل اسکول نہیں آؤں گی کیونکہ بھائی سے شایان کے سامنے بات کرنی ہے۔سمجھ رہی ہونا۔''
''میں سمجھ گئی ہوں۔میں کیسے تمہارا احسان چکاؤں؟ کاش میرا بھی کوئی بھائی ہوتا آج یہ نوبت نا آتی۔کیونکہ اچھی اولاد والدین کا سرمایہ ہوتی ہے۔پتا ہے بہت سی لڑکیاں کہتی ہیں کہ ہر کوئی بیٹیوں کو ہی سمجھاتا ہے کہ اپنی عزت کی حفاظت کرنا لیکن کوئی بیٹوں کو کیوں نہیں کہتا کہ کسی کی عزت مت لوٹنا۔'' ہادیہ نے روہانسی ہوکر کہا۔
اگلے دن حسنین کالج وقت سے پہلے پہنچ گیا اور تمام پلان پر غور کرنے لگا اور سوچنے لگا اقراء کی کوئی نیکی ضرور ہے جس کی وجہ سے اللہ پاک اس کو بچا رہے ہیں۔ورنہ آج کے دور میں ہر دوسری لڑکی کسی نا کسی دھوکے باز کے عشق میں مبتلا ہے۔بعض کی ماں باپ کی دعائیں کام آجاتی ہیں جن کی عزت بچ جاتی ہے اور بعض سب کچھ لٹانے کے باوجود بھی سمجھ نہیں پاتیں۔خیر شاید اللہ کے کلام پاک کا پہلا لفظ ہی اقراء ہے اس لیے اللہ اس نام کو بھٹکنے سے بچا رہا ہے۔وہ گہری سوچ میں گم تھا کہ کسی نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا وہ ایک دم چونک گیا۔اور مڑ کر دیکھا تو شایان کھڑا تھا۔وہ فوراً بولا۔
''یار تونے تو ڈرا ہی دیا۔'' یہ سن کر شایان بولا۔
''یار مجھے لگتا ہے تو صباء کے خیالوں میں کھویا ہوا ہے۔یہ بتا کیا بنا؟ تونے نمبر دیا اس کو یا نہیں؟''
''یار کام ہوگیا میرا۔جیسا تو نے کہا تھا ویسا ہی کیا۔جب صباء کالج سے نکلی تو میں نے پیچھا کیا۔موقع پا کر اس کے ہاتھ میں اپنا نمبر دے دیا۔رات کو اس نے کال کی تھی کہ صبح وہ کالج نہیں جائے گی۔مجھ سے بات کرے گی وہ۔چل آجا کنٹین پہ چلتے ہیں میں تجھے چائے پلاتا ہوں۔''
شایان اور وہ کالج کی کینٹین کی طرف چل پڑے۔حسنین نے چائے اور بسکٹ کا آرڈر دیا۔پھر حسنین نے کہا۔
''یار میں صباء کو کال کرتا ہوں اور کال ملالی۔دو تین بیل کے بعد صباء مطلب فائزہ نے کال اٹھالی۔شایان نے اشارے میں کہا لاؤڈ اسپیکر آن کرلو اس نے ایسا ہی کیا۔
''السلام وعلیکم! کیا حال ہے آپ کا۔'' فائزہ نے صبا بن کر بات کی۔

''میرا حال بہت برا ہے۔'' حسنین نے شایان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آپ کو کیا ہوا رات کو تو بالکل ٹھیک تھے؟ بتاؤ مجھے ٹینشن ہو رہی ہے۔'' فائزہ نے بناوٹی فکرمندی سے کہا۔

''یار جب سے تم کو دیکھا ہے نا میرا حال بہت برا ہے۔تم سے حسین لڑکی کبھی دیکھی ہی نہیں زندگی میں۔کیا کروں تمہاری آواز جب سے سنی ہے میرے تو ہوش اُڑ گئے ہیں۔اب میرا سب کچھ تم ہی ہو یار۔'' حسنین نے شایان کی جانب دیکھ کر کہا۔

''سچ میں تم مجھے اتنا پیار کرتے ہو۔کیا واقعی ہی میں اتنی خوبصورت ہوں؟ مجھے دھوکہ تو نہیں دو گے؟قسم کھاؤ۔میرا ساتھ نبھاؤ گے نا؟ بولو جواب دو۔'' فائزہ نے کہا۔

''میں قسم کھاتا ہوں کے ساتھ دوں گا تمہارا۔کبھی دھوکہ نہیں دوں گا اور......!''

ایک دم حسنین نے پلین کے مطابق کال کاٹ دی۔ شایان بولا۔

''کیا ہوا یار؟ مجھے لگتا ہے میرا بیلنس ختم ہو گیا ہے۔شاید پیکج نہیں لگا ہوگا۔''

شایان فوراً بولا۔

''یار تو میرے موبائل سے کر لے کال اور دل میں سوچا تو ایک دفعہ کال تو کر میرے پاس بھی صباء کا نمبر آجائے گا۔ یہ لے موبائل ذرا نمبر بتا اور پریشان نہ ہو یار چاہے تو پھنسایا میں ایک ہی تو بات ہے۔بس حصہ مل جانا چاہیے۔'' وہ وہاں بول رہا تھا اور حسنین نے چپ چاپ موبائل کی ریکارڈنگ آن کر لی۔جیسے ہی اس نے بات ختم کی تو وہ بولا۔

''اچھا یار لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تمہارے سیل سے بات کروں کیونکہ اگر میں موبائل کی گیلری میں چلا گیا تو تمہارے گھر کی تصویریں ہو سکتیں۔میری نظر کہیں ان پر نہ پڑ جائے؟''

یہ سنتا تھا شایان نے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا ''اوئے بھولے آج کے دور میں کوئی بھی لڑکا اپنے گھر کی تصویریں موبائل میں نہیں رکھتا۔البتہ گرل فرینڈ کی رکھنی پڑتی ہے کہیں بھی شومنٹ کے کام آجاتی ہے تاکہ دوست ترسا ہوا نا سمجھ لیں۔ میں نے اپنی گلیری پر پاس ورڈ لگایا ہوا ہے اور اپنی تمام گرل فرینڈ کی تصویروں کے فولڈر کو مخفی کر رکھا ہے۔اگر کوئی میموری کارڈ میں بھی گھس جائے تو پتا نہیں چلے گا۔ اس لیے ڈونٹ وری۔تو بس نمبر بتا۔ مجھے لگتا ہے تجھے اعتبار نہیں ہے مجھ پر۔ٹھیک ہے جیسے تیری مرضی۔'' اور جھوٹ موٹ کا ناراضگی والا چہرہ بنا لیا۔

حسنین نے جب دیکھا کہ کام بن رہا ہے۔اس نے کہا ''ناراض کیوں ہوتا ہے یار۔ یہ لے ملا نمبر اور اگر ابھی سگریٹ مل جاتی تو مزہ آجاتا۔''

شایان نے جیسے سنا اور بولا بادشاہو بس میں یوں گیا اور یوں آیا میں نے ایک جگہ پر سگریٹ چھپا رکھی ہے اور باہر چلا گیا۔

جیسے ہی وہ باہر گیا حسنین نے ریکارڈنگ بند کر دی اور فوراً اسکے سیل سے میموری کارڈ نکالا اور دانتوں میں لے کر ہلکا سا کریک کر دیا اور پھر دوبارہ سیل میں لگا کر آن کر دیا۔پھر جلدی سے ٹائم اور ڈیٹ ٹھیک کر دی موبائل کی۔ پھر گلیری میں گیا تو وہ اوپن نہیں ہوئی۔حسنین نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔پھر اس نے اپنی بہن کا نمبر ملایا جو اس نے اٹھا لیا۔

''یہ نمبر کس کا ہے؟اور آپ کچھ کہہ رہے تھے؟''

''یہ نمبر اسی دھوکے باز کا ہے اور میں یہ کہہ رہا تھا اگر آپ ساتھ دو گی تو میں بھی ساتھ دوں گا۔''

''بھائی میں آپ کا ہر طرح سے ساتھ دوں گی۔'' اور ہنسنے لگی۔

اتنے میں شایان سگریٹ لے کر اندر آکر اشارہ کرنے لگا کہ بس کرو اب۔'' تو حسنین نے ہاتھ ہلا کر او کے کہا۔

''اچھا صباء خیال رکھنا اپنا اور اگر میرا نمبر آف ہو جائے تو تم اس نمبر پر رابطہ کر لینا۔او کے خدا حافظ۔'' حسنین نے یہ کہہ کر کال کاٹ دی۔

اس نے جان بوجھ کر آخری الفاظ زور سے کہے۔ جیسے شایان نے یہ سنا وہ خوش ہو گیا۔اور بولا آجا جگر یہ لے پی سگریٹ میری طرف سے تو نے دل خوش کر دیا۔

حسنین نے سگریٹ ہاتھ میں لے لی دل ہی دل میں سوچا یار میں نے تو آج تک پی ہی نہیں۔ کس مصیبت میں پھنس گیا۔ اچانک اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا ''یار یہ پکڑ جلدی خواجہ عالمگیر کا ٹیسٹ ہے تجھ کو پتہ بھی ہے نا اگر ٹیسٹ نا دیا تو پورے کالج میں کان پکڑوا کر گمائے گا۔'' حسنین نے کہا۔

''ہاں یار تو جا جلدی بڑا خطرہ ہے وہ اچھا سن ایک کش تو لگاتا جا یار۔'' شایان بولا۔

''پھر کبھی اوکے میں چلتا ہوں۔'' اور وہ اپنی کلاس کی طرف چل پڑا جیسے تیسے کر کے چھٹی کا وقت آیا۔ شایان اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کو میموری کارڈ کا پتہ چل گیا کہ خراب ہو گیا ہے۔ اس نے موبائل نکالا اور ریکاڈنگ آن کر لی پھر کیونکہ اس کا دل کہتا تھا اب یہ اقراء کا ذکر لازمی کرے گا۔

شایان نے جیسے اس کو دیکھا اس نے تیز آواز میں بولا۔

''بے غیرت تو نے کیوں کیا تجھ کو پتا نہیں میرے کارڈ میں اقراء، انعم، عائشہ پتا نہیں کتنے نام گنوا دیئے ان کی تصویریں تھیں تو نے کیوں میرا کارڈ خراب کیا۔ اقراء سے تو میں نے ابھی اپنا خرچہ وصول کرنا تھا تو باہر نکل میں تجھے بتاتا ہوں تو نے میری دوستی دیکھی ہے دشمنی نہیں۔''

حسنین پہلے ہی تیار تھا اس کے لیے وہ بولا۔ ''بھائی کیا ہوا ہے صبح تو چنگے بھلے تھے تم اور کون سے کارڈ کی بات کر رہے ہو یار؟'' شایان ایک دم پریشان ہو گیا کیونکہ حسنین کے آنکھوں میں خود اعتمادی تھی جو اس نے دیکھی پھر وہ ہلکا پڑ گیا اور بولا۔

''یار میرا میموری کارڈ خراب ہو گیا ہے۔ میں نے اپنا سیل تم کو دیا تھا۔ تم نے ہی کچھ کیا ہے۔ میں نے تم کو اپنا دوست سمجھا لیکن تم ایسا کیا میرے ساتھ میری پاس ان تصویروں کا بیک اپ بھی نہیں ہے۔ اگر اب اقراء مجھ سے نا ملنے آئی تو کیسے اس کو بلیک میل کروں گا۔ اگر تم نے واقعی ایسا کیا ہے جیسا میں سوچ رہا ہوں تو وجہ بتا دو۔ میں قسم کھاتا ہوں تم کو کچھ نہیں کہوں گا۔'' حسنین یہ سن کر دل ہی دل بولا بے غیرت ان ہی قسموں کی وجہ سے لڑکیاں تیرے جال میں پھنس جاتی ہیں۔

''یار دیکھو میں نے آپ کے سامنے کال کی۔ اگر میرے دل میں کچھ ہوتا تو تم سے پہلے میں تمہارا موبائل لیتا۔ کبھی صباء کو یہ نا کہتا کہ اگر میرا نمبر آف ہو جائے تو تمہارے نمبر پر رابطہ کرنا۔ مجھے کیا ملے گا تمہارا میموری کارڈ خراب کر کے؟'' شایان نے یہ سنا تو لاجواب ہو گیا۔ پھر بولا

''ٹھیک کہا اقراء سے تصویریں دوبارہ لے لوں گا۔ آ جا چلتے ہیں اب تصویروں کا بیک اپ بنا کر رکھوں گا تا کہ اگر کارڈ خراب ہو جائے گا تو محنت ضائع نا ہو۔''

''شایان اگر برا نا مانو تو ایک بات کہوں؟''

''ہاں بولو حسنین بلا کسی پریشانی کے۔''

''یار تم کو ڈر نہیں لگتا تم جو اوروں کی زندگیاں تباہ کرتے ہو؟''

''ہاہاہاہا ڈر کیسا جو اپنے ماں باپ کی نہیں ہو سکتیں ان پر اعتبار کر کے اپنی زندگی کو تباہ نہیں کر سکتا نا۔ میں نے کسی کو انوائٹ تو نہیں کیا نا۔ ان لڑکیوں میں عقل نہیں کیا جو شادی سے پہلے کسی کی محبت میں پڑ جاتی ہیں۔ یہ تم کو بھی پتا ہے لڑکے تو آج کل بس انتظار میں ہوتے ہیں کوئی پھنس جائے۔ آجکل تو دھوکہ دہی عام ہے۔ صرف جذبات تو ان لڑکیوں کے ہیں جو مڈل کلاس کی ہیں اور وہ بیچاری ان جذبات کی وجہ سے پھنس جاتی ہیں اور ایلیٹ کلاس میں تو ان چیزوں کو بطور فن لیا جاتا ہے اور پھر بریک آپ کا نام دے دیا جاتا ہے ان کو فرق نہیں پڑتا۔

لیکن نقصان تو ان لڑکیوں کا ہوتا ہے جن کو شادی کا وعدہ کر کے لوٹا جاتا ہے لیکن کہیں نا کہیں قصور تو انکا بھی ہے جو اپنے والدین کا اعتماد توڑ کر جب کسی سے دل لگی کریں گی تو کون سی کامیابی ملے گی؟ حسنین تم کو چاہے میری باتیں بری لگیں یہی سچ ہے۔ پتا ہے مجھے ایک اچھی بیوی چاہیے۔ میں پاگل ہوں جو گرل فرینڈ سے شادی کروں دل نہیں مانتا وہ تو اپنی سب چیزیں شادی سے پہلے دے دیتی ہے۔ میرا کیا جاتا ہے۔ نقصان تو لڑکی کا ہی ہے نا۔ یہاں تو لوگ قتل کر کے ڈرتے نہیں میں تو بس لڑکیوں سے ہی وقت گزارتا ہوں کیا ان میں

عقل نہیں ان کو یہی سزا ملنی چاہیے۔ چل میں چلتا ہوں کیونکہ اقراء کی چھٹی ہونے والی ہے اور مجھے اس سے بہت ضروری ملنا ہے کیونکہ اس کو بتانا ہے کہ جگہ کا انتظام ہوگیا ہے۔ شاید وہ مان جائے۔ آج کل وہ کال پر بات نہیں کرتی کیونکہ اس کی چھوٹی بہن کو اس پر شک ہوگیا ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔'' حسنین نے جب یہ سنا تو بولا۔

''ٹھیک ہے تم اس سے جا کر ملو۔'' اور دل میں کہا یہ اپنی آخری ملاقات سمجھ اس سے اور پھر گھر کی طرف چل پڑا۔

جیسے ہی گھر وہ پہنچا اس نے فائزہ کو بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے دیکھا اور مسکرا پڑا۔

ٹھیک پانچ منٹ کے بعد وہ کمرے میں آگئی، آتے کے ساتھ ہی بولی۔

''بھائی اب بتاؤ نا کیا ہوا آج کالج میں؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا نا؟ جو پلین کیا تھا وہی ہوا نا؟''

''اف فائزہ چپ کرو یار۔ یہ سنو چپ چاپ پہلے اس نے اپنے موبائل کی ریکارڈنگ پلے کردی۔ جس میں شایان اپنا سب کچھ بتا رہا تھا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی اور خوش ہونے لگی۔ کیونکہ شایان کا اصل چہرہ سامنے آگیا تھا۔ جب تمام ریکارڈنگ سن لی تو بولی۔

''بھائی آپ نے ہی کیا اس کا میموری کارڈ خراب؟'' حسنین نے قہقہہ لگایا۔

''ہاں جب وہ سگریٹ لینے گیا تب میں نے ایسا کیا۔ اب ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ کہیں شایان دوبارہ اقراء سے اس کی تصویریں نا لے لے۔ تم ہادیہ کو کال کرو کہ آج شام ہم ان کی طرف آئیں گے اور ھادیہ کو سمجھا دو کہ ابھی اقراء آپی کو کچھ نا بتائے اور میں کچھ دیر آرام کرلوں۔''

فائزہ نے ہادیہ کے گھر کا نمبر ملایا جو ھادیہ نے ہی اٹھایا سلام دعا کہ بعد اس نے سب کچھ ہادیہ کو بتایا اور سمجھایا۔ پھر کال کاٹ دی۔

شام پانچ بجے فائزہ نے اس کو اٹھایا وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ گیا۔

''تم تیار ہو جاؤ میں نہا کر آیا۔'' حسنین فائزہ کو یہ کہتا ہوا واش روم میں گھس گیا جب باہر نکلا تو اس کی امی صحن میں بیٹھی تھی۔ وہ اپنی امی کے پاس گیا اور بولا۔

''امی جی اب کیسی طبعیت ہے۔ جب میں آیا تو آپ سو رہی تھیں۔''

''میں ٹھیک ہوں کہاں جانے کی تیاری ہے تم دونوں کی؟''

''وہ امی ہادیہ کی طرف اس کو لے کر جانا ہے۔'' حسنین نے بتایا۔

''اچھا چلے جاؤ لیکن واپس مغرب سے پہلے آجانا تیرے ابو آگئے تو ناراض ہوں گے۔'' امی نے تلقین کے ساتھ اجازت دے دی۔

''ٹھیک ہے امی ہم چلتے ہیں۔'' پھر فائزہ اور حسنین ہادیہ کے گھر چلے گئے۔

اقراء فائزہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور بولی۔ ''جناب آج کیسے غریبوں کی طرف آگئے۔ اکیلی آئی ہو؟''

''نہیں آپی میں بھائی کے ساتھ آئی ہوں۔ سوچا آپ سے آج ملاقات ہوجائے گی۔'' اس نے کہا۔

''حسنین بھائی کو بھی اندر لے آؤ۔ پہلے بھی تو وہ آتے تھے تمہارے ساتھ۔'' اقراء نے فائزہ کو بھائی کو اندر بلانے کا کہا۔

''اچھا میں بلاتی ہوں۔'' اور پھر وہ بھائی کو اندر بلا لائی۔

حسنین نے اندر آتے سلام لیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ اتنے میں ہادیہ بھی آگئی۔ اس نے پہلے ہی انتظام کیا ہوا تھا ان کی خاطر داری کا۔

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے کیوں کہ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ بات شروع کرے جس وجہ سے وہ ہادیہ کی طرف آئے تھے۔

پھر حسنین نے ہمت کی اور بولا۔

''اقراء آپی آج میں اور فائزہ یہاں آپ کے لیے آئے ہیں۔''

''میرے لیے......!'' حیرانی سے اس نے پوچھا۔

''ہاں آپی آپ کے لیے آپ کو کچھ بتانا ہے، بلکہ کچھ سنوانا ہے۔ اگر اجازت ہو تو؟''

''بھائی آپ نے جو کہنا اور سنوانا ہے سناؤ۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔

حسنین نے چپ چاپ تمام ریکارڈنگ اقرا کو سنا دی ہادیہ کے چہرے پر خوشی جھلک رہی تھی لیکن اقراء کا چہرہ دیکھنے والا تھا کہ وہ کسی بھی وقت رو پڑے گی اور ہوا بھی یوں کہ جب ریکارڈنگ ختم ہوئی تو اقراء پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ ہادیہ اور فائزہ جیسے ہی اس کو چپ کرانے کے لیے آگے بڑھے حسنین نے انہیں روک دیا۔ کوئی دس منٹ تک وہ روتی رہی۔ ہادیہ نے اسے پانی کا گلاس دیا۔ جو اس نے بڑی مشکل سے پیا یا۔

''آج بھی شایان مجھے ملا تھا کہہ رہا تھا اپنی تصویریں دو۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اور آج رات میں بھیج بھی دیتی۔ میں غلط تھی میں نے ایسے انسان پہ بھروسہ کیا جو باتیں اچھی کر لیتا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ انسان کے روپ میں شیطان ہے۔ اس کی وجہ سے میں نے اپنی بہن سے لڑائی کی۔ اپنی حدود کو توڑا۔ شکر ہے میں اس سے ملی نہیں ورنہ میں تو اب تک خودکشی کر لیتی۔ لیکن اس کے پاس میری تصویریں ہیں۔ کیا کروں کیا پتا اس نے کہیں اور سیو کی ہوئیں ہوں۔ آج میری روح زخمی ہوگئی ہے مجھے مرد کے نام سے بھی نفرت ہوگئی۔ کیوں ذاتی مفاد کے لیے کسی کی زندگی تباہ کر دیتے ہیں۔ حسنین بھائی میں پوری زندگی آپ کا احسان نہیں اتار سکتی۔ آپ نے غیر ہو کر میری زندگی بچائی۔'' اقراء نے روتے ہوئے کہا۔

حسنین نے یہ سنا تو اس نے وہ تمام باتیں بتائیں کہ کس طرح اس نے شایان کا میموری کارڈ توڑا اور یقین کرایا کہ اس کے پاس کوئی تصویر نہیں ہے۔

اے ابنِ آدم!

ایک میری چاہت ہے اور ایک تیری چاہت ہے۔ ہوگا وہی جو میری چاہت ہے۔ پس تو نے سپرد کر دیا اپنے آپ کو اس کے جو میری چاہت ہے تو پھر وہ تجھے دوں گا جو تیری چاہت ہے اگر تو خلاف ہوا اس کے جو میری چاہت ہے تو میں تھکا دوں گا اس میں جو تیری چاہت ہے، پھر ہوگا وہی جو میری چاہت ہے۔

''سنو اس ذات کو چاہت بنا لو کہیں ایسا نا ہو وہ تم کو تھکا دے۔ بس وعدہ کرو کہ تم تینوں میرا ساتھ دو گی اور ہم مل کر زندگیاں بچائیں گے۔ یہ جو محبت ہے نا شادی سے پہلے کی ایک خواب کی مانند ہوتی ہے جو انسان کو جلتے ہوتے صحرا میں تنہا چھوڑ دیتی ہے جب انسان تھک ہار کر ادھر اُدھر پانی کی تلاش کرتا ہے نا تو اس کو دور سے ریت کی جو چمک نظر آتی ہے وہ اس کو پانی سمجھتا ہے جو صرف آنکھوں کا دھوکہ ہوتا ہے جس کو سراب کہتے ہیں اس سراب سے خود کو بچاؤ وعدہ کرو کہ کبھی خود کو بھٹکنے نہیں دو گی جو غلطی ہوگئی سو ہوگئی اور میرا ساتھ دو گی تم سب اوروں کی زندگیاں بچانے میں۔ کیونکہ کسی نے تو قدم اٹھانا ہے نا۔'' حسنین نے پرعزم لہجے میں کہا۔

''ہم وعدہ کرتے ہیں کہ کبھی بھی ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے جس سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔'' تینوں نے ایک ساتھ باآواز بلند کہا۔

پھر اقراء ہادیہ کے گلے لگ کر رونے لگی ''مجھے معاف کر دو۔ میں نے بہت غلط کیا تمہارے ساتھ۔''

ہادیہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے جبکہ حسنین اور فائزہ مسکرا رہے تھے۔

اذیت کا شکار

خلیل جبار

اللہ تعالیٰ نے غصہ کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ غصہ عقل وخرد کو لمحوں میں کھا جاتا ہے ار انسان حالت غصہ میں اپنے فیصلے کر دیتا ہے جس پر اسے زندگی بھر پچھتاوے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص کی روداد، اس نے حالت طیش میں اپنی محبت کرنے والی بیوی کو طلاق دے دی تھی اب اسے حلالہ کا مسئلہ درپیش تھا۔

کورٹ رپورٹر کی ڈائری کا ایک ورق، ایک عبرت انگیز واقعہ کی روداد

جمشید کے میرے کمرے میں جانے پر میں گیلری میں آ گیا تھا۔ ہما کمرے میں ہی تھی وہی ہما جو دنیا اور گھر والوں کی نظر میں میری بیوی تھی۔ ایک وقت تھا ہما کے بغیر مجھے اپنی زندگی ادھوری لگتی تھی، ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے اور ایک دوسرے کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

مجھے آج بھی اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب وہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے آئی تھی بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اتفاق سے اس وقت یونیورسٹی میں کوئی لڑکی بھی نہیں تھی جس سے وہ ایڈمیشن سے متعلق معلومات حاصل کرتی، لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ہما لڑکوں سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی، اب اس کے لیے یہ مجبوری بن گئی تھی کہ وہ کس سے بات کرے۔ میں ایک درخت کے پاس کھڑا تھا، مجھے اپنے دوست کاشف کا انتظار تھا، آج اس نے اپنی کلاس سے باہر آنے میں بڑی دیر کر دی تھی۔ ورنہ میں کبھی کا یونیورسٹی سے جا چکا ہوتا، ہما گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی۔

''جی میں ایڈمیشن کے سلسلے میں آئی ہوں مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اس سلسلے میں کہاں جاؤں۔''

''کیا آپ کی کسی سہیلی نے ایڈمیشن نہیں لیا۔'' میں نے پوچھا۔

''میری ایک سہیلی نائلہ نے ایڈمیشن لیا ہے مگر وہ آج یونیورسٹی نہیں آئی ورنہ مجھے پریشانی نہ ہوتی۔'' وہ بولی۔

''آپ یہاں نئی ہیں اس لیے میں تمہاری پریشانی دور کیے دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آپ مجھے صرف بتا دیں کہ مجھے کہاں جانا ہے۔''

''اس طرح گھبرائیں گی تو بقیہ دن یہاں کیسے گزاریں گی، آؤ میرے ساتھ یہ جنگل نہیں ہے یونیورسٹی ہے یہاں کسی کی مجال نہیں جو تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔'' میں نے کہا۔

میری ہمت افزائی پر اس کی ہمت بڑھی اور وہ میرے ساتھ متعلقہ ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھی، میرے تعاون سے اس کے ایڈمیشن کا مسئلہ حل ہو گیا۔

''آپ کے پاس سواری ہے نہیں پھر کیسے جائیں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جیسے تیسے چلی جاؤں گی۔''

''کیمپس کے لیے جو یہاں بسیں ہیں وہ جا چکی ہیں، اب جو بسیں ہیں وہ دیر سے آئیں گی۔'' میں نے کہا۔

''میں گیٹ تک پہنچ جاتی ہوں پھر دیکھ لوں گی کہ شہر کیسے جانا ہے۔''

''آپ تکلف نہ کریں، ویسے بھی ہمارا رشتہ قائم ہو چکا ہے اس لیے......''

''رشتہ.....کیسا رشتہ۔'' ہما گھبرائی۔

''طالب علموں والا' ایک طالبعلم دوسرے طالب علم کا دوست ہوتا ہے جب تک آپ کا ایڈمیشن نہیں ہوا تھا' میرے لیے اجنبی تھیں' ایڈمیشن ہونے پر یونیورسٹی کے طالب علم کی حیثیت سے تعلق پیدا ہوگیا ہے۔''

''اچھا آپ اس رشتے کی بات کررہے تھے۔'' ہما کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''شکر ہے تمہارے چہرے پر مسکراہٹ تو آئی ورنہ پریشان ہی پریشان لگ رہی تھیں۔'' میں نے کہا۔

''پہلی بار ایسا ہوتا ہے۔''

''میں نے کب کہا کہ نہیں ہوتا' ایسا کریں کہ میرے ساتھ بائیک پر چل دیں جہاں جانا ہے میں چھوڑ دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''اور تمہارا دوست.....'' وہ بولی۔

''اس کی تم فکر نہ کرو وہ کسی اور دوست کے ساتھ آجائے گا' ویسے بھی یونیورسٹی کے طالب علموں کے تمہارے ساتھ تعاون کرنے سے تمہارا حوصلہ بڑھے گا اور تم روزانہ خوشی خوشی یونیورسٹی آؤ گی۔'' میں نے کہا۔

''طالبعلموں کے تعاون نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟''

''تعاون نہ کرنے سے لڑکیاں چند دن آکر یونیورسٹی آنا چھوڑ دیتی ہیں۔''

''کیا ایسا بھی ہوتا ہے۔''

''ہاں ایسا ہوتا ہے جبھی میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔''

''تم سنیئر ہو اگر کوئی بات کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوگے۔'' ہما نے کہا۔

''آؤ پھر چلتے ہیں۔'' میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ہما میری بائیک پر پیچھے بیٹھ گئی جب ہم یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر نکلے ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔

موسم صبح ہی سے خوش گوار تھا' ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں' آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ دھوپ غائب تھی۔

''ارے اس بوندا باندی کو بھی ابھی ہونا تھا۔'' ہما بولی۔

''بوندا باندی سے گھبراؤ نہیں بارش تیز ہونے پر ہم کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ریسٹورینٹ یہاں سے کافی دور ہیں۔''

''تیز بارش بھی ابھی دور ہے۔'' میں نے کہا۔

''بارش کا کچھ پتا نہیں کب تیز ہو جائے۔'' ہما نے کہا۔

''دعا کرو تیز بارش نہ ہو۔'' میں نے کہا۔

''کیوں؟''

''بارش تیز ہونے پر سڑکوں پر پانی بھر جائے گا اور گاڑی کے انجن میں پانی جانے سے گاڑی بند ہو جائے گی۔ اس لیے ڈبل پریشانی ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔

''پھر تو واقعی مجھے تیز بارش نہ ہونے کے لیے دعا کرنی پڑے گی۔'' وہ مسکرائی۔

ہما مسکراتے ہوئے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ بارش تیز نہیں ہوئی تھی لیکن بوندا باندی نے ہم دونوں کے کپڑوں کو گیلا کر دیا تھا' ہما کے میرے بدن سے مس ہونے پر ایک خوشگوار کیفیت کا احساس ہو رہا تھا۔ میرے بدن میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ یہ سفر جاری رہے ختم نہ ہو مگر سفر کو ختم ہونا ہی ہوتا ہے۔

''تم شہر میں کہاں رہتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہیرآباد کے علاقے میں کبھی کیپری سینما ہوتا تھا' وہاں میں رہتی ہوں۔''

''کیا تم رحمت انکل کو جانتی ہو جو اسکول ٹیچر ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم انہیں کیسے جانتے ہو؟''

''وہ میرے والد کے دوست ہیں' اکثر فقیر کا پڑ ہمارے گھر آتے رہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کیا تم نور محمد انکل کے بیٹے ہو۔'' ہما بولی۔

''ہاں مگر تم میرے والد کو کیسے جانتی ہو۔'' میں چونکا۔

''جیسے تم میرے ابو رحمت کو جانتے ہو۔'' ہما مسکرائی۔

''کمال ہے میں نے تمہیں کبھی ہمارے گھر دیکھا نہیں۔''

''بس یہ اتفاق ہے میں جب بھی تمہارے گھر ابو کے ساتھ آئی ہوں' تم گھر پر نہیں ہوتے تھے۔ تمہارا تذکرہ ضرور گھر پر ہوتا تھا لیکن کبھی اس طرح ہماری ملاقات نہیں ہوئی' تمہارا چہرہ مجھے دیکھا دیکھا لگا تھا لیکن یہ یاد نہیں آ رہا تھا اس لیے میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے سلسلے میں تمہیں مخاطب کیا تھا۔''

''جب ہماری ملاقات نہیں ہوئی پھر تمہیں میرا چہرہ کیسے دیکھا ہوا لگا۔'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ تمہاری صورت نور محمد انکل سے بہت ملتی ہے۔''

''آ......خا......'' میں زور سے ہنسا۔

''تمہیں ہنسی کس بات پر آئی۔'' ہما نے کہا۔

''اس بات پر آئی کہ اتنی معمولی بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میری شکل والد صاحب میں ملنے کے سبب تمہیں جانی پہچانی لگی تھی۔'' میں نے کہا۔

باتوں باتوں میں سفر کا پتا ہی نہیں چلا' اور ہیرآباد آ گیا۔ میں نے جب ہما کو ہیرآباد چھوڑا' اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا گھر نہیں چلو گے۔''

''ابھی میرا حلیہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیوں تمہارے حلیے کو کیا ہوا ہے۔''

''پورا جسم کپڑوں سمیت بھیگا ہوا ہے ایسے حلیے میں جانا اچھا نہیں لگتا۔'' میں نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو واقعی بارش نے تمہارا حلیہ عجیب دغریب بنا دیا ہے۔'' ہما نے مجھ پر ایک بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

اس کے مجھے اس طرح دیکھنے پر دل میں ایک خوشی کا احساس ہوا تھا وہ گھر چلی گئی اور میں بھی اپنے گھر آ گیا۔

......☆☆......

ہما نے دروازہ سے باہر گیلری میں دیکھا۔ اس کی نظروں کی تپش مجھ سے برداشت نہیں ہوئی اور میں نے گھبرا کر نظریں نیچی کر لیں۔ دل میں ایک شرمندگی کا احساس مجھے ہما سے نگاہیں ملانے نہیں دے رہا تھا۔ ہما نے زور سے دروازے کے پٹ بند کیے' مجھے ایسا لگا کہ اس نے دروازے کے پٹ بند نہیں کیے میرے چہرے پردے

مارے ہیں۔ میں سسک کر رہ گیا۔ دل میں درد کی ایک لہر اٹھی اور میں نے درد کی شدت کو دبانے کی غرض سے سگریٹ کو سلگایا اور سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرنے لگا۔ میں بے غیرت نہیں تھا' یہ میری مجبوری تھی کہ میرے کمرے میں میرے بجائے ہما کے پاس جمشید تھا۔ وہ کس موڈ سے یہاں آیا تھا میں اس سے بہت اچھی طرح باخبر تھا۔ پھر بھی میں اسے کسی صورت روک نہیں سکتا' اسے روکنے کا مطلب تھا کہ ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا اور میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا' انسانی زندگی میں سارا کھیل ہی جذبات کا ہوتا ہے' جو جذبات اور غصے پر قابو پالے وہ اپنے مقصد میں قابو پالیتا ہے' جو قابو پا نہ سکے اس کے پاس پچھتاوے کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ قدرت انسان کا برا نہیں چاہتی' انسان خود اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر لیتا ہے' میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا' کہ میرے ساتھ ایسا بھی ہوگا' میں نے جو کیا میں اس کا مستحق تھا' ہما سے مجھے کتنی محبت تھی یہ مجھ سے زیادہ کون زیادہ بہتر جان سکتا ہے۔ میں نے اپنی ذات سے بڑھ کر ہما کو چاہا تھا' میرے اختیار میں ہوتا تو آسمان سے تارے توڑ کر لے آتا۔

ہما کے یونیورسٹی میں داخلہ ہو جانے کا مجھے یہ فائدہ ہو گیا تھا کہ جب اس کا کوئی خالی پیریڈ ہوتا وہ مجھے میسج کر دیتی اور میں اس کے ڈیپارٹمنٹ پہنچ جاتا اور اسے وہاں سے کینٹین لے جاتا تھا۔ کینٹین میں جا کر ہم باتوں میں ایسے مصروف ہوتے تھے کہ وقت کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ تا کلہ کا جب میسج آتا کہ خالی پیریڈ ختم ہو گیا ہے' سر کلاس میں آ گئے ہیں اس وقت چونکتے۔

یونیورسٹی میں ہما کے ساتھ میرا اچھا ساتھ گزرا وقت کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا' تعلیم سے فراغت ملنے پر مجھے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں نوکری مل گئی۔ تنخواہ بھی میری توقع سے بڑھ کر تھی۔ ہما کا تعلیم ختم ہونے پر نوکری کرنے کا ارادہ تھا مگر اس کے والد نہیں مانے' ہم دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ اس شادی پر ہم دونوں ہی خوش تھے۔ چھ ماہ کا عرصہ ہم نے بہت اچھا گزارا' اور پھر ہم دونوں کی زندگی میں ایک ایسا تلخ موڑ آیا جس کا ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا' کاش وہ لمحہ ہماری زندگی میں نہ آتا۔

میں غصے کا بہت تیز ہوں جب مجھے غصہ آ جائے میں اپنے آپ میں نہیں رہتا' کوئی غلطی کرے اور اپنی غلطی کو تسلیم نہ کرے تو میرا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے' یہ بات ہما کے علم میں تھی۔

اس دن مجھے کمپنی کے کام سے دوسرے شہر صبح روانہ ہونا تھا' میرے سوٹ کے حساب سے ٹائی نہیں مل رہی تھی۔ میں نے دو تین بار ہما سے کہا کہ ٹائی دے دو۔

''مجھے نہیں پتا تمہاری ٹائی کہاں رکھی ہے۔''

''میں نے خود رات کو تمہارے ہاتھ میں دی تھی اور یہ کہا تھا کہ اسے سوٹ کے ساتھ رکھ دینا۔'' میں نے غصے سے کہا۔

ہما میں یہ عادت بڑی خراب تھی وہ چیز رکھ کر بھول جاتی تھی۔ جہاں بیٹھی ہے وہاں چیز رکھ دیتی اصل جگہ نہیں رکھتی تھی اور ٹوکنے پر اپنی غلطی نہیں مانتی تھی۔

''مجھے نہیں پتا تم نے کب مجھے ٹائی دی اور اگر دیتے تو میں ضرور سوٹ کے ساتھ رکھ دیتی۔''

مجھے دوسرے شہر کو روانہ ہونے کو دیر ہو رہی تھی' اوپر سے ہما بے پرواہی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ جھوٹ بھی بول رہی تھی' ہم دونوں میں بحث و تکرار اتنی بڑھی کہ میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا' ہما یہ بات ماننے کو تیار نہ تھی کہ میں نے اسے ٹائی دی تھی' اور نہ ہی ٹائی ڈھونڈھ کر دے رہی تھی' میں غصے میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور طلاق کے تین لفظ بول کر گھر سے نکل گیا' میں غصے سے پاگل ہو رہا تھا مجھے یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ میں کیا بول گیا ہوں۔

دوسرے شہر سے جب میں گھر لوٹ رہا تھا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا' مجھے جتنا غصہ آتا تھا اتنا ہی جلدی غصہ دور بھی ہو جاتا تھا' میں رات گئے جب کمرے میں گیا ہما کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔

''ہما تمہیں کیا ہوا' یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''اس حالت کے ذمہ دار بھی تم ہی ہو' پھر مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔''

''میں نے ایسا کیا کر دیا؟'' میں چونکا۔

''ہما کو میں نے جیسے ہی چھونے کی کوشش کی وہ مجھ سے دور ہوگئی۔
''مجھ سے دور رہو۔''
''کیوں دور رہوں۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''میں تمہارے لیے اب نامحرم ہوں تم صبح مجھے تین بار طلاق دے کر جاچکے ہو' ایک یا دو بار طلاق دیتے تو امید تھی کہ ہم ایک دوسرے سے رجوع کر لیتے۔'' ہما نے کہا۔ اس کے کہنے پر مجھے صبح کا واقعہ یاد آ گیا۔ ایک لمحے کو میرا دماغ چکرا گیا میں دیوار کا سہارا نہ لیتا تو زمین پر گر پڑتا' ہما تین لفظ کہنے پر میرے لیے غیر محرم ہوگئی تھی۔ کاش میں اپنے غصے پر کنٹرول کر لیتا' کاش ہما اپنی غلطی تسلیم کر لیتی۔
ایک کرب کی لہر میرے دماغ پر آ گئی تھی۔ ہم نے ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھائی تھیں پھر یہ سب کیا ہوگا؟ اس طرح ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے اس کا بھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ دماغ کو ایسا جھٹکا لگا تھا کہ وہ کام نہیں کر رہا تھا' انسان سوچ سمجھ کر جو اقدام اٹھاتا ہے اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوتا ہے' میں نے انتہائی غصے کی حالت میں ایسا کیا تھا' اس لیے ذہنی طور پر کیسے تیار ہو سکتا تھا۔
''ہما تم نے یہ بات گھر والوں کو بتادی ہے۔'' میں نے پوچھا۔
''نہیں...... میں یہ بات انہیں ...... کس طرح سے بتا سکتی ہوں' مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ کسی کو بتاؤں' تم خود ہی بتا دو۔'' ہما نے کہا۔
''جو بات تم کسی سے کہہ نہیں پا رہی ہو' وہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''تم نے پھر ایسا انتہائی قدم اٹھایا ہی کیوں؟''
''جو کچھ بھی ہوا غصے میں ہوا ہے۔''
''پیار میں کون طلاق دیتا ہے۔'' ہما نے کہا۔
''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو' جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے تم ہی بتادو کہ میں کیا کروں کہ ہماری عزت بھی رہ جائے اور زمانے میں رسوائی بھی نہ ہو۔'' میں نے کہا۔
'میں کیا بتاؤں تم ہی اپنے دوستوں سے مشورہ کرو کہ ہم کیا کریں؟''
''ٹھیک ہے میں صبح اپنے دوست جمشید سے مشورہ کرتا ہوں' وہ اچھے مشورے دیتا ہے۔'' میں نے کہا۔
''جب تک اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلتا ہمارے بستر الگ الگ ہوں گے دنیا کی نظر میں ہم میاں بیوی ہوں گے لیکن حقیقت میں نہیں۔'' ہما نے کہا۔
''ہاں یہ سب کرنا ہوگا' بدنامی سے بچنے کا یہی حل ہے۔'' میں نے ہما کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔
یہ بات میں نے کہنے کو کہہ دی تھی مگر میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا' صبح سویرے تک جو میری بیوی تھی وہ اب میری بیوی نہیں رہی تھی۔
جمشید میرا اچھا دوست تھا میں ہمیشہ اس سے ہی مشورہ کرتا تھا' دوسرے دن میں نے جمشید سے ملاقات کی اور اپنا مسئلہ بیان کر دیا' میری بات سن کر جمشید افسردہ ہوگیا۔
''یہ تم نے کیا کر دیا' تمہیں اندازہ ہی نہیں تم نے کتنی بڑی غلطی کر دی ہے۔''
''یار جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے' تم مجھے مشورہ دو کہ کیا کروں عزت بھی رہ جائے اور ہما پھر سے میری بیوی بن جائے۔'' میں نے کہا۔
''اس کا ایک ہی حل ہے حلالہ اور کوئی حل نہیں ہے۔'' جمشید نے کہا۔
''کوئی اور ترکیب نہیں ہو سکتی۔'' میں نے کہا۔
''باقی جو بھی کام ہوگا وہ حرام کام میں شمار ہوگا۔'' وہ بولا۔
''تم بڑے بڑے مسئلے حل کر دیتے ہو میرا یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتے۔''
'جو بات ہے وہ میں نے بتا دی ہے۔''
میں جمشید کے پاس سے مایوس لوٹ آیا۔ میرا اترا چہرہ دیکھ کر ہما سمجھ گئی کہ بات نہیں بنی ہے۔
''کیا ہوا اتنے مایوس کیوں ہو۔'' ہما نے پوچھا۔
''اس نے وہی مشورہ دیا ہے جو مولوی حضرات دیتے ہیں۔''
''حلالہ۔''
''ہاں اس کا کہنا ہے کہ میں نے جو اقدام اٹھایا ہے اس کا یہی حل ہے۔''
''تم کسی اور سے بات کرو۔'' ہما نے کہا۔

’’یہ بات جتنا پھیلے گی ہماری اس میں رسوائی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔
’’تم ایسا کرو مختلف مفتی صاحبان سے مل کر بات کرو انہیں خود کے بارے میں نہ بتاؤ بلکہ یہ کہو کہ تمہارے دوست نے غصے میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ وہ کیا دوبارہ سے ایک ہو سکتے ہیں۔‘‘
’’ٹھیک ہے میں ایسا کر کے دیکھ لیتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔
پندرہ دن ایسے ہی گزر گئے ہر طرف سے یہی جواب مل رہا تھا کہ حلالہ بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر میرے پاس یہی چارہ تھا کہ سب کو بتا دیا جائے کہ میں نے ہما کو طلاق دے دی ہے اور حلالہ کا انتظام کر کے دوبارہ ہما کو اپنا لوں جہاں میں بدنامی سے ڈر رہا تھا وہیں ہما بھی بدنامی سے ڈر رہی تھی۔
سوچتے سوچتے میرے ذہن میں خیال آیا کہ حلالہ اس طرح کیا جائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور ہما بھی دوبارہ سے میری بیوی بن جائے جب میں نے جمشید سے مشورہ کیا اس پر وہ مسکرا کر بولا۔
’’تم بھی اپنی ضد کے پکے ہو یہ ممکن ہے مگر یہ کام بڑی رازداری چاہتا ہے ورنہ تمہارا سارا پلان فیل بھی ہوسکتا ہے۔‘‘
’’تم سے مشورہ کرنے اسی لیے آیا ہوں کہ اس پلان میں کوئی جھول نہیں ہونا چاہیے۔‘‘
’’تم کسی قابل اعتماد دوست سے حلالہ کے لیے بات کرو اور اپنے اس دوست کو کہہ دینا کہ تمہاری سابقہ بیوی اس کے پاس پوری رات نہیں گزارے گی ایک یا دو گھنٹے تمہارے ہی گھر میں اس سے ملاقات کرنے کو وہ تمہارے گھر پر اس سے مل کر چلا جائے اور پھر دوسرے یا تیسرے دن طلاق دے دے اس طرح تمہارا راز راز رہ سکتا ہے۔‘‘
’’جمشید میں جو چاہتا ہوں تم نے بھی ویسا ہی مشورہ دیا ہے میں اس کام کے لیے تمہیں بہت موزوں سمجھتا ہوں اور کسی اور پر میرا اعتبار نہیں ہے۔‘‘ میں نے کہا۔
میں نے اس کام کے لیے جمشید کو تیار کر لیا وہ دل سے اس کام کے لیے راضی نہ تھا مگر بھرپور اصرار پر وہ تیار ہوا تھا ایک دن میں ہما کو گھمانے کے بہانے گھر سے باہر لے گیا اپنے ایک دوست کے دفتر میں جمشید نے نکاح کا اہتمام کیا ہوا تھا وہاں سادگی سے نکاح ہوگیا وہاں موجود دوسرے لوگوں کی طرح سے میں نے بھی ہما کے نکاح کے چھوہارے کھا لیے چھوہارے کھاتے ہوئے میں بڑی بے بسی سے ہما کو دیکھ رہا تھا۔
نکاح ہو جانے پر میں ہما کو گھر لے آیا ایک ہفتے کے دوران میں جمشید کو ہما سے ملاقات کرنے تین بار موقع بھی فراہم کیا ان کی کمرے میں ملاقات کے وقت میں کمرے کے باہر پہرے دار کی حیثیت سے بیٹھا رہا میرا کمرا اوپر تھا اس لیے یہ اہتمام بھی ہوگیا تھا۔
ایک ہفتہ گزر جانے پر میں نے جمشید کو طلاق دینے کے سلسلے میں بات کی اس نے ڈھٹائی سے کہا۔
’’ہمارے نکاح کو ہوئے ابھی مشکل سے ایک ہفتہ ہوا ہے ہما اب میری بیوی ہے تم اس سے چند ملاقات اور کرانے کا اہتمام کرو۔‘‘
’’تم نے مجھ سے دوسرے یا تیسرے دن طلاق دینے کی بات کی تھی۔‘‘ میں نے کہا۔
’’ایسا نہیں ہوتا۔‘‘
’’پھر کیا ہوتا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’بیوی جب نکاح میں آجائے اور وہ جب تک شوہر سے طلاق نہ مانگے شوہر طلاق نہیں دے سکتا۔‘‘ جمشید نے کہا۔
’’ٹھیک ہے میں ہما سے بات کرتا ہوں کہ وہ کیوں تم سے طلاق نہیں مانگ رہی ہے۔‘‘ میں نے غصے سے کہا۔
’’یہ غصہ تم بعد میں کر لینا پہلے ہم دونوں میاں بیوی کی ملاقات کا اہتمام کرو۔‘‘
’’میرے گھر میں والدین اور بہن بھائی ہوتے ہیں میں کس طرح سے بار بار ملاقات کا اہتمام کرسکتا ہوں۔ تمہیں میری مجبوری کا خیال کرنا چاہیے۔‘‘
’میرے پاس کوئی اور جگہ نہیں ہے ورنہ میں یہ کام وہاں ہی کرتا۔‘‘ جمشید نے کہا۔
میں نے جیسے تیسے گھر میں ان کی ملاقات کا اہتمام کر دیا ہما سے وہ ملاقات کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے پر میں نے ہما سے پوچھا۔
’’جمشید میں ایسی کیا بات ہے جو تم اس سے طلاق نہیں

لے رہی ہو۔"

"تم سے یہ کس نے کہا میں ہر ملاقات پر جمشید کو طلاق دینے کو کہتی ہوں مگر وہ ہاں' ہوں کر کے رہ جاتا ہے۔"

"میں جمشید سے بات کرتا ہوں کہ وہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے۔" میں نے کہا۔

جمشید میرا بہترین دوست تھا مگر نکاح کر کے بدل گیا تھا' ہر بار ملاقات کے بعد طلاق دینے کا وعدہ کرتا اور ملاقات ہو جانے پر وہ بھول جاتا تھا کہ اس نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا۔ جمشید کو ٹال مٹول کرتے ہوئے تین ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا' اب مجھے اسے دیکھتے ہی غصہ آنے لگتا تھا' میں جب اس پر غصہ کرتا وہ بڑی ڈھٹائی سے کہتا۔

"ہما میری بیوی ہے' میرے پاس نکاح نامہ موجود ہے جس میں گواہ کے طور پر تمہارے بھی دستخط موجود ہیں تم میرا کچھ نہیں کر سکتے کورٹ جاؤ گے اس میں تمہاری ہی بدنامی ہوگی۔ اس لیے جو بھی قدم اٹھاؤ سوچ سمجھ کر اٹھانا تم پہلے ہی غلط اقدام کا خمیازہ بھگت رہے ہو۔"

میں اس کی بات پر لرز کر رہ گیا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا' ایک طرح سے وہ شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا' میں دن رات اسی سوچ میں ڈوبا رہتا تھا کہ کس طرح سے ہما کو اس سے طلاق دلاؤں۔

ایک شام میں انہیں سوچوں میں غرق گھر آ رہا تھا' اس وقت پیدل تھا' اچانک میں کسی سے ٹکرا گیا۔

"بھائی دیکھ کر چلا کرو کن سوچوں میں گم ہو۔" سید سرفراز علی ایڈووکیٹ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ آپ ہیں۔" میں نے کہا۔

"کہاں ہو بھئی تمہیں نوکری کیا ملی ہے ہمیں بھول ہی گئے ہو' آؤ کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔" سید سرفراز علی ایڈووکیٹ نے کہا۔

ہم نزدیک ہی ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے میں اس وقت بہت اداس تھا۔ میری اداسی کا سبب پوچھنے پر ناچاہتے ہوئے بھی میں نے سب کچھ انہیں بتا دیا۔

"تم ہمارے بھائی ہو ایسی بات تھی تو میرے پاس آتے ہم کوئی مسئلے کا حل نکال لیتے۔ تمہارا دوست انتہائی خودغرض ہے جب تم دونوں میں ایک معاہدہ ہو چکا تھا پھر اس نے ایسا کیوں کیا' تم کل میرے آفس میں آ کر ملاقات کرو۔"

"ٹھیک ہے میں آ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہاری بیوی تمہارے حق میں کورٹ میں بیان دے دے گی۔"

"ہاں وہ خود اس سے جان چھڑانے کی کوشش میں ہے مگر جمشید اسے طلاق نہیں دے رہا ہے۔" میں نے کہا۔

سخت گرمی کے دن تھے میں ابھی ہائی کورٹ سے لوٹا تھا' گرمی سے میری حالت خراب ہو گئی تھی۔ حیدرآباد میں گرمیوں کے دنوں میں کورٹ رپورٹنگ کرنا بڑا ہی مشکل کام ہے' گرمیوں میں جب مختلف کورٹوں کے چکر لگانے پر میری حالت خراب ہو جاتی تھی میں کینٹین میں جا کر بیٹھ جاتا تھا یا سیشن کورٹ کے احاطے میں لگی کرسیوں پر بیٹھ جاتا اور میرے ذہن میں خیالات کا سلسلہ چل نکلتا کہ کورٹ کی خبروں کے سلسلے میں مختلف کورٹ کے کئی کئی چکر لگانا پڑتے ہیں' کبھی سیڑھیاں اترنا' کبھی سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں' خاص کر گرمیوں کے دنوں میں ٹانگوں سے جان نکل جاتی ہے' ابھی جوانی میں یہ حال ہے تو بڑھاپے میں کیا حال ہوگا' نعیم قریشی اور ایس ایم رضوی بوڑھے ہیں' وہ اکثر مجھ سے کٹ کر رپورٹنگ کرنا چاہتے تھے مگر ان سے اتنی بھاگ دوڑ نہیں ہو پاتی تھی اس لیے مجبوراً انہیں میرے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا تھا۔ وہ دونوں ہی میری خدمت کرتے تھے تاکہ انہیں کورٹ کی ساری خبریں مل جائیں۔ ورنہ دفتر میں خبریں مس ہو جانے پر انہیں کھری کھری سننے کو ملتیں' اخبارات کو ویسے بھی جوان خون چاہیے ہوتا ہے وہ بوڑھے رپورٹرز کے مقابلے میں جوان رپورٹر کو رکھنے پر ترجیح دی جاتی ہے' جوان رپورٹرز رکھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تنخواہ کم دینا پڑتی ہے اور انہیں کام کرنے کا شوق ہوتا ہے وہ ادارے کو ایسی خبریں دیں جو کسی اور رپورٹر کے پاس نہ ہوتا کہ رپورٹنگ میں ان کا نام بنے۔ اس کے برعکس بوڑھے رپورٹر رکھنے میں ادارے کو یہ نقصان ہوتا ہے کہ انہیں تنخواہ زیادہ دینی پڑتی ہے ان سے زیادہ محنت نہیں ہوتی' اور ان کی گھریلو ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کی خاطر زیادہ رقم کی ضرورت پڑتی ہے۔

میری جب مئی 1997ء میں شادی ہوئی ان دنوں میں دو اخبارات میں کام کر رہا تھا' صبح میں ایک فلمی اخبار اور شام میں ایک روزنامہ میں کام کرتا تھا۔ شادی ہوجانے پر اخبارات سے ملنے والی تنخواہ مجھے کم لگنے لگی تھی۔ روزنامہ اخبار میں جب تنخواہیں بند ہوتی تھیں تو کئی کئی ماہ کے بعد ملتی تھیں' جس کی سرکاری نوکری ہو اس کا گزارا چلتا رہتا تھا مگر جس کے پاس سرکاری نوکری نہ ہو اس کا گزارا مشکل ہوجاتا تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ مجھے آمدنی کے ذرائع بڑھانے کو کچھ کرنا ہوگا' صحافت میں رہ کر میں اپنے بیوی اور بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا' میں دل میں سوچ رہا تھا کہ اپنے بہتر مستقبل کے لیے صحافت کو خیر باد کہہ کر کاروبار کرلوں' ایسے میں ایک دن میرے دوست رات میں میرے پاس آئے وہ اسکول میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میرا دوست جو موٹر سائیکل کا مستری ہے اس کی اپنے بھائی سے نہیں بنتی ہے' اس لیے وہ چاہتا ہے کہ میں اسپیئر پارٹس کے سامان کی دکان اس کے بھائی کی دکان کے نزدیک کھول لوں' اس طرح اسے دکان کا کرایہ نہیں دینا پڑے گا' دکان کا کرایہ مجھے ادا کرنا پڑے گا' جب بھی بھی اس کی اپنے بڑے بھائی سے تلخ کلامی ہوئی وہ میرے پاس آجائے گا اور دکان کے باہر سڑک پر موٹر سائیکل کی مرمت کرتا رہے گا اور رات میں اپنا سامان میری دکان کے اندر رکھ دے گا۔ دوسرے دوست نے دکان کے لیے یہ شرط رکھ دی کہ میں اپنی دکان میں اس کے ہارڈ ویئر کا سامان بھی رکھوں گا' میں نے ان کی باتوں میں آکر فلمی اخبار کو چھوڑ کر دکان کرلی' رات کے اخبار میں کام جاری رکھا' جب تک مجھے کاروبار کی سمجھ بوجھ آئی مجھے کاروبار میں زبردست نقصان ہوچکا تھا' مختلف لوگوں کا قرض دار ہوچکا تھا' میرے پاس کاروبار کا تجربہ آچکا تھا' لیکن پیسہ نہیں تھا' ملک میں ایٹمی دھماکا کا تجربہ کرنے پر سارے کاروباری لوگ پریشانی میں آگئے تھے' جن کی سیل لاکھوں میں تھی وہ ہزاروں میں اور جن کی سیل ہزاروں میں تھی ان کی سیل سیکڑوں میں آگئی تھی۔ پھر میں نے یہی بہتر جانا کہ دوبارہ سے صحافت میں آجاؤں میں نے دکان ختم کردی' حیدرآباد میں اردو روزنامے کم نکلتے ہیں اس لیے مشکل سے ہی اخبار میں جگہ نکلتی ہے' جس وقت میں نے دکان کو ختم کیا اس وقت میرے پاس کچھ رقم نہ تھی لوگوں کو قرضہ ادا کرتا تھا' میں رات میں ایک سندھی اخبار روزنامہ حیرت میں کام کرتا تھا' اخبار کے مالک نے بھی اخبار میں خرچے کم کرنے کی غرض سے اسٹاف کم کرتے کرتے ادارے میں باقی رہ جانے والے کمپیوٹر آپریٹر ممتاز عباسی اور مجھے بھی جواب دے دیا کہ میں اخبار بند کر رہا ہوں تم کسی اور اخبار میں نوکری تلاش کرلو۔''

میں یہ سن کر پریشان ہوگیا کہ دکان بھی ختم ہوگئی اور اخبار سے جو گزارے کو رقم ملتی تھی وہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا ہے۔ مقامی اخبارات کو اشتہارات کم ملنے پر وہ بھی اپنے اسٹاف میں کمی کرتے جارہے تھے۔ میں نے چھ ماہ قبل ایک اردو روزنامے کے اخبار کے مالک سے ملاقات ہونے پر کہا تھا کہ ''ہمارے اخبار کے مالک کا اخبار بند کرنے کا پروگرام بن رہا ہے کیا میں آپ کے اخبار میں آجاؤں۔''

اخبار کے مالک نے میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور بولا۔

''تم شریف آدمی ہو' ہمارے اخبار کے آفس کا ماحول ایسا ہے کہ تمہیں اچھا نہیں لگے گا' اور ہماری دوستی میں بھی فرق آجائے گا' کیا تم چاہو گے ہماری دوستی میں فرق آجائے' لیکن پھر بھی تم کام کرنے کی غرض سے دفتر آگئے میں تمہیں انکار نہیں کرسکوں گا۔''

یہ بھی محض اتفاق ہے کہ جب مجھے حیرت اخبار سے جواب ملا اس اخبار کے مالک کا انتقال ہوچکا تھا اور اس کا اخبار مارکیٹ میں نہیں آرہا تھا۔

روزنامہ حیرت کے بند ہونے میں ابھی چند دن باقی تھے کہ اخبار کا سابق کمپیوٹر آپریٹر انور عرف فوجی نے صدف منزل میں اپنا کمپیوٹر سینٹر کھول لیا اور مختلف ہفت روزہ اخبارات کی کمپوزنگ کر رہا تھا' وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''یہ اخبار بند ہو رہا ہے اب تم ایسا کرو میرے پاس ہفت روزہ اخبارات کی پیسٹنگ کرنے کا کام شروع کردو۔''

مجھے کام کی ضرورت تھی اس لیے کام کی حامی بھرلی۔

کسی اخبار سے 150 اور کسی سے 200 روپے ملتے تھے ان اخبارات کا کوئی وقت مقرر نہ تھا' اس لیے میری پوری رات ہی خراب ہوجاتی تھی' مجبوراً مجھے ان اخبارات میں کام کرنا پڑ رہا تھا۔ اخبارات سے پیسے ملنے پر میں پورے ہفتے کا سودا گھر میں لا کر ڈال دیتا تھا' کمپیوٹر آپریٹر انور بھی چاہتا تھا کہ اخبار کا کام دن میں ہو مگر اخبار والے اخبار کا کام کرانے اندرون سندھ سے شام میں آتے تھے۔ وہ چاہتے تو صبح بھی آسکتے تھے مگر صبح آنے میں یہ نقصان تھا کہ رات بارہ بجے اخبار چھپ جانے پر وہ کہاں سوئیں' شام میں آنے کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ اخبار رات دو بجے تیار ہو کر پریس جاتا تھا اور اس کے چھپتے چھپتے صبح کے چار بج جاتے تھے۔ اخبار تیار ہونے پر وہ اخبار کے بنڈل بنوا کر ان پر ٹکٹ لگا کر اسٹیشن کے پوسٹ آفس کے حوالے کر کے اپنے گاؤں روانہ ہوجاتے تھے' اس لیے انور نے پریشان ہو کر اخبارات کے مالکان سے کام کرنے کی معذرت کر کے صرف کتابوں کا کام شروع کردیا' وہ دوسری جگہ کمپیوزنگ کراتے اور اخبار کی پیسٹنگ کا کام رحمان چنا پریس پر ہونے لگا تھا۔ مجھے بھی راتوں میں پیسٹنگ کرنا اچھا نہیں لگتا تھا اور یہ میرا کام نہیں تھا۔ مجبوری میں پیسٹنگ کر رہا تھا۔ میں نے اپنے ایک دوست رئیس شیخ کو کہا ہوا تھا کہ اگر قومی اخبار میں رپورٹر کی جگہ خالی ہو تو بتانا' ایک دن اس نے مجھ سے ملاقات کی اور قومی اخبار کے بیورو آفس میں لے گیا' اس طرح میں قومی اخبار میں آ گیا۔

میں نے حیدر آباد مین ڈیسک پر کام کیا تھا جب میں رپورٹر کی حیثیت سے کورٹ میں گیا' سینئر کورٹ رپورٹر نے مجھ پر رائے زنی شروع کردی کسی نے کہا میں ایک ہفتے میں رپورٹنگ چھوڑ جاؤں گا' کسی نے کہا کہ میں ایک ماہ کے اندر اندر رپورٹنگ چھوڑ جاؤں گا' میں ان کی باتیں سن کر دل ہی دل میں مسکرا دیتا تھا کہ میں نے اخبار میں پیسٹنگ سے لے کر نیوز ایڈیٹر تک فرائض انجام دیے ہیں۔ پھر میرے لیے کورٹ رپورٹنگ کون سا مشکل کام ہے۔ کورٹ رپورٹنگ میں مشکل کام یہ ہے کہ حیدر آباد میں سخت گرمی پڑتی ہے ایسے میں بار بار خبروں کے لیے مختلف کورٹوں میں جانا پڑتا ہے۔ پیاس اتنی شدت کی لگتی ہے کہ حلق میں کانٹے پڑ جاتے ہیں' ادھر پانی پیا ادھر پانی پسینے کے ذریعے خارج ہوگیا۔ بلڈ پریشر لو رہنے لگتا ہے' صبح سویرے اٹھا نہیں جاتا تھکن کا احساس رہتا ہے' میرے بارے میں کورٹ رپورٹرز کے اندازے غلط ثابت ہوئے اور ان رپورٹرز میں سے کئی کورٹ رپورٹر رپورٹنگ چھوڑ گئے۔ صرف نعیم قریشی اور ایس ایم رضوی ہی رہ گئے تھے۔

کورٹ رپورٹنگ کرتے ہوئے مجھے ابھی ایک ماہ ہی ہوا تھا۔

ایک روز میں ہائی کورٹ سے سیشن کورٹ آنے کے لیے پتلی سی گلی سے نکل کر باہر آیا' ایسے میں اوپر کی طرف سے نیچے کو آتے ہوئے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل سوار نے مجھ کو زوردار ٹکر ماردی اور میں قلابازی کھاتے ہوئے سڑک پر گر پڑا۔ سڑک کی رگڑ سے میرا چہرہ شدید زخمی ہوگیا تھا۔ الٹے ہاتھ میں فریکچر آ گیا تھا۔ موٹر سائیکل سوار میرے سنبھلنے سے پہلے ہی بھاگ گئے' یہ وہ وقت تھا جب کورٹ آنے والے لوگ جا چکے تھے' اتفاق کی بات ہے اس وقت میری جیب میں ایک روپیہ بھی نہیں تھا۔ ایسے میں فرہاد علی ایڈوکیٹ آ گئے۔ وہ مجھے سول اسپتال لے گئے اور وہاں میرے ہاتھ پر پلاسٹر لگوا کر اپنی گاڑی پر ہی گھر چھوڑ گئے۔ ان ہی دنوں میری دوسری بچی کی ولادت بھی ہونے والی تھی۔ جب مجھے اپنے ہاتھ پر پلاسٹر تبدیل کرانا ہوتا تھا' میں بیگم کو چیک اپ کی غرض سے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جاتا تھا' مجھے پیسوں کی سخت ضرورت تھی' سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گھر کے خرچ اور دیگر معاملات کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ایسے میں سابق صدر پرویز مشرف نے ملک میں بلدیاتی انتخابات کا اعلان کردیا۔ میں نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اخبار کے لیے اشتہارات لینا شروع کردیا۔ اس طرح اشتہارات کی مد میں کمیشن ملنے سے گھر کا خرچ اور دیگر معاملات چلنے لگے تھے' میرا ہاتھ ٹھیک ہونے پر میں نے دوبارہ سے کورٹ رپورٹنگ شروع کردی۔

''خلیل جبار کن گہری سوچوں میں غرق ہو۔'' سید سرفراز علی ایڈوکیٹ نے میری آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

میں اپنی پرانی یادوں سے باہر نکل آیا۔

''اور کیا خبریں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

"تمہارے لیے ایک زبردست خبر ہے۔ آؤ سول کورٹ چلتے ہیں۔ وہاں دونوں پارٹیاں موجود ہیں۔ان سے بات چیت بھی کر لینا۔" سید سرفراز علی ایڈوکیٹ نے کہا۔

"ٹھیک ہے ابھی دونوں پارٹیوں کو دیکھ لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

سول کورٹ میں دونو جوان اور ایک خاتون موجود تھی۔ سول کورٹ تک آتے ہوئے سید سرفراز علی ایڈوکیٹ مقدمے کی تفصیل بتا چکے تھے۔

کورٹ سے ہما کی خلع کی درخوات منظور ہو چکی تھی' اب دونوں پارٹیوں سے بات چیت کرنا تھی۔ میں نے جمشید سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

"تم شہباز کے اچھے دوست ہونے کا دعویٰ کرتے ہو پھر تم نے اپنے دوست کی مجبوری کا فائدہ کیوں اٹھایا؟"

"دوست نے مجھے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا تھا تو میں کیوں فائدہ نہیں اٹھاتا تم خود دیکھ لو ایسی حسین بیوی کو کون کمبخت چھوڑے گا۔ میرا دوست اپنی خوبصورت بیوی کو طلاق دے کر اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے پھر وہ میرے نکاح میں آ چکی تھی اس لیے حق زوجیت ادا کرنا اس کا فرض ہے۔" جمشید نے کہا۔

"شوہر کے ذمے بھی بیوی کے حقوق ہوتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی کی ضروریات کا خیال رکھے اور خرچے کو پیسے دے اس کا تمہیں خیال نہیں آیا۔" میں نے کہا۔

"میری اس بات پر جمشید جھینپا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں نے یہ سب اس لیے کیا کہ میں چاہتا تھا کہ شہباز کو نصیحت حاصل ہو اور یہ میاں بیوی کے رشتے کو سمجھے کہ طلاق دے کر انسان کس اذیت سے دوچار ہو جاتا ہے' میاں بیوی کا رشتہ جتنا مضبوط ہے اتنا ہی وہ کچے دھاگے کی طرح کچا بھی ہے۔ بعض خواتین دوسری شادی ہو جانے پر پہلے شوہر کے پاس جانے سے انکار کر دیتی ہیں' آئے دن اس طرح کے واقعات میں قتل بھی ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں ایسا تو ہوتا ہے' اس طرح کے کاموں میں۔" میں نے کہا۔

"میں چاہتا تو حق زوجیت کی غرض سے ہما کو کہیں اور بھی لے جا سکتا تھا مگر میں نے شہباز کے گھر کو اس لیے چنا کہ وہاں جو تکلیف واحساس شہباز کو ہو سکتا ہے وہ کہیں اور نہیں ہو سکتا تھا۔" جمشید نے کا۔

"شہباز تم کیا کہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے یہ ہی سبق حاصل کیا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن غصہ ہے انسان کے غصے پر قابو پا لینے سے وہ بہت بڑے بڑے مسائل سے بچ جاتا ہے۔ یہ سرفراز علی ایڈوکیٹ صاحب کی مہربانی ہے کہ جو یہ کام رازداری سے ہو گیا ہے' ورنہ میری بڑی رسوائی ہو جاتی' آپ خود سوچیں یہ بات کھلنے پر مجھے گھر والوں کے سامنے کس قدر شرمندگی ہوتی' میں کسی کے آگے سر اٹھا کر چلنے جیسا نہیں رہتا۔" شہباز نے کہا۔

"ٹھیک ہے میری خبر مکمل ہو چکی ہے۔' میں نے کہا۔

"کیا یہ خبر اخبارات میں آئے گی۔" وہ چونکا۔

"تم گھبراؤ نہیں اخبار میں تمہاری تصویر نہیں آئے گی' جس سے کسی کو پتا چلے۔ ہما کا نام دینے کی بجائے مسماۃ (ہ) لکھ دیا جائے گا۔شہباز نام کسی کا بھی ہو سکتا ہے' کسی کو کیا پتا چلے گا کہ یہ خبر تمہاری ہے۔تم خود کسی کو بتاؤ گے تو کسی کو پتا چلے گا' خبر اخبار میں دینے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو نصیحت حاصل ہو تم نے جو جذبات میں ایسا کیا کوئی اور ایسا نہ کرے اور ایسا کرتے ہوئے ڈرے کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" سید سرفراز علی ایڈوکیٹ نے اسے سمجھایا۔

"یہ بات بھی آپ ٹھیک کہہ رہے ہو کسی کو میری یہ بات کسی کو بتانے پر ہی پتا چلے گی۔ اس خبر سے واقعی لوگوں کو نصیحت بھی ملے گی۔" شہباز نے کہا۔

میری خبر مکمل ہو چکی تھی اس لیے میں ان سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھ گیا۔

چھری مار

عارف شیخ

کراچی کے ایک مخصوص علاقہ میں نامعلوم شخص نے خواتز حملہ کر کے خاصا خوف و ہراس پھیلا رکھا ہے وہ کون ہے ایسا کیوں کرتا ہے کہاں سے آتا ہے اور کہاں غائب ہو جاتا ہے، یہ سب کچھ ابھی تک پولیس کے لیے سربستہ راز بنا ہوا ہے اسی خوف و ہراس کی آڑ میں سیانے کوؤں نے بھی اپنے ہاتھ رنگنے کی کوشش کی۔

وہ دونوں پنجوں سے پھنس گئے

آج کل اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا پر ایک خبر کا بڑا چرچا ہے اور وہ ہے چاقو مار کر خواتین کو زخمی کرنے والے کا، روزانہ پرنٹ میڈیا اس خبر کو نمایاں جگہ رہتا ہے دوسری طرف الیکٹرانک میڈیا بھی حساس نیوز کو بڑی اہمیت دیتے ہوئے زور و شور سے نشر کر رہا تھا بلکہ یوں سمجھ لیں کہ ملک کے سب سے بڑے شہر کی آج کل سب سے بڑی خبر یہی چھری مار چھلاوا ہے۔

وہ دونوں ہوٹل پر بیٹھے سامنے پڑے ہوئے اخبارات کا جائزہ لے رہے تھے دونوں افراد کا تعلق پرنٹ میڈیا سے تھا یعنی دونوں صحافی تھے ویسے تو دوپہر کا وقت تھا لیکن صحافیوں کی صبح دوپہر ہی سے شروع ہوتی ہے اس لیے دونوں ناشتہ کرنے ہوٹل پہنچے تھے۔

''یہ چاقو مار تو کوئی چھلاوا ہی لگتا ہے۔'' اکرم نے اپنا اخبار لپیٹا۔

''یار لگتا ہے یہ چھری سے حملہ کرنے والا واقعہ کوئی سیاسی ایشو ہے۔'' امجد پیشانی پر سلوٹیں ڈالے بولا۔

''تم ہر بات میں سیاست ہی کیوں ڈھونڈنے لگتے ہو۔'' اکرم نے ناگواری سے جواب دیا۔

''اسی طرح جس طرح ہر کام میں ایجنسی کا تعلق جوڑ دیتے ہیں۔'' امجد کا جواب آیا۔

''جان چھڑانے کے لیے غیر ملکی ہاتھ بھی ڈالا جاسکتا ہے۔'' اکرم مسکرایا۔

''کیا ملک دشمن عناصر اب چاقو مار جیسی چھوٹی حرکات پر آ گئے ہیں۔'' جواباً امجد بھی مسکرا دیا۔

''آپریشن کے نتائج میں شاید اب اس میں اتنی ہی طاقت بچی ہو۔'' اکرم نے کہا۔

''میرا تجربہ کہتا ہے یہ کوئی کرمنل شخص ہے جو توجہ حاصل کرنے کے لیے اس طرح کا کام کر رہا ہے۔''

''کوئی نفسیاتی ذہنی مریض بھی ہوسکتا ہے۔'' اکرم بولا۔

''اہم خبر یہ نہیں کہ شہر میں خواتین پر چاقو سے حملہ ہو رہا ہے بلکہ خبر یہ ہے کہ تین روز سے مسلسل اس طرح کے واقعات ہونے کے باوجود پولیس ناکام ثابت ہوئی ہے۔''

''بری طرح ناکام، الجھی گتھی کا سرا ابھی تلاش نہیں کر سکی ہے پولیس۔'' اکرم نے کہا۔

''چلو پھر پولیس کی ہم ہی خبر لیتے ہیں۔'' امجد نے کہا اور وہ دونوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔

☆☆

تھانہ انچارج بڑے افسران کی کھنچائی کے بعد واپس تھانے لوٹ آیا تھا انچارج نے آتے ہی تمام عملے کو طلب

کرلیا اور اپنے افسران کا غصہ اپنے عملے اتار ڈالا۔
''تم لوگوں کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے آج مجھے ڈانٹ سننی پڑی ہے۔'' تھانے دار شیر زمان غصے سے بولا۔
''تین روز سے ہماری حدود میں خواتین پر چاقو سے حملہ ہو رہا ہے اور کوئی کلیو تم لوگ نہیں ڈھونڈ سکے ہو۔''
''سر جی بڑی جان مار رہے ہیں۔'' سب انسپکٹر سہیل بولا۔ ''گشت بھی بڑھا دیا ہے لیکن وہ چھلاوے کی طرح واردات کرتا اور غائب ہو جاتا ہے۔''
''مجھے کچھ نہیں معلوم یا تو اسے گرفتار کرو ورنہ میرے علاقے میں کوئی اس نوعیت کا واقعہ ہوا تو پھر سمجھ لو کہ معطل ہو جاؤ گے۔''
''سر جی مجھے لگتا ہے کہ جرم کرنے والا کوئی پڑھا لکھا ہے۔'' کانسٹیبل ساجد بولا۔
''تو پھر کالج یونیورسٹیوں کو جانچو۔'' انچارج کی آواز تیز تھی۔
''سر جی کالج یونیورسٹی کے اندر ہم نہیں جا سکتے۔'' اے ایس آئی سہیل نے کہا۔
''تعلیمی اداروں کے اطراف میں نظر رکھو۔''
''سر جی اسنیپ چیکنگ کی اجازت دیں۔'' سپاہی ساجد بولا۔
''چیکنگ کے دوران وہ گھبرا کر غلطی کرے گا اور پکڑا جائے گا۔''
''ٹھیک ہے اسنیپ چیکنگ کرو لیکن مجھے رزلٹ چاہیے۔'' انچارج نے فیصلہ سنایا۔

......☆☆......

وہ موٹر سائیکل دھیمی رفتار سے چلاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا اس نے جینز کی پینٹ اور شرٹ پہن رکھی تھی بلیک کلر کی موٹر سائیکل پر وہ ریڈ رنگ کا ہیلمٹ پہنتے ہوئے تھا وہ ایسی سڑک پر تھا جہاں رش نہیں تھا اچانک اس نے بائیک ایک گلی میں داخل کر دی اور سامنے سے آنے والی ایک لڑکی کی طرف بڑھا لڑکی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اس لیے وہ بھی محتاط انداز میں بڑھ رہی تھی موٹر سائیکل کی رفتار خاصی دھیمی تھی وہ موٹر سائیکل سوار لڑکی سے کچھ فاصلے سے گزر گیا۔
لڑکی جو بے حد ڈری ہوئی تھی اس نے سکون کا سانس لیا لیکن وہ ابھی چند گز ہی آگے بڑھی تھی کہ اسے ایسا لگا کہ موٹر سائیکل واپس آ رہی ہے وہ ایک دم سے پلٹی تو بائیک سوار کا چاقو والا ہاتھ فضا میں لہرایا لڑکی نے تیزی سے اپنا بیگ سامنے کر کے خود کو بچایا، چاقو بیگ کو کاٹتا ہوا نکل گیا اگلی آواز لڑکی کی چیخ کی تھی لیکن موٹر سائیکل کی رفتار بڑھی اور غائب ہو گئی لڑکی لگاتار چیختی چلی گئی۔

......☆☆......

وہ دونوں تھانے سے روانہ ہوئے تو ان کے پاس اپنے اخبار کے لیے خبر موجود تھی کہ ایک اور چاقو کا حملہ، اس مرتبہ بھی حملہ آور پکڑ میں آئے بغیر غائب ہو گیا۔
''پولیس اسنیپ چیکنگ کے نام پر موٹر سائیکل سواروں کو ہراساں کر کے رشوت وصول کر رہی ہے۔'' امجد نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔

''ہاں خبر میں پولیس کی خبر بھی لینی ہے۔'' اکرم نے ہامی بھری۔
''ابھی تک حملہ آور کی شناخت حاصل نہیں ہوئی۔''
''حملہ آور اپنے کام کے معاملے میں پاگل نہیں بلکہ کوئی عقل مند مجرم معلوم ہوتا ہے۔'' اکرم نے جواب دیا۔
''اگر کوئی کلیو ہاتھ لگ جائے تو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے کیش کرایا جاسکتا ہے۔'' امجد سوچتے ہوئے بولا۔
''نیوز چینلوں کے درمیان ریٹنگ کی دوڑ ہے اور ہماری خبر کے لیے وہ اچھے ریٹ دیں گے۔''
''لیکن نیوز ہوگی تو پھر اہمیت ہوگی۔'' امجد نے ٹھنڈی سانس بھری۔
''دوست ہمت مت ہارو کامیابی ڈھونڈنے سے مل ہی جاتی ہے۔'' اکرم نے سمجھایا۔

......☆☆......

صبح سویرے کا وقت تھا اس لیے سڑکوں پر آمدورفت بھی کم ہی تھی زیادہ تر لوگ اس وقت اسکول کالج جانے والے ہی تھے یہ علاقہ چاقو کی وارداتوں سے کافی فاصلے پر تھا اس لیے یہاں پر وہ خوف کا سماں بھی نہیں تھا۔
ایک ویران سی سڑک پر کچھ لڑکیاں اپنے کالج کی طرف پیدل ہی جا رہی تھیں کہ اچانک ایک موٹر سائیکل سوار نمودار ہوا اور اس نے نزدیک سے گزرنے والی دو لڑکیوں کو چاقو کے وار سے زخمی کرنے کی کوشش کی جو کافی حد تک کامیاب رہی تھی چاقو کی نوک لڑکی کے کندھے میں گھس کر کاٹتی چلی گئی، لڑکی کی بھیانک چیخ نے دور تک خوف پھیلا دیا۔
وہ موٹر سائیکل سوار سیکنڈوں میں غائب ہوگیا لڑکی خون آلود کپڑوں کے ساتھ اپنے اردگرد جمع ہونے والوں کو تکلیف اور خوف سے دیکھ رہی تھی۔
تھوڑی دیر میں یہ خبر کالج تک اور پھر پولیس سے ہوتی ہوئی میڈیا تک پہنچی تھی اس خبر کا پہلا اثر یہ ہوا کہ وزارت داخلہ کو ایکشن لینا پڑ گیا اور وزیر اعلیٰ کی طرف سے حملہ آور سے متعلق خبر دینے والے کو انعام دینے کا اعلان ہوگیا۔

......☆☆......

پولیس کے اعلیٰ افسران کا اجلاس وزارت داخلہ کے دفتر میں جاری تھا گزشتہ چھ روز کے چھری مارنے کے واقعات نے پورے شہر میں خوف کا عالم برپا کردیا تھا الیکٹرانک میڈیا کے کیمرہ مین اور فیلڈ صحافیوں نے علاقوں میں جاکر عام عوام اور خواتین سے انٹرویو کرتے ہوئے پورے ملک کو خوف ناک خبروں سے آگاہی دینے کا بیڑہ اٹھالیا تھا۔
اخباری نمائندے وزارت داخلہ کے باہر ہی موجود تھے کہ دیکھیں حکومت اور پولیس کیا فیصلہ کرتی ہے اجلاس کے اختتام پر آئی جی نے صحافیوں کے ذریعے یہ اپیل کی کہ عوام مدد کرے پولیس پورے شہر کی نگرانی کرنے سے قاصر ہے لوگ مشکوک آدمی سے متعلق خبر دیں تاکہ اسے پکڑا جاسکے آئی جی کے اس اقدام سے حکومت اور پولیس کی بے بسی ظاہر ہوگئی تھی۔

......☆☆......

پولیس کے سینئر افسران کا اجلاس جاری تھا ایس پی امداد خان آئی جی کو وضاحت دے رہے تھے۔
''سر مجرم نے جب یہ دیکھا کہ ہم پورے علاقے کی نگرانی کررہے ہیں تو اس نے دوسرے علاقے میں جاکر واردات کی۔''
''سر اس نے علاقہ تبدیل کرنے کے ساتھ موٹر سائیکل بھی تبدیل کی ہے۔'' ایک اور پولیس والا بولا۔ ''ہیلمٹ بھی دوسرے رنگ کا تھا۔''
''یہ کیسے معلوم ہوا۔'' آئی جی نے سوال کیا۔
''سر پہلے والے علاقے میں جتنے واقعات رپورٹ ہوئے اس میں موٹر سائیکل بلیک رنگ میں ریڈ ہیلمٹ کے ساتھ بتائی گئی لیکن نئے علاقے میں چھری مارنے والا لال رنگ کی موٹر سائیکل استعمال کی اور ہیلمٹ کا رنگ کالا تھا۔''
''کوئی اور اہم معلومات۔'' آئی جی نے پوچھا۔
''سر حملہ خواتین پر ہوتا ہے اس لیے وہ سہم جاتی ہیں اور کچھ اور نہیں بتا پاتیں حملہ آور سے متعلق۔''
''یہ کیس اگر حل نہیں ہوا تو بہت رسوائی ہوگی۔'' آئی جی نے تفکر سے بات مکمل کی۔

......☆☆......

اکرم اور امجد نیوز چینل کے دفتر پہنچے تھے وہ سیدھے ایڈیٹر سے ملاقات کررہے تھے ادھیڑ عمر کے ایڈیٹر صاحب اپنے چشمے کے پیچھے سے ان دونوں کو بغور دیکھ رہے تھے۔

''تو تمہارے پاس چاقو مارنے والے سے متعلق خبر ہے۔''

''مبہم سی خبر ہے۔'' اکرم نے بتایا۔

''لیکن اس کے ذریعے بڑی خبر تک پہنچا جاسکتا ہے۔''

''وہ مبہم خبر کیا ہے۔''

''پہلے معاملات ڈیل کریں۔'' امجد بولا۔

''کیا چاہتے ہو۔''

''دس لاکھ۔'' اکرم بولا۔

''اور خبر کے ساتھ ہمارا نام جائے گا۔'' امجد نے لقمہ دیا۔

''دولت اور شہرت دونوں ہی حاصل کرنا چاہتے ہو۔'' ایڈیٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ دونوں چیزیں آپ کے حصے میں بھی آئیں گی۔'' امجد بولا۔

''اگر میں انکار کردوں۔''

''بے مقصد سوال ہے ہم کہیں اور سودا کرلیں گے۔'' اکرم نے کہا۔

''لیکن ابھی تمہاری خبر مبہم ہے پورا سودا تو نہیں ہوسکتا۔''

''ابھی ہم ٹوکن مانگ رہے ہیں اس مبہم خبر کے بدلے۔''

''خبر کی تفصیل دو۔''

''واردات کے وقت ہم دونوں اس سڑک پر تھے لیکن کافی فاصلے پر تھے موبائل کیمرے سے تصویر بنائی ہے لیکن کیمرہ اچھا نہیں تھا اور فاصلہ زیادہ تھا اس لیے تصویر واضح نہیں ہے لیکن پھر بھی آپ کو سمجھ آجائے گی۔''

ان دونوں نے موبائل میں موجود دھندلی تصویر ایڈیٹر کو دکھائی اس تصویر میں ایک موٹر سائیکل سوار لڑکی سے دور جاتا دکھائی دے رہا تھا اور لڑکی کی چیخیں محسوس ہورہی تھی ایڈیٹر کو اندازہ ہوگیا کہ تصویریں واضح نہیں ہیں لیکن اندازہ تھا کہ یہ وہی مجرم ہے جو چھری سے خواتین پر حملہ کررہا ہے۔

اس نیوز چینل نے ایک لاکھ میں تصویر کا سودا کرلیا اور یوں اس چینل نے بریکنگ نیوز چلا کر ریٹنگ میں اپنے ریٹ بڑھا لیے اور دوسرے چینلوں کو پریشان کردیا کہ اب کیا کریں۔

......☆☆......

امجد اور اکرم نے تمام چینلوں کو فون کرکے یہ خبر دے دی تھی کہ انہوں نے خبر اس چینل کو فروخت کی ہے ان کی کوشش بارآور ہوگئی تھی نیوز چینل نے ان سے رابطہ کرلیا تھا اور مزید معلومات کے عوض رقم کا تعین بھی ہورہا تھا امجد اکرم کو بھی اپنی محنت دگنی کرنا پڑگئی تھی وہ موٹر سائیکل پر سوار شہر بھر میں گھوم رہے تھے انہیں اس خبر کی تلاش تھی جو انہیں شہرت اور دولت دونوں دلوادے اور وہ راتوں رات مشہور ہوجائیں آخر کار انہوں نے ایک جگہ ڈھونڈ لی تھی۔

''یہ جگہ چھری مارکے لیے محفوظ ہے۔'' امجد بولا۔

''ہاں بنگلوں کے درمیان گزرنے والی سڑک خاصی سناٹے میں ہے۔'' اکرم بھی جائزہ لے رہا تھا۔

''لیکن یہاں چاقو سے حملہ کرنے والے کا شکار کون سی خاتون ہوسکتی ہے۔''

''بنگلوں میں کام کرنے والی ماسیاں بھی عورت ہی ہوتی ہیں۔'' اکرم مسکرایا۔

امجد نے بھی سمجھ کر اثبات میں سر ہلایا۔

اب وہ دونوں خاموشی سے ایک کونے میں کھڑے خبر کا انتظار کرنے لگے۔

......☆☆......

پورے شہر کے ٹی وی چینلوں نے شور مچادیا تھا اس لیے کہ ایک گھنٹے کے اندر تین مرتبہ چاقو سے خواتین پر حملہ ہوا تھا پولیس اور تحقیقات کرنے والے ادارے سخت مشکل میں تھے اس لیے کہ ایک علاقے میں دو الگ الگ مقام پر دس منٹ کے وقفے سے خواتین کو زخمی کیا گیا تھا اور عینی شواہد کے تمام حملہ آور کی نشانیاں ایک ہی جیسی تھیں لیکن اس واقعے کے نصف گھنٹے بعد ایک اور علاقے میں ایک گھر میں کام کرنے والی عورت پر حملہ ہوتا ہے ماسی کے مطابق حملہ آور کا حلیہ اور اس کی موٹر سائیکل پہلے والے حملہ آور سے الگ تھی یہ بات پولیس کو تشویش میں مبتلا کررہی تھی۔

☆☆

امجد اور اکرم کیونکہ ایک ہی محلے کے رہائشی تھے اس لیے علاقے میں داخل ہوتے ہی پولیس موبائل نے ان کا راستہ روک لیا دونوں اس سے قبل کہ کوئی بات کرتے انسپکٹر ان سے مخاطب ہوا۔

''تم دونوں صحافی ہو ہمیں معلوم ہے اس کے باوجود تم لوگوں کو تھانے چلنا ہے۔''

وہ دونوں سمجھ گئے کہ وضاحت کی کوئی گنجائش نہیں ہے ایک سپاہی نے دونوں کے موبائل بھی قبضے میں لے لیے تھے تھوڑی دیر میں وہ دونوں تھانے کے اندر تھے انچارج نے فوراً ہی دونوں موبائل چیک کیے اور پھر مخاطب ہوا۔

''آپ دونوں خود ہی تفصیل دو گے یا پھر ہمیں طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔''

امجد اور اکرم نے بھی بغیر کسی حجت کے فرفر بولنا شروع کر دیا تھا تھوڑی دیر میں مکمل کہانی سامنے آ گئی۔

''پلان اچھا تھا لیکن غلطی یہ ہوگئی کہ جہاں بنگلے ہوتے ہیں وہاں سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوئے ہوتے ہیں جنہوں نے وضاحت کے ساتھ ثبوت فراہم کر دیا تمہاری بائیک کے نمبر تک معلوم ہوگئے تھے۔''

☆☆

انچارج ایس پی صاحب کو تفصیل بتاتے ہوئے ''سر دونوں صحافی خبر ڈھونڈ نہیں رہے تھے بلکہ خبر خود بنا رہے تھے بلکہ نیوز کے کردار بھی وہ خود تھے۔ ایک ساتھی موبائل سے موی بناتا دوسرا حملہ کرتا تاکہ یہ نیوز سے چینل والوں کو فروخت کر سکیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ مجرم ابھی بھی آزاد ہے۔'' ایس پی صاحب نے کہا۔

''جی جناب لیکن وہ بھی کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرے گا وہ غلطی اسے پکڑا دے گی۔''

''ان دنوں کا پرچہ کاٹ کر جیل بھیج دو۔'' ایس پی صاحب بولے۔

''اور اصل مجرم کو جلد از جلد پکڑنے کی کوشش کرو۔''

''جی جناب عالی۔''

☆☆

اگلے روز سے اچانک خواتین پر حملہ ہونے کی خبر پر جیسے بریک لگ گیا ہو، اسی طرح دو تین روز گزر گئے اس سے عوام نے خوفزدہ ہونا چھوڑ دیا اور نیوز چینل بھی ٹھنڈے پڑ گئے پولیس اور انتظامیہ نے بھی سکون کا سانس لیا۔

پولیس نے ویسے دوسرے شہر میں ہونے والے اسی طرح کے واقعہ کے ایک مجرم کو ذمہ دار ٹھہرا دیا تھا اور اس سلسلے میں بھی تحقیقات ہو رہی تھی ویسے پولیس اس کے لیے بھی تیار تھی کہ امجد اور اکرم ہی اصل مجرم ہیں اور ساری وارداتیں انہوں نے ہی کی ہیں پولیس اور حکومت عوام کو مطمئن کرنے کے لیے عدالت میں دونوں کو اصل اور ایک ہی مجرم قرار دے کر کامیابی سمیٹنا چاہتی تھی۔

☆☆

وہ تنہا کمرے میں موجود نیوز چینل پر چھری مار کے پکڑے جانے کی خبر دیکھ رہا تھا جس میں بتایا جا رہا تھا کہ پولیس اکرم اور امجد کا موقف تسلیم نہ کرتے ہوئے انہیں ہی تمام وارداتوں کا مجرم مان رہی ہے اور شہرت دولت اور اپنے پروفیشن میں غلط راستے سے بڑا مقام حاصل کرنے کے لیے انہوں نے یہ جرم کیا۔

اس نے چینل آف کیا اور سامنے میز پر موجود نوک دار چھری اٹھائی اور بولا۔

اب تمہیں بھی کچھ دن آرام کرنا ہے تاکہ ہم پکڑے نہ جا سکیں لیکن اپنا مشن نہیں بھولنا ہے ہم دونوں کو عورتوں سے سخت نفرت ہے انہیں اس طرح سے اذیتیں دینی ہے جیسے میری سوتیلی ماں مجھے چاقو کی نوک سے زخم لگاتی تھی۔'' وہ مسکرایا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

❀

فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگا رنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھولیں گی

بنت حوا

انعم خان

کالی گہری رات عمیق سناٹوں میں دبی سسکیوں کو کچل رہی تھی۔نسیمہ نے تو مسئلے کا حل وصلاح بیٹے کو دے دی تھی۔اب چپ چاپ ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے سے پوتیوں کو ڈرا دھمکا کر کمرے میں بھیج رہی تھی جو ماں کو روتا دیکھ کر گھبرائی ہوئی تھیں۔

آخری فیصلہ ہونے کو تھا۔فیصلے میں سفاکیت درکار تھی اور ایک بے بس ماں،سفاکیت سے عاری دل و دماغ لیے گود میں نومولود بیٹی کو ممتا سے بھینچے سامنے کھڑے اس شخص کو گھور رہی تھی،جو اس کا شوہر تھا،اس کی بیٹیوں کا باپ،گھر بھر کا اکیلا مرد۔

''رات کافی ہو چکی ہے۔اسے مجھے دے دو۔صبح تک اسے رکھنا ممکن نہیں ہے۔!''باپ کا ہاتھ بیٹی کی طرف بڑھا تھا۔

''نہیں۔۔۔۔یہ ظلم ہے۔۔!''بیٹی کو مزید مضبوط گرفت میں لیتے رابعہ نے احتجاج کیا تھا۔

''یہ ظلم نہیں ہے۔اس بچی کے،ہمارے مستقبل کا سوال ہے۔تم جانتی ہو یہاں اس گھر میں صرف محرومیاں ہی ہیں۔پانچ بیٹیاں پہلے سے ہیں۔اس کا بوجھ کیسے اٹھائیں گے۔!''

''یہ اپنا رزق لکھوا کر آئی ہے۔جیسے پہلے سب جی رہے ہیں،یہ بھی جی لے گی۔مگر اسے خود سے دور،اندھیرے میں نہیں پھینکوں گی۔یہ مر جائے گی۔''ماں نے صاف انکار کرنا چاہا تھا۔

''ارے میں کون سا اسے بھوکے کتوں کے سامنے پھینکنے جا رہا ہوں۔وہاں گراؤنڈ کے سامنے جھولا پڑا ہوا ہے اس میں ڈال دوں گا۔کوئی بے اولاد جوڑا یا کوئی اللہ کا نیک بندہ اسے اٹھا لے گا ورنہ این جی او والے تو ہیں ہی.....''شعیب نے بیوی کو سمجھانا چاہا تھا۔

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

شعیب کے دلائل سے اس کا دل پسیج رہا تھا۔

''ارے منحوس۔۔۔شکر ادا کر کہ شعیب اسے مار نہیں رہا ورنہ پرانے زمانے میں تو لوگ بیٹیوں کو دفنا دیتے تھے۔''نسیمہ نے لمحے بھر کو چپ کا قفل توڑا۔ہانک لگائی۔

رابعہ نے تاسف سے ساس کو دیکھا تھا۔دکھ و یاسیت کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔

اس بار ابنِ آدم نے بنتِ حوا کو زندہ دفنانے کے بجائے اس کے لیے ''جھولا''ڈھونڈ لیا تھا۔

''دیکھو رابعہ۔۔۔میری اتنی گنجائش نہیں ہے کہ روز روز کی بڑھتی مہنگائی میں ایک اور بچی کا خرچہ اٹھا سکوں۔اگر بیٹا ہوتا تو میں سختی کاٹ بھی لیتا۔اس وقت ہم حقیقت سے آنکھیں نہیں چرا سکتے۔اب بھی کئی کئی دن ہمیں فاقے کاٹنے پڑتے ہیں۔ہم سے زیادہ کوئی اور اس کی پرورش بہتر کر لے گا۔۔۔!''باپ کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''جس بچی کو پیدا ہوتے ہی بوجھ سمجھ کر ہم گھر سے،ماں سے دور کریں گے کوئی اور کیسے اسے سنبھال سکتا ہے،کوئی اور کیسے اسے محبت دے سکتا ہے؟''نو سالہ شادی شدہ زندگی میں پہلی بار رابعہ احتجاج کر رہی تھی۔

''رشتے دار کیا کہیں گے۔۔۔کیا بتائیں گے انہیں؟''اس سے پوچھ رہی تھی۔

نسیمہ کو بہو کا لہجہ و زبان زہر لگ رہا تھا۔مگر چپ تھی کہ جو صلاح اس نے بیٹے کو دی تھی اس پر عمل ہر صورت ہو کر رہے گا۔

''کہہ دوں گا کہ دوست کی جان پہچان میں ایک بے اولاد جوڑے کو بچی دے دی ہے۔۔۔چند دن ہی باتیں ہوں

گی پھر سب بھول جائیں گے۔۔۔تم اتنی دور کی نہ سوچو، بچی کو مجھے دو۔۔۔!" دوٹوک انداز میں کہتا شعیب آگے بڑھا، بیوی کی گود سے بچی کو لینے کے لیے مضبوط ہاتھ استعمال کرنے چاہے مگر اس وقت ماں کی گرفت بیٹی کے نرم وجود پر سخت و مضبوط تھی۔ اور ایک دن کی وہ معصوم کلی اپنے وجود پر سختی برداشت کرتی بلبلا کر روئے جا رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔!"

رابعہ کا دل پھٹنے کو تھا اور زبان شدت سے انکاری تھی۔

"رابعہ۔۔۔ چھوڑو بچی کو۔۔۔!" حکمیہ انداز میں شعیب چلایا۔

"نہیں۔۔۔ خدارا ہم پر رحم کرو۔۔۔ بچی کو دیکھو، کتنا رو رہی ہے، میں کیسے اس کے بنا۔ رہوں گی۔۔۔ میری ممتا۔۔۔۔!"

"بکواس بند کرو۔۔۔!" شعیب نے درشتگی سے بیوی کی بات کاٹی تھی۔ عین ممکن تھا کہ ہاتھ بھی اٹھ جاتا مگر رابعہ کی توجہ بیٹی کے رونے سے ہٹنے لگی تھی۔

"یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔۔۔ میں تم سب کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا ہوں۔ اب اور میرے صبر کا امتحان نہ لو۔۔۔ ایسے ہزاروں مائیں روزانہ اپنی ممتا اپنے گھر اور اولاد کے لیے قربان کرتی ہیں۔ تمھیں بھی اگر میرے ساتھ، پانچ بیٹیوں کو لے کر اس گھر میں رہنا ہے تو میرا حکم ماننا ہوگا ورنہ چلی جاؤ سب کو لے کر۔۔۔ خود خرچہ اٹھاؤ سب کا۔۔۔ پہلی پانچ میں سے ایک بھی بیٹا ہوتا تو اسے رکھ لیتا۔۔۔ مگر تمھارے نصیب میں بیٹا ہے ہی نہیں۔۔۔ میری زندگی عذاب کر دی ہے۔ سارا دن مغز ماری کرتا ہوں۔۔۔ گرمی میں کام کرتا ہوں۔۔۔ مگر تمھیں کوئی احساس نہیں۔۔۔ کوئی فکر نہیں۔۔۔ آخری بار کہہ رہا ہوں۔۔۔ مجھے دو اسے۔۔۔ ورنہ ہاتھ میں طلاق کا کاغذ لو اور جاؤ سنبھالو سب کو۔۔۔ میرا کیا ہے میں دوسری شادی کر لوں گا۔۔۔!"

شعیب کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا تھا۔

طلاق کی دھمکی سمیت سو باتیں مزید سنائیں۔

رابعہ نے دھمکی پر۔۔۔ بے بسی سے گرفت ڈھیلی چھوڑی تھی۔ شعیب نے اس کی دکھتی رگ پر ایک بار پھر ہاتھ رکھا تھا۔ طلاق کی دھمکی ہر بار کی طرح اس بار بھی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ وہ مجبور تھی۔ مجبوری بھی جاتی۔۔۔ میکے کے نام پر غربت کا شکار ایک کرائے کا گھر اور بیمار لاغر ماں تھی۔ جو چند لوگوں کی ہمدردی کے سہارے زندہ تھی۔ پانچ بچیوں کو وہ کیسے سنبھالتی۔۔۔

نہ پاس کوئی ہنر تھا، نہ تعلیم۔۔۔ کم عمری میں شادی، پھر بیٹیوں کی لائن، رشتے دار بھی مدد سے ہر بار انکاری ہوتے۔۔۔

"اگر پال نہیں سکتے، سنبھال نہیں سکتے تو بچے پیدا ہی کیوں کرتے ہو۔۔۔ بیٹے کے چکر و لالچ میں بیٹیوں کی لائن لگانا فرض سمجھا ہوا ہے۔" سب حقارت سے کہتے۔ کئی کئی دن بھوک برداشت کرتے مگر کسی سے کچھ نہ مانگتے، نہ کبھی کوئی انہیں خود سے کچھ دیتا۔ حقیقت جھٹلانے لائق نہ تھی۔

اب سوائے شوہر کے حکم ماننے کے اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ شعیب نے بیٹی کو بے رحمی سے اس کی گود سے اٹھالیا۔

رابعہ اسے پیار کرنا چاہتی تھی۔ اسے سینے سے لگانا چاہتی تھی۔ اس کے لمس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محسوس کرنا چاہتی تھی۔ وہ رو رہی تھی اسے چپ کروانا چاہتی تھی۔ اس پر اپنی ممتا نچھاور کرنا چاہتی تھی۔ مگر اسے شعیب نے موقع نہیں دیا تھا۔ وہ بے حس بنا اسے بے بس چھوڑ کر بیٹی کو لیے داخلی دروازہ عبور کر چکا تھا۔

اپنی خالی گود کو بے بسی سے گھورتی، رابعہ کی سسکیوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اتنا دکھ تو اسے پہلی پانچ بیٹیوں کی پیدائش پر ساس اور شوہر کی باتیں، طعنے سننے پر نہیں ہوا تھا جتنا آج بیٹی کی جدائی پر ہوا تھا۔

"ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔۔۔؟" سسکیوں کے درمیان وہ بے بس رندھی آواز میں تاسف سے بولی تھی۔ جانتی تھی کچھ دنوں بعد پھر سے اسے اگلی آزمائش کے لیے جسم و جان کو پیش کرنے کا فیصلہ سنایا جائے گا۔

پھر سے نو مہینے تک طعنوں کی خوراک کھانی ہو گی۔ شوہر و ساس کی امید و خوشیوں کے بھر آنے کے لیے دن رات دعا کرنی ہو گی۔

مگر حقیقتاً اس بار وہ اس ستم ظریفی پر مات کھا گئی تھی۔

البتہ آواز پر دوسری چارپائی پر بیٹھی نسیمہ نے بہو کو دیکھتے ہوئے تنفر سے ایک بار پر دوٹوک جواب دیا تھا۔

"جب تک بیٹا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔!!!"

......❀☆❀......

نالے

صوفیہ کاشف

وہ انیس بیس سال کی کچی کلی تھی اور میں عمر کی دہائیاں عبور کرتا چالیسویں سال کے آخری پیٹے میں جا پہنچا تھا مگر جوانی دل کی ہر رگ میں براجمان تھی۔ بچے جوان تھے اور بیوی بوڑھی۔ بالوں کے رنگ، مہنگے کپڑوں کی کریز، بے سلوٹ، جوتوں کی چمک سے اور لمبی بڑی کار کی امارت نے عمر کا حساب چھپا دیا تھا۔ ساٹھ ستر جوانوں کے سامنے سٹیج پر کھڑا لمبے لمبے لیکچر دیتا، طلبا اور طالبات کو گہری نظروں سے ٹٹولتا میں خود کو مہاراجہ سمجھتا۔ میں جیسے اپنی ذات میں وجاہت کا خدا تھا، شرافت کا امین تھا اور خوابوں کی دنیا کا سب سے زیادہ چاہا جانے والا دیوتا تھا۔ یہ کل کے لونڈے جنکو داڑھی ڈھنگ سے نہ تراشنی آئے، پینٹ کی کریز، شرٹ کی جدید ترین تراش خراش سے ناواقف، جیبوں میں چند سو یا ہزار کے نوٹ ڈالے کیمپس میں بھنورے بنے پھرتے مگر میری قابلیت اور ہنر، میری مہارتیں اور انداز ان کی جوانی کے چمکتے سکے کو پچھاڑ دیتیں۔ میں اپنے شعبہ میں دیومالائی ذات اور انداز کا اک واحد کرشمہ تھا۔

اور وہ پری سی، پھولوں کی شبنم سے دھلی، تتلی کے پروں سے نازک، سہانے خواب جیسی مدہوش کرنے والی لڑکی، جو میرے لیکچر بہت دھیان سے سنتی، کبھی لکھتی، کبھی رکتی کبھی پینسل اپنے گال پر رکھتی، نقطے سے حرف اور حروف سے جملے بناتی میری طرف تکتی، نجانے میرے درس سے کچھ اخذ کرتی یا میرے نقوش میں شہزادہ گلفام ڈھونڈتی۔ کلاس جیسے اک ویرانہ ہو جاتی جس میں کھلی وہ واحد سرخ کلی تھی۔ باہر جیسے ابر آلودگی کی دھند تھی۔ پوری کائنات میں بس اک وہ اور اک میں رہ جاتا۔ اس کی پرسکون ٹھہری پلکوں پر بے نیازی تھی اور میرے پاس اس بے نیازی کے سب مرہم تھے۔ اس کے شہد سے گالوں اور سمندر سی آنکھوں میں دوشیزگی تھی اور میرے پاس فتوحات کے سب ہنر تھے۔ بس کچھ ہی دنوں کی بات تھی۔ اس کی کتابیں اور میرے لیکچر سب اسی کلاس میں دھرے تھے جب میں نے کڑکتی قمیص پہنی، مسحور کن خوشبو لگائی، بالوں پر نیا رنگ لگایا جیب میں اس کی ملکیت کا دو صفحی کاغذ ڈالے اس کا ہاتھ تھامے دھنک رنگ دنیاؤں کی سیر کو نکلا۔ یہ دو صفحی ورق اپنے اوپر کچھ شہادتیں لیے میرے حقوق کی دستاویز تھے جس پر سب شہادتیں میرے ہی رفقا کی تھیں۔ بیوی کو خبر دی کہ دفتری کام ہے، جانا بہت ضروری ہے۔ جلد ہی لوٹ آؤں گا۔ گاڑی میں "میرے

رشکِ قمر" چلائے دھند بھری زمینوں سے میں سبزہ بھری وادیوں کی طرف اُسے لیے نکلا۔ وہ کانچ کی گڑیا تھی جو ہاتھ لگنے سے ٹوٹ جاتی۔ چمکتے سورج سے دور رہنے والی، محفوظ غاروں کی پیداوار جو بھڑ کیلے سورج کی حدتیں پہچان نہ پاتی تھیں۔ میرے الفاظ میں کالے جادو کے سب کرشمے تھے اور اس کے کانوں میں توجہ تھی۔ میرے تاثرات میں ہنر تھا اور اس کی نورسی نظروں میں معصوم قبولیت۔ وعدوں اور وعید کے نرغوں میں لپٹا اک لمبا سفر تھا اور میری مٹھی میں بند اس کے نرم ہاتھ کا لمس تھا۔ میرے سنگ بیٹھی وہ ذرا ذرا سا ڈرتی، خوفزدہ ہوتی، کبھی ہونٹ چباتی، کبھی پلکوں کو جھپکتی۔ اپنے رشتے اور بندھن توڑ کر وہ میرے ساتھ نکلی تھی تو اب ہر منزل پہ ڈرتی تھی۔ میں اس کا دل بڑھانے کی خاطر کبھی کوئی شگوفہ چھوڑتا، کسی بات پر چھیڑتا تو وہ نمی زدہ سی آنکھوں میں اداس سا مسکراتی۔ اس کی مسکراہٹ کے کناروں پر جیسے کوئی ان کہا دکھ جھانکنے لگتا۔ کبھی کبھی دھند اس قدر ثقیل ہونے لگتی کہ راستہ اس کی سفیدی میں گم ہونے لگتا اور میرے ہاتھ کانپنے لگتے۔ مگر وہ نجانے کہاں تھی۔ میرے ساتھ ہو کر بھی جیسے کہیں کسی سوچ میں گم تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے موبائل کی مدہم سی بیپ بجی، وہ کانوں سے لگاتی اور لہجہ کو سنبھال کر کہتی۔

"جی! ہاسٹل پہنچ گئی ہوں۔" پھر ہونٹ چبانے لگتی، خلاؤں سے باتیں کرنے لگتی۔ اس کے چہرے پر جیسے گھٹائیں جھومنے لگتیں، پلکوں پہ برف پڑنے لگتی۔ یوں لگتا جیسے کچھ پچھتاوے اس کے وجود سے لپٹے ہیں، کوئی احساس جرم کچھ خوف اس کا ہاتھ دبوچے بیٹھا ہے۔ میرے چہرے پر اسے پا لینے کی مسرت تھی۔ آنے والے رنگین وقت کی سرخ حرارت تھی۔ میرے پاس برف پگھلانے کی طاقت تھی اور گھٹاؤں کو پھونک مار کر اڑانے کا ہنر آتا تھا۔ اک الاؤ میری طرف جلتا تھا اور اک بھاپ اڑاتی برف اس کے چہرے پر گرتی تھی۔ لمبے طویل اور مشکل راستوں پہ میں اس کا ہاتھ تھامے رنگیں کہکشاؤں کی طرف لیے جاتا تھا اس قیامت خیز احساس کے ساتھ کہ یہ نور کا اجالا، صبح کی تازگی، پھول کی شبنم اور خوابناک دوشیزہ اب میری تھی۔

چند روز میں اک واپسی کا سفر درپیش تھا۔ اس کی آنکھوں میں جادو بولتا، چہرے پر لگاوٹ اترتا اور وہ خود کو میرے قریب قریب رکھتی۔ میرے بازو تھامے کاندھے پہ سر دھرتی۔ اس کے وجود کے سب تالے کھل چکے تھے اور وہ اپنی وسعتوں سمیت میری ہو چکی تھی۔ میں کھڑکی سے باہر تکتا، ٹریفک کو کوستا، موسیقی کو دھیما رکھتا، گاڑیوں کے ہجوم میں سے جلد نکلنے کی سعی کرتا۔ چمکتا سورج کی مانند اب تھک ڈھل چکا تھا دن اب سکون کا متلاشی تھا۔ ہر طرف کالے اور گورے کا عکس تھا پھولوں کا رنگ دِکھتا نہ کلیوں کی خوشبو دل کھینچتی۔ جنت بریں سے ہو آیا تھا اب زمیں کی طرف لوٹنے کی جلدی تھی۔ گھر میں جواں بیٹی کی شادی اور بیٹے کے ایڈمیشن کے سو بکھیڑے تھے اور میری بوڑھی بیوی جوڑوں کی ماری میری راہ تکتی تھی۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر وہ بیٹھی سرخ چہرہ لیے کبھی میرے بازو سے لپٹتی کبھی ہاتھ پکڑتی۔ اس کی نظروں سے میرے لیے پیار اُمڈتا۔ وہ اک کچی عمر کا پھول تھی اور مہارتوں اور ہنر سے نابلد تھی۔ برف پگھلانا ہر کسی کے بس کا روگ کہاں ہوتا ہے۔ صحرا کو سمندر دکھانا، کھنڈرات پر محل بنانا اور سمندر پہ پل تعمیر کر دینا کچی عمر کے لوگوں کے کام کہاں اس کے گالوں پر گئے دنوں کی سرخی تھی اور میری پلکوں پہ آتی رتوں کی برف جمی تھی۔ اس کو ہاسٹل کے سامنے اتار کر مجھے اپنی دنیا کی طرف لوٹنے کی جلدی تھی۔

دنیا بہت ظالم ہے جینے کہاں دیتی ہے۔ فیصلے، عزتیں اور خاندان بیچ میں ٹپک ہی پڑتے ہیں۔ کچھ لوگ میرے بھی پیچھے ہوئے تھے اور میرے ہاتھوں میں اک قلم تھا۔ میری بیٹھک میں کچھ وکیل کاغذات لیے بیٹھے تھے اور مجھے فون پر وہ بار بار کہتی۔

"نہیں! پلیز نہیں۔" میں اسے ایک دلاسہ دیتا اور دوسرا سامنے بیٹھے لوگوں کو شہر کے اک بڑے شادی ہال میں میری

بیٹی کی شادی تھی اور مجھے نکلنے کی جلدی تھی۔ کاغذ پر نشانی ثبت کر کے میں نے کام نبیڑ دیا تھا۔

……❀☆❀……

انتظار اور سہی

عفرا بنت گلزار

آج تین سال بعد جب میں اپنی گریجویشن کی ڈگری مکمل کر کے خوشی خوشی اپنے گاؤں واپس آ رہی تھی تو حاجی غلام محمد کے گھر سے گزر ہوا۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ گاؤں کے لوگ جوق در جوق اُن کے گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔ میرا ذہن تذبذب کا شکار ہونے لگا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

''کیا اِن کے یہاں کوئی مر گیا ہے؟ شاید سلمٰہ کے والدین میں سے کوئی مرا ہوگا۔'' میرے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا۔ میں نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ جونہی پیچھے مڑ کر دیکھا تو میری دوست افشاں کھڑی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اُس نے میرا تذبذب دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں مرا کوئی نہیں ہے۔۔۔ آج تو اِس گھر کے لئے خوشی کا دن ہے۔۔۔ آج اِن کو اپنی منزل مل گئی۔۔۔'' خوش گوار حیرت میں مبتلا میرا ذہن اِس گھر کے ساتھ خوشی کا رشتہ قائم کرنے والے تمام اِمکانات کا اندازہ کرنے لگا۔

''خوشی! کون سی خوشی؟۔۔۔ اِس گھر کا اور خوشی کا تو دور دور تک کوئی رشتہ ہی نہیں۔۔۔ سلمٰہ کی شادی؟۔۔۔ یا اُن کا گمشدہ بیٹا اُنہیں مل گیا؟۔۔۔''

افشاں مسکرائی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اُن کے گھر کے اندر لے جاتے ہوئے کہنے لگی ''پاگلوں کی شادیاں نہیں ہوتیں۔۔۔ تمہارا دوسرا اندازہ صحیح ہے۔'' اِتنی ہی دیر میں قہوے کی ہلکی ہلکی خوشبو آنے لگی اور میرا دل کھل اُٹھا۔ میں نے قیاس کر لیا کہ شاہد کے مل جانے کی خوشی میں مہمانوں کی تواضع قہوہ سے کی جا رہی ہیں۔

ہم دونوں کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ سامنے شاہد کی ماں خدیجہ پیالے میں قہوہ ڈالتی ہوئی نظر آئی۔ حاجی غلام محمد کے چہرے پر آج خوشی سے زیادہ اطمنان کے آثار نمودار تھے۔ آج میں نے زندگی میں پہلی بار اُنہیں اِس قدر اطمینان و سکون سے لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ اِس چھوٹے سے کمرہ میں بیٹھے ہجوم میں میری نظریں اُس شخص کو ڈھونڈ رہی تھی جس کے باعث اُس گھر میں سالوں بعد رونق لوٹ آئی تھی۔ میں کمرے میں بیٹھے لوگوں کے چہروں کا جائزہ لینے لگی۔ وہاں پر بیٹھے ہر شخص کو میں جانتی تھی تو افشاں سے دریافت کرنے لگی ''اِن کا بیٹا کہاں ہے؟''

اِس سے پہلے کہ افشاں میرے سوال کا جواب دیتی خدیجہ باجی مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

''بیٹی! تم ڈاکٹر صاحب کی بیٹی ہونا۔۔۔ ارے ہاں افشاں بیٹی نے کہا تھا کہ تم آج شہر سے واپس آ رہی ہو۔۔۔ آؤ اندر آؤ۔۔۔ قہوہ پیو۔۔۔ آج ہمارا دہائیوں پر محیط کرب اختتام پذیر ہوا۔۔۔ آج یہاں بڑی خوشی کا دن ہے۔۔۔'' اتنے میں ہی دوسرے کمرے سے کسی لڑکی کے رونے کی آوازیں آنے لگی۔ یقیناً وہ سلمٰہ تھی۔ خدیجہ باجی دوڑ کر اُس کمرے میں جاتے ہوئے کہنے لگی۔

''یہ سلمٰہ کی گائے بابرہ مر گئی ہے۔۔۔ اِس لئے اِتنا چیخ رہی ہے۔'' یہ جان کر بہت عجیب لگا کہ اب جب شاہد کی واپسی ہوئی ہے تو اُسی وقت اُس کی پسندیدہ گائے بھی فوت ہو گئی۔

غلام محمد ہمارے گاؤں میں صبر و استقامت کی مثال مانے جاتے ہیں۔ مسلسل بیس سال سے اپنے بیٹے شاہد کی تلاش

میں دیوانوں کی مانند کبھی اِک کیمپ اور کبھی اُس تھانے جاتا رہا کہ کہیں سے تو شاہد کا کوئی سراغ مل جائے۔شاہد کی تلاش نے اگرچہ اُن کے جسم کو لاغر ونحیف کر دیا، دل اور گردوں کے مرض کے سامنے اُنہوں نے ہار مان لی لیکن اپنے اکلوتے بیٹے کی واپسی کی اُمید کو کبھی نہ ٹوٹنے دیا۔تب شاہد اٹھارہ سال کا شوخ مزاج اور شرارتی لڑکا تھا جب کریک ڈاون کے دوران ہزاروں لوگوں کے مجمعے میں جیپ میں بیٹھے مخبر کے اشارے پر گرفتار کر لیا گیا۔بابا کا کہنا تھا کہ اُنہوں نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔اُسی دن شاہد کا نام گاؤں کے اُن گمشدہ افراد کی فہرست میں شامل ہو گیا جنہیں اب بھی اُن کے والدین یاد کرتے ہیں، اپنی بدنصیبی پر دو چار آنسو بہاتے ہیں اور پھر ماضی کی اُن کڑوی یادوں کو فراموش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔شاہد اُن افراد سے بالکل مختلف نہ تھا البتہ اُسے خاص بنانے والے اُس کے والدین تھے جو اُسے پانے کی جستجو میں آج تک لگے ہوئے تھے۔چنانچہ اُس کی والدہ خدیجہ کا یہ جملہ ہمارے گاؤں میں زبان زدِ عام ہے۔

''ہماری امید تب تک جاری وساری رہتی ہے جب تک ہمیں ہمارے رب کی ذات پر اعتماد ہے۔۔۔ہم جستجو کی ہر حد پار کر کے دیکھیں گے۔۔۔ہمارا بیٹا ہمیں کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی دن ضرور ملے گا۔''

ہمارے گاؤں میں بعض لوگ اِس جملے کا سہارا اُس وقت لیتے ہے جب اُنہیں کسی کو اُمید سے کام لینے کی تلقین کرنی ہو اور بعض لوگ خدیجہ کے اِس جملے اور اِس گھرانے کی ثابت قدمی کو محض حماقت سمجھ کر قہقہے لگاتے تھے البتہ اُس ستم زدہ گھرانے پر یہ بات ظاہر کر کے اُن سے جینے کی آخری اُمید چھیننا نہیں چاہتے تھے۔

شاہد کی اکلوتی بہن سلمٰہ کے متعلق میں نے بابا سے سُنا ہے کہ اپنے بھائی کی اچانک گمشدگی کی خبر اُس کے معصوم سے ذہن پر اِس طرح مسلط ہوئی کہ اُس کا دماغی توازن برقرار نہ رہ سکا۔آج سے تین سال پہلے جب میں گریجویشن کے لئے شہر جانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی تو بازار میں اُس بدنصیب بہن سے ملنے کا اتفاق ہوا۔اُس کی والدہ بھی اُس کے ساتھ ہی تھی اور وہ بار بار بے حد معصومیت کے ساتھ اپنی والدہ سے کہہ رہی تھی۔

''اماں! بابرہ ٹھیک ہو جائے گی نا۔۔۔اگر اُسے کچھ ہو گیا تو بھائی مجھ سے بہت ناراض ہوں گے۔''

جب میں نے اپنی دوست افشاں سے پوچھا کہ یہ کس بابرہ کا ذکر کر رہی ہے تو کہنے لگی۔

''بے چاری پاگل ہے۔۔۔پاگلوں کی باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔۔۔'' میرے اصرار کرنے پر اُس نے مجھے بتایا کہ وہ دن رات اپنی گائے کے ساتھ مست رہتی ہے جو اُس کے گمشدہ بھائی کو بے حد عزیز تھی اور اُسی نے اُس کا نام بابرہ رکھا تھا۔

میری والدہ کا کہنا ہے کہ غلام محمد کو میرے والد صاحب جو کہ پیشہ سے ایک ڈاکٹر ہے، اکثر سمجھانے کی کوشش کرتے تھے کہ وہ اِس طرح کی جستجو کو مقصدِ زندگی بنانا چھوڑ دے اور محنت ومشقت کم کر کے اپنی عمر کا پاس کریں لیکن اُس کے نزدیک ایسی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔

آج تین سال بعد اُس گھر کو دیکھا تھا جہاں بیس سالوں میں پہلی دفعہ خوشی نے دروازے پر دستک دی تھی۔آخر کار میں افشاں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر اُسے گھر سے باہر لے آئی اور اُس سے پوچھنے لگی۔

''آخر معاملہ کیا ہے۔۔۔اِن کا بیٹا کہاں ہے؟۔۔۔وہ اِس کمرے میں کیوں نہیں بیٹھا ہے؟''

''اُس کی قبر ملی ہے۔۔۔وہ نہیں۔۔۔اور گاؤں کے لوگ اُنہیں اُن کے حوصلے اور فلاحی کی مبارک بادی دینے آرہے ہے۔'' افشاں کے جواب نے میرے ہوش اڑا دیے۔مجھے اُن کی زندگی کے بیس سالہ سفرِ انتظار پر ترس آنے لگا جس نے اُن کو اِس حادثے کے موقعے پر ماتم کرنے کے بجائے جشن منانے کی وجہ دی۔

ہم دونوں واپس گھر کے اندر چلی آئیں اور خدیجہ قہوہ ہمارے سامنے رکھ کر باقی عورتوں سے گفتگو کرنے لگی۔

''بہن! آج میرے لئے بہت بڑی خوشی کا دن ہے۔۔۔اب افسوس صرف اِس بات کا ہے کہ میرے بیٹے کے ساتھ جو دوسرا فرد قبر میں دفن پایا گیا ہے، اُس کے والدین بھی پاگلوں کی طرح اُس کا کہیں نہ کہیں انتظار کر رہے ہونگے۔۔۔اور یہ تمنا کر رہے ہونگے کہ اے کاش! ہمیں ہمارے بیٹے کی لاش ہی مل جائے۔''

......❀☆❀......

جاچ

شمسہ نجم

میں کتھے جاواں باجی (میں کہاں جاؤں باجی)

ہائے ہائے باجی میری دھی دے نال ظلم ہوگیا اے (میری بیٹی کے ساتھ ظلم ہوگیا ہے)۔

شادو کی ماں حسب معمول ہائے ہائے کرتی گھر میں داخل ہوئی۔ سر سے سفید شٹل کاک برقع اتار کر صحن میں بچھے پلنگ کی پائنتی پر رکھا، پھر سلیپر صحن کی دیوار کے پاس اتارے اور وہیں چپلوں کے پاس زمین پر بیٹھ کر اپنا سر پکڑ کر با آواز بلند رونے لگی۔ اس کے رونے سے میں بھی ایک دم گھبرا گئی۔ میں نے فوراً ہی شاہ جی یعنی اپنے شوہرِ نامدار کے کپڑے تہہ کرنا بند کیے اور اس سے پوچھا: ''کیا ہوا شادو کی ماں؟''

''باجی کیا بتاؤں آج پھر اس کم بخت نے میری بچی کو بہت مارا۔ سارے پنڈے (بدن) پہ نیل ڈال دیئے۔ باجی اسے تیز بخار ہو گیا ہے، بستر میں پڑی ہے میری شادو۔ ہائے ہائے رب کرے نعیم تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں''۔ اس نے اپنے داماد کو کوسنے دینا شروع کر دیئے۔ شادو کی مار کا سن کر میرا دل بھی بُرا ہوا۔ مجھے شادو سے کافی انسیت ہو گئی تھی۔

میں ڈپٹی انسپکٹرس آف اسکولز تھی۔ میرے شوہر سیٹلمینٹ کمشنر تھے ان کا زمینداره بھی تھا زمینوں سے آمدن بھی اچھی تھی۔ میں شادی سے پہلے بھی نوکری کرتی تھی اس لیے شادی کے بعد بھی میں نے اس کو جاری رکھا۔ میرے شوہر شخصی آزادی کے قائل تھے۔ روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ نوکری کی ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے میرے نوکری کے شوق میں کبھی خلل نہیں ڈالا۔ یوں بھی میری سالوں کی محنت رنگ لائی تھی۔

میں ضلع جھنگ کی ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر تھی۔ استانیوں اور ہیڈ ماسٹرنیوں یعنی ہیڈ مسٹریس کی تعیناتی و تبادلے اور اسکولوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے اسکولوں کا اچانک معائنہ کرنا میرے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ میری نوکری میں اک نشہ تھا بادشاہی کا۔ لیکن اس کے کچھ غیر مثبت نتائج بھی تھے۔ گھر میں ہر وقت استانیوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ میرے شوہر اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھے رہتے۔ کبھی نظر بھر کے کسی عورت کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ میرے آئے دن کے اسکولوں کے دوروں کے باوجود میرے اوپر کبھی روک ٹوک نہیں کرتے تھے۔ ان کے اعتبار نے مجھے بہت باہمت اور مضبوط بنا دیا تھا۔ حالانکہ خود ان کا دراز قد تھا بڑی بڑی آنکھیں، براؤن اور سبز دو رنگ آنکھوں میں جھلکتے تھے، سنہرے بال، بڑا روشن ماتھا، میرا رنگ بھی صاف ہے ان کا رنگ مجھ سے بھی صاف تھا۔ گھر میں زیادہ تر کرتا شلوار پہننا پسند کرتے اور اس میں اور بھی شاندار لگتے۔ لیکن ہمیشہ میری تعریف ہی کرتے۔ میری آنکھوں کو چشم آہو پکارتے۔ میرے لمبے قد، پتلی کمر اور لمبے سیاہ بالوں سے جیسے انہیں عشق تھا۔ اکثر مجھ سے بال کھلے رکھنے کو کہتے انہیں سونگھا کرتے میری کمر کے گرد بازو حمائل کر کے مجھے میری گڑیا کہہ کر بلاتے۔ میں خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ انہی کی محبتوں کا اثر تھا۔ دنیا پہ اعتبار آنے لگا تھا۔ ہمارے گھر کا آنگن کافی بڑا تھا۔ آنگن میں بوگن ویلیا کی بیل کے پاس کبوتر

دانہ چگنے آجاتے تھے۔ جب بھی میں گھر میں ہوتی باقاعدگی سے ان کو دانہ ڈالتی۔ ان پرندوں سے مجھے الفت سی ہو گئی تھی۔ وہ بھی مجھے پہچاننے لگے تھے۔ میرے پاس جانے پر بھی اُڑتے نہ تھے، دانہ چگتے رہتے تھے۔ محبت ہر چیز پہ اعتبار کرنا سکھا دیتی ہے۔ اعتبار کے پرندے محبت کی زبان سمجھتے اور اس کی خوشبو کو محسوس کرتے ہیں۔ اور محبت کی خوشبو کے دائرے میں مقید رہتے ہیں۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک نہیں تو دوسرا بھی نہیں۔

کبھی کبھی بہت دور دراز کے گاؤں کا دورہ ہوتا۔ لیکن میرے اندر کے اعتماد نے مجھے کبھی ڈرنے یا متزلزل ہونے نہیں دیا۔ ایک اچھا جیون ساتھی انسان کے حوصلے بلند کر دیتا ہے۔ احمد پور سیال جھنگ کے ایک گاؤں کا نام تھا۔ اب تو احمد پور سیال جھنگ کی ایک تحصیل بن چکا ہے۔ لیکن ان دنوں ضلع جھنگ کی تین تحصیلیں تھیں۔ چنیوٹ، شورکوٹ اور جھنگ۔ اور احمد پور سیال شورکوٹ تحصیل کا ایک گاؤں تھا۔ جو جھنگ سے پچانوے کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ وہاں کے مڈل اسکول کو چیک کرنا میرے شیڈول میں شامل تھا۔

احمد پور سیال میں پہلی بار میں نے شادو کی ماں کو دیکھا تھا۔ وہ بھاگ بھاگ کر میرے کام کر رہی تھی۔ اس وقت تو معائنہ یعنی انسپکشن کے لیے آئے افسر کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ ہیڈ مسٹریس اور ساری استانیاں بھاگ بھاگ کر سارے کام کر رہی ہوتی ہیں۔ آگے پیچھے کام چوری کرنے والے اس وقت اتنے سلیقے سے کام کرنے والے بن جاتے ہیں اور اتنا مثبت رویہ اپنائے ہوئے ہوتے ہیں کہ بے اختیار ان پر ترس اور پیار آجائے۔

حتیٰ کہ علاقے کے زمیندار اور وڈیرے اپنے اسکول کو قائم رکھنے کے لیے اور علاقے کی عزت و شہرت اور نیک نامی برقرار رکھنے کے لیے انسپکٹر اور انسپکٹریس کو اپنے گھر بلاتے ہیں۔ کھانے اور لسی پانی سے تواضع کرتے ہیں۔ جب میں اسکول کا چکر لگا کر اس کی مکانیت کی درستگی اور نادرستی اور ماحول کا جائزہ لے رہی تھی تو شادو کی ماں ستاں ایک دم میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے پوچھا۔

''کیا بات ہے''

''باجی میرا تبادلہ شہر جھنگ میں کردیں کیونکہ میرا مکان جھنگ میں ہے اور میری بیٹی کو بھی اسکول میں نوکری دلا دیں۔ میرا خاوند فوت ہو گیا ہے باجی۔ ہمارا گزارا نہیں ہوتا۔ مجھے اپنی بیٹی کی شادی کرنا ہے۔ جہیز تو ہے نہیں۔ نوکری ہوگی تو چار پیسے آئیں گے تو اس کی شادی کی کوئی صورت نکلے گی۔ میری بیٹی زیادہ پڑھی ہوئی نہیں ہے کسی اسکول میں چپڑاسن کی نوکری دلوا دیں۔'' ستاں نے دل کھول کر رکھ دیا۔

میں نے اس کو تسلی دی اور اس کو ہاتھ جوڑنے سے منع کیا اور اسے کہا۔

اپنی بیٹی کو لے کر کل میرے دفتر آجانا۔ اگلے دن ہی دونوں ماں بیٹی میرے دفتر میں آموجود ہوئیں۔ شادو کی نوکری کا آرڈر جاری کر کے میں نے کلرک کو نقل بنا کر لانے کو کہا۔ ستاں کے ٹرانسفر آرڈر اور شادو کی نوکری کا پروانہ یعنی اپائنٹمنٹ لیٹر خود شادو کی ماں کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کلرک کے ہاتھ سے دلواتو پھر ان غریبوں کو کلرکوں کی جیبیں بھرنا پڑتی ہیں۔ یہ الگ کہانی ہے جو کہ افسر کی بدنامی اور غریب کی ناشنوائی پر ختم ہوتی ہے جو کہ تقریباً ہر محکمے کا خاصہ ہے۔ اور ہمارے ملک کا نظام بدلنا آسان کام نہیں۔

میں یہ نہیں کہتی افسر فرشتے ہوتے ہیں۔ ایک سے ایک حرام کھانے والے اور رشوت خور دنیا میں ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک افسر کو بُرا بنانے میں اس کے حالی موالیوں اور خوشامدیوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ شادو کی نوکری ہونے کے بعد شادو اور اس کی ماں نے ہر چھٹی کے دن میرے گھر آکے میرے گھر کے چھوٹے موٹے کام کرنا شروع کر دیئے۔ میں منع بھی کرتی لیکن وہ باز نہ آتیں۔ ان کا احسان مندی اور شکر گزاری کے اظہار کا یہی طریقہ تھا۔ میری والدہ،

میرے دونوں بچے نوال اور دانیال اور میرے شوہران کے آنے سے اتنے خوش نظر نہیں آتے تھے۔ کیونکہ شادو کا حلیہ عجیب تھا۔ الجھے ہوئے بال اور نہانے کی چور تھی۔ جب بھی پاس سے گزرتی عجیب طرح کی مچھلی کی سی بو اس میں سے آتی۔ میں بچوں کو منہ بناتے دیکھ کر ہمیشہ اس سے کہتی۔
''شادو نہا تو لیا کرو''
''اور وہ'' جی اچھا باجی آج گھر جا کے نہاؤں گی۔'' کہہ کر کام میں لگ جاتی یا اپنے گھر کی راہ لیتی۔
شادو کی نوکری کو دو مہینے ہی ہوئے تھے کہ اس کی شادی طے پا گئی۔ شادو کی ماں سے میں نے پوچھا بھی کہ ''تمہاری بیٹی کو لڑکا پسند بھی ہے یا نہیں''۔ شادو کی ماں جھٹ سے اس لڑکے کی خوبیاں گنواتے ہوئے بولی: ''باجی اُسے کیوں نہیں پسند آئے گا۔ وہ ماسٹر ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ شادو سے صرف چار سال بڑا ہے۔ بہت سوہنا منڈا ہے باجی۔۔۔۔۔۔ ہماری برادری میں ایک بھی اس جیسا لڑکا نہیں ہے''۔
شادو کی شادی پکی ہو گئی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ شادو نے نوکری کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ شادی کے اخراجات میں میں نے حتی المقدور مدد کی۔ لیکن شادی کیا ہوئی ایک شکایتوں کا دفتر کھل گیا۔ ہر روز کے جھگڑے۔ شادو کی ماں ہر دوسرے تیسرے دن شادو کی تکلیف کا رونا شروع کر دیتی۔ میرے شوہر بہت نیک طبیعت اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ انہوں نے مجھے کبھی بھی فلاحی کاموں سے منع نہیں کیا لیکن وہ شادو کی ماں کے روزانہ واویلا کرنے کی وجہ سے تنگ ہوتے تھے۔
مجھے شادو کی ماں سے ہمدردی محسوس ہوتی۔ اس بار شادو ماں کے گھر آئی تو مجھ سے بھی ملنے آئی۔ جبھی ہلکی ہلکی بارش شروع ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے برآمدے میں آنے کے لیے کہا کہ کہیں زیادہ بھیگ نہ جائے۔ میں نے دیکھا وہ بہت اداس تھی۔ اُترا ہوا چہرہ اور پہلے سے بھی زیادہ برا حلیہ۔
میں نے اس سے پوچھا'' یہ سب کیا قصہ ہے'' کیونکہ میں اسے جانتی ہوں نہ وہ جھگڑالو ہے نہ بدتمیز۔ بلکہ بیوقوفی کی حد تک سیدھی تھی۔ ذرا باتیں زیادہ کرتی تھی۔ بس بولے چلی جاتی۔ بات چھپانا یا لگی لپٹی رکھنا اُسے آتا ہی نہ تھا۔ اس نے مجھے بتایا'' اس کا شوہر نعیم ایک بیوہ جو کہ پانچ بچوں کی ماں ہے، کے عشق میں مبتلا ہے۔ وہ عورت بہت بن سنور کے رہتی ہے۔ نعیم کہتا ہے عورت ایسی ہوتی ہے خوشبو میں مہکی ہوئی صاف ستھری اور اسے پیار کرنا بھی آتا ہے''۔ اس نے یہ بھی بتایا'' وہ کہتا ہے تم میں سے بدبو آتی ہے''۔ میں نے شادو سے کہا'' میں تمہیں پہلے ہی کہتی تھی روزانہ نہایا کرو۔ دیکھا اب تمہیں اندازہ ہوا کہ نہ نہانے سے جسم سے بدبو آتی ہے''۔ اُسے میں نے اپنے کپڑے دیئے اور صابن اور شمپو دے دیا اور کہا'' جاؤ نہا کے آؤ''۔
اور اسے سمجھایا'' صابن جسم کے ہر حصے پہ لگانا۔ بغلوں کو اچھی طرح صاف کرنا''۔ وہ کپڑے لے کر ملازمین کے لیے مخصوص غسل خانے کی طرف گئی پھر جاتے جاتے پلٹ آئی'' باجی بال صفا پاؤڈر تو دے دیں۔
''یہ کیسا پاؤڈر ہوتا ہے۔ میرے پاس تو ایسا کوئی پاؤڈر نہیں ہے''۔
''باجی جسم کے فالتو بال صاف کرنے کے لیے ہوتا ہے''۔
''کیا سیفٹی سے بال صاف کرنا آتے ہیں؟''۔
''نہیں باجی ـــــ کٹ لگ جائے گا''۔ اس نے گھبرا کر کہا۔
میں نے اسے بال صاف کرنے کی کریم دی۔ شادو نے ماں جی سے تولیہ مانگا اور پھر غسل خانے میں بند ہو گئی اور پورے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد واپس آئی۔ میں اُسے بیوٹی پارلر لے گئی اس کے بال ٹھیک کروائے۔ وہ ایک دم صاف ستھری اور نکھری نکھری لگنے لگی۔

آج میں نے اسے غور سے دیکھا۔ شادو کا گو کہ رنگ گہرا سانولا تھا لیکن نقش خوبصورت تھے اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔ لگتا تھا آنکھوں میں قدرتی کاجل لگا ہو۔ ہونٹ بھی بہت خوبصورت تھے ابھرے ابھرے سے گلابی۔ ستواں ناک۔ کم عمر اور دبلی پتلی ہونے کے ساتھ ساتھ جسم پر کشش تھا۔ میرے کپڑے اسے ذرا کچھ ڈھیلے تھے پھر بھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

میں نے اس سے کہا کہ ''تم روز نہاؤ گی۔ جب تمہارا صابن اور شیمپو ختم ہو جائے تو مجھ سے آ کے اور لے جانا۔ اور اپنے شادی کے نئے کپڑے پہن کر تیار ہو کر رہا کرو۔ اب تم اپنے گھر جاؤ گی تو تمہارا شوہر تم سے نفرت نہیں کرے گا''۔

پھر وہ اسی دن اپنے گھر چلی گئی لیکن ڈیڑھ ہفتے کے بعد پھر اپنی ماں کے گھر آ گئی۔ مجھ سے شادو کی ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ'' اس کا شوہر پہلے دن تو بہت اچھی طرح ملا اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا اور کافی باتیں بھی کیں۔ چمیاں شمیاں بھی لیں۔ لیکن اب اس کو شکایت ہے کہ '' تجھے تو پیار کرنا بھی نہیں آتا۔ تو منہ سے بھی کچھ نہیں کہتی۔ میں نے لاش سے شادی کی ہے۔ اس لیے وہ پھر ناراض ہو گیا ہے اور اُسی دوسری عورت کو روزانہ گھر میں بلا لیتا ہے''۔

میرے ذہن میں ایک خیال آیا نعیم کا تبادلہ کسی دوسرے علاقے کے اسکول میں کروا دیتی ہوں، پھر اس عورت سے شادو کی جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن ابھی کچھ کرنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ مجھے ضروری دورے پہ جانا تھا۔ تین اسکول چیک کرنا تھے۔ میں نے اُسے کہا'' پھر بات کریں گے۔ ابھی مجھے بہت ضروری جانا ہے۔ واپس آ کے اس کا کچھ نہ کچھ حل نکالتے ہیں۔ گھر کا خیال رکھنا۔ اماں جی کی کام میں مدد کرنا''۔

مجھے دیر ہو رہی تھی میں اپنے کام پہ نکل گئی۔ میرا دو دن کا دورہ تھا۔ کافی دور دراز علاقوں کے اسکولوں کا معائنہ کرنا تھا۔ ایک اسکول کے بارے میں تو یہاں تک شکایت ملی تھی کہ استانی صاحبہ اسکول ہی نہیں کھولتی۔ سوئی رہتی ہے۔ مجھے ضروری چھاپہ مارنا تھا۔

میرا دورہ دو دن پر مبنی تھا۔ دو دن کے بعد جب میں گھر پہنچی تو شادو گھر پہ تھی اور میری والدہ اور بچوں کے کام میں لگی ہوئی تھی۔ مجھے اچھا لگا اس نے خود کو مصروف کر لیا ہے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی نعیم کے پاس واپس جانے کی بات کر کے بُری طرح حیران کر دیا۔

''باجی آج میں اپنے گھر جاؤں گی نعیم کے پاس۔''

''چلو اچھا ہے تمہیں کچھ عقل آئی ہے۔ جاؤ چلی جاؤ''۔

حالانکہ میں تھکی ہوئی تھی لیکن میں اس کو شیمپو اور صابن کے لیے پیسے دینا نہ بھولی اور ہاتھ میں ویسے بھی پیسے ہونے چاہئیں۔ یہ سوچ کر اس کو دو سو روپے اور ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ اُس نے جلدی سے اپنی چادر اُٹھائی اور اپنے گرد لپیٹتے ہوئے تیز تیز چلتی ہوئی بقول اس کے اپنی ماں کی طرف چلی گئی۔ کیونکہ اس کی ماں کو اسے نعیم کے پاس پہنچانا تھا۔

اِس بار کی گئی شادو دو مہینے تک واپس نہیں آئی۔ دو مہینے کے بعد اس کی صورت نظر آئی۔ وہ چھٹی کا دن تھا۔ صبح کے دس بجے تھے فروری کے پہلے ہفتے کی خنک ہوا چل رہی تھی۔ آسمان صاف تھا اس لیے دھوپ میں تیزی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں گھر کے آنگن میں بوگن ویلیا کی بیل کے پاس کھڑے کھڑے کبوتروں کو دانا ڈال رہی تھی کہ سامنے سے شادو آتی دکھائی دی۔

''باجی جی السلام علیکم''۔ ''وعلیکم السلام، کہاں ہو شادو کیا بات ہے بھئی بہت خوش نظر آ رہی ہو''۔ واقعی وہ بہت بدلی بدلی اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔ چہرے پہ نکھار سا آ گیا تھا۔ خلاف معمول چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔ ''چلو تم آ گئی ہو تو اپنے ہاتھ کی چائے پلاؤ، سبھی کے لیے بنا لینا''۔ میں وہیں آنگن میں بچھے پلنگ پہ بیٹھ گئی۔ شادو کچن میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر میں ہی وہ چائے کی ٹرے اُٹھائے آ گئی۔ میں نے اپنا کپ اُٹھالیا۔
''شادو کیا ہوا بھئی، تمہاری نعیم سے دوستی کیسے ہوگئی؟''۔
''باجی اب میں روز نہاتی ہوں دیکھیں میرے بال کتنے سوہنے ہوگئے۔ نعیم نے شمپو کی اور بوتل بھی لا کے دی تھی۔ باجی یہ سب آپ کی مہربانی ہے جی۔ ویسے بھی اب مجھے اچھی طرح جاچ آ گئی ہے مردوں کو کیسے پیار کرنا اچھا لگتا ہے''۔
''کیسے آ گئی تمہیں جاچ''۔ میں نے ہنس کراس کے چہرے کی طرف دیکھا۔
''باجی اس دن آپ دورے پر گئی تھیں تو اماں جی کی طبیعت خراب ہوگئی تھی، انہوں نے رات کو مجھے یہیں روک لیا تھا۔ اماں جی کے سونے کے بعد شاہ جی مجھے جاچ سکھانے کے لیے آپ کے کمرے''۔۔۔ایک دم بات کرتے کرتے وہ رک گئی اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا۔ اس کی جھینپی شکل اور نظریں چرانا سارا احوال کہہ گیا۔
میرے ہاتھ سے کپ چھوٹ کر زمین پر زور کی آواز کے ساتھ گرا۔ سینے کے اندر کوئی چیز چھن کر کے ٹوٹ گئی۔ میں ڈھندلائی آنکھوں سے آسمان کو تک رہی تھی۔ اعتبار کے پرندے پرواز کرتے ہوئے دور جارہے تھے۔

......❀☆❀......

درد دل کے واسطے

عائشہ تنویر

ردا نے پسینہ صاف کرتے ہوئے بیزاری سے نظر دوڑائی۔ امی برآمدے کے کونے میں بنے ہوئے کچن میں، ساگ کو بگھار دینے میں مگن تھیں جبکہ وہ خود پنکھے کے نیچے بیٹھی تھی پھر بھی دل گھبرا رہا تھا۔
چوتھی منزل پر بنے ان دو کمروں اور برآمدے کے سامنے کھلی چھت تھی، جو اس وقت چلچلاتی دھوپ سے بھری ہوئی تھی۔ دھوپ کی شدت سے برآمدہ آگ کی مانند تپ رہا تھا۔
"کتنی گرمی ہے نا آج۔"
ردا نے امی کی توجہ اپنے سرخ پڑتے چہرے پر دلانی چاہی لیکن انہوں نے نگاہ بھی نہ اٹھائی۔
"ہاں، دیکھ پرندے، انسان سب بے حال ہوئے پھر رہے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے ہم سکون سے پنکھے کے نیچے اپنے گھر میں بیٹھے ہیں۔"
انھوں نے اطمینان سے تبصرہ کیا۔ ان کے شان استغناء پر ردا کا دل جل کر راکھ ہوگیا۔
بتول نے شوہر کی وفات کے بعد بہت کڑا وقت دیکھا تھا۔ ایک چھوٹے سے حبس زدہ کمرے میں تین بچوں کے ساتھ سلائی کر کے گزارا کیا۔ پھر بھی مہینے بعد جب کرایہ دینے لگتیں تو یوں لگتا کہ یہ سر چھپانے کا ٹھکانا ہی ان کی سب سے بڑی عیاشی ہے۔ اتنا کٹھن وقت گزار کر اب بیٹے کی کمائی کھانا، ایسے کھلے گھر میں رہنا، من پسند کھانا بنانا گویا ان کے دیکھے گئے خوابوں کی حسین تعبیر تھی۔
"ردا، یہ ساگ پروفیسر صاحب کے گھر دے آؤ۔"
انھوں نے پیالے میں ساگ نکال کر اور دیسی گھی سے سجاتے ہوئے آواز دی۔
"شام میں دے آوں گی نا!"

اتنی گرمی میں چوتھی منزل سے نیچے اترنے کا خیال ہی اسے لرزا گیا۔ وہ تین بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ یتیمی کے دکھ سہتے اس کے بڑے بھائی اور بہن نے ہمیشہ حتیٰ المقدور اس کے ناز اٹھائے تھے۔ تب ہی وہ یوں نخرے دکھاتی۔
"شرم تو نہیں آئے گی، ٹھنڈا کر کے دیتے ہوئے، جاؤ وہ حرا کا سوٹ نکال لاؤ۔ میں خود جارہی ہوں۔"
انھوں نے اسے گھورا، پھر کچھ خیال آنے پر خود ہی جانے کی تیاری کرنے لگیں۔
"اماں، بھائی نے آپ کو سلائی کرنے سے منع کر دیا تھا۔ آپ نے پھر بھی آنٹی کے کہنے پر حرا آپی کا سوٹ لے لیا۔"
ردا نے شاپنگ بیگ نکالتے ہوئے کہا تھا۔
"بیٹا، یہ ماسٹر اشفاق ہی ہیں، جن کی محنت سے تیرا بھائی پڑھ لکھ گیا۔ ان کے اتنے احسانات کے بدلے میں ایک سوٹ سینے کو بھی منع کر دوں۔ یہ تو نہیں ہوگا مجھ سے۔"
ردا کو سمجھاتے ہوئے وہ شاپنگ بیگ اٹھایا اور ساگ کا پیالہ لیے جانے کے لیے نکلیں۔
پروفیسر اشفاق کا گھر حسب معمول ہر عمر کے طالب علموں سے بھرا تھا۔ وہ سرکاری کالج کے استاد تھے۔ کالج سے آ کر غریب بچوں کو پڑھانا اور تعلیم حاصل کرنے میں ان کی ہر ممکن مدد کرنا ہی ان کی زندگی تھی۔
ایک طرف پروفیسر اشفاق میٹرک، انٹر کے طلبہ کو لیے بیٹھے تھے۔ جبکہ دوسرے کمرے میں چھوٹی کلاسز کے بچے بیٹھے تھے۔
"ابھی آ کر ٹیسٹ لوں گی سب کا، آرام سے یاد کرو۔"
ماسٹر اشفاق کی بیٹی حرا کھڑی بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔ جب ان پر نظر پڑی۔
"السلام علیکم آنٹی!"
"وعلیکم السلام، ابھی آئی ہو پڑھ کر؟"
انھوں نے اس کا جائزہ لیا، موہنی سی یہ لڑکی انہیں بہت عزیز تھی کہ وہ ان کے بیٹے کے دل کی خواہش تھی گو اس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا لیکن وہ اس کا دل پڑھنا جانتی تھیں۔
"جی، ابھی تو کھانا بھی نہیں کھایا اور یہ سب وقت سے پہلے ہی آ کر بیٹھ گئے ہیں۔"
مسکرا کر کہتی وہ انہیں اپنے ہمراہ لیے اندر کی طرف چل دی۔
......☆☆......
"اماں بھائی کی تو بہت اچھی نوکری لگ گئی ہے۔"
بڑی بیٹی فضا بہت دن بعد رہنے آئی تھی۔ شام میں چائے کا کپ لے کر جب وہ سب چھت پر ٹھنڈی ہوا میں بیٹھیں تو موڈ بھی خوشگوار ہو گیا۔ بھائی کو ترقی کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر وہ بہت خوش تھی۔
"اللہ کا کرم ہے، شہیر کہہ رہا تھا، ابھی تو ابتداء ہے آگے ان شاء اللہ اور ترقی ہوگی۔" امی نے خوشی خوشی بتایا تھا۔
"بس پھر ہم بھائی کی شادی کر دیں گے اماں" ردا جوش میں آئی۔
"ابھی کہاں شادی، پہلے تو فضا کی شادی پر لیا قرض اتارنا ہے۔ تمہاری شادی کرنی ہے۔ گھر بدلیں گے، سامان لیں گے پھر کریں گے شادی"
امی کے پاس ایک لمبی لسٹ تھی۔ ردا کا منہ بن گیا۔ جبکہ فضا نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور مسکرا کر شوخی سے بولی۔
"واقعی امی گھر تو بدلنا پڑے گا۔ سامان کی فکر نہ کریں، وہ تو جہیز میں آ جائے گا"

"جہیز نہیں لے گا شہیر، مجھے پتہ ہے اور پروفیسر صاحب بھی کہاں ان رواجوں کو ماننے والے ہیں۔"

امی کا جملہ ان دونوں کو چونکا گیا۔

"سر اشفاق؟ آپ حرا آپی کو بہو بنانے کا سوچ رہی ہیں امی۔"

ردا کے لہجے میں جوش تھا۔فضا ایکدم سنجیدہ ہو چکی تھی۔

"یہ کیا بات کی آپ نے امی۔حرا بہت اچھی ہے لیکن بھابھی کے طور پر بالکل مناسب نہیں۔"

ان دونوں نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔وہ ایک لمحہ خاموش رہ کر پھر بولنے لگی۔

"اللہ بھائی کی زندگی اور رزق میں برکت دے امی لیکن مجھے یہی لگتا ہے کہ بھابھی اچھے خاندان کی ہونی چاہیے تا کہ برے وقت میں اس کے گھر والے کام آئیں۔اتنا مشکل وقت دیکھا ہے ہم نے،اگر آپ کے یا ابو کے رشتے دار ہوتے تو ہماری کچھ تو مدد کرتے۔کاغذ کے لفافے بنانے سے لے کر موتی ستارے لگانے تک سب کچھ کیا۔اب اللہ کا شکر کہ اللہ نے آسانی دی۔سر اشفاق تو کچھ جمع کرنے کے قائل ہی نہیں،سب لوگوں کی مدد پر لگا دیتے ہیں۔اچھی بات ہے،مدد اچھی بات ہے مگر کل کو اکلوتی بیٹی کو ضرورت پڑی تو خالی ہاتھ ہوں گے۔"

اچھی بات ہے پر زور دیتے اس نے کہا تھا۔ردا کے چہرے پر خفگی کے آثار چھا گئے تھے جبکہ امی کا چہرہ بے تاثر ہی رہا۔

"آپی ہم بھی سر اشفاق کی مدد کھانے والے غریب ہی ہیں۔"

ردا نے چیخ کر کہا تھا۔فضا کی بات اسے بالکل پسند نہیں آئی تھی،وہ حرا سے پڑھنے جاتی تھی۔دھیما دھیما بولنے اور کھل کر مسکرانے والی حرا آپی اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔

"پتہ ہے میری جان،ان کا احسان سر آنکھوں پر۔حرا کو رشتوں کی کمی نہیں۔شہیر بھائی سے زیادہ اچھے رشتے اس کے لیے موجود ہیں۔شہیر بھائی نے زندگی میں بہت محنت کی ہے۔اب کوئی تو ساتھ دینے والا ملے۔اس لیے کہہ رہی تھی میں۔"

فضا نے پیار سے اسے ساتھ لگایا تو وہ چپ ہوگئی۔بتول ان کی باتیں خاموشی سے ہی سنتی رہیں۔خیالات کا ایک سمندر ذہن کے اندر تھا۔فضا کے پھینکے پتھر نے بھنور پیدا کر دیا تھا۔انہیں تسلی سے سوچنا تھا۔

......☆☆......

کہاں رہ گئے تھے بیٹا،دیر لگادی"

بتول نے شہیر کے پاس بیٹھتے پیار سے پوچھا۔

"سر کی دوائیاں لانی تھیں۔وہ دینے گیا تو پھر اسکول کی باتوں میں لگ گیا۔"

اس نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔جانتا تھا کہ امی نے کتنی کٹھن زندگی گزاری ہے اور اب ان کا سرمایہ اولاد ہی ہے۔اس لیے ہر ممکن کوشش کرتا کہ انہیں وقت دے،ان سے باتیں کرے۔

"اسکول کی کیا باتیں" امی نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"سر ریٹائرڈ ہوگئے ہیں۔تو اب کہہ رہے تھے کہ اوپر کا پورشن پورا اسکول کے لیے مختص کر کے پورا دن غریب بچوں کو پڑھائیں گے۔کچھ اور لوگ بھی رضاکارانہ طور پر پڑھانا چاہتے ہیں۔"

شہیر نے تفصیل بتائی۔

"ان کا اتنا بڑا گھر ہے۔کرائے پر چڑھا دیں تو اچھی آمدنی ہو جائے،برے وقت کے لیے کچھ جمع بھی کرنا چاہیے۔"

فضا کی باتوں کے زیر اثر انہوں نے کہا تھا۔

"برے وقت کے لیے صرف اچھے دوست جمع کرنے چاہیں۔ اچھے دوست اوران کی دل سے نکلی دعائیں ہی اللہ کی مددلاتی ہیں"

وہ ہنسا تھا۔ ماں کے اندر پنپتے عدم تحفظ کے احساس سے وہ واقف تھا۔ جب تک زندگی مشکل تھی تو لگن سے مشکلوں سے نکلنے کے راستے ڈھونڈتی رہیں۔ اب جب آسانی آ گئی تھی تو پیچھے دیکھ دیکھ کرخوفزدہ اور حیرت زدہ ہوتیں۔

شہیر نے اپنے زور بازو پر زندگی کے پہاڑ سے خوشیوں کی نہر نکالی تھی۔ خود پڑھنا اور ساتھ معاشی ضروریات کے لیے دن، رات محنت کرنا، طویل عرصے سے اس کا معمول تھا۔ سر اشفاق کی رہنمائی ملی تو تعلیم بھی اچھے سے ہوگئی۔ اب جب ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کے بعد زندگی سہل ہوگئی تھی تو وہ اپنے جیسے دوسرے لوگوں کی زندگی سہل کرنا چاہتا تھا۔ اللہ نے سر اشفاق کے ذریعے اس کی غیبی مدد کی تھی۔ اسی لیے اس کا طرز فکر بہت مثبت تھا۔

......☆☆......

"امی میری خالہ ساس کی انجیو گرافی ہوئی ہے۔ آپ عیادت کے بہانے چکر لگالیں میرے ساتھ۔ بہت امیر ہیں۔ ایک بیٹی ہے ان کی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ جہیز میں گھر، گاڑی سب دیں گے۔ لڑکی بھی اچھی ہے۔"

فضا نے بار بار فون کر کے اتنا دباؤ ڈالا تھا کہ آج وہ اس کے ساتھ عیادت کرنے آ ہی گئی تھیں۔

خوبصورت اور وسیع گھر سے اندر داخل ہوتے وہ قدرے مرعوب ہوگئی تھیں۔ پھر یاد آیا کہ ان کا بیٹا بھی خوبصورت، شریف، پڑھا لکھا، اکلوتا ہے۔ تب ہی تو فضا کی خالہ ساس بھی اتنی دلچسپی لے رہی ہیں۔ اس خیال نے ان کا اعتماد بحال کیا۔

ملازمہ نے سیدھا بیگم صاحبہ کے کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ بھی ان سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک پیاری سی لڑکی چائے اور لوازمات کے ساتھ اندر آ کر خوشدلی سے ملی تو وہ فضا کے انتخاب کی قائل ہوگئیں۔

"آپ اپنا خیال رکھیے گا، میں جا رہی ہوں۔"

ماں کو پیار کرتی وہ جانے کے لیے اٹھ گئی تھی۔

"دوست کی شادی ہونے والی ہے۔ بس اس کی تیاریوں میں ہی لگی ہے۔ کبھی پارلر، کبھی شاپنگ یا ویسے ہلہ گلہ"

وہ مسکرا کر بتا رہی تھیں۔ بتول نے بھی مسکرا کر سر ہلایا۔

"کافی سناٹا ہے گھر میں، بھابھی نہیں ہیں۔" فضا نے ان کی بہو کے بارے میں پوچھا تھا۔

"وہ لوگ تو آج کل مری گئے ہیں، بچوں کی چھٹیاں تھیں۔ عرصے سے پروگرام بن رہا تھا، آخر چلے ہی گئے۔" مسکرا کر کہتے انہوں نے روایتی خواتین کی طرح بہو، بیٹے کی برائیاں نہیں کی تھیں۔ بتول ان کی وضع داری کی قائل ہو گئی۔

"آنٹی آپ اکیلی ہی رہیں گی، کوئی مسئلہ تو نہیں۔"

وہ جانے کے لیے اٹھیں تو فضا کو ان کی طبیعت کی وجہ سے تشویش ہوئی۔

"ملازمہ گھر میں ہی ہے۔ میں روز اس کے ساتھ ہی ہوتی ہوں۔ بچے بیچارے بھی کب تک بندھ کر بیٹھیں۔" انہوں نے تسلی دی تو وہ دونوں نکل آئیں۔

"کیسی لگیں خالہ اور ردبا" فضا نے گھر سے نکلتے ہی جوش سے پوچھا تھا۔

"اچھی ہیں" امی نے مختصر جواب دیا

"اچھی نہیں، بہت اچھی ہیں۔ اپنے پیسے کا ذرا غرور نہیں۔" اس نے زور دے کر کہا تھا۔ انہوں نے بس سر ہلا دیا۔

......☆☆......

روزانہ سر اشفاق سے ملنا اور ان کے گھر کے چھوٹے، موٹے کام کرنا شہیر کا معمول تھا۔ وہ احسان فراموش قطعاً نہیں تھا اور نہ ہی یہ بتول کی تربیت تھی۔ آج کل تو اسکول بنانے کے سلسلے میں بھی کام ہوتا، تو وہ رات کو روز ہی ان کے گھر چکر لگالیتا۔ آج وہ جانے لگا تو بتول بھی ساتھ ہولیں۔

سر اشفاق اور ان کی بیوی انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے انہیں حرا کی کمی محسوس ہوئی۔

''حرا کہاں ہے؟ سوگئی کیا؟''

انہوں نے دریافت کیا۔

''سونا کہاں ہے اتنی جلدی، اپنی پڑھائی میں لگی ہے۔ آتے ساتھ تو بچوں کو پڑھانے بیٹھ جاتی ہے۔ اپنا پڑھنے کا وقت نہیں ملتا لیکن خدمت خلق ضرور کریں گی۔ میں نے تو منع کر دیا کہ اب اسکول میں بالکل نہیں پڑھانا تم نے۔ اتنی کمزور ہوگئی ہو۔''

امینہ بیگم نے جواب دیا تھا۔ وہ بھی ان کی طرح اپنی بیٹی کے لیے فکر مند سیدھی سادی خاتون تھیں۔

''خدمت خلق تو اچھی بات ہے نا ماں جی، اسکول تو خیر وہ نہیں پڑھا سکے گی، صبح وہ خود یونیورسٹی میں ہوتی ہے۔ یہ کام تو سر کو ہی کرنا ہوگا۔'' شہیر نے مسکرا کر گفتگو میں حصہ لیا۔

ماں، بہنوں کی خوشی یا سر کی خدمت اور دوسروں کی مدد ہی اس کی منشا تھی۔ اپنے لیے اس نے زندگی میں صرف ایک خواب دیکھا تھا۔ سر اشفاق جیسے آئیڈیل خیالات رکھنے والی ان کی بیٹی کا زندگی بھر کا ساتھ۔ پہلے وہ چاند کی مانند دلکش مگر پہنچ سے دور لگتی۔ جب سے تعلیم مکمل کر کے اسے جاب ملی تھی، تو من میں دبی تمنا ابھر آئی تھی۔ دل اس کے ساتھ زندگی بتانے کے سپنے بننے لگا تھا۔ اس پیاری سی، دردمند لڑکی کا خیال ہی اس کی آنکھوں میں چمک اور لبوں پر مسکراہٹ لے آیا تھا۔ بتول نے اس کی چمکتی آنکھیں بغور دیکھی تھیں۔

تب ہی واپس گھر آکر باتیں کرتے اس کے سامنے فضا کی نند ردا کا ذکر کر دیا۔

''ابھی مجھے شادی نہیں کرنی امی، جب کروں گا بھی تو بہن کی سسرال میں نہیں کروں گا۔''

شہیر نے قطعیت سے منع کیا۔ اس نے حرا کا نام نہیں لیا تھا، وہ خود کو اس کے قابل بنانا چاہتا تھا لیکن بتول سے صبر نہیں ہوا۔

''اگر تمہارے ذہن میں حرا ہے تو اس کا خیال نکال دو، میری ایک ہی بہو ہوگی۔ وہ بھی گھر کو وقت نہ دے گی تو مجھے کیا فائدہ!''

ان کے خفا لہجے پر شہیر چونکا، وہ ان کی بات تو نہ سمجھا لیکن انداز، اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ محاذ بنا چکی تھیں۔

''امی میں آپ کی رضا کے بنا، کچھ نہیں کروں گا لیکن آپ پلیز ابھی سے ایسی باتیں مت کریں۔''

اس نے سبھاؤ سے بات ختم کی۔ ابھی بحث کر کے ماں کو دکھ دینے سے بہتر تھا کہ درست وقت کا انتخاب کیا جائے۔

......☆☆......

''سر اشفاق کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے، وہ اسپتال میں ہیں''

ردا، حرا سے پڑھنے گئی تھی، جب فون آیا۔ حرا اور اس کی امی ایکدم پریشانی سے ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھی تھیں۔

اسے کم از کم حرا سے یہ امید نہیں تھی۔ وہ بھاگ کر بتول کو بلا لائی اور شہیر کو بھی فون کر دیا۔ جس وقت وہ چاروں اسپتال پہنچیں، شہیر پہلے سے موجود تھا۔ سر اشفاق کی حالت سیریس تھی۔ خون کی فوری ضرورت تھی۔ شہیر بھاگ دوڑ

کرنے لگا۔تھوڑی ہی دیر میں اسپتال سر اشفاق کے طالب علموں سے بھر گیا۔سب مختلف طبقے اور سوچ کے لوگ تھے۔کوئی ماسٹر جی کہہ رہا تھا تو کوئی سر یا پروفیسر صاحب لیکن ایک بات جو مشترک تھی، وہ محبت اور عقیدت تھی جو سب کے دلوں میں تھی۔وہ دعائیں تھیں جو لب سے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے نکل رہی تھیں۔یہی پروفیسر اشفاق کا زندگی بھر کا اثاثہ تھا۔

خون، ایکسرے، دوائی ہر چیز کا انتظام منٹوں میں ہو رہا تھا۔کوئی ڈاکٹر کسی کا دوست تھا تو کوئی وارڈ بوائے کسی کا محلے دار۔وہ دونوں حرا اور اس کی امی کے ساتھ ایک بنچ پر بیٹھی انہیں تسلی دے رہی تھیں۔تھوڑی دیر بعد کوئی آ کر حالات سے باخبر کرتا، دل کو ڈھارس دیتی کوئی بات کہہ جاتا۔آخر سب کی دعائیں رنگ لائیں اور ڈاکٹرز نے سر اشفاق کو خطرے سے باہر قرار دے کر وارڈ میں شفٹ کر دیا۔ابھی وہ دوائیوں کے زیر اثر نیند میں تھے۔انہیں دیکھ کر جب حرا اور ماسٹرنی جی واپس آئیں تو شہیر نے خود وہاں رہنے کا عندیہ دیتے ان چاروں کو گھر جانے کا کہہ دیا۔

"نہیں، میں یہیں رہوں گی۔میں بابا کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" حرا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

"حرا آپی، آپ کو ہم پر بھروسہ نہیں۔میں ہوں نا یہاں۔آپ صبح ملنے آ جایئے گا۔"

بیس سالہ احمد ایک ورکشاپ میں گاڑیاں ٹھیک کرتا تھا لیکن تعلیم حاصل کرنے کا شوق اسے پروفیسر اشفاق سے ملوا گیا تھا۔ان کی محنت اور توجہ ہی تھی کہ اس سال اس نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔

ہاتھ کی پشت سے چہرہ صاف کرتے احمد کا پرخلوص لہجہ سنکر حرا کچھ نہیں بولی تھی۔

"تم جاؤ یار، میں رک جاتا ہوں۔" شہیر نے کہا تھا۔

"آپ کا گھر سر کے محلے میں ہے۔آپ ساتھ چلے جائیں۔اتنی رات کو یہ اکیلی کیسے جائیں گی۔دن میں آپ آ جایئے گا۔" احمد نے سنجیدگی سے کہا تو شہیر بھی خاموش ہو گیا۔

رات گئے واپس آتے ہوئے بتول کا ذہن سر اشفاق کو ہی سوچ رہا تھا۔

تین دن اسپتال میں گزارنے کے بعد سر اشفاق گھر آ گئے تھے۔ان تین دنوں میں ان کے طالب علم ہی باری باری اسپتال میں رک جاتے اور اصرار کر کے حرا اور اس کی والدہ کو گھر بھیج دیتے۔

گھر آنے کے بعد حرا سب کچھ بھلائے ان کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی لیکن خدمت کرنے کو ان کے طالب علم بہت تھے۔جو خود ہی باری لگا کر گھر آتے تا کہ باتھ روم جانے اور اٹھنے، بیٹھنے میں انہیں کوئی مسئلہ نہ ہو۔

فرمانبردار اولاد والدین کی خدمت کرتی ہی ہے لیکن سر اشفاق کے ان گنت طالب علم دن، رات کا فرق بھلائے اپنے روحانی باپ کا خیال کر رہے تھے۔

فضا بھی ان کی عیادت کے لیے بالخصوص آئی تھی۔ "اللہ کا شکر ہے، سر کی طبیعت اب بہتر ہے ورنہ تو کافی بڑا ایکسیڈنٹ تھا۔"

گھر میں ماں، بہن سے بات کرتے اس نے کہا تھا۔

"سب نے خیال بھی تو بیحد رکھا ہے۔اس لیے صحت جلدی بحال ہو گئی ورنہ تو کافی زخمی ہوئے تھے۔" بتول نے جواب دیا۔

"خوش قسمت ہیں سر، آج کل کے دور میں بھی اتنا بے لوث، بے غرضی سے خیال رکھنے والے شاگرد ملے ورنہ آج کل تو سگی اولاد نہیں پوچھتی۔"

فضا نے سراہا تھا۔اس کی بات نے بتول کو ملازمہ کے ساتھ اکیلی گھر میں رہنے والی فضا کی امیر خالہ ساس یاد دلا دی

تھیں۔ جن کے بچے ملازمہ فراہم کر کے بےفکر ہو گئے تھے۔ پیسہ انسان کی ضرورت سہی لیکن پیسے سے خدمت خریدی جا سکتی ہے محبت نہیں۔

"دور سارے ہی اچھے ہوتے ہیں آپی۔ ہمارے اعمال ہی ہماری تقدیر بنتے ہیں۔ اپنا مستقبل ہم خود کماتے ہیں۔ سر نے بھی تو بےغرضی سے سب کی مدد کی تو اللہ نے انھیں اس کا صلہ دیا ورنہ ہم جیسے رشتے داروں کو کوستے رہ جاتے ہیں۔"

ردا نے جتایا تھا۔ اس کا انداز ان دونوں کو بےاختیار مسکرانے پر مجبور کر گیا۔

"چوکتی نہیں ہے ردا، موقع ملتے ہی سنا دیا مجھے، میں نے منع جو کیا تھا حرا کے لیے"

فضا نے مطلب پا کر ماں کو مخاطب کیا۔

"ٹھیک ہی کہہ رہی ہے ردا، انسانوں سے امیدیں لگانا بیکار ہے۔ یہ ظاہری ذرائع تو ہم دیکھتے ہیں کہ دولت کتنی ہے رشتے دار کون ہے مصیبت میں کام آنے والا۔ اللہ پاک جب مدد کرتے ہیں تو انجانے لوگوں کے دل میں ہماری محبت ڈال دیتے ہیں۔"

بتول نے بھی تائید کی تھی۔ فضا نے قائل ہو کر سر ہلایا تھا۔

"تو پھر اب کیا خیال ہے آپ کا؟"

ماں کی حمایت پا کر ردا چہکی تھی۔

"بہت نیک خیال ہے۔ ان شاء اللہ حرا ہی میری بہو بنے گی۔"

انہوں نے تیقن سے کہا۔

سر اشفاق نے ساری زندگی اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے جو مال جمع کیا تھا، بتول اس کی قیمت جان گئی تھیں۔ اب یہی زاد راہ انہیں اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے جمع کرنا تھا۔ پھر شہیر کی بھی تو یہی خواہش تھی۔

خوشگوار لمحوں کی دستک محسوس کرتے وہ کھل کر مسکرائیں تھیں۔

❀☆❀

موسم گرما

صدف آصف

جون کی تپتی دوپہر تھی، شمس مثل نار بنا نار برسا رہا تھا ہر چیز ساکت و جامد، اس گرمی سے حیران و پریشاں سڑکیں سنسان گلیاں ویران، انسان تو انسان پرندے تک اپنے آشیانوں میں اس گرمی سے بچنے کی کوشش کر رہے مگر ایک وجود جو اس گرمی سے بے نیاز ہونے کی کوشش کرتا بس آگے بڑھا جا رہا تھا، چلا جا رہا تھا، نہ جانے اس جھلساتی دھوپ میں وہ دو قدم کس کی تلاش میں سرگرداں تھے پسینے سے شرابور لباس، دھوپ سے تمتمایا گرم سانولہ چہرہ دوپٹہ سختی سے اپنے گرد لپیٹے، ہاتھ میں بس ایک شاپر لیے، بائیں ہاتھ سے چہرے پر لحظہ بہ لحظہ آتا پسینہ صاف کرتی وہ چلی جا رہی تھی...... آنکھوں میں امید کی آس اور بےبسی کی نمی تھی کالی پٹی کی چپل میں مقید ریت سے اٹے پاؤں بیان کر رہے تھے۔

یہ نار میل پر سفر کئی گھنٹوں سے جاری ہے، پوش ایریا میں ایک کے بعد ایک عمارت کو آس سے دیکھتی اور اس دیکھنے کے عمل میں آنکھیں دھوپ سے چندھیا جاتی۔ پھر آگے بڑھ جاتی ہر طرف فلیٹ تھے، شاید کسی خاص عمارت کی تلاش تھی

جب ہی اس تپتی دھوپ میں وہ خشک لبوں، تمتمائی ہوئی سانولی رنگت جو چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی یہ رنگت کبھی گندم کے خوشوں سی تھی، چلی جارہی تھی، اس نے تو شاید طے کرلیا تھا کہ اس گرما کی سخت گرمی میں اپنے آپ کو مضبوط ثابت کرلے گی لیکن چلتے چلتے اچانک لڑکھڑائی اور منہ کے بل گرتے گرتے بچی جب سیدھی ہوئی ٹوٹی چپل نے اس کا منہ چڑایا......
وہ اس کالی پٹی کی ٹوٹی چپل کو دیکھتی رہی آنکھ سے ایک آنسو نکلا اور جلتی سڑک پر گر کر غائب ہوگیا چپل اتار کر ہاتھ میں پکڑی اور ننگے پاؤں چلنے لگی...... پیاس سے حلق میں کانٹے اگ آئے تھے مگر نہ جانے کون سا جذبہ تھا جو اسے ٹھہرنے ہی نہیں دے رہا تھا قدم تھم ہی نہیں رہے تھے، دھوپ سے جلتی سڑک پر قدم پڑتا اور پھر اٹھ جاتا تلوے سرخ پڑنے لگے تھے دھوپ کی جلن قدموں میں محسوس ہورہی تھی مگر ننگے پیروں سے جیسے سنگ میل عبور کرنے کا فیصلہ کیا تھا یا شاید اس کا مضبوط حوصلہ و عزم تھا کہ اب کی بار جو سر اٹھایا تو اسے اس کی منزل نظر آگئی ہو۔
بے تابانہ اس عمارت کی طرف بڑھی نڈھال ہوتے وجود اور درد سے چور پیروں میں نئی قوت دوڑ گئی۔ فرط جذبات سے بے اختیار شکر نکلا اور بیس منزلہ عمارت کی بارہویں مالے پر جانے کے لیے لفٹ کی طرف بڑھی سیکیورٹی گارڈ ایک گرمی سے نڈھال، عام سے لباس اور ٹوٹی چپل ہاتھ میں لیے ننگے پاؤں والی لڑکی کو دیکھ کر چونکا گمان کیا شاید کوئی چور ہے بھکارن کے لباس میں مگر جب مدھم آواز سے لفٹ کا معلوم کیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے نرمی سے بتادیا کہ لفٹ خراب ہے یہ سن کر وہ جو جلد از جلد منزل تک پہنچنا چاہ رہی تھی، منزل کے قریب پہنچ کر یہ سناٹے سرے سے تکلیف دے گیا سر اٹھا کر بارہویں منزل تک کے سفر کی طوالت کو جانچنا چاہا پر سورج جیسے آنکھوں میں ہی گھس آیا ہو نہ جانے سورج کی تپش سے آنکھوں میں پانی آیا یا ننگے پاؤں سفر طے کرنے کے خیال سے بہرحال وہ زینہ کی طرف بڑھ گئی ایک کے بعد ایک سیڑھی پار کرتے پانچویں منزل پر پہنچ کر ہمت جواب دے گئی سانس لینے کو سیڑھی پر ہی ٹک گئی، اپنے پیروں پر نظر پڑی جو ریت میں اٹے پڑے تھے شاید ان کی قسمت میں اب یہی ہے۔
ہاتھ میں پکڑی ٹوٹی چپلوں کو ایک نظر دیکھا اور پھر اوپر کی جانب چل پڑی چھ، سات، آٹھ، نو، دسویں منزل پر پہنچ کر لگا جیسے پھر سے کسی نے برق بھر دی ہو تیزی سے زینہ طے کرنے لگی بارہویں منزل...... اسے لگا بھری دھوپ میں ٹھنڈا سایہ آگیا ہو بے تابانہ آگے بڑھی گھنٹی بجائی ایک دو تین، امید ٹوٹنے لگی۔ دوبارہ بجائی، دروازہ ہاتھوں سے بجانے لگی پر اندر کوئی ہوتا تو آکر دروازہ کھولتا...... دروازہ تو نہ کھلا مگر پیچھے سے ایک دوسرا دروازہ کھلا جھنجھلائی ہوئی عورت نے سر باہر نکالا دروازے کی یہ ٹھک ٹھک اس کے قیلولہ میں مخل ہوئی تھی جبھی تلخی سے پر کرخت آواز آئی۔
''او بی بی یہ لوگ گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں چار مہینے ہوگئے ہیں جاؤ کہیں اور جا کر بھیک مانگو۔'' اور کھٹاک سے دروازہ بند ہوگیا اسے لگا شاید قسمت کا دروازہ بھی بند ہوگیا ہو امید کی سب کرنیں بجھتی چلی گئیں تیز جلتی دھوپ بے رحم حالات سیاہ اندھیرے میں بدل گئے سب کچھ ختم ہوگیا وہیں زینے پر بیٹھتی چلی گئی...... بھکارن...... بھیک مانگو کہیں اور جا کر مگر کہاں...... نہ جانے کتنی دیر وہیں بے حس و ساکت بیٹھی رہی تیرہویں منزل سے کوئی اتر رہا تھا احساسات تھوڑا بیدار ہوئے احساس ہوا کہ قدموں کی آواز قریب آتی جارہی ہے یہاں سے اٹھ جاؤں پر امید کا کانچ کچھ اس طرح سے ٹوٹا کہ اس کی کرچیاں ہمت کے اندر تک کھب گئی تھیں وجود نے اٹھنے سے انکار کردیا...... قدموں کی دھپ دھپ قریب آتے آتے رک گئی۔
''اے کون ہو تم اور یہاں کیا کررہی ہو چوری کرنے آئی ہو......'' جھٹکے سے سر اٹھایا۔
''چوری کرنے نہیں اپنا حق لینے آئی تھی......''
''اچھا لیکن تمہارا حلیہ تو کچھ اور کہہ رہا ہے'' مقابل کی آنکھوں اور چہرے پر شک ہی شک تھا۔

''یہ فلیٹ میرے انکل کا ہے ان سے ہی ملنے آئی تھی راستے میں چپل ٹوٹ گئی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی آواز جیسے بھرا گئی ہو۔

''اوہ......!'' اس کے لہجے میں سچائی محسوس ہوئی۔

''اچھا تم اوپر آؤ میرے فلیٹ پر میری بیوی کی چپلیں پہن لو، پانی وغیرہ پی لینا...... کافی نڈھال لگ رہی ہو......!'' مقابل ابن آدم تھا بنت آدم کی مجبوری دیکھ کر کیسے مدد نہ کرتا۔

اس نے ایک نظر سامنے کھڑے شخص کو دیکھا اور پھر اپنے خشک پڑتے حلق کی خشکی محسوس کی۔

''دیکھو میں بیوی بچوں والا ہوں تم اعتبار کرسکتی ہو تمہاری حالت بھی ایسی نہیں کہ تم واپسی کا سفر کرسکو۔'' چاہتے ہوئے بھی وہ مزید انکار نہ کرسکی اور اثبات میں سر ہلا دیا اس کے پیچھے چلتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ قدموں میں اب واقعی اب جان نہ رہی تھی۔ اس شخص کے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی خنک دٹھنڈک کا پرسکون احساس ہوا۔

''آؤ تم ادھر بیٹھ جاؤ میں پانی لاتا ہوں۔'' مکمل خاموشی تھی کچھ لمحوں میں ہی وہ شخص اورنج جوس لے آیا...... کانچ کے گلاس پر ابھرتا پانی اس کے یخ ہونے کا پتا دے رہا تھا۔

''یہ لو۔'' بنا کوئی جواب دیے، گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا ایک گھونٹ لیتے ہی پیاس کی شدت میں اضافہ ہوا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کرگئی...... وجود میں جیسے جان پڑ گئی ہو۔

''تم چاہو تو کچھ دیر آرام کرسکتی ہو سامنے باتھ روم میں فریش ہونا چاہو تو ہوسکتی ہو۔''

یہ بات سن کر اس کی آنکھوں میں تشکر امڈ آیا پر زبان سے کچھ کہے بنا باتھ روم کی طرف بڑھ گئی ٹھنڈے پانی کو چہرے پر مارتی رہی اور آنسو بہاتی رہی ہاتھ پاؤں دھوکر باہر آئی تو وہ شخص وہاں نہیں تھا دوپٹے سے چہرہ خشک کرتی وہیں صوفے پر بیٹھ گئی کچھ دیر بعد آہٹ ہوئی۔ ہاتھوں میں ایک زنانہ چپل کا جوڑا اٹھائے وہ شخص تھا۔ اس کا یہ خلوص دیکھ کر شکریہ کرنے ہی والی تھی کہ اسے محسوس ہوا ماحول بدلہ ہے، شاید اس شخص کی نظریں جیسے ہی وہ شخص اسی صوفہ پر بیٹھا وہ کھڑی ہوگئی۔

''اچھا میں اب چلتی ہوں آپ کا بہت بہت شکریہ کافی مدد کی آپ نے۔'' یہ کہتے آگے بڑھی ہاتھ پر گرفت محسوس ہوئی دیکھا تو اس شخص نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اس نے ہاتھ نہیں چھڑایا بلکہ استفہامیہ نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا اور ایک گہری سانس لی، ابن آدم اپنی مدد کا صلہ طلب کررہا تھا۔

''تم ابھی مت جاؤ، شام میں چلی جانا موسم بھی ٹھنڈا ہوجائے گا جب تک......!''

''ٹھنڈا موسم...... موسم ٹھنڈا ہوجائے گا؟'' وہ ہنسی اور پھر ہنستی چلی گئی اس کے ہنسنے پر اس شخص کو لگا بنت آدم نے اس کی بات مان لی جبھی ابھی تک جو ہاتھ صرف تھاما ہوا تھا اس پر انگلیاں سرسرانے لگی اور وہ جو ہنستی جارہی تھی ایک دم چپ ہوگئی۔

''تمہیں پتا ہے میرے لیے یہ موسم اب کبھی ٹھنڈا نہیں ہوگا تمہیں معلوم ہے میرے لیے یہ موسم گرما کی تپش دسمبر کی ایک سرد رات سے شروع ہے اس رات سے جس رات میرا باپ دل میں درد اٹھنے سے مرا تھا اس رات سے، اس سخت سرد رات سے میں تپتی دھوپ میں ہوں...... ٹھنڈا موسم دینے والے بدلہ طلب کرتے ہیں...... میرے لیے تو جنوری کی وہ صبح بھی جلتی دھوپ کا دن تھا جب تم جیسے ہی ایک مدد کرنے والے سے اپنی عزت بچا کر نکلی تھی...... دیکھو میرے پیروں کو یہ تو اس دن سے ننگے ہیں اور سنگ میل عبور کررہے ہیں جب سے میرا باپ دفن ہوا ہے۔

اب کبھی ٹھنڈا موسم نہیں ہوگا میرے لیے کیونکہ میرا باپ مجھے اپنی موت کے ساتھ ہی سب ٹھنڈے موسم لے گیا تھا۔ بس یہ تپتی زمین جلتا آسمان اور یہ موسم گرما رہ گیا ہے میرے لیے، باپ کی شہزادی تھی میں پر اب چور، بھکارن ہوں اور

لوگ دھندے والی بنانا چاہتے ہیں، میرے لیے تو ہر موسم ''موسم گرما'' ہے ہر دن تیز دھوپ کا دن ہے، ہر لمحہ جون کی تپتی کی جلتی، تپتی، جھلساتی دھوپ ہے میرا سگا چچا جس نے میرے باپ کے مرنے والے دن میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا ''میں ہوں نہ تم لوگو کا سہارا......'' وہ اس موسم گرما میں مزید آگ لگا گیا میرے باپ کا سب کچھ لے گیا سوائے اس کی بیوہ اور اس کی چار بیٹیوں کے...... آنسو چہرے پر تھے پر ایک کے بعد ایک لفظ بتا تا چلا گیا کہ وہ کون سا گرمی کا موسم جھیل رہی ہے......اس نے دوسرے ہاتھ سے اس شخص کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے ہٹایا اور ننگے پاؤں ہی دروازہ عبور کر گئی۔

......❀☆❀......

ذرا سی کنی

صدرا قریشی

زندہ رہنے کی تمنا میرے اندر ہمیشہ اسے دیکھ کر ہوک بھرنے لگتی' میں کالا بھنا' بھدا سا جسم' موٹے چھوٹے ہاتھ' دوشاخہ انگلیاں' بڑی بڑی آنکھیں' اطفل ٹاور سی ایستادہ رخسار کے تختہ دار پر بھدی سی ناک' پتلی پتلی ٹانگیں' لباس ہمیشہ ریت ومٹی کے ملغوبے میں اٹا' جسد خاکی ہڈیوں کا ڈھانچہ اور وہ ماہ پروز وہ ماہ رخ جس کا ذکر میں نے ابتدا میں کیا۔ اس کی ادنی سی توجہ میرے سارے دن کو طمانیت کے لبادے میں فرحت وشاد رکھتی۔ میں یہ بات صیغہ راز رکھتا کہ وہ مجھے اکثر سوکھے نان' پھیکا بدمزہ کم یا زیادہ نمک والا سالن بصورت تحفہ پیش کرتی اور میں وہ اس سے ایسے وصول کرتا جیسے رب کے آگے کوئی باادب بیٹھا اظہار تکریم سجدۂ شکر بجالائے۔

اس دوران وہ ماہ رخ مجھے پانچ سے دس' دس سے کبھی کبھی ایک منٹ بھی ہو ہی جاتا اپنے دیدار کی لذت سے شیر وشکر کر جاتی۔ میں ایسے سیر ہوتا جیسے کوئی شدید پیاس کا مارا ابھرا جگ پانی کا خالی کردے۔ میری زیست بس اس ماہ رخ کے گرد گھومتی' میری بے تاب آنکھیں شب کے اس پہر کا کسی چوکنے نگران گر کی طرح انتظار کرتیں۔ وہ مجھے دیکھ کر کبھی کبھی تو ہنستی ہی جاتی اور میں وہ نظارہ اپنی پتلیوں کے فرش پر کسی کیمرے کی طرح محفوظ کرتا جاتا۔ کبھی کبھی نخوت سے دیکھ کر سر بھی جھٹک ڈالتی' میں کسی مشتاق رفیق کی طرح ''ذرا ٹھہرو'' کی گردان کرتا ہاتھ ہلاتا رہ جاتا اور وہ باد صبا کے سرعت سے آتے جھونکے کی مانند بے نیازی دکھاتی لمحوں میں کوچ کر جاتی۔ اس کی بالکونی میرے لیے گوشہ عافیت' اس کے گھر کے اوپر منڈلاتی بوگن ویلیا کی شاخیں میرے لیے استقبالیہ میزبان' اس کے نین نقش میرے لیے طشتری میں پڑے سنہرے پرت' اس کے گیسو باخدا چاند کی چاندنی میں لپٹے ماہ کامل تھے میرے لیے۔ میں جو بھی تھا اس کے لیے......خبط الحواس بوڑھا' نادان بچہ' بدصورت انسان' خاک زدہ فقیر' اجڑ اور رخت' جو بھی تھا کچھ تو تھا میں اس کے لیے یہی میری سچی خواہش کے ضامن کے لیے بہت تھا۔ میرا حلیہ کسی مجنوں سے بھی بدتر تھا کہ میں نے آج مہینے کے نصف دن بعد اس کو دیکھا تھا' جانے وہ ماہ پرور خدا ترس تھی یا میری ذات اس کے لیے تسکین کا کوئی چھوٹا سا بادل کا ٹکرا' بہرحال آج وہ میرے لیے کناروں سے بچی روٹی اور پکوڑے لائی تھی۔ اس من وسلویٰ کو کسی اخبار کے ورق' کاغذ یا کپڑے میں لپیٹنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی ہوا کے دوش پر لہرا کر اس رزق کو میری جانب اچھالا گیا تھا۔ میں بڑی حسرت سے' رشک سے اس طرف لپکتا بڑھا تھا لیکن ہوا کیا......؟ میرا وہ محبوب رزق' مری زندگی کا حاصل کالے بھدے کوے سبک رفتاری سے اڑا کر لے گئے میں نے ان چالاک کوؤں کو ملعون کا خطاب دیا اور حد درجہ بے دلی سے اس تنکوں سے بنی جھونپڑی کی جانب قدم بڑھانے لگا جو اس ماہ پرور کے آشیاں سے دو گلیوں' بازاروں کی مختصر راہداری اور دو سڑکوں کو عبور کرنے

کے بعد آتی تھی جب گھر پہنچا تو کونے میں دبک کر ذہن کے پردے پر اس ماہ رخ کی لانبی انگلیوں میں دبی روئی کے پھینکنے کے منظر کو تازہ کرنے لگا۔ اس عالم بے خودی میں کب نیند نے اپنی آغوش میں دابا پتا ہی نہیں چلا۔ جھکے کاندھوں سے جھونپڑی کے درزوں سے جھانکتی روشنی کو خوش آمدید کہتا' کاغذوں کی کرچیاں چنتا' انہیں تھیلے میں بھرتا' منہ ہی منہ میں کچھ ایسے مصرعے گنگناتا جو بس مری سمجھ تک ہی محدود تھے پھر سے اس شناسا منزل کی جانب پاؤں رکھنے لگا تھا۔ چلئے ذرا اس قصے کے تھوڑا آغاز کی طرف جاتے ہیں' میں جھونپڑی میں پیدا ہوا' صورت ایسی کہ دنیا میں لانے والے میرے اماں باوا نے دوبارہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی' مری مقدس بہن جو مجھ سے پانچ برس بڑی تھی نے مجھے ممتا کی تھوڑی بہت گرمی بخشی بس بطن سے ایسے نکلا ماں کے پھر تو احسان کی سولی پر چڑھا دیا گیا۔ ایسے ہی پلتے بڑھتے میرا تعارف اس ماہ پرور سے ہو گیا بس زندگی کا ساماں ہو گیا۔ جینے کی تمنا طوالت کی شدت اختیار کرنے لگی وہ میری نادیدہ خواہشوں سے باگھ بکری کی طرح نبٹتی اور میں کسی کمزور میمنے کی طرح اس کی جانب کھنچتا جاتا...... کھنچتا جاتا۔

اس کا گھر بڑی عالی شان تھا' پر مجھے اس سے کیا غرض میرا دل و دماغ تو اس کے سراپے میں ہی الجھا رہتا بلا وجہ اس کے لیے لمبی عمر کی دعائیں کرتا' اس کی خواہشات پوری ہونے کی جہد میں لگا رہتا۔ ایک دفعہ وہ نیچے آئی بالکونی سے' آنکھوں کا تصادم ہوا جوانی کے بڑھتے طول وعرض پر وجدان کے ہاتھوں میں ملی یکدم سانس بیدار ہوئی۔ وہ مجھ سے خوفزدہ نہ ہوتی' گھن کھاتی تھی شاید' حیوانوں کی طرح میرے آگے دانہ پیش کرتی۔ میں اس کے آگے جھکتا' ہاتھ جوڑتا وہ مسکرا دیتی۔ اس کے گرد کوئی جانور' کوئی آوارہ انسان اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا۔ میں جان لیوا حد تک اس کی درگت بنا دیتا' میرے جسم کے ہر نظام کا دارومدار اس کی خوشی پر تھا' اس کا چہرہ مجھے محو خواب ہونے سے روکتا سو میں نے اپنی شب گزاری بھی بلا معاوضہ اس کو دان کر دی۔ کبھی کبھی دن میں تو کبھی رات کے کسی پہر میرا معدہ آہ و زاری کرنے لگتا۔ میں تغافل برتتا' اچانک میری زندگی میں ایک لفظ ''شادی'' طبیب کی صورت آ گیا' مری مقدس بہن نے مجھے خود اس لفظ کی حقیقت بتائی تو ایسی غذا کا رس مرے رگ و پے میں سرائیت کرنے لگا جو شہد سی طمانیت' بادشاہوں سی امیدی ودیعت کر دیتا ہے بس اس وقت مجھے لگا وہ ماہ پرور اب ہمیشہ کے لیے مجھے مل سکتی ہے۔ فریب کے رویے میں محبت کسی مفکر کی طرح مجھ معصوم پر طعنے کسنے لگی۔ میں مضحکہ خیز منہ بنائے کسی روگی سا بھیس دھارے اسے اپنے اندر جذب کرتا رہا۔

میں اس ماہ پرور کے تصور میں رہنے والا جوانی کے تخت پر قدم رکھتا ایسا نوجوان تھا جو اندر سے دو سال کے بچے کی طرح تھا' میرا دل چھتا بناتا اور وہ ماہ رخ میرے خیالوں میں شہد جمع کرتی' چہار سو منڈلاتی رہتی۔ ایک دفعہ اس ماہ پرور کو زخمی کتے کی گرفت سے بچایا جو بلی ہی پڑا تھا اس پر' اس نے جان بچانے پر اپنے ہاتھ کالمس میرے رخسار پر رکھ دیا' بس وہ وقت ایسا تھا جس نے اس کے عشق میں مجھے مکمل بیمار بنا دیا۔ دو متضاد کیفیات رکھنے والے نفوس ایک ہی درخت کے سائے تلے پرورش پا نہیں سکتے۔

آج موسم میں بلا کی حدت تھی' مکاں' مسجدیں' روسا و امراء ہر شے' ہر شخص اپنی دنیا میں مگن تھا۔ ہوائیں خاکستر اڑاتی میرے روز کی نسبت آج کے بہتر لباس کا پراگندہ کرنے کے درپے تھی اور وہ ماہ رخ اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت میرے سامنے کسی مسجد کے اونچے ستون کی طرح کھڑی ہو گئی میں نے کہا۔

''اپنا دل مجھے دے دوگی۔'' اس نے جواباً ایک چاولوں کی پرات میرے سامنے رکھ دی اور ایک پانی کا پیالہ' پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔

''تم پلید سمندر ہو اور میں متحرک جل پری جو کبھی ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے۔ جیسے شاہ بلوط اور صنوبر کے درخت ایک ہی کنج میں پیدا ہوتے ہیں (بقول جبران کے) اور ایک ہی ہوا ایک ہی زمین پر پرورش پاتے ہیں مگر ایک دوسرے

کی شاخوں کے سائے میں پرورش نہیں پاسکتے۔'' میں نے دیوانہ وار چاولوں کو آڑھا ترچھا منہ میں ٹھونسنا شروع کردیا' میرا بطن کھینچا تھا۔ اس ماہ پرور نے عجیب ترحم آمیز نگاہوں سے مری جانب دیکھا تھا جن میں نفرت کی چنگاریوں کا بھی سیل رواں تھا۔

ایسا کیوں تھا؟ میں نے نفرت وحقارت سے اس پیالے کو ہاتھ سے پرے کیا اور اپنی مقدس بہن کی سمت بھاگا۔ میرے کپڑوں پر چاولوں کے دانے چپکے تھے جا بجا' کچے کئی زدہ چاولوں کے' گویا انتڑیوں کو کسی نے سکڑ کر یکجا کرنے کی کوشش کی ہو اور کوشش ناکام رہ گئی۔ مری ناکام محبت کی طرح' میرا پورا پیٹ کسی کچے گھڑے کی طرح کھول کر باہر کی طرف لاوے کی صورت ابل پڑا' ناخدا بن گیا' معبد بنا بیٹھا۔ لات ومنات جیسے بتوں کی اسیری میں رہ گیا' اس ماہ پرور کی پرستش کی جو خود اس خالق کے دست مبارک سے بنی ایک ادنی سی شے تھی' واحد وہ بس جو تمام عبادتوں کے لائق ہے۔

وقت آخر ہضم شدہ چاولوں کی صورت دونوں کی محبت میں بس باقی رہ گئی تھی ''ذرا سی کنی......''

کسی اجڑے ہوئے درخت جیسی

ہے محبت بھی مری قریشی

میرے بخت جیسی......

بعد میرے وہ ماہ پرور پانچ برس زندہ رہی مع جسم کے بغیر روح کے۔

......❀☆❀......

مہرہ

سیما بنت عاصم

ساحل سمندر سے قریب تر اوپن ایئر ریستوران میں احتشام اور روبی آمنے سامنے بیٹھے تھے روبی کچھ دیر اس کے بولنے کی منتظر رہی مگر جب خاموشی طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی تو اسے لب کشائی کرنا ہی پڑی۔

''نادر نے میری زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے جو پیسہ اسے صرف اور صرف میری بدولت حاصل ہے میں اس کی پائی پائی کو ترستی ہوں، میری حسن و جوانی کو کیش کر کے وہ کانٹریکٹ پر کانٹریکٹ حاصل کرتا ہے جواب میں مجھے کیا حاصل ہے ایک ترستی ہوئی زندگی اس کے پاس میری کچھ ایسی کمزوریاں ہیں کہ میں اس کے جال سے نکلنا بھی چاہوں تو نہیں نکل سکتی مگر اب مزید اس کے ہاتھ کھلونا بننا مجھے منظور نہیں اسے مر ہی جانا چاہیے اس کی موت کے بعد سب کچھ خود بخود میرا ہو جائے گا۔''

احتشام جانتا تھا وہ سدا سے ایسی ہی بزنس مائنڈڈ تھی وہ زندگی کو جائز و ناجائز سے بالاتر ہو کر گزارنے کی قائل تھی اور شاید یہی اس کی بھاری جیب کا راز تھا نام کو سہی مگر وہ اک مالدار زندگی کا سمبل تھی اور اس کی زندگی کی تمام تلخیوں میں اک کڑوا سچ یہ بھی تھا کہ اسے آج بھی اس سے شدید محبت تھی۔

احتشام نے بغور اسے ایک نظر دیکھا تھا سرخ لانگ اسکرٹ اور لائننگ والے بلاؤز میں اس کا چھریرا بدن اب قدرے بھرا بھرا سا لگتا تھا اس کے براؤن پرم کیے بال ساحل سمندر سے گزر کر آتی ہوا کی اٹکھیلیوں سے لہراتے پھر ٹھہر جاتے آنکھوں کے سیاہ گلاسز اس نے سر پر ٹکا رکھے تھے جاذب نظر چہرے پر عمر رفتہ نے کچھ لکیروں کا اضافہ ضرور کیا تھا مگر اس سے روبی کی دلکشی میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ احتشام جب اس سے ملتا اسے یونہی سالوں پیچھے پاتا، روبی احتشام کی

ٹھیکرے کی مانگ تھی اس نے ہمیشہ اپنا نام روبی کے نام کے ساتھ سنا اور اسی کے خواب دیکھے تھے مگر روبی کی پرواز بلند تھی اس نے احتشام کی محبت کو پہلا ڈاج جب دیا جب نوعمری میں وہ اپنے ایک قریبی بوائے فرینڈ کے ساتھ فرار ہوگئی تھی احتشام کے دل کو ٹھیس لگی اس نے لاکھ کوشش کی روبی کو بھلانے کی مگر روبی کی محبت اس کے اندر جڑ بنا چکی تھی۔

ہاں ان دنوں اسے لگتا کہ زندگی اس کے لیے ختم ہو کر رہ گئی ہے وہ کالج کا ہونہار اسٹوڈنٹ تھا مگر روبی کی بے وفائی نے اس سے اس کا اپنا آپ چھین لیا تھا اس کے سارے خواب ٹوٹ کر بکھر گئے تھے سگریٹ کی لت اسے انہی دنوں لگی تھی پھر وہ اپنی راہ سے بھٹک گیا بری گیدرنگ نے اسے وہ سب کچھ سکھا دیا جس کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا شاید وہ اس کا غم بھلانے کے لیے کچھ اور آگے بڑھ جاتا۔

مگر روبی اپنے قریبی بوائے فرینڈ سے دھوکا کھا کر لوٹ آئی تھی۔

اس نے احتشام کے قدموں میں بیٹھ کر چند آنسو بہائے تھے اور احتشام کا دل موم ہوگیا مگر بس یہ کچھ عرصہ کی بات تھی رسی کے کس بل ابھی باقی تھے اس بار روبی نے اپنے آفس کے بوڑھے باس پر ڈورے ڈالے تھے جس نے روبی کے حسن و جوانی پر فریفتہ ہو کر اس سے شادی کر تو لی مگر اس پر روبی کی فطرت واضح عیاں تھا سو وہ اسے وہیں رکھتا جہاں رکھنا چاہیے یہاں تک بھی ٹھیک تھا مگر ایک حادثے میں وہ بوڑھا اپنی دونوں ٹانگیں گنوا بیٹھا وہیل چیئر اس کا نصیب بن گئی تو اس کے کاروبار کا سارا بار روبی کے سر آ پڑا اس بار بھی روبی کے دماغ میں یہی کیڑا کلبلایا تھا جب سارے کاروبار کی باگ دوڑ اس کے ہاتھ ہے تو اسے ایک بوڑھے محتاج شوہر کو پالنے کی کیا ضرورت ہے اس کے طفیل اس کے شوہر کو ہزار فوائد حاصل ہیں جواب میں اس کی زندگی کسی بے آب و گیاہ صحرا کی مانند ہے۔

روبی اک عرصہ سے روپوش تھی احتشام نے بھی اسے نہیں کھوجا شاید وہ اس کے ہرجائی پن کو سمجھ گیا تھا اور اس بار اسے یقین تھا کہ وہ روبی کو بھول جائے گا اسے اس کی شکل سے بھی نفرت ہوجائے گی لیکن روبی ایک بار پھر اس کے قدموں میں آ بیٹھی، تو اسے لگا اس کے اندر جمی برف آہستہ آہستہ پگھل گئی ہے اسے روبی سے شدید محبت تھی اور روبی اسی محبت کا فائدہ اٹھاتی احتشام جانتا تھا روبی کے پاس جو کچھ ہے سب اسی بوڑھے شوہر کا ہے جسے راستے سے ہٹانے کے لیے اس نے روبی کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

علی الصبح وہ فلیٹ کی چوتھی منزل کی بالکونی سے ہاکر سے اخبار لینے کے لیے جھکتا تھا احتشام نے اسی بالکونی کے پیچ ڈھیلے کر دیے تھے اس بار وہ اخبار لینے کے لیے جھکا تو اوندھے منہ گر پڑا اس کا بوڑھا وجود کرچی کرچی ہوگیا تھا اس کی موت کو حادثاتی رنگ دینے میں سارا کمال روبی کی ہشیاری کا تھا احتشام کو خوب یاد تھا اس اندوہناک حادثے کے نقش مدہم پڑنے کے بعد روبی اپنے بوڑھے شوہر کے بزنس پارٹنر نادر کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کسی ہل اسٹیشن چلی گئی تھی۔

احتشام کے دل کو ایک بار پھر ٹھیس لگی تھی، مگر اب وہ تقریباً اس کے اس ہرجائی پن کا عادی ہوگیا تھا آخر اسے یہ یقین ہوگیا کہ روبی کے تمام ہرجائی پن کے باوجود وہ روبی کو نہیں بھول سکتا نہ ہی اس سے نفرت کرسکتا ہے روبی کی محبت آج بھی اس کے دل میں روز اول جیسی ہے وہ اب بھی اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتا۔

اور آج روبی پھر اس کے سامنے تھی۔

اس نے احتشام کے سامنے ٹیبل پر ایک موٹی گڈی اور کچھ چابیاں رکھی تھیں۔

''یہ گھر اور کرولا کی ڈپلی کیٹ چابیاں ہیں اور یہ کچھ پیسہ تمہارے اس کام کا معاوضہ۔''

''معاوضہ کیا میں نے تم سے کبھی کسی بھی کام کا معاوضہ طلب کیا ہے۔'' احتشام نے گڈی کی جانب نظر تک نہ ڈالی تھی یا میرے اور تمہارے درمیان کبھی پیسہ آیا ہے۔''

''نہیں مگر جو بھروسا میں تم پر کر سکتی ہوں کسی کرائے کے قاتل پر نہیں کر سکتی، یہ اسی بھروسے کی قیمت سمجھو۔''
''قیمت محبت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی محبت تو انمول ہوتی ہے روبی۔''
''سب یہیں...... یہیں مات کھا جاتے ہیں تم جیسے لوگ زندگی انجوائے منٹ کا نام ہے اور انجوائے منٹ پیسے کے بغیر ناممکن ہے اگر اک کامیاب زندگی گزارنا چاہتے ہو تو اپنے دل سے جذبات کو نوچ پھینکو۔ یہ محبت بھروسا وفا یہ لفظ کتابوں میں سجتے ہیں یہ سب بے مول باتیں ہیں انسان کو ناکارہ بنا دیتی ہیں تم اپنی ذاتی زندگی میں ناکام ہو تو یہ سارے خسارے تمہارے اپنے خریدے ہوئے ہیں والدین گزر گئے بہنیں دور جا بسیں بھائیوں نے آبائی گھر کے دام کھرے کر لیے تمہارے پاس کیا رہا تم نے بھی خود کو کیش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔''
احتشام خاموشی سے سنتا رہا کیسے کہتا اس کے لیے زندگی اپنے معنی کھو بیٹھی ہے اسے اس سب کی خواہش ہی نہیں رہی روبی کی پے در پے کج ادائیوں نے اس کا خانہ دل ویران کر دیا تھا وہ بھٹک گیا تھا لوٹ مار جوا خانہ بار روم اس کی زندگی اسی محور کے گرد گھومتی، اس کی لوٹ مار کا انحصار اس کی جیب کے خالی پن پر رہتا پھر اگلی واردات بھی اسی خالی پن کے تحت رہتی۔
روبی کہتی رہی ''اگر تم اپنی جیسی کسی لڑکی کو زندگی میں شامل کر لیتے تو شاید تمہاری زندگی مختلف ہوتی۔''
''اپنی جیسی۔'' احتشام کے دل کو ٹھیس لگی ہاں اس کے نزدیک احتشام کی یہی اوقات تھی مفلس وقلاش ناکام وناکارہ انسان۔
''یہ بھی کوئی زندگی ہے جہاں رات پڑی سو گئے۔ بھوک لگی کھا لیا نہ گھر نہ ٹھکانہ نہ ہی کوئی اسٹیٹس۔'' وہ استہزائیہ ہنسی تھی۔
احتشام نے بغور اسے دیکھا روبی کے زیر لب اک بھورا تل اب بھی کھلکھلاتا تھا کبھی اس تل پر وہ جان دیتا تھا۔
''نادر نے مجھے محبت کا جھانسہ دے کر پھنسایا تھا اس کے نزدیک میں سونے کا انڈہ دینے والی مرغی تھی یہ بات اب مجھ پر کھلی نادر کو مجھ سے محبت نہیں میں تو بس ایک مہرہ ہوں اک آلہ کار وہ مجھے محبت کا ڈاج دے کر نئے جہانوں کی سیر کرتا پھرتا ہے اک ترستی زندگی میرا نصیب بن گئی ہے۔
مگر اب نہیں میرا فیصلہ ہے
زخم جب ناسور بن جائے تو عضو کاٹ کر پھینک دینا چاہیے تمہیں اس کی سرخ کرولا کے بریک فیل کرنے ہیں میرا خیال ہے تمہیں طریقہ واردات، سمجھانے کی تو ضرورت نہیں واچ مین کو میں کسی بہانے چھٹی دے دوں گی باقی تم سنبھال لینا مگر دھیان سے ہماری پارکنگ میں دو سرخ کرولائیں اسے میرے لیے ہر چیز اپنے جیسی خریدنے کا خبط ہے کل وہ علی الصبح گھر سے نکلے گا اس نے مجھ سے کسی بزنس ٹرپ کا بہانہ کیا ہے مگر میں جانتی ہوں وہ اپنی سیکرٹری کے ساتھ رنگ رلیاں منانے ہل پوائنٹ جا رہا ہے یہ حادثہ اس وقت ہوگا جب میں آفس کے راستے میں ہوں گی تقریباً دس سے گیارہ بجے مجھے کل کے اخبار میں نادر کی کرولا شمالی علاقہ جات کی اتھاہ گہرائیوں میں گرنے کی خبر چاہیے۔''
روبی اپنا سرخ اسکرٹ پھڑ پھڑاتی احتشام کے سامنے سے گزر کر اوپن ایئر ریستوران سے نکلتی چلی گئی تھی احتشام نے کرسی کی بیک سے پشت ٹکا کر اک نظر نچلی جانب ڈالی تھی روبی سبک خرام ہوا کی مانند سیڑھیاں اترتی پارکنگ تک گئی تھی اور پھر اس کی سرخ کرولا پیک ہو کر گزرنے پر احتشام کی نظر کرولا کی نمبر پلیٹ پر ٹک کر رہ گئی تھی۔ یہ اسی رات کی بات تھی جب پلان کے مطابق محافظ کتوں کو نشہ آور پارچے کھلا کر احتشام نے ٹارچ کی مدد سے بغور سرخ کرولا کی نمبر پلیٹ پڑھ کر ہی اس کے بریک فیل کیے تھے۔
اگلے روز کے اخبار میں سرخ کرولا کے حادثے کی خبر واضح تھی یہ حادثہ اس وقت پیش آیا جب روبی نادر کے آفس

کے سفر میں تھی وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگئی تھی کیونکہ احتشام نے نادر کی نہیں روبی کی کرولا کے بریک فیل کیے تھے۔
روبی کو اس سے محبت نہیں وہ تو بس اک مہرہ ہے اک آلہ کار اور آخر کار یہ بات احتشام کی سمجھ میں آ ہی گئی تھی۔

بس یہی ھے زندگی

ام اقصیٰ

صغیر احمد کا پروپوزل تھا ہی ایسا کہ جس نے سنا دانتوں تلے انگلیاں داب لیں۔ جو بچپن کے پیٹے میں تھے وہ اور کہنے کو یہ ان کی دوسری شادی تھی۔ دو جوان بیٹے اور بیٹی تھی۔ پرہینڈسم غضب کے تھے۔ ہلکی فرنچ کٹ داڑھی، گھنے آگے سے قدرے لمبے بال، بادامی آنکھیں اور خوب صورت کے سفید رنگت...... حسین دوشیزائیں اس کے سامنے ٹھہر جاتیں تو لڑکے بالے کترا کے نکل لیتے۔ بڑھتی عمر انہیں اور زیادہ باوقار بناتی چلی گئی۔
ان کی جوانی کے دور میں لڑکیاں انہیں دیکھ دیکھ کر جیتیں اور جی جی کے مرتیں۔ بہانے بہانے سے سامنے آتیں۔ فلرٹ نہیں تھے۔ مگر لڑکیوں کی اپنی طرف اٹھتی نظروں کو مایوس بھی نہ لوٹاتے تھے۔ ماں باپ کو خدا نے اتنا نوازا تھا کہ دو وقت کی روٹی باآسانی پوری ہوتی۔ تیسرے ٹائم کی روٹی، یا کسی عیاشی کی صورت کچھ دن ایک ٹائم کے کھانے پر گزارا کیا جاتا۔
صغیر احمد کو البتہ اللہ نے مکمل کر نوازا تھا۔ جوانی میں ایک دو معاشقے بھی کیے۔ لیکن شادی ماں باپ کی پسند سے اور ان کی پسند کی ہوئی لڑکی سونیا سے کی اور نبھائی بھی...... کچھ سونیا کو بھی قابو کرنا آتا تھا۔ خوب صورت تو خاص نہ تھی۔ سانولی نمکین سی صورت، لمبی صراحی دار گردن، سلم اسمارٹ، پتلے لمبے ہاتھ ملا کر پرکشش دکھتی...... صغیر احمد کے خاندان کی پہلی میٹرک پاس تھی وہ...... بیٹا...... پھر بیٹا اور بیٹی خوب صورت ستھری اور فرمان بردار اولاد تبھی تو صغیر احمد ہر وقت سونیا کے گن گاتے نظر آتے۔
سونی ایسے کرلیں...... سونی آپ بتائیں ناں...... سونی سے پوچھ لیں۔ وہ سب کے سامنے اسے سونی بلاتے...... برملا بلاتے...... بارہا بلاتے۔
دونوں کی جوڑی تھی بھی ایسی کہ رشک کرنے والے بھی حسد کر بیٹھتے...... اخلاق کے دونوں اچھے تھے۔ خاندان بھر سے میل ملن رکھتے...... اپنی گاڑی تھی کسی کو کانٹا تک چبھتا تو فوراً گاڑی نکال کر پوچھنے چل دیتے...... بچے ذرا بڑے ہوئے تو صغیر احمد نے کل مختار سونیا کے ہاتھ میں دے دیا۔ خود خاموشی سے تعمیل کرتے وہ کہے جاتی یہ مانے جاتے...... سوئٹزرلینڈ کی سیر...... دو عمرے...... ایک حج...... اور تو اور بیٹے کو بیس سال کی عمر میں بیاہ ڈالا...... بہو کی موجودگی میں سونیا ساس تو کہیں سے نہ لگتی اور صغیر احمد بھی بیٹے کا بڑا بھائی لگتا...... دونوں کی جوڑی مانو ایلفی سے جڑی لگتی۔ اٹوٹ بندھن...... مگر

❀ ❀ ❀ ❀
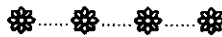
ایک دن سونیا وفات پا گئی...... کیسے؟ جیسے سب مرتے ہیں ایسے۔ موت نے جواز ڈھونڈا...... ہارٹ اٹیک...... اور آن دبوچا۔
بچوں اور خود صغیر احمد کا رو رو کر برا حال تھا۔ موت نے رونا دیکھا ہے کبھی۔ سونیا نے بچے پالے نہیں تھے۔ ہاتھ کا

چھالا بنا کر رکھے ہوئے تھے۔ ذائقے اور چٹخارے کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ خوراک براہ راست بچوں کے معدوں میں انڈیلتی ...... چبانے اور نگلنے کی مشقت۔ بچوں کو نہ جھیلنے دیتی۔ لاڈ اور اخلاق واطوار دو چیزیں اس نے بچوں میں کوٹ کوٹ کر بھر رکھی تھیں۔ تو ایسی ماں کی وفات پر بچے کیوں نہ رو رو کر بے حال ہوتے۔ چھوٹے بیٹے کو چودھواں سال لگا تھا۔ مگر ابھی تک ماں کی گود میں سوتا ...... تیرہ سال کی بیٹی کنگھا پکڑنے تک سے نابلد تھی۔

بیٹا بچھڑی کونج بنا تھا ...... تو بیٹی بھی ہرنی سی کونے میں پڑی رہتی۔

صغیر احمد نے چار دن آنسو بہائے۔ ماں زندہ تھی۔ بیٹے کے آنسو نہ دیکھ پائی اور نئی بہو کی تلاش شروع کر دی۔

ٹھیک تینتیسویں دن صغیر احمد کا اپنی سے آدھی عمر کی لڑکی سے نکاح انجام پایا۔ بچے آنسو کی زبان سے پوچھتے رہ گئے ...... پاپا آپ کو تو بیوی مل گئی۔ ہمیں ماں کہاں سے ملے گی؟ دو چار دن ہم آہنگی میں گزرے اور وہی صغیر احمد زینب فاطمہ کو جگہ جگہ لیے پھرے۔

بس یہی تو ہے زندگی کبھی پہاڑ سی کاٹتے جاؤ نہ کٹے۔ کب کام انجام کو پہنچے۔ ذمہ داریاں ختم ...... فرض ادا ...... لیکن زندگی ہے کہ موجود ہے۔

اور کبھی اتنی مختصر کہ ...... گلاس کے پیندے سی ...... نکلتی کونپل جتنی ...... اور اس افسانے سی مختصر۔

......❀☆❀......

میونئیے

تنویر خلیل

کہانیاں برسوں صدیوں سے بلکہ ابتدائے زمانے سے چلی آ رہی ہیں کس نے کس کو قتل کیا ...... اک کہانی ...... مجنوں اور لیلیٰ ملے یا پھر ہجر کے برزخ میں جلتے رہے ...... اک کہانی۔

کہانی دنیا کی اہم چیز ہے بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ کہانی ہی دراصل دنیا ہے۔ خواہ وہ ناول ہو افسانہ ہو داستان یا پھر لوگ کتھا۔ لوک کہانی اپنے اندر عجیب سی جاذبیت اور ایک قسم کی فسوں سموئے ہوتی ہے۔ کسی علاقے میں مشہور کہانی ''لوک کتھا'' کہلاتی ہے۔ لوک کتھا کو افسانے کی شکل دینا یاد نہیں کسی ''ادیب'' نے کیا ہوگا۔ مگر میرا خیال ہے کہ لوک کہانی کو افسانے کی شکل دینا ایک خوبصورت بلکہ فسوں خیز انداز ہے۔

میری خواہش تھی کہ پشاور کے دور افتادہ علاقے کی لوک کہانی کو افسانے کی شکل دوں۔ پشتو کا لوک گیت '' کچھ عرصہ دہ میموییے حلالہ دعانا'' کے اندر اس کو لوک داستان میموییے کی ساری کہانی ہے۔ اس پشتو لوک داستان کو ڈاکٹر خاطر غزنوی نے ترجمہ کیا ہے۔ محمد ابراہیم بیگ المعروف خاطر غزنوی پشاور کے ایک مایہ ناز صحافی، ادیب، شاعر، تشکیل نگار، مصور، مجسمہ ساز اور مترجم تھے۔ ان کی یہ لوک کہانی پشاور بورڈ کے دسویں کلاس کے درسی اردو نصاب میں بھی شامل ہے۔ خاطر صاحب اس داستان کے ابتدائی پیراگرف میں لکھتے ہیں۔

''شاید ہی کوئی پشتو بولنے والا شخص ایسا ہو جو پشتو کے مشہور لوک گیت '' کچھ عرصہ دہ میموئیے حلالہ دعانا!'' سے آشنا نہ ہو۔ اس گیت کا اس داستان میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کا تانا بانا ہی اس داستان نے بنا۔''

ہم اس داستان اس افسانے کی بہت عقیدت صرف میموئیے کی قربانی کو مانتے ہیں۔ شیر عالم کا اسے ذبح کرنا کوئی انوکھی اور نئی بات نہیں۔ ہمارا معاشرہ ابھی بھی اس جیسے واقعات سے خالی نہیں۔ خاطر صاحب نے اس داستان کو ایسے

لکھا کہ جیسے دریا کو کوزے میں بند کیا۔
میں نے اس افسانے میں بہت سے ایسے منظر شامل کئے ہیں جس کا میرے خیال میں اس داستان سے کہیں بھی کوئی تعلق نہ ہو۔ کچھ کرداروں کا اضافہ بھی کیا کہانی پڑھتے ہوئے پہلے اپنے تخیل میں اس زمانے کی فضا قائم کرنا ضروری بلکہ کرنی چاہیئے۔ اور میں نے بھی اس کو پڑھتے ہوئے یہ کیا تھا۔ اور میں نے اس کہانی کو اس زمانے سے کتنا جوڑا ہے یہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے اور حرف آخر یوں کہ اردو ادب میں لوک کہانی کو افسانے کی شکل دینا کیسا تجربہ ہے آپ کے خطوط کا انتظار رہے گا۔
دعاؤں میں یاد رکھیے گا
دعا گو تنویر خلیل۔
دریچے کے پار روشنی گھٹ گھٹ کے رو رہی تھی تو دوسری طرف تاریکی فاتح عالم ٹھہری تھی۔
میمو بیبئے ندی کے کگر پر خود رو زرد پیلے پھولوں کی ردا کو پاؤں تلے روندتی چلتی ہے اس نے سفید برقع پہن رکھا تھا ٹوپی کے اندر سے چھوٹے چھوٹے سوراخوں کے پار سے گاؤں پر ٹھہری شیالی دوپہر نظر آتی۔
''اللہ اللہ! آج تو رکیئے کے ہاں بھی جانا ہے اور وہ ذرعونہ بھی ناں ...... قسم سے جو صرف شام کو قہوے پہ بلائے رات کو تو گل مینے کے ہاں ٹپوں کی محفل خوب ٹھک کے جمتی ہیں اور وہ بھی قسم ایک دن بھی ذکر نہ کریں کہ جیسے ہماری طرف وہ سورہ میں دی جائے گی۔''
پھر دفعتاً جیسے کچے بادام کے تیل کی خوشبو سی پھیل گئی گھوڑے کی ٹاپیں ابھری ندی کے کگر پر گھوڑا ہنہنایا میمو بیبئے نے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ شیر عالم کی سفید پگڑی کے جھالر دھول سے اٹے تھے سفید شلوار قمیص پر جگہ جگہ دھبے نمایاں تھے۔ اسے دل میں کچھ ڈوبنے کا احساس ہوا اور اپنے گھر کی راہ لی۔ پھاٹک آج صبح سے کھلا تھا۔ اندر جا کے اس نے دیکھا کہ کچے آنگن میں اس کی سہلیاں قہوہ بھرے فنجان سے لطف اندوز ہو رہی تھی ان کے منہ بند نہ تھے۔
''میمو بیبئے آج صبح تاج بی بی نے کہا تھا کہ تم ہمارے گھر تشریف آوری کر رہی ہو واللہ! ہمیں اگر پتہ ہوتا تو ہم ایک عدد دعوت ہی رکھ لیتے۔''
''دعوت۔''
''اری پگلی! تمہاری تاریخ گل مست کا کانے طے کردی ہے اگلے جمعے کو تمہارا نکاح ہے شیر عالم کے ساتھ۔'' ذرعونہ نے فنجان دری پر دھرا اور سکے سے اپنے ساتھ بیٹھایا۔
''پتا ہے گاؤں والے آج اس حسین عالم کی زندگی کے اس غلط فیصلے پر کتنے رنجیدہ ہیں' گاؤں کے بہت سے خوبصورت بانکے تمہاری راہ کی دھول بننا پسند کرتے ہیں اور تمہیں اس سیاہ بھنورے کی دھول بنا دیا گیا۔'' گل مینہ کا درد سب سے افضل معلوم ہوتا تھا۔
شیر عالم میمو بیبئے کے ماموں کا لڑکا تھا۔ ہٹا کٹا صحت مند' سیاہی مائل رنگت' چہرے پر چیچک کے داغ اور کرخت آواز کے ساتھ ساتھ چال کی بے ڈھنگی میمو بیبئے اس کے ساتھ منسوب تھی۔
''خوب معلوم ہے! اور تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ بعض اوقات ہمارے بزرگ ہمارے فیصلے محض انا کی تسکین اور زبان کی پاسداری کے لیے کرتے ہیں خواہ خواہش موت کا ذائقہ کیوں نہ چکھ لے۔'' میمو بیبے کی روکھی آواز تھی۔ زرینہ ہنسی۔
''اور ہر غیرت مند پٹھان بزرگوں کے فیصلے کی پاسداری کرنا خوب جانتا ہے۔'' میمو بیبئے کے سرخ دودھیا رخسار پر ایک عجیب سی فضا ٹھہری۔ اسے نام دینا میرا قلم گوارا نہیں کر رہا۔ اس کے قندھاری انار کے سے ہونٹ جیسے رعشہ زدہ

لگتے۔ آشفتہ دل فگار ہونے لگتا اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ پٹھانی اس رشتے سے راضی نہ ہو۔
حذاقت کی ڈھولنے کے بات نہیں وہ آنے والے کل سے خوف زدہ بھی نہیں...... مشرقی حیا کی دیوی اس کے قدم چھو رہی تھی اور میمونے کو اپنی یہ قدر دانی سراسیمگی میں دھکیل رہی تھی۔
سراسیمگی آشفتگی......
ذرعونہ اٹھی اور تاج بی بی سے آٹا لے کر پیڑ اپنانے لگی۔
''لاؤ میں بناتی ہوں۔'' میموپیے آگے بڑھی ذرعونہ نے ذرا سا اسے پرے کیا تھا۔
''تم آج کے بعد دلہن ہو اور دلہن سے کام لینا ہمارے رواج کا حصہ نہیں۔''
ذرعونہ روٹیاں پکاتی ہے' گل بینہ سالن بنائے گی زرینہ مہندی کے دوپٹے پر گوٹہ کناری کرے گی اور شبنم ذرا سا مویشیوں کو چارہ ڈالے گی۔'' افق پر جیسے ساب کی نیلاہٹیں سی ابھری اور چھاجو چھاج مینہ برسنا شروع ہوا۔
❀......❀......❀......❀
چاروں اور رات کی تاریکی پھیلی تھی۔ امبر پر تارے بکھرے تھے اور ان کے بیچ و بیچ منار کی نور پھوٹ رہی تھی گاؤں پر نقرئی فضا چھائی ہوئی تھی کچے آنگن میں چارپائی بچھائی گئی تھی۔ برآمدے کے ستونوں میں لائٹیں لگائی گئی تھی۔ طاقوں میں چراغ روشن تھے' چارپائیوں پر الفت بی بی ٹپے گارہی تھیں۔ تالیوں ہنسی پھلجڑیوں اور ہلکی ہلکی سرگوشیوں کا شور تھا۔
وہ دریچے کے ساتھ کھڑی تھی' آسمان پر نظریں لگائے اور جیسے اس پر نظر کرم کروا رہی تھی۔
''صبح کی باد نسیم میں' میں نے سوچا تھا۔''
شبنم نے سر اٹھایا۔ ''کیا سوچا تھا؟''
''ارے سانس تو لیجئے۔ باد نسیم کے مست جھونکوں نے مجھ سے کہا۔''
''تمہاری زلفوں کی مہک ہمیں مہکا رہی ہے اور تم اس کو مہکا رہی ہو جو اس وقت تک مہک سے آشنا نہیں ہے۔'' سرسراتی سانس نکلی سرسراہٹ سی ابھری تھی۔
''ذرعونے' گل مست کے ساتھ مولانا صیب آرہا ہے نکاح کے لیے' گھونگھٹ بنالوں لڑکیوں۔'' تاج بی بی پھولی سانسوں سمیت کہہ کر گئی تھی۔ گھونگھٹ بنایا۔ ذرعونہ' گل بینہ' زرینہ' شبنم رکیہ اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کی سانسیں مدھم تھی اور یہ سانسیں واقعی وفا نبھانے کا سندیسہ دے رہی تھی گالوں پر بکھری شفق کی سرخیاں اور اس پر چھائی رات کی تاریکیاں۔ بھلا کوئی گوارہ کرتا ہے چند لحوں بعد نکاح خواہ آیا نکاح پڑھایا۔
اور جب میموپیے آخری بار سر اثبات میں ہلا رہی تھی اس وقت حجرے میں یوسف خان' بیرام' برہان اور پرویز شیر عالم کو کونسا شروع ہوگئے تھے۔ وہ چاروں بھی میموپیے کے سنگم کے بارے میں سوچتے تھے۔ یوسف نے قہوہ بھرا فنجان میں اور ایک بڑی چسکی لی۔
''بے جوڑ بندھن' حسین دوشیزہ اور حبشی جوان!''
''شیر عالم سیاہ بھنورا اور وہ پری چہرہ۔ یہ شادی غیر منطقی ہے۔'' پرویز نے چلم کے دھویں میں جیسے من جلتے دیکھا...... اظہار خیال پیش کیا تھا۔
''دن اور رات میں فرق کو بھی گل مست نے نہ دیکھا۔''
اور پھر دنیا والوں نے بھی دیکھا میموپیے بانکوں کے دلوں پر تیل چھڑکتی شیر عالم کی ہی رہی اور سب نے بھولنا شروع کیا۔ خاموش ہوئے بھول گئے' بانکوں نے نئی راہیں اپنالیں۔ نئے در کے آگے رہنے لگے تھے۔

میمونیئے شادی کے بعد ایک وفاشعار بیوی ثابت ہوئی۔ حالانکہ دنیا والے اس جوڑے کے بندھن پر خوش نہ تھے' مگر عورت کے خمیر میں جیسے وفا کے ذرے شامل ہیں' وہ دھیرے دھیرے اس سے محبت کرنے لگی۔

حجرے کی شان اور بڑھی' شیر عالم کا وقار اور بھی بڑھا۔ اور اگر یاد ہوندی کے گھر پر اس کی پگڑی اور لباس جو دھول سے اٹے تھے۔ اب سفید کپڑے اجلے رہنے لگے' پگڑی میں خوب صورت جھالریں بجی۔ حجرے میں چلم زیادہ پیئے جاتے تھے' تمباکو کے لیے ایک خوب صورت تھیلی سی دی تھی۔ تھیلی کے رنگ برنگے تین موتیوں کی لڑیاں تھی۔ شیر عالم جب چلم پینے کے مرام سے حجرے میں بیٹھتا' تمباکو کے لیے بنائی گئی موتیوں ٹرے تھیلی سے تمباکو نکالتا تھا۔ تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی ریاست کا راج کمار ہیرے اور سونے کے پترے نکالتا ہو۔

شیر عالم کی بے ڈھنگی چال میں اکڑ پیدا ہوگئی۔ گھوڑا دوڑا تا دور چلا جاتا اور لوگ دیکھتے۔

''حسین دوشیزہ نے بدصورت لڑکے کو صورت دی۔''

❀ ...... ❀ ...... ❀ ...... ❀

صبح سے موسم پاگل ہو رہا تھا' چھاجوں چھاج مینہ برسنے کے بعد جب آفتاب نکلا تو یوں لگتا کہ جیسے کسی نے چہار سو سنہری مٹی بکھیر دی ہو۔

میمونئے نے دوپہر میں ذرعونے کو بلایا' سہہ پہر سمٹ کر گلابی آنچل میں دب کے سو گیا تو وہ ماں کے ہاں چلی گئی۔

حجرے میں آج مہمان ٹھہرے تھے۔ شیر عالم صبح سے دوسرے گاؤں زمینی مسئلوں پر نکلا تھا۔ گاؤں میں کسی کا مہمان بھی' سارے گاؤں والوں کے مہمان ٹھہرتے۔ کھانا کھایا گیا' قہوے کا دور چلا۔ چلم کے مرغولے اڑائے گئے تھے۔ تمباکو کم تھا اور چلم چاروں اور گھومتی رہی تو کم ہوا کریے گھر گیا۔ جب آیا تو تہی دست لوٹا۔ دوسرے کے گھر بھی گیا مگر شاید آج تمباکو کا ختم ہونا ہی مقصود تھا۔ مہمانوں میں سے کسی نے شیر عالم کا ذکر کیا' پوچھا گیا...... اس کے وقار' شان' رعب کی باتیں چھڑ گئیں۔ تمباکو کی تھیلی کا ذکر ہوا شیر عالم کے ہاں تمباکو کا شدید امکان تھا۔ کسی نے کریے بھائی شیر عالم سے تمباکو لانے کا کہا اس نے انکار کیا۔ اکیلی عورت ہے شیر عالم بھی یہاں نہیں ہیں۔ سوچا کیسے جا سکتا ہے۔

کسی بوڑھے نے کہا۔

''کریے بیٹا! شیر عالم کی بیوی کو بہن سمجھو اور جب تم سیدھے جہاں سیدھا!'' پاک من ہے تو پھر ڈر کا ہے کا۔''

''ہاں بھئی! تمہیں اپنے مہمانوں کا بھی خیال نہیں۔ گاؤں میں تو ویسے بھی تمباکو کی قحط ہے۔'' حجرے کے کونے میں دبکے بیٹھا' بھرائی آواز کے ساتھ تعصب' کینہ اور حسد سے گندھی آواز ابھری۔

اور ویسے بھی مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق کریے کو مجبور اجانا پڑا۔ کچی سڑکوں پر اوس کی پھواریں تقریباً بھیگ چکی تھی۔ اندھیرے کے منہ میں جیسے ساری گلیاں اور چوپارے استراحت فرما رہے تھے۔ اس رات کتوں نے ماحول پر عجیب سی دہشت طاری کر دی۔ گیدڑوں کی چیخیں یوں لگتی کہ پری زادوں کی محفل جمی ہے اور قہقہے لگائے جا رہے ہیں۔ لکڑی کے پھاٹک پر ہلکی سی ضرب پڑی۔ کریے کا دل چاہا کہ میمونئے نہ آئے اور ذرا ٹھہریئے۔ اندر گھر میں...... میمونئے......

دالان کے ستون میں لالٹین لٹکایا گیا تھا۔ اسے موہوم سی امید تھی کہ شیر عالم رات کو ہی آ جائے' اسی خیال سے وہ ابھی تک جاگ رہی تھی بستر میں ذہنی خیالات کے نگر میں محو پرواز تھیں۔ اور اس سوچ نگر میں اس کا شیر عالم ہی سمایا ہوا تھا۔ شیر عالم کی پگڑی کے شملے کی جھالریں ہوا اڑائے جا رہی تھیں۔ موتیوں اور منکوں جڑے حسین تھیلی جھملا رہی تھی اور چھوٹی چھوٹی منگولین سی آنکھوں میں گل کی پتلی پتلی لکیریں سی پھیلتی ہے۔ نرگس کے پھول کانوں میں اٹکے تھے۔

کریے نے جیسے ہی پھاٹک پر ضرب ماری تھی اسے لگا کہ اس کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا' خیالات کی جھالریں مکمل

ہوگئی۔ تمبا کو کی تھیلی سے تمبا کو نہیں بلکہ سونے اور ہیرے کے پترے نکل کر چھنچھنائے ہوں۔ میمو نیئے نے لحاف پرے پھینکا، کفش پہنے بغیر دوڑی چلی آئی اور اب کی بار دستک پر ذرا سی ٹھٹکی' یہ دستک تو اجنبی معلوم ہوتی تھی۔ میمو نیئے نے سوچا۔

''کون ہے؟'' ہولے سے استفسار کیا گیا۔

کریے کی سانس اٹکی۔

''میمو نیئے بہن! میں کریے ہوں...... حجرے میں مہمان ٹھہرے ہیں۔ چلم کے شوقین ہے اور بدقسمتی سے تمبا کو ختم ہوگیا ہے۔ اگر شیر عالم بھائی ہوتا تو کوئی ڈر نہیں تھا۔ آپ دیکھیں اگر تھوڑا سا تمبا کو مل جائے۔''

میمو نیئے تمبا کو تلاش کرنے لگی اور بدقسمتی سمجھ لیجیے یا پھر قسمت کی ہیر پھیر۔ خوف اور آشفتگی کی وجہ سے وہ بھول گئی کہ میں نے کہاں رکھی وہ تھیلی؟ بہت دیر بعد جب وہ تھیلی ملی تو جلدی سے تمبا کو نکال کر کریے بھائی کو دیا۔ کریے جب حجرے پہنچا۔ دبکے کسی کونے میں بیٹھے اس نوجوان کی آواز آئی جو صنم خان تھا۔ کریے کا حریف۔

''ارے کریے! تو نے تو اتنا وقت لگالیا کہ جتنا تو تمبا کو کو بونے' پیدا ہونے' کاٹنے اور خشک ہونے میں بھی نہیں لگتا۔''

رات گئی......سو......بات گئی۔

❀ ...... ❀ ...... ❀ ...... ❀

رات کے وقت سے شیر عالم پریشان تھا' کل اس کے کھیت کے پانی کی باری تھی۔ صبح اٹھا ناشتہ کیا۔ درانتی اور چھری جو ہمہ وقت اس کے ساتھ ہوا کرتی تھی لے گیا۔

کھیت پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کے پڑوسی ''صنم خان'' نے باری لی ہے۔ وہ غصہ ہوا' صنم سے جھگڑا کیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں گالیاں دیں باتیں پلٹیں باتوں کا سرا نہ تھا اور جب مل بھی گیا تو حجرے میں تمبا کو والی بات طعنے پر جا کر ساری مردانگی' غیرت' برادری امڈ آئی۔

صنم خان نے سانپ کی طرح پھنکارتے طعنہ اچھالا۔ ''ارے جاؤ! ہم سے جھگڑا کرتے ہو' دوسروں سے لڑنا گھر کی خیر خبر نہیں اور آیا بڑا اپنے آپ کو پختون کہنے والا...... رضوانہ (نوجوان)! اپنی بیگم کی خبر لو گھور سیاہ اندھیرے میں غیر مردوں میں تمبا کو بانٹتی ہے اپنی بیوی کو سنبھالنا پھر جاکے ہمارے منہ لگنا۔''

شیر عالم کو برا لگا اور یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ چلم کا دھواں ہو...... ہوا میں تحلیل ہوا۔

اور کتنی عجیب بات ہے کہ مرد دوسرے مرد کو صرف اس کی ''عورت'' پر للکارتا ہے اور وہ مرد بھی جسے للکارا جائے اسی عورت کا گلا گھونٹتا ہے کتنی عجیب کتھا ہے کتنی عجیب سوچ ہے۔

چاہیے یہ تھا کہ شیر عالم اسے وہی کے وہی دفن کرا دیتا۔ اس کا گریبان پکڑتا اور کہتا کہ وہ اور جیسے مرد ہوگے جو کسی کے للکارنے پر آتے ہوں گے مگر نہیں۔

نہیں ہماری سوچ کے برخلاف وہ سیدھا گھر جا پہنچا کھیت سے لوٹتے وقت اس کے ہاتھ میں تمبا کو کی تھیلی ہوتی تھی اور اب روشن چمکیلی چھری تھی۔ کمل کی پتلی پتلی خون سے لت ہوئے اب خون کی پتلی پتلی لکیریں سی کھینچتی چلی گئی۔ پگڑی کے شملے کی جھالریں ناگن کی طرح پھنکارتی معلوم ہوتی۔ اس کے کان پر نرگس کے پھول نہیں بلکہ پھنکارتی ناگن کی طرح صنم خان کے الفاظ کی بازگشت ٹکرائی تھی۔

''گھور سیاہ اندھیرے میں غیر مردوں میں تمبا کو بانٹتی ہے......''

وہ میمو نیئے سے پوچھا ہے۔

''تم نے رات کو کسی کو تمبا کو دیا ہے؟''

ڈری سہمی میمو ہیئے نے رعشہ طاری آواز کے ساتھ کہا۔
''ہاں میں نے......''
''بتاؤ' تم نے آدھی رات کو کسی کو تمبا کو دیا ہے؟''
وہ اس کے پاؤں میں پڑی تھی اور وہ چھری سنبھالے ہوئے تھا۔
''ہاں میں نے ایک بار آپ کو بتایا بھی تھا کہ حجرے میں ایک رات مہمان ٹھہرے تھے تمبا کو ختم ہوا تھا تو انہوں نے کریمے کو بھیجا تھا۔''
شیر عالم نے کچھ نہیں سنا۔ پھولتی کانپتی پھول سے بھی نازک اندام کو کہا گیا تھا۔
''تو پھر تیار ہو جاؤ آج میں تمہیں ذبح کر کے ہی چھوڑوں گا۔''
فیصلہ سنا دیا گیا دور ابراہیمی کی یاد آتی ہے مگر وہ رب کے کہنے پر ذبح کرنے والا تھا اور یہ دنیا کے کہنے پر کوئی دنبہ آسمان سے نہ اترا اور میمو ہیئے مشرقی روایات کا سرا اونچا کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ خاموش ہوگئی۔ خاموش کر دی گئی۔
اور وہ لوگ بھی ناں...... کتنے کبھی کبھار سچ بولتے ہیں کہ سیاہ رو بھنورے نے آسمانی اپسرا کو مٹی میں ملا دیا۔ کسی نے لقمہ دیا۔
''کلی کھلی بھی نہ تھی اور سیاہ اژدھا اسے نگل گیا۔''
گیت نگاروں نے مغموم نغمہ سرائی کی۔
(پشاور کے بعض علاقوں میں اس مصرعے کو ''تکرہ غرمہ دہ'' گاتے ہیں جس کا مطلب ''تپتی ہوئی دوپہر'' کا ہے۔ اور ہمارے علاقے میں بھی یہی گایا جاتا ہے۔)
''کچی دوپہر ہے' میمو ہیئے ذبح کی جارہی ہے۔
میمو ہیئے ہنسنے لگی اور کہنے لگی۔
''وہ میرے ماموں کا لڑکا ہے وہ مجھے ذبح نہیں کرے گا۔''
کچی دوپہر ہے اور میمو ہیئے ذبح کی جارہی ہے۔
اے شیر عالم! میمو ہیئے پہ کچھ تو ترس کھا' اس کی جوانی کی بددعائیں نہ لے۔
کچی دوپہر ہے اور میمو ہیئے ذبح کی جارہی ہے۔
میمو ہیئے تجھے ذبح کرنے کے لیے لے جارہا ہے' خبردار اسے سلام نہیں کرنا۔
کچی دوپہر ہے اور میمو ہیئے ذبح کی جارہی ہے۔
میمو ہیئے تجھے ذبح کرنے کے لیے لے جایا جارہا ہے۔ پھول سے بھی نازک میمو ہیئے آہستہ آہستہ چل۔
کچی دوپہر ہے اور میمو ہیئے ذبح کی جارہی ہے۔
میمو ہیئے کی زلفیں بھی عجیب ہیں کہ شیر عالم کی چھری سے گلے مل رہی ہے۔
کچی دوپہر ہے اور میمو ہیئے ذبح کی جارہی ہے۔''
(میمو ہیئے کے گلے پر چھری رکھ دی گئی' خون کی لہریں قلعے کے دیو قامت دیواروں سے ٹکرانے لگی تھی۔ ڈھلتی شام کے سے پیا کی سلامتی کی دعائیں مانگتی میمو ہیئے کچھ بھی نہ کر سکی' رات کو خوابوں کی جھالریں بنتی میمو نئے کچھ بھی نہ کر سکی۔
بس......بس عورت کی قربانی کی ایک نئی داستان رقم کر گئی۔ گاؤں میں ہمارے ٹپوں میں آتا ہے کہ پانی کی کمی تھی۔ میمو نئے نے دل بڑا کر کے خون کا ایک دریا روانہ کیا اور ہر ہر جگہ کو سیراب کر گیا۔)

''کچی دو پہر ہے اور میمو شیے ذبح کی جا رہی ہے۔
میمو شیے کے قتل کی آواز بلند ہوئی تو اس کی سہیلیوں نے ماتمی لباس پہن کر رونا شروع کیا۔
کچی دو پہر ہے اور میمو نئے ذبح کی جا رہی ہے۔
میمو شیے کی موت کی خبر پھیل گئی۔اس کی سہیلیاں آٹے کے برتن (تنور پر) بھول گئیں۔
کچی دو پہر ہے اور میمو شیے ذبح کی جا رہی ہے۔
(گاؤں والوں اور گیت نگاروں شیر عالم کو مطعون قرار دینا شروع کیا اور ہم نے بھی کئی بار ماں سے سوال کیا کہ شیر عالم کا کیا بنا؟ جواب ندارد اور خاطر صاحب کا قلم بھی خاموش رہا تھا۔)
کچی دو پہر ہے اور میمو شیے ذبح کی جا رہی ہے۔
میمو شیے کی بددعائیں تو نے لیں شیر عالم! تجھے بالکل بھی رحم نہ آیا۔
شیر عالم تجھے الزام دے رہی ہے کہ دوسرے کے بہکاوے پر قتل کر دیا۔
کچی دو پہر ہے اور میمو شیے ذبح کی جا رہی ہے۔
اے شیر عالم! خدا تیرا ایمان خراب کر دے۔
''محض تمباکو کے پتوں پر آج تک کسی نے قتل کیا ہے؟''

......❀☆❀......

اک سحر ہونے تک

تو بیہ امبر

''میری پوسٹنگ ہو رہی ہے۔'' اس نے سادہ سے لہجے میں کہا اور نظر سامنے والے درخت پر جما دی۔ کب سے چڑیا ایک ایک تنکا اپنی چونچ میں اٹھا کر لاتی تھی اور اپنا گھونسلہ مکمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ زرناب کی نظر بھی اسی گھونسلے پر تھی یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا کہ حیدر کی پوسٹنگ ہو رہی تھی لیکن ایسا کیا تھا کہ حیدر اس سے نظر چرا رہا تھا۔
''کہاں؟'' زرناب نے اس سے پوچھا۔ حیدر نے اسے دیکھنے سے اجتناب برتا تھا۔
''میں آپریشن ضرب عضب کا حصہ بننے جا رہا ہوں' میں وزیرستان جا رہا ہوں۔'' اس نے ایک ہی جملے میں کہہ کر جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اتارا تھا۔
''ایک تم نے اپنی مرضی سے آرمی جوائن کر لی۔'' وہ آنسو صاف کرتے بولیں۔''اور اب تم وزیرستان جا رہے ہو۔'' ان کے لہجے میں جیسے ہوک تھی۔
''امی' آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے میں جنگ پہ جا رہا ہوں۔'' اس نے دونوں کندھوں پر دباؤ ڈالا۔ وہ انہیں پر سکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پاس کرسی لے کر بیٹھ گیا۔
''جنگ ہی تو ہے۔''
''ہاں لیکن ویسی جنگ نہیں کہ آپ اتنا روئیں اور پریشان ہوں۔''
انہوں نے پھر اپنے آنسو پونچھے تھے۔ وہ ماں تھیں کیسے کیسے اندیشے ایک لمحے میں حملہ آور ہوئے تھے۔ پہلے ہی ہر لمحہ' ہر سانس کے ساتھ وہ اس کی حفاظت کی دعا کیا کرتی تھیں۔

''آپ ایک غازی کی ماں ہیں۔'' یہ جملہ حیدر فوج میں جانے کے شروع سے لے کر اب تک کئی مرتبہ دہرا چکا تھا۔اس کے لہجے میں ہمدردی تھی' اطمینان تھا' ڈھارس تھی۔

جب اس نے آرمی میں جانے کی خواہش کا اظہار کیا اور پھر اس کے مطابق کیڈٹ کالج میں داخلہ لیا تھا۔انہیں لگا کہ شاید کوئی وقتی لگاؤ' کوئی بے معنی وابستگی اور کوئی سطحی تاثر حیدر کو اس طرف لے گیا ہے لیکن حیدر کے رویے نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کو بتادیا تھا کہ وہ سرتاپاؤں ایک فوجی تھا۔اس نے جس تیزی سے ترقی کی منازل طے کی تھیں' وہ بعد میں سب کے لیے اور خصوصاً ماں باپ کے لیے فخر کا باعث بن گئی تھیں۔

زرناب نے پھر چڑیا پر نظریں جمادی۔جو گھر بنانے کے شوق میں چونچ میں ایک ایک تنکا لیے پھر رہی تھی۔

فروری کی ٹھنڈی صبح' رات تھوڑی پھوار بھی پڑی تھی۔سارا منظر ایسے جیسے کسی نے معطر کردیا ہو' نکھار دیا ہو۔پتوں پر پڑی اوس تھی اور صبح کی دھوپ' نرم گرم اور بلاشبہ روشن تھی۔اس نے اپنے ساتھ اس شخص کو دیکھا' جس کے کلون کی مہک اسے مہکا رہی تھی اور صرف ان لمحوں میں ہی نہیں' یہ مہک اسے ہر وقت شاد کردیتی تھی' ان لمحوں میں بھی جب وہ اداس ہوتی اور ان لمحوں میں بھی جب وہ مایوس ہوتی تھی۔

کل وہ ممانی کے کہنے پر آئی تھی۔انہوں نے گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کررکھا تھا۔حیدر کے آنے نہ آنے کا اسے کچھ علم نہیں تھا اور شاید ممانی کو بھی علم نہیں تھا۔شام کو سب کے جانے کے بعد حیدر گھر میں داخل ہوا تھا۔زرناب نے اسے پہلی بار یونیفارم میں دیکھا تھا۔

اس کے دل کی ایک دھڑکن مس ہوئی تھی' اس نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور نظر جھکالی تھی۔اس ایک لمحے میں اسے احساس ہوا تھا کہ عورت شاید ہر اس مرد سے محبت کرتی ہے جو اس سے محبت کرتا ہے لیکن اس مرد پر 'مرمٹتی' ہے جو یونیفارم میں ہوتا ہے۔

علینہ نے اسے رکنے کا پہلے ہی کہہ رکھا تھا اور یہ کوئی پہلی بار تو نہیں تھا کہ وہ سجاد ماموں کے ہاں ٹھہرے گی لیکن آج بے تحاشہ جھجک تھی' ایسے جیسے وہ کوئی جرم کرنے جارہی تھی۔

''میں امی کو فون کرتی ہوں' میں چلی جاؤں گی۔'' اس نے دل میں سوچا تھا۔

''تم نے آنے کا نہیں بتایا؟'' ممانی نے حیدر کو پانی کا گلاس تھماتے ہوئے کہا تھا۔

''میں نے سوچا آپ کو سرپرائز دوں۔'' اس نے زرناب کو نظر انداز کرتے کہا۔

حیدر کم گو تھا' سنجیدہ بھی اسی لیے جب ممانی رشتہ لائیں تھیں تو سب حیران تھے اور سب سے زیادہ وہ خود حیران تھی۔بقول ممانی حیدر نے خود رشتے کے لیے کہا ہے۔

اسے اپنی یادداشت اچھی طرح کھنگال لینے کے بعد بھی ایسا ایک بھی موقع یاد نہ آیا جب حیدر نے ایسی کوئی بات یا حرکت کی ہو۔یا ایسا کوئی اشارہ دیا ہو۔اول تو زیادہ سامنا ہوتا نہ تھا کہ ماموں کے گھر اتنا جانا نہ ہوتا تھا اور اگر سامنا ہوتا بھی تو وہ سنجیدہ ہی ہوتا۔

ممانی کہہ کر چلی گئیں اور بعد میں سننے میں آیا کہ وہ اپنی بہن کی بیٹی لانا چاہتی ہیں۔امی تک یہ سب خبریں پہنچانے والے خدا جانے سچ کہتے رہے یا پھر 'رشتہ نہ ہو' کی نیت سے جھوٹ بولتے رہے۔ممانی دوبارہ آئیں۔امی نے ہاں کردی۔

اسے خبر نہ ہوئی اور اس کی زندگی میں ایک نیا نام شامل ہوگیا تھا' جو اس کی زندگی بن گیا۔وہ عمر کے اس حصے میں تھی جب خواب دیکھنے کی فرصت اور خواب دیکھنے کی خواہش بھی ہوتی ہے اور پھر تو وہ چاہت سے مانگی گئی تھی' خوابوں پر اس کا حق تھا' سب سے زیادہ۔

''کھانے میں کیا لو گے؟''
''جو بنا ہے وہ ہی دے دیں۔'' وہ سادگی سے گویا ہوا تھا۔
وہ اس کے سامنے نہیں تھی' بالکل کونے میں تھی' جہاں وہ اسے دیکھ سکتا تھا اور نہ اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ سکتا تھا۔

☆☆☆......☆☆☆

رات علینہ کے کمرے میں اسے پھر نے چینی نے گھیر لیا تھا۔
''اچھا مجھے فون کرنے دو۔'' اس نے علینہ کے کمرے میں پڑے کارڈلیس کا ریسیور اٹھایا تھا۔
''اتنی رات ہوگئی ہے' اب کیسے جائیں گی؟'' اس نے فون پکڑا تھا۔
حیدر کے آنے کے چھ بجے تک ماموں آگئے اور وہ امی کو فون کرنے کا سوچتی رہ گئی۔ امی کسی کو بھیج ہی دیتیں۔ ابو یا فیصل کو لیکن سب بیٹھ گئے پھر تھوڑی دیر بعد زید آگیا اور پھر گھڑی کی سوئیوں نے تین گھنٹے کا سفر کیسے طے کیا کسی کو بھی خبر نہ ہوئی۔
''اچھا حیدر تھکا ہوا آیا ہے' باقی باتیں کل۔'' ممانی نے جیسے نشست برخاست کی' ماموں بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
علینہ اور وہ پہلے ہی چائے کے برتن اٹھانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔
''زید' صبح کی نماز کے لیے میں نے تمہیں اٹھا دینا ہے۔'' ماموں نے زید کو جاتے جاتے وارننگ دی تھی' حیدر بھی اٹھ کھڑا ہوا اور ابھی علینہ کے کمرے میں بیٹھی وہ اس کے حالیہ شاپنگ دیکھ رہی تھی۔
علینہ کے فون کی بیل ہوئی تھی۔
''صبح ٹیسٹ ہے میری دوست کا فون ہے اسے کچھ مدد چاہیے۔'' اس نے فون کے اسپیکر پر ہاتھ رکھ کر اسے مطلع کیا تھا۔
نجانے کون سی کتاب ڈھونڈتی وہ اپنے رائیٹنگ ٹیبل کے پاس تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی اور فون پر بات کرتے ہوئے علینہ نے اسے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا تھا۔
اس نے دروازہ کھولا تو سامنے حیدر تھا' آرام دہ کپڑوں میں ملبوس۔
''تم سے بات کرنی ہے۔'' اس نے دروازے سے باہر ایک قدم رکھا تھا۔
''یہ تمہارے لیے۔'' اس نے ایک گفٹ پیک اس کی طرف بڑھایا۔ ''سنا ہے صبح برتھ ڈے ہے تمہاری۔''
حیدر نے زرناب کی آنکھوں میں ساری دنیا کی چمک دیکھی تھی' کیسی خوشی' بے یقینی اور روشنی تھی اس کے چہرے پر۔
''شکریہ۔'' اس نے گفٹ تھاما۔
''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' علینہ آن موجود تھی۔
''برتھ ڈے گفٹ دیا جا رہا ہے۔'' حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
''ٹریٹ کے بغیر ہی گفٹ؟'' اس نے احتجاج کیا تھا۔
''بھائی آپ بھی ناں' ٹریٹ لیتے پہلے' میں تو لوں گی ٹریٹ۔ مجھے پزا کھانا ہے۔'' اس نے فرمائش بھی کر دی تھی۔
اگلی صبح وہ لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ماموں کو پودوں کا بہت شوق تھا۔ لان کی دیکھ بھال مالی تو کرتا ہی تھا لیکن ساتھ ممانی کا بھی بہت وقت لان میں گزرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بیٹھی لان کے خوب صورت منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی جب حیدر غیر متوقع طور پر اس کے ساتھ آ کر بیٹھا گیا تھا' وہ اپنے اندر سمٹی تھی۔
اس نے اپنی پوسٹنگ کا بتایا اور پھر اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھا تھا۔
''ایم۔ اے انگلش؟'' حیدر کا سوال تھا۔

''جی......''

''مرے کالج میں لوگی داخلہ؟'' وہ جانتا تھا کہ اسے وہ کالج پسند تھا۔

''بالکل۔'' پھر ممانی نے ناشتے کے لیے آواز دے دی تھی۔

اس نے ممانی کا چہرہ دیکھا' ان کی آنکھیں اداس تھیں روئی روئی سی۔ حالانکہ کل ان کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا' جب حیدر کو دیکھا۔

☆☆☆......☆☆☆

ممانی کے اصرار پر ہی کچھ مہینوں بعد منگنی کی تقریب رکھی گئی تھی۔ امی ابو کا کہنا تھا کہ جب بات طے ہو چکی تو ایک مرتبہ ہی شادی کر دی جائے لیکن حیدر کا کہنا تھا کہ جب تک اس کی پوسٹنگ کسی اور جگہ نہیں ہوتی اسے شادی نہیں کرنی ویسے بھی اس کا کام بہت توجہ چاہتا تھا۔ سو تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا۔ ممانی نے اسے دلہن بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ کپڑے اور زیور اس کے لیے بھاری تھا لیکن ماموں اور ممانی بہت خوش تھے بلکہ سب بہت خوش تھے۔

''تم میرے حیدر کی دلہن ہو ناں، میرا بس نہیں چل رہا کہ ابھی تمہیں بیاہ کے لے جاؤں لیکن یہ لڑکا مانتا نہیں' کہتا ہے ابھی تمہیں وقت نہیں دے پائے گا۔'' اس کا سجا سنورا روپ دیکھ کر وہ' اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیے اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔

انگوٹھیوں کے تبادلے کے بعد زید تصویریں بناتا رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی' حیدر خوش تھا' ہر ایک بات پہ کھلکھلا رہا تھا۔

''بھائی' تھوڑی دیر پلیز اپنے دانت اندر رکھیں۔'' زید نے آخر کہہ ہی دیا۔ سب کا مشترکہ قہقہہ تھا اور سب سے بلند قہقہہ حیدر کا تھا۔

☆☆☆......☆☆☆

کالج میں کلاسز کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا اور کالج میں منگنی شدہ لوگوں کو دیکھ کر اسے لگتا کہ شاید وہ منگنی شدہ ہے ہی نہیں۔ حیدر سنجیدہ تھا اور فون پر رابطہ بہت کم ہوتا تھا۔ پہلے پہل اسے لگا کہ جیسے منگنی ہوتے ہی لڑکیوں کا فون ان کے کان کے ساتھ چپک جاتا ہے اور وہ ہر دوسرے سیکنڈ فون چیک کرنے کی بے چینی کا اظہار کرتی ہیں اور پھر موبائل اسکرین دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹ بکھیرتی ہیں' یہ سب کچھ اس کے ساتھ بھی ہوگا لیکن ایسا کچھ ہونا حیدر پر منحصر تھا اور زرناب جانتی تھی کہ وہ ایسا نہیں کرے گا شاید۔ وہ کبھی کبھار کال کرتا جو بہت فارمل ہوتی تھی کیونکہ وہ بہت پریکٹیکل تھا شاید اور اتنی فرصت بھی نہ تھی شاید اور اس کی جھجک اور انا اسے بھی دن رات فون کی طرف دیکھتے رہنے سے باز تھی۔ وہ جانتی تھی باتیں اور اظہار کرنے کے لیے وہ مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس لیے ایسا سوچ سوچ کر وہ تھک گئی تھی اور پھر اس بارے میں اس نے سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

شام کی چائے پینے کے بعد وہ کمرے میں آئی اور اپنے بیڈ پر پڑے فون پر حیدر کی چار مسڈ کالز دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ وہ تو کبھی اتنی کالز نہیں کرتا تھا۔ اس نے ہزار وسوسوں کے ساتھ کال ملائی تھی۔

''ہیلو' السلام علیکم۔'' فون ریسیو ہی وہ بولی تھی۔

''وعلیکم السلام۔'' حیدر کی آواز قطعاً نارمل نہیں تھی ایسا اسے محسوس ہوا تھا۔

''آپ نے فون کیا تھا؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' آواز میں گہرائی کے ساتھ کچھ تھکن بھی تھی۔

''آپ ٹھیک ہیں؟'' وہ جانتی تھی کہ وہ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔
''ہاں ٹھیک ہوں بس......''
''اچھا آپ کی آواز سے نہیں لگ رہا۔'' وہ جاننا چاہتی تھی اس کی اداسی کی وجہ۔
''آج میرے ایک دوست کی شہادت ہوگئی ہے۔ دہشت گردوں کے ایک ٹھکانے پر حملہ کیا تھا اور اس لڑائی میں وہ شہید ہوگیا۔'' کچھ دیر کے لیے خاموشی رہی۔
''انا اللہ وانا الیہ الراجعون' بہت دکھ ہوا۔'' وہ گویا ہوئی۔
''پتہ نہیں زری' اس رات کی صبح کب ہوگی' یہ اندھیرا کب چھٹے گا۔ یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کتنے سال' کتنے لوگ کھا جائے گی؟ دو مہینے کے مختصر عرصے میں یہ دوسرا آفیسر تھا اور میرے دل کے بہت قریب بھی۔'' اس کی آواز اس کے کرب کی عکاسی کررہی تھی اور اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس حیدر کو تسلی دینے کے لیے الفاظ بھی نہیں تھے۔
''اللہ آپ کو صبر دے اور ان کی فیملی کو بھی۔''
''دو بچے ہیں اس کے اور بہت محبت کرنے والا تھا ہر ایک سے اپنی فیملی سے بھی بہت محبت کرتا تھا۔'' وہ اسے اپنے دوست کے بارے میں بتانے لگا تھا۔ کچھ دیر مزید بات چیت کے بعد فون بند ہوا تھا۔
اسے احساس ہوا کہ فوجی ہونا آسان نہیں لیکن حیدر نے اس سے غم بانٹا تھا اور یہ کیسا مان تھا وہ اپنی نظر میں معتبر ہوگئی تھی۔ دنیا میں رونے کے لیے آپ وہی کندھے ڈھونڈتے ہیں جن کے بارے میں آپ کو یقین ہوتا ہے کہ وہ آپ کے درد کو آپ کی طرح ہی محسوس کریں گے۔

☆☆☆......☆☆☆

آج کالج کا آخری دن تھا۔ گرین روم میں بیگ رکھنے کے بعد وہ کلاس رومز کے باہر برآمدے میں کھڑی تھی۔ برآمدے کے باہر لگی جالیوں سے باہر کہر میں لپٹا منظر تھا۔ آج صبح سے ہی بہت دھند تھی۔
ڈیپارٹمنٹ کے سامنے بنے کیتھڈرل کی صلیب بھی دھند میں غائب تھی اور کیتھڈرل اور ڈیپارٹمنٹ کے درمیاں مختصر قبرستان بھی دھند میں گم تھا۔ اسے ان قبروں کے درمیاں ایک بوڑھا نظر آیا۔ ایک غریب' محنت کش بوڑھا۔ اتنی ٹھنڈ میں وہ ایسے کسی بھی لباس کے بغیر تھا جسے اس سرد موسم کی ضرورت کہا جاتا۔ عام سی قمیص کے ساتھ' بدرنگ دھوتی اور سر پر باندھا ہوا گندا' میلا سا رومال۔ اس کے چہرے کے خدوخال اس کی محنت کے ماہ وسال کی چھاپ تھے اور اس کے چہرے کی جھریوں میں کوئی غم بیٹھا تھا۔
وہ ایک قبر کے سرہانے' تازہ گلاب کی پتیاں بچھائے' دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔
ایک سرد لہر زرناب کے اندر دوڑ گئی۔
''کون تھا اس قبر کے اندر جس کی محبت میں اس بوڑھے کو یہ ٹھنڈ محسوس نہیں ہورہی؟'' وہ محویت سے اس بوڑھے کو دیکھ رہی تھی جو کسی خستہ حال کھنڈر کی طرح تھا۔
''جب کوئی پیارا مر جائے تو انسان تاحیات' دھند میں لپٹی قبروں پر تازہ گلاب بچھائے انہیں یاد کرتا رہتا ہے۔'' کیسا اداس کردینے والا لمحہ تھا۔
وہ اندر تک ویرانی محسوس کررہی تھی۔ اسے اس بوڑھے سے ہمدردی محسوس کی تھی۔ اسے کسی نے کندھے سے ہلایا اور وہ چونک گئی۔ مریم اس کے پاس کھڑی تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''کب سے بلا رہی ہوں؟'' کلاس شروع ہونے والی ہے۔ نو بج رہے ہیں' وہ گرین روم کی طرف مڑتے ہوئے

بولی۔ وہ پیچھے چل دی تھی۔

☆☆☆......☆☆☆

حیدر کی سالگرہ تھی اور وہ صرف دو دن کی چھٹی لے کر آ رہا تھا۔ اس نے حیدر کی پسندیدہ پرفیوم یوم پیدائش مبارک والا کارڈ اور ایک گلاب بھیجا تھا' جو اس نے علینہ کو کہا تھا کہ حیدر کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دے تا کہ جب وہ رات سونے کے لیے آئے تو اسے دیکھ لے۔

اور خود وہ اس دن موبائل فون کے دھیان میں رہی کہ کب ''تھینک یو'' کا میسج آئے گا؟ اور وہ اپنے تصور کی آنکھ سے حیدر کا مسکراتا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس کمرے کو گلابوں سے بھر دیتی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ رات کو ہی وہ سالگرہ کی چیزیں دیکھے گا لیکن اس کا دل کسی طور موبائل سے دھیان ہٹانے پر آمادہ نہیں تھا۔

اب وہ بستر پر سونے کے لیے بھی لیٹ چکی تھی اور دل بس اٹکا ہوا تھا کہ ابھی میسج آیا کہ آیا لیکن موبائل چیک کر کر وہ تھک چکی تھی۔ سو اب صبح کے لیے الارم لگانے کے لیے اس نے فون اٹھایا تھا اور اسکرین پر حیدر کا میسج جگمگا رہا تھا۔

''تھینک یو وری مچ آئی لو یو۔'' اندر تک سرشار ہو گئی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا اسے پتہ تھا لیکن کہتا نہیں تھا اور آج تو اس نے کہہ بھی دیا تھا۔ وہ یہ میسج اب ہزاروں بار پڑھے گی صبح شام اور حیدر کی آواز اس کے تصور میں گونجتی رہے گی۔

☆☆☆......☆☆☆

آج شام کے وقت ہی رات کا گمان ہو رہا تھا دسمبر کی دھندلان اور باہر صحن میں ہر طرف تھی۔ مغرب کے بعد شام کی چائے پکانے کے لیے کچن میں کھڑی تھی' امی مغرب کے بعد اذکار میں مشغول تھیں اور کل دو دن ہوئے حیدر واپس گیا تھا۔ وہ آیا تھا امی سے ملنے کے بہانے تھوڑی دیر بیٹھا اور بس، کسی دوست سے ملنے بھی جانا تھا سو چلا گیا اور وہ جو سوچتی تھی کہ بھلا لڑکیاں عشق میں کیسے پاگل ہو جاتی ہیں وہ اب دن رات' صبح شام ہر پل حیدر کو سوچتی رہتی تھی۔

ابھی بھی وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ دل یوں ہی بے چین ہوا تھا۔ حالانکہ حیدر نے اسے خیریت سے پہنچنے کا میسج کر دیا تھا اور آج صبح بھی ہلکی پھلکی بات ہوئی تھی۔ فون کی بیل ہونے پر وہ کچن سے نکلی تھی۔ تیسری بیل پر اس نے فون اٹھالیا۔ دوسری طرف علینہ تھی اور وہ بے تحاشہ رو رہی تھی' اتنا کہ وہ بولنے کی کوشش کرتی اور رو پڑتی۔ اس کا دل بے قابو ہوا اور اس کے ہاتھ کپکپا اٹھے تھے۔

''علینہ کیا ہوا ہے' کچھ بولو خدا کے لیے کچھ بتاؤ؟'' اسے احساس ہوا کہ وہ بھی رو رہی ہے۔

''بجو! حیدر بھائی...... حیدر بھائی......'' وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

''کیا ہوا ہے حیدر کو......'' اس نے ہزار دل میں اندیشوں پر خدانخواستہ کہا تھا۔ اس کے آنسو لفظوں سے پہلے گرے تھے۔

''حیدر بھائی شہید ہو گئے ہیں۔''

جائے نماز پر بیٹھی عائشہ بیگم جو اسے ہی دیکھ رہی تھیں وہ اسے فون کے پاس پڑی کرسی پر ڈھتے ہو کے دیکھ چکی تھیں۔ فون پیس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر لٹک رہا تھا۔ اس لمحے انہوں نے دیکھا کہ ان کی زندہ بیٹی کے اندر سے زندگی ختم ہو چکی ہے۔ وہ اسے پوچھ رہی تھیں۔ انہوں نے فون پیس اٹھایا تھا۔

''بجو میرا بھائی نہیں رہا' میرا ہیرو نہیں رہا۔ شہید ہو گیا بجو۔'' انہوں نے علینہ کی روتی آواز سنی تھی اور اپنی بیٹی کو دیکھا جو کہیں سے بھی زندہ نہیں لگ رہی تھی۔

وہ رو رہی تھیں لوگ کہتے ہیں رونے سے غم ہلکا ہو جاتا ہے لیکن اس غم پر اگر ساری عمر وہ روتیں تو ان کا غم ہلکا نہ ہو سکتا

تھا' وہ ان کا لاڈلا بھتیجا تھا' وہ ان کو اپنے بیٹے جیسا نہیں اس سے زیادہ پیارا تھا۔ وہ ان کی بیٹی کی آنکھوں کا مقدس خواب تھا وہ کتنا روتیں۔

وہ امی کو روتا دیکھ رہی تھی لیکن وہ کسی تاریک جگہ ڈوب رہی تھی۔ اس کا پورا جسم سن تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھانا چاہا لیکن نہیں اٹھا پائی وہ امی کے گلے لگ کے رونا چاہتی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پائی تھی وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی لیکن اس کی آواز بھی نہ نکل سکی تھی۔

☆☆☆......☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا' جب اس کی آنکھ کھلی تھی۔ کمرے میں نائٹ بلب کی مدہم روشنی تھی۔ کتنی لمبی رات تھی۔ اس نے مٹی مٹی سی روشنی میں ڈوبے ملگجے در و دیوار دیکھے تھے۔

''تم اٹھ گئیں؟'' امی نجانے کہاں سے نمودار ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھیں متورم تھیں' چہرہ اداس اور جسم ایسے جیسے کسی نے زندگی نچوڑ لی ہو۔ وہ حرکت کرتا روبوٹ نظر آرہی تھیں۔ امی کو دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی تھی اور اس نے اپنے دونوں گھٹنوں پر سر رکھا تھا۔ اپنے ہاتھ اپنی ٹانگوں کے گرد پھیلا کر وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

عائشہ بیگم اس کے پاس بیٹھ گئیں اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

''شہیدوں کا ماتم نہیں کرتے۔'' انہوں نے بے جان لہجے میں کہا تھا۔ ایسے جیسے اس بات کا یقین انہیں بھی نہیں تھا۔

''اگر ماتم نہیں کرتے تو آپ کی آنکھیں کیوں لال ہیں۔'' وہ سوچ کر رہ گئی۔

''ہاں شہیدوں کا ماتم نہیں کرتے کیونکہ شہید نہیں مرتے' بھلا حیدر اس کے لیے مر سکتا تھا' اس کی محبت اس کے لیے مر سکتی تھی' وہ تو اس کو سوچنے کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اب اسے جتنا جھٹلائے گی وہ اسے اتنا ہی یاد آئے گا۔''

عائشہ بیگم نے اس کے کندھوں کے گرد اپنا بازو پھیلایا اور اسے اپنے قریب کر لیا۔

اسے دسمبر کی دھند میں لپٹا ہوا' قبر پر سرخ پتیاں بچھائے' فاتحہ پڑھتا' وہ بوڑھا یاد آیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے وجود کا ایک حصہ' حیدر کی قبر پر تمام عمر سرخ پھولوں کی پتیاں بچھائے کھڑا رہے گا' صدیوں گم صم اور وہ چاہ کر بھی وہاں سے ہل نہیں پائے گی۔ حیدر! شہید نہیں مرتے اور ان سے کی جانے والی محبت بھی نہیں مر سکتی۔ میری محبت بھی نہیں مر سکتی۔ وہ سسک رہی تھی۔ وہ جانتی تھی اسے صبر نہیں آئے گا ابھی یا شاید کبھی بھی نہیں۔

عائشہ خود بھی رو رہی تھیں لیکن جیسے وہ رو رہی تھی وہ ان سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

''اتنا نہ رو بیٹا! جانے والے کا تو سوگ بھی تین دن کا ہوتا ہے۔'' انہوں نے اسے جھوٹی تسلی دینا چاہی تھی۔

''ہاں' سوگ تین دنوں کا ہوتا ہے اور غم عمر بھر کا۔'' وہ اپنے آنسو پونچھتے بولی تھی اور اس سے زیادہ آنسو ان کی آنکھ سے ٹپک پڑے تھے۔ محبت آنکھ کا پانی ہوتی ہے۔ آنسو بن کر بہہ جاتی ہے پھر بھی باقی رہ جاتی ہے۔ وہ اس کی آنکھ کی پتلی پر نہ مٹنے والا عکس تھا' جو تمام عمر ساتھ رہنا تھا۔ وہ شخص میری روح میں ہے کہیں' اب تب نکلے گا جب روح نکلے گی۔

''اس رات کی سحر کب ہوگی؟'' حیدر کا ٹوٹا ہوا لہجہ اس کے کانوں میں گونجا تھا۔ یہ رات حیدر کو بھی کھا گئی۔ یہ دہشت گردی کا ناسور جس کو ختم کرنے لیے کیا کچھ نہیں لٹایا گیا۔

ذوق آگھی

سباس گل

القرآن

تم کسی بھی انسان کو برا نہ سمجھو شاید وہ ویسا نہ ہو جس طرح تم سمجھتے ہو حقیقی علم تو اللہ کے پاس ہے اور تم تو لاعلم ہو۔
(سورۃ البقرۃ)

شجاع بخاری جعفری......اکوال

امام حسن رضی اللہ عنہ کا فخر

مجھے فخر ہے کہ میں ایک ایسے درخت کی شاخ ہوں جو دنیا کا بہترین درخت ہے میرے اباؤ اجداد بزرگ ترین عرب ہیں ہم کو ان پر فخر ہے ہمارا حسب ونسب بہترین حسب ونسب ہے ہم ایک ایسے درخت کی شاخ ہیں جو اگنے اور بڑھنے والا ہے جس کے پھل پاک اور پاکیزہ ہیں جس کا تنا قائم رہنے والا ہے جس کی جڑ اسلام اور علم نبوت ہے ہم کو خدا نے بلند مرتبہ دیا ہے اور وہ ہمارے فخر کے لیے کافی ہے ہماری عزت کا دریا کبھی خشک نہیں ہوتا اور ہماری بزرگی کے پہاڑ کبھی پست نہیں ہوتے۔

ریاض بٹ......حسن ابدال

قطعہ

ان سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سنو یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے
یہ ٹھٹھرتی ہوئی راتیں لمبی کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشی آواز نما کچھ کہتی ہے

عبدالجبار رومی انصاری......چوہنگ لاہور

تقدیر کیا ہے

امیر المومنین حضرت علی سے تقدیر کی بابت سوال ہوا تو آپ نے فرمایا یہ تاریک راستہ ہے اس پر نہ چلو (کہ بھٹک جاؤ گے) یہ گہرا سمندر ہے اس میں غوطہ نہ لگاؤ کہ (غرق ہو جاؤ گے) یہ اللہ کے پوشیدہ رازوں میں سے ایک راز ہے اپنے آپ کو اس کے جاننے کا پابند نہ بناؤ (کہ گمراہ ہو جاؤ گے) یعنی انسان کو اللہ اور اس کے رسول اور شریعت مطہرہ کے احکام کا پابند رہنا چاہیے کیونکہ انہیں اسی کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے تقدیر ایسا امر ہے جس کی حقیقت جاننے کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا گیا ہے۔

گل مہر......کراچی

دلچسپ اسلامی معلومات

- حضرت موسیٰؑ نے طور سینا پر اور حضورﷺ نے شب معراج میں اللہ تعالیٰ سے بلاواسطہ گفتگو کی (صاوی)
- جنت میں سب سے پہلے محمدﷺ آپﷺ کی امت داخل ہوگی (تفسیر ابن کثیر)
- حضرت موسیٰؑ نے شعیبؑ کے ہاں دس سال تک بکریاں چرائیں اسی طرح نبی کریمﷺ نے حضرت خدیجہؓ کے ہاں مزدوری کی (ذخیرہ معلومات)
- ہجرت کے بعد انصار میں سب سے پہلے پیدا ہونے والے بچے حضرت نعمان بن بشیر تھے (البدایہ)
- مسجد نبوی کی محراب اگر چہ آنحضرتﷺ کے زمانہ میں نہیں تھی لیکن یہ محراب سب سے پہلے ولید کے زمانے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بنوائی تھی (تاریخ حرمین شریفین)
- حضرت علیؓ نے غزوہ خیبر میں جو در خیبر اکھاڑ کر پھینکا تھا اسی کا وزن آٹھ سو من تھا (التعوذ فی الاسلام)

ایس حبیب خان......کراچی

ہر عمل کا خاتمہ استغفار پر کیا جائے

جتنا بھی اچھے سے اچھا کام کرنے کی اللہ توفیق دے ہمیشہ اس کا خاتمہ استغفار پر ہی کیا جائے غرض ہمارے ہر کام کا جزو استغفار ہو یعنی یہ سمجھ کر کہ مجھ سے یقیناً اس کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہوتی ہیں ان کوتاہیوں سے اللہ سے معافی مانگی جائے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے ختم پر بھی اللہ سے استغفار کیا کرتے تھے۔

لہٰذا تبلیغ کا کام ہمیشہ استغفار پر ہی ختم کیا جائے بندے سے کسی طرح بھی اللہ کا حق ادا ہو نہیں سکتا، ایک کام میں مشغولیت بہت سے دوسرے کاموں کے نہ ہونے کا بھی باعث بن جاتی ہے تو اس قسم چیزوں کی تلافی کیسے بھی ہو بس انسان یہ سوچے کہ مجھے ہر کام کے اختتام پر استغفار کرنا ہے۔

احسان سحر......میانوالی

محبت

یہ محبت کچھ بھی تو نہیں تیری میری کہانی کے سوا جب سے مجھے محبت ہوئی ہے میں نے اک اذیت میں جینا سیکھا ہے ویسے بھی محبت تو اک اذیت کا ہی نام ہے نا یہ محبت اس سے ہوتی ہے جو لا حاصل ہو۔

بیگم رفعت شبنم...... بہاولپور

بیوی

پاگل خانے کا ڈاکٹر اپنے ایک دوست کو پاگل خانے کی سیر کرا رہا تھا اس نے ایک مریض کی طرف اشارہ کر کے افسوس سے کہا۔

"اس کو دیکھو، اس کی بیوی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔"

دوست نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا" واقعی عورت کا اعتبار نہیں۔"

ڈاکٹر نے ایک اور پاگل کی طرف توجہ دلائی جو سلاخوں سے اپنا سر ٹکرا رہا تھا دوست نے پوچھا" یہ پاگل کیوں ہو گیا؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا" یہ وہ شخص ہے جو اس کی بیوی کو لے کر بھاگا تھا۔"

مہر پرویز احمد دولو...... میاں چنوں

سنہری باتیں

کوئی بھی کام بسم اللہ الرحمان الرحیم سے نہ شروع کیا جائے وہ کام ادھورا رہ جاتا ہے۔

اس لیے کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے الغرض ہر جائز کام کے شروع میں بسم اللہ الرحمان الرحیم پڑھنے کی عادت بنالیں۔

انسان کے ساز و سامان اور لباس کو جنات استعمال کرتے ہیں۔لہٰذا کپڑے بدلتے وقت بسم اللہ شریف پڑھ لیا کریں تاکہ جنات ان کپڑوں کو استعمال نہ کر سکیں۔

ہر جائز کام میں بسم اللہ شریف پڑھنے والے کو اللہ تعالیٰ شریر جنات سے محفوظ رکھتا ہے۔

بسم اللہ شریف درست مخارج کے ساتھ ادا کریں اور کم از کم اتنی آواز ہو کہ رکاوٹ نہ ہونے کی صورت میں اپنے کانوں سے سن سکیں بعض لوگ ضروف چبا جاتے ہیں جان بوجھ کر اس طرح پڑھنا گناہ ہے اور اس سے معنی بھی غلط ہو جاتے ہیں۔

حضرت سیدنا جابر بن عبداللہ نے فرمایا کہ جب بسم اللہ نازل ہوئی اس وقت ایک کھلبلی مچ گئی بادل مشرق کی سمت دوڑے ہوائیں ساکن ہو گئیں سمندر جوش میں آ گئے چوپائیوں غور سے سننے کے لیے اپنے کان لگا دیے اور شیطانوں کو آسمان سے پتھر مارے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے میری عزت و جلال کی قسم جس شے پر بسم الہ پڑھی گئی ہے اس میں برکت دوں گا۔

محمد رفاقت...... واہ کینٹ

اسکندر رومی کی فتوحات کا راز

اسکندر رومی سے پوچھا گیا۔آپ نے مشرق و مغرب کے ملکوں کو کس طرح فتح کیا؟ اس لیے کہ آپ سے پہلے بادشاہ آپ سے زیادہ خزانے، ملک، عمر اور لشکر رکھتے تھے مگر ان کو ایسی کامیابی حاصل نہیں ہوئی سکندر نے فرمایا۔ اللہ بزرگ و برتر کی مدد سے میں نے جس سلطنت پر قبضہ کیا اس کی رعیت کو ستایا نہیں اور پچھلے بادشاہوں کی خیرات کے طریقوں کو بند نہیں کیا اور ان بادشاہوں کا نام ہمیشہ بھلائی سے لیا برائی سے کبھی کسی کا تذکرہ نہیں کیا۔

فائدہ: جو لوگ دنیا سے چلے گئے ہیں ان کے نیک نام کو ضائع مت کرو تاکہ تمہارا نام دنیا میں باقی رہے۔

انتخاب: زرینہ الیاس...... شیخوپورہ

شیخ چلی جیسے خیالات رکھنے والا ایک سوداگر

میں نے ایک سوداگر کو دیکھا کہ ایک سو پچاس اونٹ رکھتا تھا اور چالیس غلام اور خدمت گار۔ ایک رات وہ جزیرہ کیش میں مجھے اپنے چھوٹے سے کمرے میں لے گیا رات بھر نہ خود سویا اور نہ مجھے سونے دیا' بہکی بہکی باتیں کرتا رہا کہ میرا فلاں سامان ترکستان میں ہے اور فلاں پونجی ہندوستان میں اور یہ فلاں زمین کی دستاویز کا کاغذ ہے اور فلاں چیز کا فلاں آدمی ضامن ہے اور کبھی کہتا کہ اسکندریہ کا ارادہ رکھتا ہوں کہ وہاں کی آب وہوا اچھی ہے پھر کہتا کہ نہیں دریا میں طغیانی ہے پھر کہتا اے سعدی! ایک دوسرا سفر درپیش ہے اگر وہ بھی کر لیا جائے تو پھر پوری عمر سکون سے رہ سکوں گا۔ میں نے کہا کون سا سفر ہے؟ اس سوداگر نے کہا۔ ایرانی گندھک چین لے جاؤں گا اس کی وہاں بڑی قیمت ہے اور وہاں سے چینی پیالے روم لے جاؤں گا

اور روم کا ریشم ہندوستان میں اور ہند کا لوہا حلب اور حلبی آئینے یمن میں اور یمنی چادریں پارس میں۔ بس اس کے بعد سفر چھوڑ دوں گا اور ایک دکان پر بیٹھ جاؤں گا۔ ایسی پاگل پن کی باتیں کرتا رہا پھر مجھ سے پوچھا اے سعدی! تم بھی کچھ کہو جو تم نے دیکھا یا سنا ہو۔ میں نے کہا تم نے سنا ہے کہ غور کے جنگل میں ایک سردار گزشتہ سال گھوڑے سے گر پڑا۔ اس نے کہا دنیا دار کی تنگ آنکھ کو قناعت یا قبر کی مٹی بھر سکتی ہے۔

فائدہ: انسان کو قناعت کرنی چاہیے اگر قناعت چھوڑ کر حرص میں پڑ گیا تو ایک بڑی سخت مصیبت میں پھنس جائے گا۔

مرسلہ: سید اعجاز علی...... کراچی

ایک سمجھ دار تاجر کی حکایت

ایک تاجر کو تجارت میں ہزار دینار کا نقصان ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے سے کہا: مناسب نہیں ہے کہ کسی سے اس کا ذکر کیا جائے۔ لڑکے نے عرض کیا: ابا! آپ کا حکم ہے اس لیے میں کسی سے نہیں کہوں گا لیکن مجھے اس کے فائدے پر آگاہ رہنا چاہیے کہ چھپانے میں کیا مصلحت ہے؟ باپ نے کہا: تا کہ مصیبت ایک سے دو نہ ہو جائیں' ایک تو مال کا نقصان دوسرے دشمنوں کی خوشی۔

فائدہ: اپنے نقصان کا ذکر دوستوں کے سوا کسی اور سے نہیں کرنا چاہیے' دشمنوں کو سنانے سے نقصان تو پورا نہیں ہو سکتا البتہ ان کو خوش ہونے کا موقع ملے گا جو ایک مستقل مصیبت ہو گی۔

مرسلہ: عبدالستار...... فیصل آباد

کمی

شادی کے کچھ عرصے بعد شوہر نے نیا مکان خریدا تو بیوی نے خوش ہوتے ہوئے اس کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے کے دوران پوچھا۔ اس میں الماریاں کتنی ہیں۔ سولہ الماریاں ہیں۔ شوہر نے فخر سے بتایا۔ سولہ یہ تو کم ہیں۔ بیوی بولی۔ کیا؟ شوہر حیرت سے بولا۔ کیا سولہ الماریاں تمہارے کپڑے لٹکانے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ میرے کپڑے لٹکانے کے لیے تو کافی ہیں۔ بیوی بولی۔ لیکن تمہیں بھی تو آخر کپڑے لٹکانے کے لیے الماری کی ضرورت ہو گی۔

غلام عباس خان...... راجن پور

آواز

جب کسی ضرورت مند کی آواز تم تک پہنچے تو تم اللہ کا شکر ادا کرو کیونکہ اللہ نے اس کی مدد کے لیے تم کو پسند کیا ہے ورنہ وہ اکیلا ہی کافی ہے سب کے لیے۔

راشد الطاف...... میاچنوں

تاج محل کے بارے میں چند شخصیات کی رائے

☆ میں نے آج تک اتنا حسین خواب نہیں دیکھا (شاہ حسین)

☆ ہر عورت تاج محل کے مزار پر فخر کر سکتی ہے (فرح دیبلہ، پہلوی)

☆ اگر میرا خاوند مجھ سے وعدہ کرے کہ میری موت کے بعد وہ ایسا ہی تاج محل بنوائے گا تو میں ابھی مرنے کو تیار ہوں (ملکہ الزبتھ دوم)

☆ کاش میں وائٹ ہاؤس کی بجائے تاج محل بنوا سکتی (جیکولین کینیڈی)

☆ خدا جانے فورڈ نے امریکہ میں تاج محل جیسی خوب صورت عمارت کیوں نہ بنوائی۔ (مسز ہنری فورڈ)

☆ کاش تاج محل چرایا جا سکتا (ایوا کارٹر)

☆ حیرت ہے کہ امریکہ کی مدد کے بغیر تاج محل کیسے تعمیر ہو گیا (ایل بی جانسن)

☆ ہندوستان میں اور کیا ہے غربت اور تاج محل کے سوا (ماؤزے تنگ)

☆ کاش کہ تاج محل دریائے ٹیمز کے کنارے منتقل ہو سکتا (چرچل)

☆ تاج محل کو چاندنی رات میں مت دیکھو اس سے ذہنی توازن بگڑنے کا خطرہ ہے (مارلن برانڈو)

بقول شاعر

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

انتخاب: چوہدری الیاس...... پاک پتن

حضورﷺ کی عظمت آئینہ عالم میں

ایک نامعلوم متعصب ذہنیت رکھنے والا مورخ یوں رقمطراز ہے

''یہ بات مجھے ورطۂ حیرت میں ڈالتی ہے کہ چند ایک

غریب اور مفلوک الحال مسلمان ایک ایسی مسجد میں بیٹھتے ہیں جس کی چھت کھجور کے پتوں سے ڈھکی ہے' حتیٰ کہ بارش ہو تو چھت ٹپک ٹپک کر نیچے کیچڑ ہو جاتی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار جب سجدہ کرتے ہیں تو پیشانی کیچڑ سے لت پت ہو جاتی ہے۔

مگر یہ لوگ جب مسجد میں بیٹھ کر مشورے کرتے ہیں تو ایران وروم کی سلطنتوں کو تخت وتاراج کرتے اور آتش کدہ ایران کو ٹھنڈا کر کے خدائے واحد کی حکمرانی کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ چند ہی سالوں میں یہ ایسا کر دکھاتے ہیں۔ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا تو قائل نہیں ہوں مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنا بڑا انقلاب کیسے آ گیا۔''

(واصف علی واصف)

شبیر احمد...... کراچی

کھٹے میٹھے ٹوٹکے

❖ اگر آپ کا وزن زیادہ ہے اور لوگ آپ پر ہنستے ہیں نیز آپ پتلا ہونا چاہتی ہیں تو نیوز چینل باقاعدگی سے دیکھیں' امید ہے وزن کم ہوگا۔

❖ اگر آپ کو خوش گوار خواب نظر نہیں آتے اور ڈر لگتا ہے تو سونے سے پہلے آئینہ ضرور دیکھیں' کبھی ڈر نہیں لگے گا۔

❖ اگر آپ چھوٹے بچے ہیں' گلی کا کوئی انکل یا بزرگ آپ کو بلاوجہ ڈانٹتا ہے تو مسکرا کر ڈھیٹ بن کر ڈانٹ سنیں اور ذرا دور جا کر کانوں سے ٹشو نکال لیں۔

❖ اگر آپ میٹھے خواب دیکھنا چاہتی ہیں تو سونے سے پہلے آنکھوں میں چینی ڈال لیا کریں اس سے آپ کو میٹھے خواب نظر آئیں گے۔

❖ اگر آپ کے شوہر گھر سے زیادہ تر باہر رہتے ہیں بلکہ اکثر راتوں کو بھی غائب ہو جاتے ہوں تو فکر نہ کریں' اپنے آپ کو خوش رکھیں اور ہر وقت خوب بن سنور کر تیار رہیں' شوہر گھبرا کر گھر پر رہنا شروع کر دیں گے۔

❖ اگر آپ کھانا بناتے ہوئے اکثر جلا دیتی ہیں اور گھر والوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں تو گھبرائیں نہیں' جلے ہوئے سالن کو بگھار لگا کر پیش کریں' اس طرح گھر والوں کی جلن بھی ختم ہوگی اور سالن کی بھی۔

❖ گھر میں رکھے ہوئے پودے اگر نہیں بڑھ رہے تو کیا ہوا' دن رات ان کو پانی دیں اور ان کے پاس جا کر ان کا نام زور زور سے لیں فوراً بڑھیں گے اور ان کا نام ہوگا ''مہنگائی''۔

پرویز آرائیں...... جھڈو، سندھ

زندگی کے رہنما اصول

❁ بدترین شخص وہ ہے جس کے ڈر سے لوگ اس کی عزت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

❁ خونی رشتوں سے قطع تعلق کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔

❁ اس شخص پر دوزخ حرام ہے جو نرم مزاج اور نرم خو ہو۔

❁ دولت مت جمع کرو کفن میں جیب نہیں ہوتی۔

❁ دنیا کے بازار میں زندگی کا سب سے قیمتی سکہ حوصلہ ہے۔

❁ بلند حوصلہ بلند مقاصد کی تکمیل ہے۔

❁ بھوکا سویا رہنا مقروض ہو کر اٹھنے سے بہتر ہے۔

❁ ہم دولت سے ہم نشین حاصل کر سکتے ہیں دوست نہیں۔

❁ زندگی میں تین چیزیں نہایت سخت ہیں۔

خوف مرگ......شدت مرض......ذلت قرض

ماریہ کنول...... چک درکاں

ضمیر

انسان کا ضمیر بھی عجیب شے ہے یہ اگر سو جائے تو انسان پستیوں میں جا گرتا ہے' اسے یہ احساس ہی نہیں رہتا کہ وہ اس کائنات کا مرکز ہے۔ وہ جو کچھ کرتا چلا جا رہا ہے وہ اس کے شایان شان نہیں' اسے یہ بھی احساس نہیں رہتا کہ وہ خود کیا ہے؟ اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ لیکن اگر یہی ضمیر بیدار ہو تو انسان کو خود بخود ان راہوں پر لے جاتا ہے جہاں انسانیت کے اعلیٰ معیار ہیں۔ اسے شعور ہوتا ہے کہ کائنات اور اس کا تعلق کیا ہے اور وہ کس مقصد کے تحت اس کائنات میں موجود ہے۔ ضمیر کا یہ عمل بڑی حد تک لاشعوری ہوتا ہے' انسان کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کس وقت کیا ہے؟

امجد جاوید کی عشق کا قاف سے اقتباس:

مصطفیٰ...... جہلم

◆

خوش بوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

غزل

چہار جانب حصار کیا ہے
سنائی دے ناں پکار کیا ہے
مجھی سے سیکھے ہیں داؤ سارے
مجھی پہ کرتے ہو وار کیا ہے
اداسی چہرے کی کب چھپے گی
ہزار کر لو سنگھار کیا ہے
مری طرح تو بھی جان جاناں
کبھی تو مجھ کو پکار کیا ہے
تمہی سے مل کر کھلا ہے ہم پر
یہ درد کیا ہے یہ پیار کیا ہے
پلٹ کے آنا نہیں جو تم نے
تو پھر ترا انتظار کیا ہے
لہو بہاتے ہیں آنکھ سے ہم
ہم ایسا گریہ گزار کیا ہے
مرے لیے ہی سہی اے نوشی
کبھی تو خود کو سنوار کیا ہے

نوشین اقبال نوشی......گاؤں بدر مرجان

غزل

زخم سارے خوں اگلتے رہ گئے تھے
چارہ گر کیسے ہی حیلیرہ گئے تھے
آ گیا وہ دشمنِ جاں غیر کے ساتھ
ناتواں دل پر یہ حملے رہ گئے تھے
کون ہو جی تم نہیں پہچانا ہم نے
سننے کو بس یہ ہی جملے رہ گئے تھے
شام ہوتے سب پرندے لوٹ آئے
ایک ہم ہیں راہ بھولے رہ گئے تھے
خوب ٹوٹا خواب تھا کل شب ہمارا
وہ ہمارے ہوتے ہوتے رہ گئے تھے
جان جوکھوں سے جو آئی وصل کی شب
وہ مری بانہوں میں سوتے رہ گئے تھے
بخیہ گرتھے یوں تو سب ہی بستی والے
زخم میرے پھر بھی رستے رہ گئے تھے
بہہ گیا سیلاب میں تھا شہر سارا
بند کے کچھ ٹوٹے تختے رہ گئے تھے
اہلِ نفرت تخت پر بیٹھے ہوئے تھے
شام مجنوں اور رانجھے رہ گئے تھے
سب ہی بچے ہسپتالوں میں گئے تھے
مدرسے میں سُرخ بستے رہ گئے تھے
آگ پھیلی نفرتوں کی گاؤں میں تو
صرف بوڑھے اور بچے رہ گئے تھے
رات کو مزدور کی تھی جیب خالی
کھردرے ہاتھوں پہ چھالے رہ گئے تھے
آ گئی لکنت تھی پھر لہجے میں ان کے
بات سچی کہتے کہتے رہ گئے تھے
آنکھ کے رستے بہا کرتے تھے پھر وہ
لفظ جو سینے میں گھٹ کیرہ گئے تھے
پیٹ نے مجبور ہجرت پر کیا تھا
میرے ارماں سب ادھورے رہ گئے تھے
دکھ میں تشنہ کام آئے غیر ہی سب
یار میرے سب ہی پیچھے رہ گئے تھے

عامر شہزاد تشنہ......یو ایس اے

غزل

مل نہ پائے گی نظر اب ترے رخسار کیساتھ
فاصلے جڑ گئے ایسے ترے دیدار کیساتھ
اس کہانی کے ہر اک باب میں تنہا رکھ کر
ظلم ہر بار ہوا ہے مرے کردار کیساتھ
عشق ناسور نہ بن جائے، جنوں روگ کوئی
اور کھیلو نہ مسیحا! دلِ بیمار کیساتھ
ایسے ہر اینٹ ہے پژمردہ کہ شب بھر جیسے
لگ کے رویا ہو دیوانہ کوئی دیوار کیساتھ
حادثو! بعد میں تم توڑ دو یہ پیر مگر
دو قدم چین سے چلنے دو مجھے یار کیساتھ
عمر تحصیل میں گزری ہے سبھی کی لیکن
دفن کوئی نہ ہوا درہم و دینار کیساتھ
مجھ کو معلوم ہے اس شہر کے لوگوں کا مزاج
میں نے رکھا قلم اس لئے تلوار کیساتھ
ایسے حاکم سے ہے یاور نہیں امید مجھے
باندھ لیتا ہو جو زنار بھی دستار کیساتھ

یاور اقبال......ایم ایم عالم روڈ، لاہور

غزل

اتنی وحشت ہے کہ عجلت نہیں دیکھی جاتی
شام سے شہر کی دہشت نہیں دیکھی جاتی
اب فرشتہ بھی نہیں شک کی نگاہوں سے بچا
اب محبت سے محبت نہیں دیکھی جاتی
گھر کا ماحول اداسی ہی مزین کرتی
دل کی اک چیز سے رغبت نہیں دیکھی جاتی
کرنا پڑتا ہے بپا جود و سخا کا عالم
اُس سے اک دن کی سخاوت نہیں دیکھی جاتی
اب کے تنہائی مجھے مار ہی ڈالے گی حجاز
اب کسی طور بھی خلوت نہیں دیکھی جاتی

فرخ حجاز......گلگت بلتستان

دشتِ تنہائی

دشتِ تنہائی میں
دل کے دروازے پر
کیسی دستک ہوئی
خواب آنکھوں میں ہی
مسکرانے لگے
اور بجھی دھڑکنیں گنگنانے لگیں
گیت گانے لگیں
ہو رہا ہے گماں
چھٹ رہا ہے دھواں
برف جذبات کی اب پگھلنے کو ہے
رت خزاں کی مری جاں بدلنے کو ہے
رات ڈھلنے کو ہے

شبنم فردوس...... پٹنہ، انڈیا

غزل

تیری خاطر انا کو اپنی میں موڑ گیا میرے کوزہ گر
تیری خاطر حدوں کو اپنی میں توڑ گیا میرے کوزہ گر
دار پہ سب لٹک رہے ہیں اپنی باری بھی آنے والی
کوئی آشنا نہیں مل رہا کہاں چھوڑ گیا میرے کوزہ گر
تاریکیاں ہیں راہ دکھائی ہیں اجالے سر چھپائے
کس راہ پہ ہوں گامزن کہاں چل دیا میرے کوزہ گر
عجب دوراہے پہ کھڑا ہوں میں تری زندگی کی بقا ہوں میں
سمجھا نہ تو اس رمز کو اور چھوڑ گیا میرے کوزہ گر
علم ہے ہاتھوں میں نفرتوں کا پرچار کرتا ہوں چاہتوں کا
پڑی ہے دنیا پیچھے میرے اب کروں تو کیا میرے کوزہ گر

شاعر: سید حمائل حسین......اسلام آباد

غزل

ہم ازل سے تمہیں اس دل میں مکیں رکھتے ہیں
دور تم کب ہو تمہیں اپنے قریں رکھتے ہیں
کل تلک جن سے مراسم تھے ہمارے گہرے
اب وہی ہم سے کوئی ربط نہیں رکھتے ہیں
اس نے ٹھکرا کے محبت کو مری اتنا کہا
ہم تو اسراف محبت پہ یقیں ہیں
ڈر یہ رہتا ہے کہ ہو جائیں نا خفا احباب
اپنا لہجہ جو اگر سخت کہیں رکھتے ہیں
ان کی یادوں سے مہک اٹھتا ہے حجرہ اپنا
اس لئے پھول کتابوں میں نہیں رکھتے ہیں
یوں تو شوبی یہ فلک شمس و قمر سب ہیں مرے
پاؤں بھر ہم نہ مگر اپنی زمیں رکھتے ہیں

ابراہیم شوبی......کراچی

غم کی مار

غم کی مار سے ڈر لگتا ہے
دل بیمار سے ڈر لگتا ہے
چلتے چلتے رک جاتا ہوں
اب بازار سے ڈر لگتا ہے
نفرت ہو گئی خود سے ایسی
مجھ کو پیار سے ڈر لگتا ہے
قاتل آنکھیں قاتل زلفیں
قاتل وار سے ڈر لگتا ہے
ہر پل سوچ میں گم رہتا ہوں
اب گفتار سے ڈر لگتا ہے
پہلے غزلیں لکھ لیتا تھا
اب اشعار سے ڈر لگتا ہے

شاعر: سید زوہیب حسن زوہیب...... ماڈل ٹاؤن لاہور

غزل

کب یہ سوچا تھا کہ ہم پیار میں ہارے جاتے
اس سے اچھا تھا کہ ہم لوگ تو مارے جاتے
اور کچھ بھی تو نہیں اس کے سوا چاہا تھا
بس ترے نام سے اک بار پکارے جاتے
تو نے تو چھوڑ دیا ہم کو زمانے کے لیے
کون تھا بعد ترے جس سے سنوارے جاتے

ہم نے بھی سیکھ لیا تم سے کہ اس دنیا میں
کس طرح لوگ ہیں یہ دل سے اتارے جاتے
ہم جہاں جیت کے بھی تم کو گنوا آئے تھے
پھر وہاں ہار کے ہم کس کے سہارے جاتے
بعد تیرے تو یہی حال تھا اپنا شاہد
ہم یہاں جاتے وہاں ساتھ خسارے جاتے

محمد عرفان شاہد......شہر عارفوالا

غزل

تجھ سے دور رہ کے بھی تجھے ہم بھلا نہ سکے
تیرے تھے پھر بھی تجھے اپنا نہ بنا سکے
دل کے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے آخر
ہم تاریکیوں میں پھر کوئی چراغ جلا نہ سکے
تجھ سے گلہ کیا کریں ہم تیری بے وفائی کا
بگڑے ہوئے حالات سے ہم نبھا نہ سکے
ملے تھے بہت سے زخم تیری محبت میں
چیر کے شکستہ دل ہم تجھے دکھا نہ سکے
تیری یادوں سے دامن چھڑاؤں پھر میں کیسے جاوید
اسیر تھے تیری زلفوں کے نظروں کو بچا نہ سکے

محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

غزل

تم نے چاہا ہی نہیں حالات تو بدل سکتے تھے
میری آنکھوں کے آنسو تیری آنکھ سے نکل سکتے تھے
تم نے سمجھا نہیں میری وفا کی قیمت کو وگرنہ
نرم لفظوں سے تو پتھر بھی پگھل سکتے تھے
ہم تو تیرے ہی رہے دریا کے پانی کی طرح
اگر بنتے سمندر تو بہت دور نکل سکتے تھے
میری چاہت کے تقاضے تیرے دل میں اتر سکتے تھے
تم ساتھ ہوتے تو قسمت کے در کھل سکتے تھے
تیری ضد نے ہمیں بھی پتھر بنا دیا آخر
ورنہ ہم تیرے اشاروں سے پگھل سکتے تھے

حافظہ رضیہ رمضان......لاہور

غزل

چاند پھر تیری یادوں کا چمکے گا رات بھر
میری پلکوں پر اشکوں کا رقص دیکھے گا رات بھر
ہر کسی کو احساس ہے کئی وقت کا آج کل
میری داستاں کوئی کب تک سنے گا رات بھر
نگاہ پھیر کے تو اس نے آج بھی نہ دیکھا
یہ درد جسم و جان میں بکھرے گا رات بھر
کیا فکر کہ ہے سوچ کی گلیوں میں گھور اندھیرا
تیرے نام کی روشنی سے من دمکے گا رات بھر
یہ کرب جدائی تو حاصل محبت ہے
یہ آگ کا دریا ہے دہکے گا رات بھر
تیرے آنے کی خبر پر ہر شام رقصاں ہے
اس خوشی میں میرا دل دھڑکے گا رات بھر

شاعرہ: فصیحہ آصف خان

انتخاب: پرنس افضل شاہین......بہاولنگر

غزل

پتھر دل سے وفا نہیں ہوتی
اپنے لہو سے جفا نہیں ہوتی
جن کی فطرت میں ہو ڈسنا
ان سے کبھی شفا نہیں ہوتی
تو پھولوں کو لاکھ چھپالے
خوشبو کبھی جدا نہیں ہوتی
جو چلتے ہیں راہ سیدھی پہ
انہیں کبھی سزا نہیں ہوتی
کاغذی پھول تو لاکھ اپنالے
مہک کبھی روا نہیں ہوئی
جن کو عادت ہو کمانے کی
ان ہاتھوں سے گدا نہیں ہوتی
زمانہ لاکھ برا کہے حسن
ہم سے بد دعا نہیں ہوتی

ایم حسن نظامی قبولہ شریف (عارف والا)

غزل

جس پہ تیری نہ یہ میری حکومت ہوگی
ایک ایسی بھی سر حشر عدالت ہوگی
ہائے وہ وقت بھی کیا دیکھنے والا ہوگا
جب تجھے اپنے رویے پر ندامت ہوگی
ایک پلڑے میں ترا حسن و تکبر ہوگا
اک طرف میری وفا اور شرافت ہوگی
نوچ ڈالا ہے درندوں نے کسی بیٹی کو
اس سے بڑھ کر بھی کوئی اور قیامت ہوگی
فیصلہ دوں گا میں مظلوم کے حق میں اپنا
مجھ سے فرعون کی ہر گز نہ حمایت ہوگی
جن کا مقصود فقط اپنا منافع ہو حکیم

ایسے لوگوں کی نہ اب مجھ سے اطاعت ہوگی
حکیم خان حکیم......اٹک

غزل

وا کریں گے لب اگر تیری شکایت کے لیے
عمر بھر ترسیں گے ہم تیری عنایت کے لیے
اب ہمیں احساس ہو بھی جائے تو کیا فائدہ
زندگی برباد کی ہم نے محبت کے لیے
ذہن میں اس کے نہیں جچتا مقام سادگی
کیا نہیں کرتا یہ انساں شان و شوکت کے لیے
حضرت انساں تو سمجھا ہی نہیں اس بات کو
سجدہ کروایا خدا نے تیری عظمت کے لیے
آشنائے درد دل نے بھی بھلا ڈالا مجھے
کون آئے گا علاج درد الفت کے لیے
ہیں اگر مجبور تو غریب گزیدہ لوگ ہیں
کیا کمی ہے اس جہاں میں اہل ثروت کے لیے
ایک ہوجائیں مسلمان بھول کر نفرت قمر
یہ ضروری ہوگیا ہے قومی وحدت کے لیے
ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

غزل

مجھے جو دل نے دیا مشورہ غلط نکلا
میری زیست کا ہر فیصلہ غلط نکلا
کتاب زیست اتنی بھی مشکل نہ تھی
ترا سجایا ہوا حاشیہ غلط نکلا
مجھے نجوم و رمل کا علم ہوتا ہے
مگر یہ عشق ہے ہر زائچہ غلط نکلا
مثال دینے سے قاصر رہا جہانِ سخن
ترے جمال کا ہر قافیہ غلط نکلا
جسے نبھاتے ہوئے عمر رائیگاں ٹھہری
وہی اصول وہی ضابطہ غلط نکلا
دستگیر شہزاد......ٹوبہ ٹیک سنگھ

آواز دے دو

پھول ہے خوشبو کے لیے
دیا ہے روشنی کے لیے
سانس ہے زندگی کے لیے
میرے سوز کو نیا اک ساز دے دو
میرے قلم کو اپنی آواز دے دو
وفا شعار ہو اگر زیست
آمد بہار ہو اگر زیست
ہمار او قار ہو اگر زیست
میرے سخن کو انوکھا اک انداز دے دو
میرے قلم کو اپنی آواز دے دو
کہیں کہیں خوشی کم ہے
کہیں کوئی آنکھ پرنم ہے
میں ہوں اور میرا غم ہے
بکھری سوچ کو میری تم ارتکاز دے دو
میرے قلم کو اپنی آواز دے دو
خود کو یوں ڈھارہا ہوں
سپنوں کے لیے جلا رہا ہوں
لگتا ہے کسی خول سا رہا ہوں
میرے ہم نشیں اک سنہرا آغاز دے دو
میرے قلم کو اپنی آواز دے دو
لمحے بدل نہ جائیں کہیں
دل ڈھل نہ جائیں کہیں
شمعیں پگھل نہ جائیں کہیں
میرے نصیب مجھے دم ساز دے دو
میرے قلم کو اپنی آواز دے دو
خوشبو بکھر جائے گی
چاہت نکھر جائے گی
حیات سنور جائے گی
اپنے اظہار میں بلند آواز دے دو
میرے قلم کو اپنی آواز دے دو
کچھ نہ تیرے سوا ہو
لب پہ اک یہی دعا ہو
ہمت ہو اور حوصلہ ہو
مجھے دل کا اپنے ہر راز دے دو
میرے قلم کو اپنی آواز دے دو
سیف الاسلام......لیاقت آباد، کراچی

مرشد

ساحر جمیل سید

قسط نمبر 6

قدم قدم ہنگاموں اور حادثوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے عشق کی روداد دل گداز
اس نے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے پر آنکھ کھولی
مسلے، مرجھائے گجرے، باسی پھول اور گھنگرو اس کے کھلونے بنے
بدمعاشوں کی دنیا نے اسے مرشد مانا اور پھر......وہ کسی کا مرید ہو گیا......!!

شاہی محلے کا نمازی بدمعاش جس نے سرکار سے عشق کیا اور عشق کی مریدی کی

اچھی خاصی سوچ بچار کرنے کے بعد حسن آرا نے یہی بہتر خیال کیا کہ نندی پور کسی دوسرے کو بھیجنے کی بجائے وہ خود جائے' کسی دوسرے کو بھیجنے کے ساتھ یہ اندیشہ رہتا کہ کہیں جانے والا کوئی ایسی غلطی یا کوتاہی نہ کر بیٹھے کہ جس کے باعث کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے۔ خود اس میں سکت نہ تھی' شازیہ سندس یا آس پڑوس میں سے کسی کو نندی پور ساتھ لے جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور پھر حجاب کی فکر بھی تھی۔ اس فکر کا حل اس نے یوں نکالا کہ مرشد کے لیے اچھو کے پاس پیغام چھوڑ دیا۔ معلوم تھا کہ مرشد کے ساتھ یہ پیغام یہاں والوں کو بھی مل جائے گا اور اس کے بعد کوئی حجاب کو پریشان نہیں کرے گا۔ مرشد کے حوالے سے اس نے حجاب کو سمجھا دیا تھا کہ وہ خبر گیری کو آئے گا' پریشان نہیں ہونا۔ بس یہ ہے کہ اسے اپنے متعلق زیادہ تفصیل مت بتانا اور......اور اپنے سید ہونے کے حوالے سے مرشد تو کیا کسی سے بھی ذکر نہیں کرنا۔

حجاب کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ خالہ خود نندی پور جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس نے پوچھا بھی مگر حسن آرا نے کچھ واضح نہیں کیا۔

''مجھے ایک مزار پر منت ماننے جانا ہے' آپ کے گاؤں بھی ایک بندہ جائے گا۔''

خاصے غور و خوض کے بعد حسن آرا نے خالہ اقبال کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا' پھر ازانوں کے بعد وہ رازدارانہ انداز میں جا کر اس سے بات بھی کر آئی۔ مختصراً اسے معاملہ بھی بتایا اور یہ بھی بتا دیا کہ دراصل وہ لڑکی سید زادی ہے۔

حسن آرا کو خالہ اقبال پر ایسا ہی بھروسہ تھا' خالہ اقبال بھی اس رازداری پر فوراً ہی آمادہ ہو گیا' دن چڑھتے ہی وہ ایک ٹیکسی میں روانہ ہو گئے' مگر وہ نندی پور کے لیے نہیں ......ڈسکہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ حجاب نے نندی پور میں اپنے گھر کے بارے میں بتایا تھا اور ڈسکہ میں موجود اپنے ماموں اور خالہ کے گھر کے متعلق بھی بتایا تھا اور حسن آرا نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ نندی پور کی بجائے ڈسکہ جایا جائے۔ حجاب کے ماموں سید مرید حسین کے گھر......یقینی بات تھی کہ وہیں سے نندی پور وقوع کی تفصیل بھی مل جاتی۔ تازہ صورت حال بھی معلوم ہو جاتی......اور خود حجاب کے ماموں اور خالہ کے ہاں کے حالات و واقعات بھی سامنے آ جاتے۔

حسن آرا کا ارادہ تھا کہ باری باری حجاب بی بی کے ماموں اور خالہ دونوں کے گھر جائے گی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی' جس وقت وہ مرید شاہ صاحب کے گھر پہنچی حجاب کی خالہ پہلے ہی سے وہاں موجود تھی۔ وہ ساتھ ساتھ ہی رہتے تھے۔ دونوں صحنوں کے درمیان بس ایک دیوار تھی۔

یہاں سے حسن آرا کو نندی پور والی قتل غارت کی جو تفصیل سننے کو ملی وہ انتہائی دل دوز اور ہولناک تھی......ظلم اور درندگی کی انتہا تھی۔ وہ لوگ تو حجاب کو بھی مردہ تصور کیے بیٹھے تھے' ان کا خیال تھا کہ منظر عام پر تین افراد کی لاشیں آئی ہیں' جب کہ باقی تین افراد' یعنی حجاب' اسرار اور ان کی ماں کو چوہدریوں نے اب تک قتل کر کے کہیں دفن کر دیا ہوگا' اسی لیے وہ حجاب کے زندہ ہونے کے انکشاف پر ششدر رہ گئے تھے۔

خالہ اقبال بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ جب کہ حسن آرا اندر ایک کمرے میں۔ اس کے علاوہ کمرے میں صرف حجاب کے ماموں اور ممانی اور خالہ موجود تھیں۔

حسن آرا نے حجاب پر گزری ساری مصیبت ان کے گوش گزار کر دی اور اپنے متعلق بھی سب کچھ صاف صاف بتا دیا لیکن اس سب کے بعد ان لوگوں کا ردعمل حسن آرا کی توقعات کے برعکس تھا......حجاب کو آسرا یا تحفظ دینا تو الگ رہا' وہ چوہدریوں سے کچھ اس درجہ خوف زدہ تھے کہ پس پردہ بھی حجاب کی کسی قسم کی کوئی مدد کرنے پر تیار نہیں تھے۔ البتہ انہوں نے ایک فون نمبر لکھ کر حسن آرا کو دیا تھا۔

''یہ حجاب کی پھوپھی زہرہ کا فون نمبر ہے......بلوچستان میں رہتی ہیں' انہیں اطلاع دو' اسی کے بیٹے سے حجاب کی بچپن سے نسبت بھی طے ہے......وہ لوگ اثر و رسوخ والے ہیں' وہ حجاب کو تحفظ دے سکتے ہیں۔ بس اتنا کرنا کہ کسی کوٹھے یا بازار حسن کا تذکرہ مت کرنا' وہ......وہ حجاب کا سسرال ہے' ہونے والا سسرال۔ ہمیں تو پہلے ہی پولیس والوں نے ذلیل کر رکھا ہے' چوہدریوں کی نمک حلالی

کے چکر میں۔''

حسن آرا کو اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ لوگ حجاب کے لیے فکر مندی تو رکھتے ہیں مگر اس فکر مندی سے زیادہ ان کے دلوں میں چوہدریوں کی دہشت بیٹھی ہوئی ہے۔

وہ بوجھل اور دکھے ہوئے دل کے ساتھ وہاں سے واپس لوٹی' اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ یہ سب حجاب کو کیسے بتائے گی...... اس کے گھر پر ٹوٹنے والی قیامت...... اس کے باپ بھائیوں کے ساتھ ہونے والی درندگی...... ان کی دردناک موت...... وہ یہ سب کیسے بیان کرے گی اور...... اور یہ سب حجاب بی بی کیسے برداشت کرے گی...... کیسے سہن کر پائے گی وہ یہ سب......!

ابھی کل شام ہی کی تو بات تھی' وہ کیسے مان اور اعتماد کے ساتھ کہتی رہی تھی کہ بس ایک بار...... کسی طرح ایک بار میرے کسی بھائی یا بابا سائیں تک میری یہاں موجودگی کی اطلاع پہنچادی جائے۔'' اسے جیسے پختہ یقین تھا کہ یہ اطلاع پاتے ہی اس کے بابا سائیں اور بھائی فوراً سے پیشتر آکر اسے یہاں سے لے جائیں گے...... اسے معلوم نہیں تھا کہ ان مشفق اور مہربان ہستیوں میں سے کوئی بھی اس کی مدد' اس کی دادرسی کرنے کے لیے باقی نہیں بچا...... وقت کے یزیدوں نے ان سبھی کو سفاکی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

حسن آرا نے مرید شاہ کے گھر سے نکلتے ہی سب سے پہلے ایک پی سی او سے حجاب کی پھوپھی کے فون نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی کہ اب یہی ایک آخری امید تھی' مگر بار بار کوشش کے باوجود رابطہ نہیں ہو پایا۔

ڈسکہ سے واپسی کے وقت حسن آرا کی طبیعت گڑبڑانے لگی اور گوجرانوالہ پہنچ کر اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے' لہٰذا خالہ اقبال وہیں اسے اسپتال لے گیا۔ جہاں اسے ڈرپ لگی رہی...... ڈھائی تین گھنٹے اسپتال گزارنے کے بعد وہ دوبارہ لاہور کے لیے روانہ ہوئے' لاہور پہنچنے کے بعد حسن آرا نے پھر سے حجاب کی پھوپھی سے رابطے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی' مغرب سے کچھ پہلے کا وقت تھا جب وہ لوگ واپس پہنچ گئے' خالہ اقبال اپنے گھر چلا گیا اور حسن آرا زینے طے کرتی اپنے گھر...... نزہت بیگم کے کوٹھے پر پہنچ آئی۔

صدر دالان میں نزہت بیگم اور عشرت جہاں کے ساتھ ہاشو بھی موجود تھا۔ وہ غالباً حجاب کی وجہ سے وہاں موجود تھے کہ کہیں وہ فرار نہ ہوجائے...... حسن آرا خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور وہ تینوں خاموشی سے اسے گھورتے رہے۔

کمرے میں حجاب بی بی اکیلی نہیں تھی۔ شازیہ بھی وہاں موجود تھی اور وہ دونوں پلنگ پر آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔

تقریباً سارا دن گزر چکا تھا اور سکون وعافیت ہی سے گزرا تھا۔ سارے دن میں ایک بار شازیہ آئی تھی' ناشتہ لے کر' خود اس نے بھی حجاب کے ساتھ ہی ناشتہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ تین بار مرشد ہوکر گیا تھا۔

صبح کے وقت وہ چند سرسری سی باتیں کرکے لوٹ گیا تھا۔ البتہ اسی دوران حجاب پہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ خالہ حسن آرا کا بیٹا ہے' حجاب کو سچ میں حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ دوبارہ وہ دوپہر کے قریب آیا حسن آرا کے متعلق اس کے کریدنے والے انداز سے حجاب کو محسوس ہوا کہ اس کے شبہے کے مطابق خالہ کسی مزار پر نہیں بلکہ اس کے گاؤں نندی پور کی طرف گئی ہے۔ تبھی سے اس کے اندر عجیب وسوسے اور اندیشے کلبلانے لگے تھے۔ ایک عجیب سا دھڑکا لگ گیا تھا اسے۔

تیسری بار مرشد عصر کی اذان سے کچھ پہلے آیا تھا۔ اس بار اس کے تیور اور تاثرات کچھ الگ ہی تھے۔ پہلے بھی حجاب نے محسوس کیا تھا کہ وہ اسے گھورتا رہا تھا مگر اس بار تو اس کی بے باکی ہی کچھ اور تھی...... وہ اسٹول رکھ کر بالکل اس کے سامنے بیٹھ کر اسے تکتا رہا تھا اور حجاب کو یہ بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ نشے کی حالت میں ہے۔ شازیہ کی زبانی وہ مرشد کے متعلق جو کچھ سن چکی تھی اس کے مطابق مرشد کا شمار لاہور کے چند نامی گرامی بدمعاشوں میں ہوتا تھا اور وہ انتہائی من موجی اور خطرناک شخص تھا۔ اس کے بعد یہاں پر حسن آرا کی اہمیت اور اثر ورسوخ کی وجہ تو وہ سمجھ گئی تھی۔ کسی حد تک اسے اطمینان بھی ہوا تھا کہ خالہ کی ہمدردیاں میرے ساتھ ہیں اور خالہ کو ایک مضبوط سہارا

بھی حاصل ہے مگر مرشد کے اس بار کے انداز اور باتیں اسے خاصا پریشان کر گئی تھیں۔
اپنی ذات کے متعلق مرشد کی دل چسپی کی نوعیت محسوس کرتے ہوئے وہ اس پریشانی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ کہیں یہی دل چسپی اس بدمعاش کو میرے لیے ایک نئی مصیبت' نیا عذاب نہ بنادے۔
عصر کی نماز پڑھ چکنے کے کچھ دیر بعد وہ اسی طرح کے پریشان کن خیالات میں الجھی بیٹھی تھی کہ دروازے سے شازیہ اندر داخل ہوئی..... اس کے ہاتھوں میں ایک طشت تھا۔
"میں نے پلاؤ بنایا ہے..... خود' تیرے ساتھ ہی بیٹھ کر کھاؤں گی..... تو چکھ کے بتا میرے ہاتھ کا ذائقہ کیسا ہے۔ چل سیدھی ہو جا۔"
طشت اس نے پلنگ پر لا رکھا اور خود بھی حجاب کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ اس کا پہناوا وہی تھا' کھلے گریبان کی تنگ کرتی اور دوپٹہ..... دوپٹہ تو شاید وہ اوڑھتی ہی نہیں تھی۔
"یہ لے پکڑ....." اس نے پلیٹ بھر کر حجاب کو تھمائی اور ایک کٹوری اس کی طرف کھسکائی۔ "رائتہ اپنی مرضی سے ڈال لے۔ میں پانی لے کر آتی ہوں۔"
وہ پلنگ سے اچھل کر اتری اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ حجاب نے چاول چکھے' ان کی ظاہری شکل تو کچھ خاص نہیں تھی البتہ ذائقے میں کوئی کمی نہیں تھی۔
"کچھ دیر پہلے وہ مچھل پھر آیا ہوا تھا' کیا کہہ رہا تھا؟"
شازیہ کچھ ہی دیر بعد اسٹیل کا جگ اٹھائے واپس آ گئی تھی۔ جگ اس نے پلنگ کے ساتھ دھری تپائی پر رکھا اور حجاب کے سامنے بیٹھ گئی۔
"وہ..... وہ خالہ کے متعلق پوچھ رہا تھا کہ وہ کدھر گئی ہیں۔"
حجاب سمجھ گئی تھی کہ مچھل سے شازیہ کی مراد مرشد ہے..... وہ تو حجاب سے اس کے اپنے متعلق پوچھتا رہا تھا کہ اس میں ایسا کیا خاص اور اضافی ہے جو دوسری لڑکیوں میں نہیں ہوتا' مگر یہ بات شازیہ کو بتانے میں اسے شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔
"صبح آیا تھا..... پھر دوپہر میں بھی آیا' یہ بات تب نہیں پوچھی اس نے اور..... اچھو بھی تو جا کے خالہ کا پیغام دے کے آیا تھا صبح۔"
وہ پلیٹ میں چاول نکال کر ان پر رائتہ ڈال رہی تھی۔
"پہلے بھی پوچھ کر گیا تھا لیکن شاید اسے یقین نہیں آیا کہ خالہ کسی مزار پر گئی ہیں۔"
"بس کھوپڑی ہی الٹی ہے اس بندے کی تو..... دوبارہ آئے تو زیادہ بات چیت مت کرنا..... بہت خراب بندہ ہے یہ مرشد..... ایک نمبر کا بد دماغ اجڈ اور وحشی۔"
"جی بہتر۔"
صرف ایک اس کی ماں اور دوسری میں ہوں' جن کا کچھ لحاظ کر جاتا ہے ورنہ تو..... پوچھ مت۔"
"یہ ایسا کیوں ہے؟"
"لے..... تو اور کیسا ہونا چاہیے تھا اسے؟ کوٹھے پر پیدا ہونے والا ایک طوائف زادہ لفنگا بدمعاش نہیں بنے گا تو اور کیا ولی اللہ بنے گا۔"
"کیا یہ سگا بیٹا ہے خالہ کا؟"
"ہاں' ایک دم سکے والا۔ اسی کوٹھے پر پیدا ہوا تھا اوپر والی منزل پر..... سب سے اوپر والا کمرہ پہلے خالہ کے پاس ہوتا تھا۔ یہاں اس کمرے میں تو وہ تین چار سال پہلے شفٹ ہوئی ہے۔ پہلے اوپر ہی رہتی تھی۔"
"لیکن خالہ تو بالکل الگ مزاج کی ہیں۔ ایک ذرا بھی نہیں لگتا کہ یہ ان کا بیٹا ہوگا۔"
باتوں کے ساتھ ساتھ ہی وہ دونوں کھانا بھی کھا رہی تھیں۔
بس خالہ کے ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار ہی نے مزاج خراب کیے تھے اس کے' پھر گلی محلے کے تلنگے دوستوں کی صحبت نے چار چاند لگا دیے اور رہی سہی کسر رستم لہوری نے پوری کر دی۔"
"رستم لہوری..... یہ کون ہے؟"
"مرشد کا گرو گھنٹال ..... اس کا سرپرست ..... خالہ یہاں سب کی مخالفت مول لے کر اسے پڑھا رہی تھی' ان دنوں یہ نویں کلاس میں پڑھ رہا تھا جب رستم لہوری سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ اس نے مرشد کی پڑھائی ختم کروا کر اسے ڈنڈے سوٹے اور کلہاڑیاں چاقو چلانے کی تربیت

دینا شروع کردی..... ہاتھ پاؤں اور بندوقیں چلانا سکھایا' بدمعاشی کے اصول اور گر سمجھائے.....!

"وہ خود تو لاہور کا سکہ بند بدمعاش تھا ہی' اسے بھی بالکل اپنے جیسا بنادیا اس نے..... آج کل وہ پراپرٹی کا کاروبار کررہا ہے۔ پنجاب لینڈ مافیا کے چند بڑے ناموں میں سے ایک نام اس کا بھی ہے۔ وہی اس مرشد کی پشت پناہی کرتا ہے۔"

حجاب خاموشی سے سر جھکائے چاولوں کے ساتھ مصروف رہی تو شازیہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کیا سوچنے لگی؟"

"اس دنیا میں برے لوگ زیادہ ہیں۔"

حجاب نے نوالہ منہ میں ڈالا اور اس کی طرف دیکھا۔

"تو برے لوگوں پر دھیان دینے کی بندے کو ضرورت ہی کیا ہے۔"

"بات ضرورت کی نہیں ہے' آپ دھیان دو نہ دو..... برے لوگ خود اگر آپ پر دھیان دینے لگ جائیں تو؟"

شازیہ نے فوراً حجاب کی طرف دیکھا..... وہ بول رہی تھی۔

"اب میں یہاں بیٹھی ہوں تو اس میں میرا کیا قصور.....؟ میں نے تو کسی پر دھیان نہیں دیا..... میں نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔"

"پھر تیرے بھائیوں نے بگاڑا ہوگا' ان کے حصے کی سزا تیرے نصیب میں بھی آگئی۔" حجاب خاموش رہی۔ آنکھوں کے سامنے یک دم بھائیوں کی وجیہ صورتیں آٹھہریں..... باباسائیں اور ماں جی کے چہرے بھی ساتھ ہی تھے۔ وہ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے اپنے گاؤں' اپنے گھر جاپہنچی.....اپنے بھائیوں اور ماں باپ کے درمیان۔

"ہاتھ کیوں روک لیا؟ ٹھیک نہیں بنے چاول؟"

"چاول تو اچھے بنے ہیں' بس مجھے بھوک ہی اتنی تھی۔"

"تھوڑے سے تو اور لے۔"

"نہیں بس.....اور نہیں کھاسکوں گی۔"

کچھ دیر تک دونوں خاموش رہیں پھر شازیہ ہی بولی۔

"تو اپنے سوچنے سمجھنے کے انداز کو بدلنے کی کوشش کر..... یہ اچھائی برائی اور گناہ ثواب کے فلسفے میں پڑ کر انسان کے ہاتھ اذیت' اور دکھ کے سوا کچھ نہیں آتا..... انسان کو اپنے معیارات اپنے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے بنانے چاہئیں' تیرے بھلے کے لیے ایسا کہہ رہی ہوں..... اور تو جتنی جلدی یہ بات جان سمجھ لے تیرے لیے اتنا ہی اچھا رہے گا۔"

"کیسے..... کیسے بدل لوں اور..... کیا اچھا رہے گا؟"

"تو جن باتوں یا کاموں کو آج تک برا اور گناہ سمجھتی رہی ہے' ان کے متعلق اپنے خیالات بدل لے' انہیں اچھا نہیں سمجھ سکتی تو برا سمجھنا بھی چھوڑ دے..... آگے آنے والی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوں گی' سکون سے گزرے گی۔"

شازیہ نے کھانے سے ہاتھ روک کر برتن سمیٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں..... یہ کیسے ہوسکتا ہے..... یہ تو جانتے بوجھتے ہوئے خود کو دھوکا دینے..... فریب دینے والی بات ہوگی..... سچ کو جھوٹ کہنے سے حقیقت تو نہیں بدل جاتی..... سچ تو پھر بھی سچ ہی رہتا ہے۔" شازیہ نے ایک ترچھی سی نظر حجاب کی متعجب صورت پر ڈالی اور طشت اٹھا کر جگ کے ساتھ تپائی پر ٹکادیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مضمحل سی مسکراہٹ تھی۔

"تیرا جسم ہی جوان ہوا ہے' دماغ سے تو اب بھی پونیوں والی بچی ہی ہے' کتنی بھولی اور معصوم ہے۔"

شازیہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔

"حقیقت..... سچ..... میری گڑیا رانی! سچ ہر ایک کا اپنا اپنا ہوتا ہے..... ضرورت پڑنے پر اپنی مرضی اور مفاد کے سچ دریافت بھی کرلیے جاتے ہیں اور گھڑ بھی لیے جاتے ہیں' حالات' ماحول اور مقام کے ساتھ یہ سچ اور سچائیاں بدل بھی جاتی ہیں..... دس دن پہلے تیرا سچ کچھ اور تھا مگر آج کچھ اور ہے..... تجھے پتا ہے نا تو کہاں بیٹھی ہے اس وقت..... یہ گناہوں کی بستی ہے' اس بستی سے باہر کا سچ یہاں فضول بکواس مانے جاتے ہیں اور یہاں کے سچ..... یہاں کی سچائیاں باہر والوں کے لیے قابل قبول نہیں..... قابل برداشت نہیں..... اور حقیقت یہ ہے کہ تو اس بستی

سے اس بستی کا حصہ بن چکی ہے..... اب تجھے یہیں جینا مرنا ہے' بہتر ہے کہ جتنی زندگی ہے اسے جی لیا جائے..... ہر پل جینے مرنے سے کہیں اچھا ہوگا کہ تو یہاں جینے کے انداز اور آداب سیکھ سمجھ لے..... جینے کا ہنر سیکھ لے..... جو سچ تجھے درپیش ہے اس سے دوستانہ انداز میں سمجھوتا کر..... اسے قبول کرنے کی کوشش کر۔"

"نہیں..... یہ کبھی نہیں ہوسکتا..... میں یہاں جینے سے مرجانا پسند کروں گی۔"

حجاب نے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے اٹل لہجے میں کہا تو شازیہ فوراً بولی۔

"کیوں..... کیوں مرجانا پسند کرے گی تو؟ زندگی اتنی فضول چیز لگتی ہے تجھے؟"

"گناہ اور ذلت کی زندگی فضول چیز ہی ہوتی ہے۔"

"تو یہاں جینے میں تجھے گناہ ذلت کی کیا بات نظر آتی ہے؟"

"یہاں..... یہاں مجھے گھنگرو پہن کر ناچنے پر مجبور کررہے تھے وہ لوگ۔"

"تو..... گھنگرو پہننا یا ناچنا گناہ کیسے ہوگیا؟"

"مردوں کی محفل میں لڑکیوں عورتوں کا گھنگرو باندھ کر ناچنا گانا گناہ اور ذلت نہیں تو اور کیا ہے؟ میں جانتی ہوں کوٹھوں طوائفوں کے متعلق' یہاں مجرے ہوتے ہیں' شرابیں اور جوئے چلتے ہیں' جسم فروشی ہوتی ہے' یہ سب گناہ وذلت کے معاملے ہی تو ہیں اور..... اور ابھی آپ نے خود بھی تو اس علاقے کو گناہوں کی بستی کہا تھا۔"

"وہ تو میں نے مہذب جانوروں کے حساب سے کہا تھا۔ ورنہ تجھے جو گناہ وذلت کے معاملے نظر آرہے ہیں وہ تو فن ہے' اور محفل کو مجرے یا ناچ گانے کی محفل کہنے کی بجائے رقص وموسیقی کی محفل کہو' یہ فن اور فن کاروں کی محفل ہوتی ہے' اس میں صاحب ذوق قدر دان اور فن کے مداح لوگ شامل ہوتے ہیں..... وہ ہمارے مہمان ہوتے ہیں اور مہمانوں کی دل بستگی اور خاطر تواضع تو اخلاقیات کا حصہ ہے۔ اور ذلت تو صرف مجبوری اور بے بسی کی وجہ سے محسوس ہوتی ہے انسان کو..... انسان ہر وہ کام کرنے میں ہتک اور ذلت محسوس کرتا ہے' جس پر کوئی دوسرا اسے زبردستی مجبور کرے' یہی رقص اگر انسان اپنی مرضی..... اپنی خوشی سے کرے..... شوق سے کرے تو یہ اس کے لیے راحت اور سرخوشی کا باعث بن جاتا ہے۔"

"یہ سب لفظوں کا ہیر پھیر ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

حجاب کے چہرے پر ناپسندیدگی کا تاثر ابھر آیا۔

"تسلیم کرلینے تک ہیر پھیر لگتا ہے' تسلیم کرلینے کے بعد فرق بھی خود بخود مٹ جاتا ہے۔ ناچ گانے سے لے کر جسم فروشی تک' سب خدمت خلق کے زمرے میں آتا ہے۔ یہاں طوائفیں بازار لگائے بیٹھی ہیں..... تو مخلوق کی خدمت خاطر کی نیت سے..... یہ مخلوق کی خواہشات کا احترام کرتی ہیں۔ مخلوق کی خوشی اور سکون کی خاطر اپنی ہڈیاں گھلاتی ہیں..... مخلوق کی مشکل میں اسے مشکل سے چھٹکارا پانے میں اس کی امداد کرتی ہیں۔ یہاں جو سوالی جس نیت اور ارادے سے آتا ہے اس کی جھولی میں وہی کچھ ڈال دیا جاتا ہے' بوجھل اعصاب اور ذہنی دباؤ کے ساتھ آنے والے یہاں سے پرسکون اور ہلکے پھلکے ہوکر واپس لوٹتے ہیں۔"

"آپ ایسی باتوں سے مجھے قائل نہیں کرسکیں گی..... مجھے نہیں معلوم آپ سب ایسی زندگی کیسے گزار رہے ہیں' کیسے یہ سب کرکے بھی اتنا مطمئن ہیں' مجھ میں تو اتنا حوصلہ نہیں' میں..... میں تو طوائف بن کر جینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی تو..... طوائف کے متعلق لوگوں کے تصورات درست نہیں بس..... ورنہ تو ہر سماج طوائفوں کا احسان مند ہوتا ہے تیرے معاشرے کی نسلیں طوائفوں کی احسان مند ہیں..... لیکن ابھی تجھے یہ بات سمجھ نہیں آئے گی..... ہاں دو چار سال بعد خود بخود ہی سمجھ جائے گی۔"

"جواز تو ہر بندہ رکھتا ہے..... کیا یہی وہ سچ ہیں جو گھڑ

لیے جاتے ہیں۔''
''یہ وہ سچ ہیں جو دریافت کیے جاسکتے ہیں...... دوسری صورت یہ تجربے کے بعد آہستہ آہستہ خود ہی آشکار ہوجاتے ہیں۔''
''میرا تو اس ماحول کے خیال سے دم گھٹتا ہے...... اپنے آپ سے بھی گھن سی محسوس ہونے لگتی ہے۔'' حجاب کے چہرے اور لہجے سے ناگواری اور کراہت مترشح تھی...... شازیہ تفہیمی انداز میں سر کو ہلاتے ہوئے گویا ہوئی۔
''ہاں...... ٹھیک کہہ رہی ہے تو...... یہ جگہ ہی ایسی ہے ...... غلاظتوں اور کراہتوں کا ڈھیر۔''
حجاب نے شازیہ کی طرف دیکھا...... اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ اتر آئی تھی۔
''یہاں ہر گھر ہی ایسا ہے...... پورا محلہ ہی ایسا ہے' لیکن اگر یہ ایک محلہ صاف ہوگیا نا تو پورا شہر گندا ہوجائے گا اور اردگرد کے قصبے اور دیہات بھی۔ خیر...... تو چھوڑ اس بات کو...... میں سمجھ گئی ہوں کہ تیری سمجھ میں نہیں آئے گی ...... میں چائے لے کر آتی ہوں' ابھی کل کا دن اور تو خالہ کی مہمان ہے۔''
''کیا یہ لوگ خالہ کی بات نہیں مانیں گے؟''
شازیہ پلنگ سے سرکنے لگی تھی کہ حجاب کے سوال پر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔
''کونسی بات؟''
''اگر خالہ انہیں کہیں کہ مجھے یہاں سے جانے دیں تو کیا یہ مجھے جانے دیں گے یا نہیں؟'' اس کے لہجے میں عجیب امید وبیم کا تاثر تھا۔
''تو تو بالکل پاگل ہے...... ایسا کیسے ہوسکتا ہے بھلا؟''
حجاب کچھ بولنا چاہتی تھی کہ کمرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی اور حسن آرا اندر داخل ہوآئی۔ شازیہ اور حجاب دونوں اس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔
''ارے خالہ! آگئیں آپ' آئیں...... ادھر آجائیں۔''
حسن آرا کے چہرے سے تھکان اور نقاہت ٹپک رہی تھی مگر ہونٹوں پر فوراً ایک نرم سی مسکراہٹ اتر آئی۔
''کیسی ہو شازیہ؟''
''بالکل ٹھیک' آپ سنائیں طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟''
''ہاں' ٹھیک ہی ہے بس ذرا تھک گئی ہوں۔''
حسن آرا آگے بڑھ کر پلنگ کے ساتھ نیچے ہی بیٹھ گئی۔ کمر اس نے پلنگ کے ساتھ ٹکالی تھی۔
''ارے...... آپ نیچے کیوں بیٹھ گئیں۔''
شازیہ نے فوراً کہا۔
''بس یہاں ذرا سکون ہے' آپ کیسی ہیں حجاب' کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی نا۔''
''نہیں خالہ! آپ ادھر اوپر آجایئے نا۔''
حجاب نے گردن جھکاتے ہوئے گھٹے گھٹے شرمندہ سے لہجے میں کہا...... اسے حسن آرا کے نیچے بیٹھنے کی وجہ معلوم تھی۔
''نہیں...... یہاں ذرا آرام مل رہا ہے۔''
''خالہ! میں نے پلاؤ بنایا ہے' لاؤں آپ کے لیے۔''
''نہیں بیٹا' کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔''
''چائے لاؤں؟''
''ہاں...... چائے پی لوں گی۔''
''میں چائے لینے ہی جارہی تھی۔ ابھی لے کر آتی ہوں۔''
شازیہ نے تپائی پر دھرا طشت اٹھایا اور جلدی سے باہر نکل گئی۔ حجاب نے آگے ہوکر تپائی سے جگ گلاس اٹھایا اور حسن آرا کو پانی ڈال کر دیا' جو اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کرلیا...... ایک گولی کھا کر پانی پینے کے بعد اس نے اٹھ کر چادر اتار کر چار پائیوں کے اسٹینڈ پر رکھی اور ایک دوپٹہ سنبھالتی دوبارہ اسی جگہ بیٹھ گئی۔ وہ بظاہر نارمل دکھائی دے رہی تھی مگر اس کے ذہن ودل میں ایک کشمکش چل رہی تھی...... دل پر ایک بوجھ سا تھا۔
حجاب اپنی جگہ مضطرب تھی' وہ یہ جاننے کے لیے بے قرار تھی کہ خالہ کہاں سے آرہی ہے' اگر وہ سچ میں نندی پور

گئی تھی تو کیا کر کے آئی ہے' کیا خبر لائی ہے اور...... اگر وہ کسی دربار مزار سے آئی ہے تو نندی پور اس نے کس کو بھیجا تھا...... اور جانے والا اس وقت کہاں ہے ...... واپس آچکا ہے یا ابھی اس کا انتظار کرنا ہوگا!

''مرشد آیا تھا؟''

''جی' تین بار...... اسے شاید یقین نہیں تھا کہ آپ کسی مزار پر گئی ہیں۔''

''ہوں......'' حسن آرا نے ہنکارا سا بھرا۔

''آپ نے اسے بتایا تو نہیں کہ آپ سید گھرانے سے ہیں؟''

''نہیں...... اور آپ نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ آپ کا بیٹا ہے۔''

حسن آرا نے یوں چونک کر اس کی طرف دیکھا جیسے اس بات کا اسے ابھی خیال آیا ہو۔ پھر نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''ہاں جی! یہ میں نے نہیں بتایا تھا۔''

پھر اس نے تپائی کھینچ کر پلنگ کے سرہاندی کی طرف کردی اور خود اٹھ کھڑی ہوئی۔ درمیان والی چارپائی سے ایک توشک نکال کر پلنگ کے برابر بچھائی' تکیہ اٹھایا اور توشک پر نیم دراز ہوگئی۔ تھکاوٹ کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگی تھی۔

''خالہ! میرے گھر کوئی گیا تھا؟''

حجاب نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ حسن آرا کے اندر کا اضطراب بڑھ گیا...... حجاب جاننے کے لیے بے قرار تھی اور حسن آرا کے پاس جو خبریں تھیں وہ انتہائی دل دوز اور تکلیف دہ تھیں...... جھوٹ وہ بول نہیں سکتی تھی اور سچ کلیجہ چیر دینے والا تھا...... اس نے ایک نظر حجاب کی طرف دیکھا پھر رخ بدلتے ہوئے بولی۔

''وہاں کے حالات...... توقع سے زیادہ خراب ہیں۔''

حسن آرا کے لبوں سے ایک جملہ کیا آزاد ہوا...... حجاب کے رگ و پے میں بے قراری کی لہریں دوڑ گئیں...... یعنی...... یعنی خبر آ گئی تھی...... کوئی اس کے گاؤں سے...... اس کے گھر سے ہو آیا تھا...... شاید...... شاید خود خالہ ہی۔

حجاب بے اختیار پلنگ سے اتر کر خالہ کے سامنے توشک پر آ بیٹھی۔

''کون...... کون گیا تھا وہاں؟'' حجاب نے جذباتی انداز میں دونوں ہاتھ حسن آرا کے گھٹنے پر رکھ دیے۔ حسن آرا نے فوراً اس کے دونوں ہاتھ تھام کر گھٹنوں سے اٹھا لیے۔

''آپ اپنی جگہ بیٹھیں آرام سے۔ میں بتاتی ہوں سب کچھ...... تھوڑا تحمل رکھیے۔'' حسن آرا نے بولنے کے لیے منہ کھولا تھا مگر بولی نہیں' کمرے کے دروازے سے اچانک مرشد اندر داخل ہوا تھا۔ یقیناً اسے بھی اماں کی واپسی کی خبر مل چکی تھی۔ حسن آرا نے آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے اسے سمجھایا کہ تھوڑا صبر رکھے' مرشد کی وجہ سے خود اسے بھی چپ لگ گئی تھی۔ وہ اجڈ انسان اچانک ہی تو منہ اٹھا کر اندر گھس آیا تھا۔ حجاب دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی پیچھے ہٹ کر واپس پلنگ پر بیٹھ گئی۔

مرشد کھڑا بغور اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا' شاید وہ اس کی طبیعت کے متعلق اندازہ کرنا چاہ رہا تھا۔

''کیا...... یادداشت تو نہیں چلی گئی تمہاری؟''

حسن آرا نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ گہرا سانس چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ کر حسن آرا کے قریب ہی قالین پر کولہے کے زور پر بیٹھ گیا۔

''گھٹنے کہاں ہیں آپ کے؟''

''ساتھ ہی ہیں...... انہوں نے کہاں جانا ہے۔''

''یہ کیا حرکت تھی؟''

مرشد نے بھویں اچکا کر پوچھا تو حسن آرا نے مسکراتے ہوئے دایاں ہاتھ اس کے گال پر رکھ دیا۔

''حاضری کا دکھ تھا پتر! ضروری تھا جانا۔''

''گئی کہاں تھیں آپ؟'' حجاب کو محسوس ہوا کہ وہ ابھی بھی نشے میں ہے۔

''ایک پاک ہستی کا در تھا' بس حاضری دے کر لوٹ

آئی۔''
مرشد چند لمحے خاموشی سے اماں کی صورت دیکھتا رہا' پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اماں کچھ پردے میں رکھنا چاہ رہی ہے۔
اسی وقت شازیہ ایک ٹرے میں چائے کی تین پیالیاں رکھے اندر داخل ہوئی۔ مرشد پر نظر پڑتے ہی وہ ایک ذرا ٹھٹکی پھر آگے بڑھ آئی۔
''پانچ دس منٹ پہلے آجاتا تو میں چار کپ لے آتی...... لے پکڑ اب میں ایک پیالی اور لے آتی ہوں۔''
اس نے قریب آ کر ٹرے مرشد کے سامنے کی' اس نے سر اٹھا کر سنجیدگی سے شازیہ کو گھورا تو وہ جلدی سے بولی۔
''خالہ کے لیے بنائی تھی۔''
مرشد نے خاموشی سے ٹرے پکڑ کر نیچے رکھ لی اور شازیہ کھسیا کر باہر نکل گئی۔
''آپ نے جہاں بھی جانا تھا کم از کم بتا تو جاتیں' اتنے لوگ ایسے ہی ادھر ادھر خوار ہوتے پھرے۔''
مرشد نے پیالی اٹھا کر حسن آرا کو پکڑائی جو اس نے حجاب تک پہنچا دی۔ مرشد نے دوسری پیالی بھی پکڑائی اور تیسری کی طرف خود متوجہ ہو گیا۔
''میں کون سا ہفتے بھر کے لیے گئی تھی۔ ویسے بھی صبح پیغام بھجوا تو دیا تھا میں نے' پھر کیا ضرورت تھی لوگوں کو خوار کرنے کی۔''
''ہوں...... آپ کو تو جیسے پتا نہیں کہ کیا ضرورت تھی؟''
وہ باتوں میں مصروف تھے اور حجاب اپنی جگہ بری طرح سے بے چین تھی۔ وہ جلد از جلد اپنے گاؤں اور اپنے گھر کے متعلق سب کچھ جان لینے کے لیے بے قرار تھی۔ اپنے سگوں' اپنے پیاروں کی خیر خیریت کی خبر سے بڑھ کر کچھ بھی اس کے نزدیک اہم نہیں تھا۔ اس کا بس چلتا تو فوراً سے پہلے اس مچھل کو اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دیتی جو پسر کر بیٹھ ہی گیا تھا۔ پھر چائے کی ایک اور پیالی اٹھائے شازیہ بھی واپس آگئی۔ حجاب اپنی جگہ بیٹھے اندر ہی اندر کسمسا رہی تھی۔
ابھی وہ لوگ بیٹھے چائے پی ہی رہے تھے کہ مغرب کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ حجاب نے پھر سے دیکھا کہ اذان کی آواز کے ساتھ ہی خالہ اور مرشد دونوں باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے تھے اور اذان کے ختم ہونے تک دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر مرشد چائے نماز اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ شازیہ نے بھی برتن سمیٹے اور اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی حجاب سرک کر حسن آرا کے قریب ہوئی اور مضطربانہ انداز میں بولی۔
''خالہ کون گیا تھا میرے گھر؟''
''آپ کے گھر تو کوئی بھی نہیں گیا' ہاں آپ کے ماموں کے گھر گئی تھی میں' لیکن پہلے نماز ادا کر لی جائے پھر تسلی اور آرام سے بات کرتے ہیں۔''
''جی...... تو ماموں ممانی سے ملاقات ہوئی آپ کی؟ میرے بابا سائیں اور بھائی کیسے ہیں اور...... اور ماں جی...... ان کے متعلق کیا بتایا انہوں نے ...... وہ...... وہ سب کیسے ہیں؟''
حجاب کی تڑپ دیدنی تھی...... اس کی شفاف آنکھوں میں امید کی چمک تھی اور چہرے پر اندیشوں کے سائے۔
''سب کے بارے میں بتاتی ہوں...... سب کچھ...... لیکن پہلے اس کے دربار میں حاضری لگالیں۔''
حسن آرا نے اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
''جی خالہ۔'' حجاب نے اس کی تقلید کی تھی۔
''ویسے...... وہ سب خیر خیریت سے تو ہیں نا؟''
اس نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے حسن آرا کی سنجیدہ صورت کو دیکھا' اس کی صورت پر جما سکوت حجاب کو الجھن اور پریشانی میں مبتلا کر رہا تھا۔
''پہلے آپ وضو کر آئیں...... میں یہیں ہوں......

سب کی خیر خیریت کا بتاؤں گی آپ تسلی رکھیے اور خدا سے دعا کیجیے وہ سب بہتر کردے گا۔"

"جی خالہ۔"

حجاب نے سر جھکایا اور غسل خانے کی طرف بڑھ گئی جب کہ حسن آرا کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے تھکے ہوئے انداز میں پلنگ پر بیٹھ گئی۔

حجاب کی تڑپ دیکھتے ہوئے اس کا دل مزید دکھنے لگا تھا۔ اسے حجاب کو ایک منحوس ترین خبر سنانی تھی۔ جن کی خیر خیریت جاننے کے لیے وہ مری جا رہی تھی' ان کے متعلق حسن آرا نے اسے بتانا تھا کہ ان میں سے اب کوئی نہیں رہا۔

دونوں نے نماز ادا کی...... حسن آرا کا تو حجاب کو اندازہ نہیں تھا' البتہ وہ آج نماز ڈھنگ سے ادا نہیں کر پائی تھی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ حسن آرا کے قریب سرک آئی۔

"بتایئے خالہ ...... بتایئے کچھ مجھے ...... ادھر کے حالات کیا ہیں؟ میرے گھر والے کیسے ہیں؟"

"حالات تو اچھے نہیں ہیں...... توقع سے زیادہ خراب ہیں۔"

"بابا سائیں۔"

حجاب کا انداز متفسرانہ تھا۔ اس کی دھڑکنیں اپنا تسلسل گنوا رہی تھیں۔ حسن آرا خاموش رہی تو دھڑکنیں کچھ اور تیز ہوگئیں۔

"بابا سائیں کیسے ہیں اور...... میرے بھائی؟"

حسن آرا کے حلق میں ایک گولا سا آ پھنسا...... حجاب کے سوال کا جواب دینا اسے مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔

"آپ چپ کیوں ہیں خالہ؟"

حجاب نے مزید قریب ہوتے ہوئے ایک بار پھر حسن آرا کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے تو حسن آرا نے جلدی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"آپ...... فی الحال اپنے گھر نہیں جاسکتیں اور...... اور کوئی وہاں سے یہاں تک آ بھی نہیں سکے گا۔"

"کک...... کیوں...... کیوں بھلا؟"

حجاب کی آواز میں لرزش آ گئی...... حسن آرا کا بجھا ہوا چہرہ اسے اپنے بدترین اندیشوں کی تائید کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"آپ کا گھر اب خالی ہے...... وہاں کوئی نہیں ہے۔"

"تو وہ...... وہ سب کدھر ہیں؟"

"نہیں رہے۔"

یہ دو لفظ حسن آرا کے ہونٹوں سے نکلتے ہی کمرے کی فضا میں دھماکے سے پھٹے تھے۔ حجاب کا پورا وجود جھنجھنا کر رہ گیا۔ کانوں میں سائیں سائیں سی ہونے لگی۔

"کک...... کیا مطلب کیا مطلب نہیں رہے؟"

لفظ ازخود اس کی زبان سے پھسلے تھے۔

"پولیس کے مطابق آپ' آپ کی والدہ اور آپ کا چھوٹا بھائی لاپتا ہیں' آپ کے ماموں لوگوں کا خیال ہے کہ چوہدریوں نے آپ تینوں کو ختم کرکے غائب کردیا ہے' جب کہ آپ کے بابا سائیں' اور دو بھائیوں کی تد...... تدفین کی جاچکی ہے۔"

حسن آرا کو یہی موزوں ترین الفاظ سوجھے تھے۔ وگرنہ تو جو کچھ اسے سننے کو ملا تھا وہ سن کر تو اجنبی' انجان شخص کے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔

حسن آرا اتنا کہنے کے بعد کسی مجرم کی طرح سر جھکا کر بیٹھ گئی اور حجاب حیرت و بے یقینی سے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ حسن آرا کو دیکھے گئی' مگر درحقیقت وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی' اسے اپنی سماعت پر شبہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے سننے سمجھنے کی صلاحیتوں کو دیکھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کررہی تھی...... اس کا وجود اور آنکھیں پتھر کی طرح ساکت تھیں اور کانوں کے رستے جیسے اندر سناٹے اترتے آ رہے تھے۔

اس طرح کے اندیشے پہلے ہی اس کے دماغ میں کہیں موجود تھے۔ مگر اب سے پہلے اس نے ان پر توجہ نہیں دی تھی۔ نظر انداز کرتی آئی تھی' آنکھیں چراتی رہی تھی لیکن اب جو کچھ حسن آرا کہہ رہی تھی' اسے وہ نظر انداز نہیں کرسکتی تھی' اب تو ان تمام بھیانک اور روح فرسا اندیشوں کی گویا

تائید وتصدیق ہوگئی تھی۔

حسن آرا مزید بھی کچھ بول رہی تھی کہہ رہی تھی مگر حجاب کی سماعتیں سن ہوچکی تھیں' وہ نہ تو حسن آرا کو ٹھیک سے سن پارہی تھی اور نہ سمجھ پارہی تھی۔ کانوں میں سائیں سائیں کا شور تھا اور دل جیسے دھڑکنا ہی چھوڑ چکا تھا۔

اسے احساس نہ ہوسکا کہ مرشد کس وقت کمرے میں آیا اور کس وقت گیا...... محلے میں سے چار چھ عورتیں بھی آئیں جو حسن آرا کی خیریت معلوم کرنے آئی تھیں۔ معلوم تو محلے بھر کو تھا کہ حسن آرا تین سال بعد گھر سے نکلی ہے...... کسی مزار پر منت ماننے اور مرشد اس کو ڈھونڈ رہا ہے...... حسن آرا حجاب کی صدماتی حالت کو سمجھتے ہوئے آنے والی عورتوں کو خود ہی لے کر باہر دالان میں چلی آئی تھی۔ حجاب اسی جگہ پلنگ سے لگی بیٹھی رہی' اس کے کانوں میں رہ رہ کر اپنے گھر والوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

''نہیں شاہ جی ...... وہاں تو بچپن ہی سے آپ نے حجاب کی نسبت طے کر رکھی ہے' وہاں نہیں...... یہ وٹے سٹے والے رشتے تو بڑی پریشانیوں کا باعث بن جایا کرتے ہیں۔''

''اونکی! میں جارہا ہوں گوجرانوالہ کچھ منگوانا ہے تو بتا' لیتا آؤں گا میں۔''

''سردار جی! آج تو گڑ والے چاول کھلا دو' چنے کی دال ڈال کے...... بڑا دل کررہا ہے آپ کی پتری کو بھی بڑے پسند ہیں۔''

بابا سائیں اکثر خوش گوار موڈ میں ماں جی کو سردار جی کہہ کر بلاتے تھے۔

''باجی! میرے جوگر کدھر رکھے ہیں مل نہیں رہے۔''

''حجاب پتری! آ میں تیرے سر میں تیل ڈال دوں' دیکھ بال کیسے روکھے روکھے سے ہورہے ہیں۔''

''تو عید کے جوتے کپڑوں پہ منہ کیوں پھلائے بیٹھی ہے' جھلیے تو اپنی پسند بتا میں شہر سے پوری دکان اٹھا کر لادوں گا تجھے...... تیرا ویر تو تجھ پہ اپنی جان بھی وار دے گا۔''

''ان ہی دو چار دنوں کے اندر' دونوں میں سے کسی ایک جگہ بات پکی کردیتے ہیں۔''

زوار بھاہ جی کی شادی ہونے والی تھی...... جس آنگن میں شہنائی ڈھولکی اور ماہیے ٹپوں کی آوازیں گونجنے والی تھیں وہاں سناٹوں اور ویرانیوں نے آڈیرے ڈالے تھے ...... وہ خوبصورت اور محبت بھری آوازیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہوچکی تھیں...... بابا سائیں اور دو بھائیوں کی تدفین ہوچکی تھی' یعنی...... یعنی وہ ہمیشہ کے لیے مٹی کی تاریک تہوں میں جالیٹے تھے' حجاب اب کبھی بھی انہیں نہیں دیکھ سکتی تھی' اب کبھی ان کی آواز اسے سنائی نہیں دینی تھی۔

اس کمزور جان کے لیے اس سے بڑی قیامت اور کیا ہوسکتی تھی کہ جو پل بھر میں اس بھری پری اجنبی دنیا میں بالکل تنہا اور بے آسرا ہوگئی تھی۔

وہ اسی جگہ بے حس وحرکت بیٹھی رہی اور اس کی آنکھوں سے خود بخود گرم اور نمکین پانی اس کے رخساروں پر بہتا رہا...... حسن آرا کس وقت واپس کمرے میں آئی' اسے کچھ پتہ نہ چلا' حسن آرا ہی نے اسے بڑی مشکل سے واپس پلنگ پر بٹھایا تھا۔ حوصلے' دلاسے بھی دیئے تھے' مگر فی الوقت سب بے اثر تھا۔

❁......☆......❁
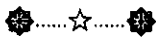
رات گیارہ بجے سے اوپر کا وقت تھا...... حجاب بدستور پلنگ پر ایک زندہ لاش کی صورت بیٹھی تھی۔ البتہ اب وہ پیچھے ہوکر دیوار سے کمر ٹکائے ہوئے تھی۔ آنکھیں خشک ہوچکی تھیں لیکن گالوں پہ آنسوؤں کی خشک لکیریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

حسن آرا دن بھر کی تھکان اوڑھے کچھ دیر پہلے ہی سوئی تھی کہ دروازے کا پردہ ہٹا اور بھدے وجود والی ڈائن بڑھیا 'نزہت بیگم اندر داخل ہوآئی۔ اس نے ایک نظر زہر بار حجاب پر ڈالی اور عجلت انگیزی سے حسن آرا کے قریب پہنچ گئی۔ اس کے جھنجوڑنے پر حسن آرا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

''کیا...... کیا ہوا؟ کیا بات ہے اماں۔''

''جلدی اٹھ...... ادھر مہمان خانے میں جاگیر دار صاحب آئے بیٹھے ہیں' جلدی چل۔''
''آئے بیٹھے ہیں تو...... میں کیوں چلوں؟''
''پھر اس کو بھیج دے میرے ساتھ۔''
نزہت بیگم نے الفاظ چباتے ہوئے حجاب کی طرف اشارہ کیا تو حسن آرا کا دماغ جیسے پوری طرح جاگ گیا...... جاگیر دار اکبر علی آیا ہے۔
''کیا چاہتا ہے وہ...... کیا کہہ رہا ہے؟''
''خود ہی چل کے پوچھ لے...... نہیں چلتی تو میں اسے لے جا رہی ہوں۔''
نزہت بیگم حجاب کی طرف دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی' حسن آرا نے دیکھا کمرے کے دروازے میں عشرت بھی کھڑی تھی۔
''میں چلتی ہوں۔''
اس نے ایک نظر حجاب پر ڈالتے ہوئے کہا اور اپنی کراہوں کو ہونٹوں میں دباتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی...... اس کے چہرے پر فکرمندی کی پرچھائیاں لہرانے لگی تھیں...... حسن آرا نے اپنی چادر اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
وہ حجاب کے معاملے میں ملوث تو ہو چکی تھی مگر اب اس کا دل بھی گھبرانے لگا تھا اور یہ گھبراہٹ حجاب اور مرشد کے حوالے سے تھی۔
مہمان خانے کے دروازے کے باہر ایک تیکھے نقوش والا سیاہ صورت مسلح شخص چوکس کھڑا تھا۔
دوسری منزل کے ہال میں محفل غالباً اپنے شباب پر تھی۔ ناچ گانے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔
پھر عشرت تو سیڑھیوں کی طرف چلی گئی' جب کہ حسن آرا نزہت بیگم کے ہمراہ مہمان خانے میں داخل ہوگئی۔
''آیئے حسن آرا بیگم...... آیئے...... ہم آپ ہی کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔'' جاگیر دار اکبر علی کا دائیں ہاتھ ایک صوفے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا اور چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ...... ایک طویل مدت کے بعد یہ مکروہ چہرہ آج پھر حسن آرا کے سامنے تھا۔ اس کے رگ و پے میں طیش اور نفرت کی ایک لہر کسمسائی' مگر وہ خاموشی سے آگے بڑھ کر جاگیر دار کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نزہت بیگم بھی منہ پھلائے ایک طرف ٹک گئی...... اسی نے آج دوپہر میں جاگیر دار اکبر علی کو فون کیا تھا...... جس طرح مرشد کو اندازہ تھا کہ اماں کسی مزار پر نہیں گئی' ٹھیک اسی طرح نزہت بیگم کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ہو نہ ہو اصل چکر کچھ اور ہے۔
نزہت بیگم' عشرت جہاں' سندس جہاں اور ہاشو چاروں باہمی مشاورت کے بعد اس فیصلے پر پہنچے تھے کہ حسن آرا اور مرشد سے ہم لوگ تو الجھ نہیں سکتے' بہترین طریقہ یہی ہے کہ جاگیر دار صاحب کو ساری صورت حال بتادی جائے وہ خود ہی دونوں ماں بیٹے کے کس بل نکال لیں گے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس طرح ان دونوں سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے...... لہٰذا نزہت بیگم نے دوپہر میں فون کر کے حسن آرا کے یہاں سے پراسرار طور پر نکلنے کا بھی بتا دیا اور یہ بھی کہ حسن آرا اور اس کا بدمعاش پتر مرشد کس طرح حجاب کے معاملے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ کچھ تفصیل اس نے فون پر کہہ سنائی تھی اور کچھ جاگیر دار کے اب یہاں پہنچ آنے پر مرچ مصالحہ لگا کر بیان کر دی تھی۔
''کہیے جاگیر دار صاحب! کیسے یاد فرمایا؟''
حسن آرا نے صوفے پر بیٹھتے ہی استفسار کیا مگر اکبر علی اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوا۔
''بیس سال...... بیس سال بعد مل رہے ہیں ہم لوگ...... ہے نا! مگر آپ کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ بیس نہیں' اسی سال گزر چکے ہیں' آپ...... آپ تو بالکل کھنڈر بن چکیں!''
حسن آرا خاموش رہی۔ وہ عجیب متضاد کیفیت کا شکار تھی۔ ذہن میں ایک ساتھ ماضی کے کئی دریچے کھل گئے تھے۔
چند لمحے توقف کے بعد جاگیر دار اکبر علی دوبارہ

بولا...... اس کے لہجے میں مصنوعی تاسف تھا اور انداز میں تمسخر۔

''آپ نے بڑا ظلم ڈھایا ہے خود پر...... رول دیا خود کو...... شکل بھی ٹھیک سے پہچانی نہیں جاتی کہ یہ شکل اسی حسن آرا کی ہے جس کا بازار حسن میں طوطی بولتا تھا کبھی۔''

''درست کہہ رہے ہیں آپ لیکن اس وقت کو گزرے تو مدت ہوچکی۔ آپ اس کا کب تک افسوس کرتے رہیں گے؟''

حسن آرا کے جواب پر جاگیردار کے ماتھے پر بل پڑگئے۔ حسن آرا اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بیس سال پہلے کے اور آج کے اکبر علی میں کوئی بہت زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ چہرے پر وہی درشتی اور لہجے میں وہی تکبر، وہی رعونت تھی۔ بس آنکھوں کے نیچے گوشت تھوڑا ڈھلک چکا تھا۔ چہرے کی جلد قدرے مرجھا گئی تھی اور مونچھوں میں چاندی چمک رہی تھی۔

جاگیردار چند لمحے تیکھی نظروں سے اسے گھورتا رہا، پھر شراب کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔

''آج صبح کہاں گئی تھی تو؟''

''گجرات!''

''وہاں تیرا کون ہے؟''

''بابے کانواں والی سرکار کا مزار ہے، وہیں گئی تھی۔''

''اور...... وہ جس لڑکی کو تو نے اپنا مہمان بنا رکھا ہے، اس کے ساتھ کیا معاملہ ہے تیرا؟''

''کچھ نہیں...... وہ سیدزادی ہے بس اسی لیے۔''

''دیکھ حسن آرا، تیرے پاس اب صرف بڑھاپا بچا ہے یا پھر وہ...... تیرا لخت جگر مرشد...... اس کا اور اپنا خیال کر...... بڑھاپا خراب کروانے والی حرکتیں نہ کر...... وہ لڑکی ہماری مجرم ہے، اس سے خود بھی لاتعلق ہوجا اور اپنے پتر کو بھی لاتعلق رکھ۔''

''جاگیردار صاحب! آپ بہت بڑے اور بااختیار انسان ہیں۔ وہ ایک معصوم اور بے قصور لڑکی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سید گھرانے سے ہے۔ آل نبی اولاد علی ہے، اس سے دشمنی نکالنا تو ویسے ہی آپ کی شان کو زیب نہیں دیتا۔''

''تقریر نہ کر، جتنا کہا ہے اتنا کر...... ورنہ مشکل میں آجائے گی، تو بھی اور مرشد بھی۔''

''آپ لوگ اس بے چاری کے باپ بھائیوں کو ختم کرچکے ہیں، اس کا پورا گھرانہ اجڑ چکا ہے، لہٰذا خدا کے لیے اس پر اب مزید ظلم مت کیجیے۔'' حسن آرا کے لہجے میں خودبخود لجاجت آگھلی۔ جاگیردار نے اس کی بات پر چونک کر اس کی طرف دیکھا، ٹھیک اسی وقت اچھو لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے اندر آیا اور اس کے پیچھے پیچھے تین بندے مزید اندر گھس آئے، ان میں سے آگے آگے چوہدری فرزند علی تھا اور اس کے عقب میں حکم داد اور سانگھا۔

جاگیردار فرزند علی کو یوں اچانک وہاں دیکھ کر متعجب رہ گیا تھا۔ جبکہ فرزند علی کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے پہلے سے باپ کی یہاں موجودگی کا علم تھا۔ مہمان خانے کے دروازے پر انورے کو تو اس نے دیکھ ہی لیا تھا، باہر گلی میں موجود باقرے اور رفیعے کو بھی یقیناً دیکھا ہوگا۔ اکبر علی کی پجارو بھی باہر ہی کھڑی تھی۔

چوہدری فرزند نے ایک نظر باپ پر ڈالی اور پھر باری باری حسن آرا اور نزہت بیگم کو دیکھا۔

''حسن آرا...... نزہت بیگم۔''

پھر اس نے پلٹ کر حکم داد کو دیکھا۔

''میں کہہ رہا تھا نا کہ یہ دونوں نام سنے سے لگتے ہیں...... اب چنگے سے یاد آگیا۔''

حسن آرا کے قریب پہنچ کر وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے جھک کر حسن آرا کو دیکھنے لگا۔

''تو یہ ہے وہ حسن آرا...... ہمارے ابے کا عشق!''

حسن آرا نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا...... وہ سمجھ چکی تھی کہ یہی چوہدری فرزند علی ہے، جاگیردار اکبر علی کا بیٹا، وہی باپ والی خباثت اور درندگی اس کی آنکھوں اور چہرے سے بھی جھلک رہی تھی۔

''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت حسین تھی...... ابے کا دل اگر تجھ پر آگیا تھا تو...... لگتا ہے کہ اس دور میں تو واقعی بڑی

آفت چیز رہی ہوگی۔"

"فرزند علی..... تو یہاں کیسے اور..... کیوں؟"

باپ کی آواز پر اس نے رخ موڑ کر دیکھا۔ پھر دیوار کے ساتھ دھرا ایک موڑھا پیر سے سرکا کر حسن آرا کے سامنے بیٹھ گیا..... حکم داد اور سانگھا دروازے کے قریب ہی جم کر کھڑے ہوگئے تھے۔

"میں تیری اس حسن آرا ہی سے ملنے آیا ہوں ابا! تیرے اور اس کے پرانے کنکشن کی تو سمجھ آ گئی مگر مرید شاہ سے اس کا کیا کنکشن ہے یہ بات یہی سمجھائے گی۔"

پھر وہ حسن آرا سے مخاطب ہوا۔

"کیوں بائی جی! کیا کرنے گئی تھی مرید شاہ کے گھر؟"

جاگیردار فرزند علی کی بات سن کر چونک پڑا تھا' اس کی بات سے تو یہی سمجھ آئی تھی کہ حسن آرا گجرات نہیں بلکہ ڈسکہ گئی تھی۔ مرید شاہ کے گھر۔

خود حسن آرا بھی پریشان تھی' مگر اس پریشانی میں کسی قسم کا خوف شامل نہیں تھا۔

"تو یعنی گجرات کا تو نے جھوٹ بولا ہے؟"

جاگیردار نے حسن آرا کو گھورتے ہوئے پوچھا تو فرزند علی اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"یعنی یہ تفتیش پہلے سے جاری تھی..... اور یہ گجرات کا بتائے بیٹھی ہے..... کب گئی تھی یہ گجرات..... آج تو ڈسکہ سے واپس آئی ہے..... مرید شاہ کے گھر سے۔"

جاگیردار کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی..... ساری بات خود بخود اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

"کس لیے..... کس کے لیے ایسا کر رہی ہے تو؟ کس یار کو خوش کرنا چاہتی ہے' یا دھندا بدل لیا ہے' ترقی ہوگئی ہے تیری؟"

جاگیردار کے لہجے میں زہر اور نفرت بھر آئی تھی۔ حسن آرا حلیمی سے بولی۔

"جاگیردار صاحب! بدلہ لینے والے سے معاف کردینے والا زیادہ بڑا' زیادہ طاقتور ہوتا ہے' آپ تو پھر بھی انتقام لے چکے' اب اس آگ کو سینے ہی میں بجھالیں۔ اس دشمنی کو یہیں ختم کردیں۔"

"تو کون ہوتی ہے ہمیں یہ نصیحت کرنے والی۔"

"یہ نصیحت نہیں' درخواست ہے جاگیردار صاحب' گزارش ہے یہ تو۔"

"بھونکنا بند کر کتیا!"

جاگیردار ایک دم بھڑک اٹھا تھا۔ نزہت بیگم اور ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑا اچھو دونوں جاگیردار کی دہاڑ پر لرز کر رہ گئے۔ کمرے کی فضا میں لحہ بہ لحہ بڑھتی سنگینی کے باعث اچھو فوراً وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا مگر کمرے کے دروازے کے بالکل سامنے خوفناک شکلوں والے وہ دونوں رائفل بردار مستعد کھڑے تھے۔ لہٰذا وہ حیران پریشان سا دیوار کے ساتھ کھڑا رہا۔

"ایک غلطی ایک بھول کی سزا تو پچھلے ستائیس سال سے بھگت رہی ہے' اور تیری باقی بچی کھچی حیاتی کے لیے بھی وہی ایک بھول کافی ہے' اور تو..... تو مزید جہالت پہ اتر آئی ہے..... پاگل ہوگئی ہے' دماغ چل گیا ہے تیرا یا پھر مرنا چاہتی ہے؟"

جاگیردار نے باقی ماندہ شراب کا ایک گھونٹ لیا اور خالی گلاس پٹخنے والے انداز میں ٹیبل پر رکھا..... نزہت بیگم فوراً گلاس کی طرف متوجہ ہوئی تو چوہدری فرزند نے اسے اپنے لیے بھی گلاس تیار کرنے کا اشارہ کردیا..... وہ خاموش بیٹھا صورت حال اور معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وہ بچی معصوم ہے' بے قصور ہے' اسے بخش دیجیے۔"

چوہدری فرزند کے کان کھڑے ہوگئے۔

"کون سی بچی؟ کس بچی کی بات کر رہی ہے تو؟"

"آپ کے ابا جی جانتے ہیں کہ میں کس بچی کی بات کر رہی ہوں۔"

حسن آرا کے جواب پر چوہدری نے باپ کی طرف دیکھا' اچانک ہی اس کے دماغ میں ایک جھما کا سا ہوا۔

"کدھر ہے وہ؟"

فرزند علی نے اضطراری انداز میں حسن آرا اور نزہت بیگم دونوں کی طرف دیکھا۔

"فرزند علی!"

جاگیردار نے اسے پکارا۔

"میں نے پوچھا ہے کہاں ہے وہ لڑکی..... کدھر چھپایا ہوا ہے اسے۔"

چوہدری فرزند نے غراتے ہوئے کہا۔ اور اگلے ہی پل وہ پسٹل نکال چکا تھا۔

''بتاؤ...... (ناقابل اشاعت) چوہدری نے باری باری دونوں کی طرف پسٹل کا رخ کیا' اس کے چہرے پر ایسی غضب ناکی چھا گئی تھی کہ نزہت بیگم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اس کے...... اس کے کمرے میں تو ہے وہ...... اسی نے اسے مہمان بنا رکھا ہے' میں نے تو خود جاگیردار صاحب کو فون کر کے بتایا ہے۔''

پسٹل کا رخ اپنی طرف دیکھ کر نزہت بیگم کی تو جیسے روح ہی فنا ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر فوراً ہی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''چل آگے لگ...... بتا کدھر ہے وہ؟''

چوہدری فرزند اٹھ کر کھڑا ہوا تو جاگیردار اکبر علی نے فوراً اٹھ کر اس کا پسٹل والا ہاتھ دبوچا اور کرخت لہجے میں بولا۔

''بندے کا پتر بن اوئے' کیا بات بے بات اس باپ کو نکال لیتا ہے تو......'' جاگیردار کا اشارہ پسٹل کی طرف تھا۔

''اندر رکھ اسے اور آرام سے بیٹھ۔''

''ابا! وہ چھوکری یہیں ہے نا؟''

''آرام سے بیٹھ تو۔''

''شاہوں کی کڑی ادھر ہی موجود ہے نا؟''

چوہدری فرزند کا لہجہ تھوڑا مزید بلند ہو گیا...... وہ حجاب کے حوالے سے یقین چاہتا تھا۔

''اوئے ہاں اوئے...... ادھر ہی ہے وہ' تو بیٹھ جا سکون سے۔''

جاگیردار غصے اور جھنجلاہٹ سے بولا۔ فرزند علی کو اس نے کھینچ کر ایک طرف صوفے پر بٹھایا تھا۔

'ابا! اسے بلا...... اسے ابھی بلا میرے سامنے۔''

''بلا لیتے ہیں پہلی اس چنگڑی سے دو چار باتیں کر لیں۔''

جاگیردار کا اشارہ حسن آرا کی طرف تھا جو اپنی جگہ خاموش بیٹھی چوہدری فرزند کے تیور دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

چوہدری فرزند نے شراب کا گلاس اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔ جاگیردار حسن آرا کی طرف متوجہ ہو گیا...... چند لمحے وہ اپنی سرخ آنکھوں سے اسے گھورتا رہا پھر انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

''مرید شاہ کے ہاں کیا کر کے آئی ہے تو؟''

''میں صرف حجاب کے گھر کے بارے میں معلوم کرنے گئی تھی کہ ادھر کیا حالات و واقعات ہیں۔''

''اس لڑکی کے بارے میں کیا بتا کے آئی ہے۔''

''کچھ نہیں......''

یہ الفاظ خود بخود ہی اس کی زبان سے ادا ہو گئے تھے۔ وہ مزید بولی۔

''وہ اتنے دہشت زدہ تھے کہ مجھے مناسب نہیں لگا کہ میں اس کے بارے میں انہیں کچھ بتاؤں۔ اگر اس کے گھر والے زندہ ہوتے تو شاید ان تک اس کی یہاں موجودگی کی اطلاع پہنچاتی' مگر وہ سب تو انتقام کا ایندھن بن کر بھسم ہوئے۔''

جاگیردار خاموشی سے اسے گھورنے لگا۔ چوہدری فرزند کبھی اپنے باپ کو تک رہا تھا اور کبھی حسن آرا کو...... کچھ دیر بعد جاگیردار ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

''بس حسن آرا! اب اس سب کے بعد مزید کچھ ایسا ویسا مت کرنا۔ ہم تجھے بتا چکے ہیں کہ وہ لڑکی ہماری مجرم ہے' اس کے ساتھ کیا کرنا ہے' اس کا انجام کیا ہوگا' یہ ہم طے کر چکے ہیں۔ آئندہ اگر تو نے یا تیرے اس ٹٹ پونجیے بدمعاش نے اس معاملے میں کوئی دخل دیا' تو تم دونوں کی لاشیں یہیں کے کسی گٹر میں پڑی ہوں گی...... سمجھ گئی؟''

حسن آرا ہونٹ بھینچے خاموش بیٹھی رہی...... جانتی تھی کہ جو کچھ بھی کہہ لیا جائے وہ بے اثر ہی ثابت ہوگا...... حجاب کے لیے اس کی فکرمندی میں اضافہ ہو گیا' اس کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

'ہاں' نزہت بیگم تم سناؤ' تم نے اسے کچھ سکھایا' سمجھایا ہے یا نہیں ابھی؟''

جاگیردار نزہت بیگم کی طرف متوجہ ہوگیا تھا جو گھبرائے گھبرائے سے انداز میں دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ چکی تھی۔

''تیاری کروا رہے تھے جاگیردار صاحب! لیکن پھر یہ

درمیان میں آ کھڑی ہوئی..... اسے ہم کچھ کہہ نہیں سکتے ورنہ وہ مرشد ہمارے سر پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جائے گا۔“

”ان کی فکر اب مت کرو..... یہ آئندہ درمیان میں نہیں آئیں گے۔“

”وہ مرشد..... بڑی الٹی کھوپڑی کا مالک ہے..... وہ ایسے باز نہیں آئے گا۔“ نزہت بیگم نے جھجکتے ہوئے بات مکمل کی۔

”اس کا علاج ہے ہمارے پاس۔“

”یہ مرشد کون ہے؟“

چوہدری فرزند نے سوال کیا ہوا تو نزہت بیگم نے فوراً اسے بتایا۔

”اسی کا بیٹا ہے..... یہاں کا تھرا بدمعاش ہے۔“ نزہت بیگم کے لہجے میں سخت ناگواری تھی۔

”تو ان دونوں کا اس شاہنی سے کیا واسطہ ہے..... کیوں اس کے ہم درد بن رہے ہیں یہ؟“

”اصل تکلیف تو اسے ہے جی! بہت سمجھایا ہے ہم لوگوں نے کہ اس معاملے سے الگ رہو ورنہ پچھتاؤ گی مگر اس کی سمجھ میں بات آتی ہی نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ تم لوگوں کو بات سمجھانی نہیں آتی۔“ چوہدری فرزند نے نخوت سے کہا۔ پھر حسن آرا سے مخاطب ہوا۔

”نندی پور تیرا بدمعاش پتر ہی گیا تھا نا آج؟“

”نہیں‘ وہ سارا دن یہیں موجود تھا۔“

حسن آرا نے فوراً تردید کی‘ اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔

جاگیردار نے بھنویں اچکا کر فرزند علی کو دیکھا تو وہ مزید بولا۔

”پھر وہ اس کے کوئی چمچے کڑچے ہوں گے‘ ہمارے بندوں سے اسلحہ اور گاڑی چھین کر فرار ہوئے تھے وہاں سے..... دو بندے تھے۔“ اس نے گلاس خالی کرتے ہوئے ٹیبل پر رکھا۔

”ہوسکتا ہے وہ کوئی اور لوگ ہوں۔“

”ہاں..... ہوسکتا ہے..... تو مرشد کا بتا کہاں ملے گا‘ ہم خود پتا کر لیتے ہیں اس سے۔“

”فرزند علی..... اس معاملے کو کل دن میں دیکھیں گے..... ابھی دماغ کو ہلکا رکھ..... ذرا ٹھنڈا رکھ۔“

جاگیردار نے فوراً مداخلت کی..... فرزند علی نے مزید کچھ بولنا چاہا‘ مگر اس کے بولنے سے پہلے ہی جاگیردار نے اسے ٹوک دیا۔

”بس..... میں نے کہا ہے نا‘ دیکھیں گے..... زیادہ بے صبرانہ ہوا کر۔“

فرزند علی غصے کا گھونٹ پی کر خاموش ہو رہا‘ جاگیردار نے گلاس اٹھا کر مشروب کا گھونٹ بھرا اور نزہت بیگم سے مخاطب ہوا۔

”وہ لڑکی ابھی تمہارے پاس ہی رہے گی..... تم نے جو ذمہ داری قبول کی تھی‘ اسے ٹھیک سے نبھاؤ..... جلد از جلد اس کو تربیت دو۔“

”کون سی لڑکی؟ وہ شاہنی؟“ فرزند علی سے چپ نہیں رہا گیا تھا۔

”یہاں کیوں رہے گی وہ..... یہاں نہیں رہے گی‘ میں اسے یہاں سے لیے بغیر جانے والا نہیں ہوں اور..... اور یہ تربیت کیا؟“

”تربیت تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے جی‘ آپ بس اس حسن آرا اور اس کے بیٹے مرشد کو اچھے سے سمجھا دیں کہ یہ رکاوٹ نہ بنیں۔“

”تمہارے سامنے اس کو سمجھا دیا ہے نا! اب ان کو بھول کر اپنے کام پر توجہ دو۔“ جاگیردار نے درشتی سے کہا۔

”اس لڑکی کو یہاں لے کے آؤ‘ ابھی۔“

چوہدری فرزند اچانک سیدھا ہو بیٹھا۔ نزہت بیگم نے جاگیردار کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہاں‘ ٹھیک ہے‘ لاؤ اسے۔“

حسن آرا مضطرب ہوگئی‘ مگر بولی کچھ نہیں‘ جاگیردار اکبر علی کی باتوں سے یہ اندازہ تو بخوبی ہو رہا تھا کہ حجاب کو فوری طور پر کوئی شدید خطرہ درپیش نہیں ہے‘ نزہت بیگم فوراً اپنی جگہ سے اٹھی اور دیوار کے ساتھ پریشان کھڑے اچھو کو لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”ابا! کیا چل رہا ہے تیرے دماغ میں؟ اس شاہنی کو میں یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا‘ بتا رہا ہوں تجھے۔“

”باؤلا نہ بن..... میرے دماغ میں وہی کچھ چل

رہا ہے جو تیرے دماغ میں چل رہا ہے...... بس میں نے اپنے اندر کی آگ کو تیری طرح بے لگام نہیں چھوڑ رکھا...... بہت عرصے سے تجھے کہتا آرہا ہوں کہ غصے پر قابو کرنا سیکھ ورنہ کسی دن کسی مصیبت میں پھنس جائے گا...... تیرے پلے نہیں پڑتی بات۔"

"میں نے اس کتیا کو زبان دی ہے۔ قسم کھائی ہے میں نے...... پتا ہے نا تجھے۔" چوہدری نے دانت کچکچائے۔

"زبان نبھانے کے لیے' قسم پوری کرنے کے لیے اس اسرارے کا ہونا بھی تو ضروری ہے نا! پہلے اس کو ڈھونڈ پکڑ' تب تک یہ یہاں محفوظ ہے۔ وہ اعوان کا پتر بھی تب تک ٹھنڈا ہو جائے گا......اور...... ویسے بھی اس کو یہاں رکھنے کی ایک اور وجہ بھی ہے' اور وہی سب سے اہم بات ہے۔" جاگیردار نے زہر خند لہجے میں کہا اور گلاس منہ سے لگا لیا۔

"کیا ایسی اہم بات ہے؟"

"تو جذباتی اور جلد باز ہے فرزند علی! اس لیے تیرے دماغ میں صرف انتقام ہے...... صرف انتقام...... ہم نے یہ قصہ صرف انتقام پہ ختم نہیں کرنا' بدترین انتقام لینا ہے ہم نے' بدترین انتقام۔"

جاگیردار نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا' اس کی مکروہ صورت کچھ مزید مکروہ دکھائی دینے لگی تھی۔

"وہ کیسے؟" چوہدری فرزند نے سنجیدگی سے استفسار کیا۔

"کچھ دیر بعد ہم لوگ چپ چاپ یہاں سے واپس چلے جائیں گے' کڑی یہیں قید رہے گی تو جا کے اسرارے کی تلاش تیز کر' اس کے ہتھے چڑھ آنے تک یہاں نزہت بیگم اس کڑی کو ناچ گانا سکھائے گی' آدمی کا دل بہلانے اور اسے خوش کرنے کے گر سکھائے گی...... اسرار ال جائے تو تو اپنی قسم پوری کر لینا تسلی سے...... اس کے بعد یہ ہم لوگوں کے خاص خاص مہمانوں کے کام آئے گی' خاص خاص محفلوں میں کام آئے گی۔" باپ بول رہا تھا اور بیٹا پوری توجہ اور دل جمعی سے سن رہا تھا۔

"انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑ بھی جائے تو ان لوگوں کی سزا ختم نہ ہونے پائے۔ اس کڑی کی وجہ سے اس کے ٹبر کی روحیں بھی ہمیشہ تڑپتی رہنی چاہئیں۔ کسی سے انتقام لینا ہو تو انتقام ایسا ہونا چاہیے جو دشمن کی آنے والی نسلوں تک اپنا اثر دکھائے اور وہ اثر اس کڑی کے ذریعے شاہوں کی اگلی نسلوں میں جائے گا' فرزند علی...... بات کو سمجھ اور اس کڑی کو فی الحال اس کوٹھے پر ہی رہنے دے۔"

جاگیردار کے اندر کا سارا کمینہ پن اس کے لہجے میں موجود تھا' چوہدری فرزند پرسوچ انداز میں باپ کی طرف دیکھ رہا تھا' اس کی آنکھوں کی چمک غمازی کر رہی تھی کہ اسے جاگیردار اکبر علی سے کوئی اختلاف نہیں رہا۔

حسن آرا اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھی ان کی بکواس سن رہی تھی اور دل ہی دل میں توبہ توبہ کر رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ ان دونوں باپ بیٹے کو بددعائیں بھی دے رہی تھی...... جو انسانی شکلوں میں دکھائی دینے والے بدترین جانور تھے' جن کو کسی کا کوئی ڈر خوف نہیں تھا...... شاید خدا کا خوف بھی نہیں تھا' تبھی تو وہ سادات کا پورا گھر اجاڑ دینے کے بعد' اب ایک پھول جیسی معصوم سید بچی کی پوری زندگی کو ایک جہنم' ایک مسلسل عذاب بنا دینے کی منصوبہ بندیاں کر رہے تھے۔

نزہت بیگم حجاب کو لے کر واپس آئی تو عشرت جہاں بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں حجاب کو ٹھوکے مارتی ہوئی اندر لائی تھیں۔

حجاب کا دوپٹہ ندارد تھا' بال بکھرے ہوئے' آنکھیں ویران اور چہرہ پتھرایا ہوا' عجیب اجڑی بچڑی سی حالت تھی اس کی۔

نزہت بیگم اور عشرت جہاں اس کو دھکیلتے ہوئے جاگیردار کے سامنے لے آئیں۔ جاگیردار اور چوہدری فرزند' دونوں شراب کے گلاس اٹھائے بیٹھے تھے۔ دونوں ہی کی آنکھیں حجاب کے وجود پر جم کر رہ گئیں' لیکن حجاب ان لمحوں میں اپنے وجود کے ہوش ربا نشیب و فراز سے غافل تھی۔ اسے ان باپ بیٹے کے انداز نظر کا بھی کوئی احساس نہیں تھا۔ صدمے کی شدت نے ابھی تک اس کے حواسوں کو شل کر رکھا تھا...... البتہ حسن آرا بری طرح بے چین ہو کر رہ گئی تھی۔

"کیا کوئی نشہ وغیرہ دیا ہے اسے...... یہ کیا حالت

ہورہی ہے اس کی؟''

چوہدری فرزند حجاب کی سپاٹ صورت دیکھتے ہوئے متعجب ہوا..... حجاب کے چہرے پر نہ کوئی ڈر خوف تھا نہ کوئی گھبراہٹ یا پریشانی اور یہ بات چوہدری کو بہت عجیب محسوس ہو رہی تھی۔

''اس کے آنے تک تو ٹھیک تھی..... اسی نے آ کر کچھ کھلایا ہے۔''

نزہت بیگم نے حسن آرا کی طرف اشارہ کیا تو وہ خود ہی بول پڑی۔

''مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا' میں نے آ کر اسے بتا دیا..... باپ بھائیوں کی موت کا سن کر سخت صدمہ پہنچا ہے..... اسی وقت سے اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ سنبھل جائے گی۔''

''اچھا..... اس طرح بھی ہوتا ہے۔''

فرزند علی کچھ مزید متعجب ہوا پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر چٹکی بجائی۔

''اے..... اے شمیم آرا کی اولاد..... یہ ادھر..... ادھر۔''

حجاب کے وجود تو کیا آنکھوں کو بھی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ویران اور خالی آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز رہیں..... فرزند علی کے تاثرات بگڑ گئے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور حجاب کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔ مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

چوہدری فرزند کے دائیں ہاتھ میں گلاس تھا' لہٰذا اس نے بائیں ہاتھ سے دو تین بار حجاب کا گال تھپتھپایا..... حجاب کے سر کو جنبش ہوئی' اس نے چوہدری فرزند کی طرف دیکھا بھی مگر خالی خالی نظروں سے..... یوں جیسے چوہدری اسے دکھائی ہی نہ دے رہا ہو۔

''حرام کی جنی! اداکاری کرنے سے کوئی رعایت نہیں لے سکے گی تو.....'' چوہدری نے غراتے ہوئے کہا' حجاب ساکت کھڑی رہی۔

''سن رہی ہے یا نہیں؟''

چوہدری دوبارہ غرایا' مگر حجاب پر کوئی اثر نہ ہوا' اچانک چوہدری نے دانت کچکچاتے ہوئے دائیں ہاتھ میں دبا گلاس اس زور سے اس کے سر پر مارا کہ گلاس ایک دھماکے سے کرچی کرچی ہوگیا' حسن آرا کے حلق سے ایک گھبراہٹ زدہ بے معنی آواز خارج ہوئی۔ نزہت بیگم اور عشرت جہاں بے اختیار دو دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

گلاس کی ضرب سے حجاب کے سر کو جھٹکا لگا' اس کی تھوڑی سینے سے ٹکرائی۔ سر پھر سے اوپر اٹھا' اس نے چوہدری فرزند کی آنکھوں میں جھانکا' تبھی چوہدری نے اس کے بائیں گال پر ایک بھرپور تھپڑ رسید کر دیا' وہ دو قدم ڈگمگا کر بائیں گھٹنے کے زور پر نیچے بیٹھی اور پھر کولہے کے بل فرش پر ٹک گئی۔

چوہدری فرزند اس کی طرف بڑھنا چاہ رہا تھا کہ جاگیردار نے جلدی سے اٹھ کر اسے بازو سے دبوچ لیا۔ حسن آرا فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر حجاب تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نہیں تھے' البتہ سر سے بھل بھل خون بہنے لگا تھا۔ حسن آرا کا کلیجہ کانپ اٹھا۔

''نزہت بیگم! اسے سامنے سے ہٹالو خون کھولتا ہے۔'' جاگیردار کا اشارہ حجاب کی طرف تھا۔

''جی! ابھی انتظام کرتی ہوں اس کا۔'' اس نے مستعدی سے کہا پھر عشرت جہاں سے مخاطب ہوئی۔

''جلدی سے ہاشو کو آواز دے۔''

ساتھ ہی اس نے آگے بڑھ کر حجاب کو بازو سے تھام لیا۔

'چل ری کھڑی ہو جا۔''

''پہلے اس کے زخم کا کچھ کرو..... چوٹ شاید زیادہ آئی ہے' دیکھو تو کیسے خون ابل رہا ہے۔''

حسن آرا نے پریشانی سے کہا' وہ ایک ہاتھ سے حجاب کے سر پر دباؤ دیئے بیٹھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں اپنی چادر کا پلو تھامے اس کے چہرے سے خون صاف کر رہی تھی۔

''تو چل کے اپنے کمرے میں بیٹھ..... اس کا جو کرنا ہوا وہ ہم کرلیں گے۔''

''فرزند علی تو نیچے چل کے گاڑی میں بیٹھ میں آتا ہوں..... جا..... شاباش۔''

جاگیردار نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

''میرے دو بندے یہیں رہیں گے' یہ چوبیس گھنٹے ان

کی نظروں میں رہے گی۔'' چوہدری فرزند بولا نہیں پھنکارا تھا۔ ''ایسا کر کہ...... رفیقے اور گامے کی ڈیوٹی لگادے...... جا ان دونوں کو جا کے سمجھا ان کی ڈیوٹی۔''

جاگیردار نے پھر سے اس کا کندھا تھپکا تو اس نے ایک نفرت کی نگاہ حجاب پر ڈالی اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

حکم داد اور سانگھا بھی اس کے پیچھے ہی نکل گئے' ان لوگوں کے باہر جاتے ہی عشرت جہاں اور ہاشو خان اندر داخل ہوئے۔

''آؤ ہاشو! اس کمینی کو لے جا کر باغیچے والے کمرے میں بند کردو...... آؤ عشرت' لے جاؤ اسے۔''

''اس طرح یہ مر جائے گی...... کچھ تو خدا کا خوف کرو تم سب۔''

حسن آرا بری طرح پریشان ہو چکی تھی' حجاب کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا' عشرت اور ہاشو نے آگے بڑھ کر حجاب کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے کھڑا کیا لیکن شاید اس کی ٹانگیں اس کا وزن نہیں سہار پا رہی تھیں۔ وہ دونوں اسے گھسیٹنے والے انداز میں لے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ حسن آرا کو نزہت بیگم نے بازو سے پکڑ رکھا تھا۔

''حسن آرا!'' جاگیردار کی آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف کرلی۔''

''مرشد کو اب تو سمجھائے گی یا...... ہم خود سمجھائیں؟''

حسن آرا خاموش رہی تو جاگیردار دوبارہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''زبان سے بھونک...... خود سمجھائے گی اسے یا ہم سمجھائیں...... اپنے طریقے سے؟''

''میں سمجھالوں گی اسے۔''

حسن آرا نے بہ دقت تمام کہا...... چوہدری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''شاباش...... عقلمندی بھی اسی میں ہے' تیری زندگی بھر کی وہی تو کمائی ہے۔ بڑھاپے کا آسرا ہے' اسی طرح عقل مندی سے کام لے گی تو لٹنے سے بچی رہے گی' آسرا باقی رہے گا اور...... تیرا...... بڑھاپا بھی گلیوں تک نہیں جائے گا۔'' پھر وہ نزہت بیگم کی طرف متوجہ ہوا۔

''اب تمہیں بھی دوبارہ کچھ سمجھانا پڑے گا کیا؟''

''نہیں جاگیردار صاحب! اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے' آپ بالکل مطمئن ہو کر جائیں۔''

''دو بندے تو ہمارے یہیں رہیں گے' کوئی مسئلہ یا پریشانی بنے تو بس انہیں اشارہ کر دینا...... وہ فوراً مسئلہ ختم کردیں گے...... ملتے ہیں کچھ دن بعد۔''

جاگیردار نے آخری نظر حسن آرا پر ڈالی اور پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

''چل تجھے تیرے کمرے میں چھوڑ کے آؤں۔''

نزہت بیگم نے اس کا بازو دبایا تو اس نے ناگواری سے بازو چھڑا لیا۔

''تم یہ سب ٹھیک نہیں کر رہی ہو اماں! جا کے حجاب کی مرہم پٹی کا انتظام کرو۔''

''نہیں مرتی وہ...... گلاس تھا' کوئی گولی نہیں لگی اسے۔''

نزہت بیگم نے بے پروائی سے کہا۔

''اماں! وہ سید ذات ہے...... نبی کریم کی اولاد میں سے ہے' کچھ عقل سے کام لے' خدا کا کچھ خوف کر...... اس کی پکڑ بہت بری ہے۔''

''تو زیادہ تبلیغ نہ کر مجھے...... میں جانتی ہوں کہ میں کیا کر رہی ہوں' تو اپنی سوچ' اپنے کام سے کام رکھ۔''

اسی وقت ہاشو اندر داخل ہوا' اس کے پیچھے عشرت جہاں بھی تھی۔

''بائی جی' بند کر کے تالا لگا دیا ہے۔''

ہاشو نے آگے بڑھتے ہوئے چابی نزہت بیگم کو دکھائی۔

''لا...... ادھر مجھے پکڑا دے...... میں دیکھتی ہوں اب اس چھنال کو۔''

ہاشو نے چابی نزہت بیگم کو پکڑا دی۔

حسن آرا اچانک اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور ان تینوں کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

''تم سب بھی ظالم ہو' ایک معصوم بچی پر ظلم ڈھا رہے ہو...... ایک ذرا انسانیت نہیں بچی تم لوگوں میں...... خدا کا

خوف نہیں رہا تمہیں' مگر یاد رکھنا' جہاں ظلم بڑھ جائے وہاں خدا تعالیٰ عذاب مسلط کر دیا کرتا ہے...... یاد رکھنا میری بات۔'' اس کے بعد وہ وہاں رکی نہیں' وہ بیرونی دروازے طرف بڑھی تو اسے عقب سے بڑبڑاہٹ سنائی دی اور دروازے سے باہر جاتے ہوئے ہاشو کی آواز آئی۔

''بائی جی! چھوکری کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا ہے' ہم لوگ ایک کپڑا تو اس کے سر پر باندھ آئے ہیں' مگر ......اس......''

حسن آرا سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی...... آتے وقت اس نے عقبی صحن میں دو کرسیوں پر رائفل بردار بھی بیٹھے ہوئے دیکھے۔ یہ دونوں یقیناً جاگیردار کے پالتو کتے ہی تھے۔

وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھی اپنے خون آلود ہاتھ دیکھ رہی تھی' اور اس کا سارا دھیان حجاب کی طرف لگا ہوا تھا۔ حجاب کے سر میں یقیناً گہرا زخم آیا تھا' خون کے بہاؤ کی جو رفتار تھی اس سے حسن آرا کو اندیشہ تھا کہ وہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے......اور...... آتے ہوئے عقب میں ہاشو کی تشویش زدہ آواز بھی اس نے سنی تھی۔

''بائی جی! چھوکری کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا ہے ......''

حسن آرا بے چین ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ فکر و پریشانی سے دل کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی وجود کے اندر خون کے ساتھ ساتھ ایک اضطراب بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

حسن آرا سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ حجاب کی فوری مدد کے لیے کیا کرے؟ اور دیر کرنے کی صورت میں یہ اندیشہ ہو لائے دے رہا تھا کہ حجاب کسی ناقابل تلافی نقصان سے دوچار نہ ہو جائے ...... جو بھی کرنا تھا وہ فوری کر گزرنے کی ضرورت تھی...... حسن آرا کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑنے لگے تو اسے اچانک شدت سے محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ قدرت کی طرف سے آزمائش ہے ...... اگر وہ سیدزادی یہاں سسک سسک کر بے کسی کی موت مر گئی تو اس کا تمام بوجھ میری گردن پر ہوگا...... نتیجہ کچھ بھی رہے...... اس کی مدد کرنا لازم تھا...... فرض تھا' اور اس فرض کی ادائیگی کرنے والے کو اگر موت بھی آ جاتی تو وہ شہادت کہلاتی۔

حسن آرا ٹہلتے ٹہلتے اچانک ایک جگہ رک گئی۔ ذہنی کشمکش یکا یک ایک کنارے جا لگی تھی۔ دل و دماغ جیسے خود بخود ایک فیصلے پر پہنچ گئے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے سے باہر دیکھا' راہداری خالی پڑی تھی' رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی مگر پورا بازار حسن ابھی جاگ رہا تھا' فضا میں گھنگھرؤ طبلوں کے ساتھ ساتھ گانے والیوں کی آوازیں بھی ڈوب ابھر رہی تھیں' حسن آرا نے چادر اچھی طرح اوڑھی اور بیرونی سمت بڑھ گئی...... گلی میں اس وقت زیادہ رونق نہیں تھی...... بس چند مخصوص دکانیں کھلی تھیں اور چند ایک گلی کے افراد ہی یہاں وہاں موجود تھے' لکڑی کے زینے سے اترتے وقت ایک بار تو اسے خیال آیا کہ خود آگے نہ جائے بلکہ کسی دوسرے کے ذمے لگا دے مگر اس نے فوراً اس خیال کو جھٹک دیا۔

وہ مدد مانگنے نکلی تھی اور یہاں صرف ایک ہی ایسا ماں کا لعل تھا جو ان حالات میں بے دھڑک' مردانہ وار اس کی مدد کر سکتا تھا اور وہ تھا...... مرشد...... وہ مرشد سے مدد مانگنے نکلی تھی ...... پیاسی تھی' سو اسے ہی کنویں کے پاس جانا چاہیے تھا۔ حجاب زخمی تھی۔ پہلے ہی اس کا کافی خون ضائع ہو چکا تھا۔ مزید دیر کرنا مناسب نہیں تھا......اور کوئی راستہ بچا ہی نہیں تھا' اسے فوری مدد کی ضرورت تھی' اور حسن آرا نے طے کیا تھا کہ حجاب کے لیے مدد مانگنے وہ خود چل کر مرشد کی دہلیز تک جائے گی۔

(ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ)